هنالک ابتلی المؤمنون و زلزلوا زلزالا شدیدا(الاحزاب۱۱)

ہم نے پاکستان کیسے بنایا

(مسلمانانِ ہند کے خون سے لکھی گئی ہجرت آزادی کی سچی داستانیں)

یوم آزادی کے موقع پر خصوصی اشاعت

عمیر محمود صدیقی

جملہ حقوق غیر محفوظ ہیں

نام کتاب: ہم نے پاکستان کیسے بنایا

مصنف و مرتب: عمیر محمود صدیقی

btm1432@gmail.com

تقریظ و نظر ثانی: ڈاکٹر حبیب الرحمٰن

فا لذین هاجروا و اخرجوا من دیارهم و اوذوا فی سبیلی و قاتلوا و قتلوا لاکفرن عنهم سیاتهم و لادخلنهم جنات تجری من تحتها الانهار ثوابا من عند الله و الله عنده حسن الثواب (آل عمران:۱۹۵)

جن لوگوں نے وطن چھوڑ دیئے اور اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے تو میں ضرور ان کے گناہ ان سے مٹا دوں گا اور انہیں یقیناً ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ اللہ کے حضور سے اجر ہے اور اللہ ہی کے پاس بہتر اجر ہے۔''

عن ابی هریرة رضی اللّٰه تعالیٰ عنه قال :

قال رسول الله ﷺ و ذکر الهند:

"لیغزون الهند لکم جیش یفتح اللّٰه علیهم حتیٰ یأتوا بملوکهم مغللین بالسلاسل یغفر اللّٰه ذنوبهم فینصرفون حین ینصرفون فیجدون ابن مریم با لشام (الفتن: رقم الحدیث:۱۱۴۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ کہا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور غزوۂ ہند کا ذکر فرمایا:

''تمہارے لیے ایک لشکر ضرور ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ اللہ ان کو فتح عطا فرمائے گا یہاں تک کہ وہ ان کے بادشاہوں کو زنجیروں میں جکڑ کر لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمائے گا۔ پھر وہ لوٹیں گے جب ان کو لوٹنا ہوگا تو وہ (حضرت عیسیٰ) ابن مریم علیہما السلام کو شام میں پائیں گے۔''

غزوہ ہند

میں شریک ہونے والے مجاہدین کے نام

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	تقریظ، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن	22
۲	ہم نے پاکستان کیسے بنایا؟	30
۳	البیرونی اور ہندو	37
۴	پہلا سبب زبان کا اختلاف:	37
۵	دوسرا سبب دین کا اختلاف:	37
۶	تیسرا سبب رسم وعادات اور طرز معاشرت کا اختلاف:	38
۷	چوتھا اختلاف:	40
۸	لنگ پوجا	40
۹	حواشی	73
۱۰	ہم نے پاکستان کیسے بنایا؟	77
۱۱	بہار کی تباہی	78
۱۲	آٹھ سید زادیاں	90
۱۳	داستان ہجرت	97
۱۴	معصوم خون	106
۱۵	روشن چراغ	111
۱۶	عصمتوں کا نذرانہ	121

۱۷	جب موت قریب سے گزر گئی	137
۱۸	گوہانہ ہندو بھیڑیوں کے نرغہ میں	143
۱۹	چاندی کے مسلمان	144
۲۰	گڑوال کی بہادر عورتیں	145
۲۱	پوٹھی کے دلیر مسلمان	145
۲۲	رہتک میں ردعمل	148
۲۳	حکام ضلع اور فوج کی آمد	149
۲۴	رہتک سے پاکستان تک	151
۲۵	کاہنی کے مسلمانوں پر کیا بیتی	153
۲۶	نسل کشی اور بیخ کنی کی کانگریسی توجیہ	156
۲۷	'ہریانہ کا اتہاس' سے اقتباسات	156
۲۸	رہتک میں مسلمانوں کی نسل کشی	158
۲۹	خوبصورت سرزمین	160
۳۰	کیا میں منحوس ہوں؟	167
۳۱	چھتیس برس اُدھر کی بات	176
۳۲	آزادی کے سائے میں	182
۳۳	مہاجر کیمپ کی بپتا	189
۳۴	پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ	195
۳۵	میرا سفر آزادی	207
۳۶	گوشہ عافیت	210

۳۷	میں زندہ رہا	227
۳۸	منزل	234
۳۹	موت کا رقص	238
۴۰	چودہ اگست اور ٹمٹماتے چراغ	246
۴۱	کیا کھویا کیا پایا	255
۴۲	کالا آم کا خونی معرکہ	260
۴۳	آزادی کی راہ میں	266
۴۴	لہو کی پہلی بارش	276
۴۵	ہم پر کیا گزری	283
۴۶	یادِ پارینہ	291
۴۷	تقسیم ہند	295
۴۸	لدھیانے سے لاہور تک	302
۴۹	اور بھوانی مسلمان سے خالی ہو گیا	323
۵۰	سرور بیگم کی سرگزشت	339
۵۱	قرول باغ اور پہاڑ گنج کی تباہی	340
۵۲	سٹی اسٹیشن دہلی، آنکھوں دیکھا حال	347
۵۳	ایک ہولناک سفر	347
۵۴	ڈاکٹر امجد علی کی سرگزشت	349
۵۵	قدرت کی مدد	351
۵۶	بلوچ رجمنٹ	352

۵۷	والد سے ملاقات	354
۵۸	جان کیسے بچی	355
۵۹	عینی شاہد	358
۶۰	ڈاکٹر ہارون رشید شہید کی بیوی کے ساتھ کیا گزری	359
۶۱	ایک بہن کی فریاد	360
۶۲	جالندھر کے خونیں واقعات	36
۶۳	جالندھر کے مضافات	364
۶۴	لدھیانہ اور اس کے مضافات	366
۶۵	ریاست کپورتھلہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا انخلاء	368
۶۶	سید سعید احمد صاحب کا بیان	374
۶۷	خواجہ سعید حسن پرنسپل پولیس ٹریننگ اسکول کا بیان (اقتباسات)	378
۶۸	صدر مسلم لیگ کی شہادت	380
۶۹	شہر کی حالت	380
۷۰	مسلمانوں کے کیمپ	381
۷۱	دہلی اور نواح دہلی میں خون مسلم کی ارزانی	382
۷۲	۳۔۴ ستمبر ۱۹۴۷ء	382
۷۳	۷ ستمبر ۱۹۴۷ء	382
۷۴	۸ ستمبر ۱۹۴۷ء	383
۷۵	غنڈوں کا دھاوا	383
۷۶	ایک شریف ہندو انسپکٹر پولیس	384

۷۷	امرتسر اور اس کے دیہات	386
۷۸	مجیٹھ ضلع امرتسر اور فتح گڈھ ضلع گورداسپور کا نواحی علاقہ	390
۷۹	دود کے پتن کا محشرستان	393
۸۰	سکھوں کی عہد شکنی اور سفاکی	396
۸۱	چند عبرت انگیز مناظر	398
۸۲	تحصیل ترنتارن کی سرگزشت	400
۸۳	پکیوان اور اس کے مضافات	405
۸۴	اوجلّہ کی سرگزشت	407
۸۵	پٹھان کوٹ کی سرگزشت	410
۸۶	فیروز پور اس کے مضافات	415
۸۷	تحصیل زیرہ کا بے پناہ قافلہ	420
۸۸	تحصیل زیرہ کے متعلق ایک اور بیان	424
۸۹	جالندھر اور اس کے مضافات	429
۹۰	جالندھر کے مضافات	443
۹۱	پھلور کی سرگزشت	443
۹۲	ہوشیار پور	449
۹۳	کانگڑہ	457
۹۴	لدھیانہ اور اس کے مضافات کی سرگزشت	459
۹۵	قسمت انبالہ کے چند مناظر	461
۹۶	کرنال	467

۹۷	ہانسی ضلع حصار	471
۹۸	گوہانہ ضلع رہتک	472
۹۹	ریاست پٹیالہ	475
۱۰۰	ریاست جیند	485
۱۰۱	نابھہ، الوراور بھرت پور	488
۱۰۲	ریاست جموں وکشمیر	495
۱۰۳	دہلی کی سرگزشت	501
۱۰۴	مہرولی شریف قطب صاحب	515
۱۰۵	ضلع بلندشہر (یوپی)	522
۱۰۶	ڈیرہ دون سے سہارن پور تک	531
۱۰۷	بمبئی	538
۱۰۸	جب امرتسر جل رہا تھا	540
۱۰۹	انسانی لاشیں اور کتے	542
۱۱۰	مسلمان دوشیزہ کی دردبھری سرگزشت	542
۱۱۱	مائی کوشلیا اور استانی سکھونت کور	543
۱۱۲	صبحِ آزادی	544
۱۱۳	دوآنکھیں دوخنجر	540
۱۱۴	مسلمان عورتیں یا تاش کے پتّے	544
۱۱۵	سکھ درندے اور پاگل دوشیزہ	548
۱۱۶	ایک سو برہنہ عورتیں	59

۱۱۷	مغویہ خواتین کا بھیانک مستقبل	552
۱۱۸	ایک رضا کار لڑکی کا دل ہلا دینے والا بیان	555
۱۱۹	تین زندہ مائیں، تین مردہ بچے	555
۱۲۰	مسلمانوں کا اہل ہند کے ساتھ رویہ	560
۱۲۱	اورنگزیب عالمگیر اور ایک ہندو برہمن دوشیزہ	560
۱۲۲	حواشی	572

Banaya\Gujrat\115.jpg not found.

at\305923_10150270618756531_228250241530_8263857_53
not found.

Banaya\Gujrat\111.jpg not found.

Banaya\Gujrat\116.jpg not found.

Banaya\Gujrat\127.jpg not found.

at\320257_10150270619721531_228250241530_8263885_73
not found.

rat\318551_10150270619506531_228250241530_8263878_46
not found.

Banaya\Gujrat\Great migration of 1947 independance of Pakistan (16).jpg not found.

Banaya\Gujrat\images.jpg not found.

Banaya\Gujrat\Mass migration during independence of India 5.jpg not found.

Banaya\Gujrat\Mass migration during independence of India 9.jpg not found.

Banaya\Gujrat\112.jpg not found.

Banaya\Gujrat\113.jpg not found.

تقریظ

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن

پاکستان کیوں اور کیسے وجود میں آیا؟ یہ وہ دو بنیادی سوالات ہیں جن کے صحیح جوابات کی تفہیم سے پاکستان کے قیام کے لئے دی جانے والی بے مثال، لازوال اور بے پناہ جان، مال ،اورعزت وآبرو کی قربانی کا درست تصور سمجھ میں آسکتا ہے۔اوراگر یہی دونوں سوالات تشنہ جواب رہیں تو خود پاکستان کا نظریاتی وجود سراب کے بدلتے رنگوں کی مانند کبھی کچھ اور کبھی کچھ نظر آتا ہے۔نظریہ پاکستان ،جدوجہد آزادی پاکستان اور تحریکِ قیام پاکستان کے لیے متحدہ ہندوستان سے لاکھوں لوگوں کی آزاد پاکستان کی فضاؤں میں سانس لینے کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا کراس خاک وطن کو چومنے کے لئے دیوانہ وار ہجرت کی اہمیت اور حقیقت کو سمجھنے کے لیے سر کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کی آنکھوں کا روشن ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ صرف سر کی آنکھوں کے مشاہدے سے حقیقت سمجھ میں نہیں آیا کرتی بلکہ صرف آنکھوں کے دیکھے کا اعتبار انسان کو عموماً برعکس نتائج سے دوچار کر دیتا ہے۔مثلاً، انسان صحراء کے سراب کو بہتے پانی کی نہر اور رات کے اندھیرے میں رسی کے ٹکڑے کو سانپ سمجھ بیٹھتا ہے، پانی میں ڈوبی ہوئی سیدھی لکڑی کے اندر کا کنارہ اسے ٹیڑھا نظر آتا ہے، دور افق پر زمین وآسمان باہم بغلگیر دکھائی دیتے ہیں اور کروڑوں میل کے فاصلے پر جھلملاتے ستارے (STARS) جو زمین سے لاکھوں گناہ بڑے ہیں، خواتین کے کپڑوں پر ٹانکے جانے والے ستاروں سے بھی چھوٹے نظر آتے ہیں، اسی طرح کا دھوکہ عقل کے اندھوں اور دانش وحکمت کی بصیرت سے محروم افراد کو بھی بار بار پاکستان کے بارے میں ہو جاتا ہے جو تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ پاکستان اب صرف نظریہ نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت بھی ہے جسے بینا و نابینا ہر دو چھو، سونگھ اور دیکھ سکتے ہیں۔اب اس حقیقت میں کسی کو ذرہ برابر شک نہیں ہونا چاہیے کہ پاکستان امت مسلمہ کے لیے رب تعالیٰ کا خصوصی انعام اور نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیسویں صدی عیسوی میں زندہ معجزہ ہے۔ پاکستان

کی تخلیق جن کھٹن ، دشوار اور نامساعد حالات میں ہوئی یہ صرف اسلام کے زندہ دین ہونے کے سبب سے ہے ورنہ بظاہر اس مملکت کے وجود میں آنے کے امکانات کے مقابلے میں اس کے قائم نہ ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ مشیت ایزدی کو شاید اس ملک سے اور اس ملک کے ذریعے کوئی بہت بڑا کام لینا منظور ہے جو اب تک پردہ اخفاء میں ہے۔

سردست ہم یہاں تاریخی طور پر پاکستان کے مخالف ،اور اس کے تاریک مستقبل کے بارے میں فٹ پاتھی نجومیوں کی طرح پیشن گوئیاں کرنے والوں اور اس مملکت خداداد کے بارے میں پہلے دن سے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والوں اور مختلف سروں میں اپنے اپنے راگ الاپنے والوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان دائیں (Right) اور بائیں (Left) کی سیاست کا اکھاڑہ نہیں اور نہ ہی سوشلزم، کمیونزم، لبرل ازم اور سرمادایت کے لئے تجربہ گاہ کے طور پر قائم ہوا ہے۔اور نہ ہی اس کا وجود کسی اتفاقی حادثہ کا مرہون منت ہے کہ متحدہ ہندوستان کے کسی خاص واقعہ نے اس ملک کے معرض وجود میں آنے کے لیے اچانک راہ ہموار کر دی تھی اور نہ ہی ایسا تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین دوستانہ تعلقات، مسلمان اور ہندو بچوں کی روزانہ باہم لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے مکدر ہو گئے تھے۔ چنانچہ مسلمان والدین نے ملکر غور وخوص کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کے آزادانہ کھیل کود کے لیے علیحدہ وطن بنایا جائے تاکہ مسلمان بچے ہندو بچوں سے علیحدہ اپنی مرضی کے مطابق کھل کر کھیل سکیں۔

اور نہ ہی ایسا تھا کہ ہندو خواتین کے مقابلے میں مسلمان خواتین اپنی تراش وخراش، لباس وپوشاک اور میک اپ کے حوالے سے احساس کمتری کا شکار ہو گئیں تھیں اور گھر آ کر اپنے خاوندوں کے سامنے اپنے احساس کمتری کی وجہ سے رو دیا کرتی تھیں چنانچہ مسلمان خاوندوں نے ملکر فیصلہ کیا کہ اپنی خواتین کو ہندو خواتین کے مقابلے میں احساس کمتری سے نجات دلانے کے لیے ایک علیحدہ ریاست کا حصول ضروری ہے جہاں انکی خواتین بغیر کسی احساس کمتری کے آزادانہ طور پر زیادہ سے زیادہ تراش خراش اور میک اپ کر سکیں تاکہ مسلمان شوہروں کی عائلی اور نجی زندگی میں

اضطراب ختم ہوکر سکون پیدا ہو سکے۔

اور نہ ہی ایسا تھا کہ ہندو بوڑھے، مسلمان بزرگوں کے صاف ستھرے کپڑوں پر بلا وجہ محض تعصب اور نفرت کی وجہ سے روزانہ پان کے پچکاریاں مار کر ان کے کپڑوں کو گندا کر دیا کرتے تھے جس سے تنگ آ کر مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے بزرگوں کو روز روز کی اس ہندوانہ شرارت اور خباثت سے بچانے کے لیے ایک علیحدہ وطن حاصل کیا جائے تا کہ وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر پرسکون زندگی گزار سکیں۔

اور نہ ہی ایسا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ناچنے یا ڈانس کرنے کی اجازت نہیں تھی، یا مسلمان مراثیوں کی توہین کی جاتی تھی، یا

مسلمان گویوں اور بھانڈوں کو رسوا کیا جاتا تھا، یا

مسلمان فنکاروں، موسیقاروں، اداکاروں کی گستاخیاں شروع ہوگئیں تھیں، یا

مسلمانوں کے سودی کاروبار اور سودی لین دین پر پابندی عائد کر دی گئی تھی، یا

مسلمانوں کے شراب پینے پر برطانوی راج اور ہندو سرکار نے جرمانہ عائد کر دیا تھا، یا

مسلمانوں کو ڈرامے اور فلمیں بنانے کی اجازت واپس لے لی گئی تھی، یا

مسلمان چوروں اور جیب کتروں کو ہندو پولیس نے گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا، یا

مسلمان ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے ہندوستانی پولیس نے رشوت اور بھتہ لینا شروع کر دیا تھا، یا

مسلمان خواتین کی بے پردگی کو سرکاری سطح پر ممنوع قرار دے دیا گیا تھا چنانچہ مسلمانوں نے ان ''تعصّبات'' سے تنگ آ کر ہندوؤں سے ان کے ''امتیازی'' سلوک کے باعث احتجاجاً پاکستان کے قیام کا فیصلہ کیا تا کہ تمام مسلمان مراثیوں، گویوں، بھانڈو، فنکاراؤں، موسیقاروں، اداکاروں، قاتلوں، بدمعاشوں، لچوں لفنگوں، چوروں، ڈاکوؤں اور بے پردہ، اور بے حیاء خواتیں کی عظمت واحترام کو بحال کر کے انہیں پاکستان کا ''معزز شہری'' بنایا جا سکے۔

اور نہ ہی ایسا تھا کہ پاکستان کے بنانے والے، خدانا خواستہ دیوانے تھے کہ پاکستان کو

ویسے ہی تفریح اور دل لگی میں بنا ڈالا، کیونکہ ان کے پاس کرنے کا کوئی کام نہ تھا، لہذا انہوں نے سوچا کہ چلو زمین پر ہاتھ کی انگلی اور لکڑی سے تو سارا دن نقشے بناتے رہتے ہیں، حقیقت میں بھی ایک ریاست قائم کرنے کی کوشش کر لیتے ہیں ہوسکتا ہے دنیا کے اتنے بڑے نقشے میں جہاں بہت سارے چھوٹے چھوٹے نقشے موجود ہیں، وہیں ایک اور نقشے کا بھی اضافہ ہو جائے گا، جہاں ہم کھلے انداز سے دن رات تفریح کیا کریں گے! ہرگز و ہرگز، حاشا وکلّا ایسا نہ تھا۔ بانیان پاکستان، مفکرین وقائدین تحریک پاکستان نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ انیسویں اور بیسویں صدی کی جملہ ہم عصر دنیا کے وہ اعلیٰ ترین اذہان اور روشن فکر دماغ تھے جن کے قلوب اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر ایمان سے منور، جن کے باطن عشق مصطفیٰ ﷺ سے لبریز جن کا دماغ اسلام کے ایک زندہ، متحرک اور جامع نظام زندگی تصور سے مالا مال اور جن کے پاس جدید علوم اور مغربی قانون اور فکر وفلسفہ کا گہرا علم تھا جن کا سامنا کرنے سے ہندو رہنما تو کیا خود انگریز حاکمین بھی کتراتے تھے۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ یہ مسلمان رہنما اپنے فکر ونظر، علم وعمل، سیرت وکردار، اخلاص اور پارسائی، تدبیر اور تنظیم، سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی، دوراندیشی اور اصول پرستی میں اپنی مثال آپ تھے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ، قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ سردار، عبدالرب نشتر، سر لیاقت علی خان وغیرہم پاکستان کے لیے ہر محاذ پر دی گئی قربانیوں کے قافلہ کے سرخیل ہیں، لیکن اپنی ذات اور ہمہ جہتی استعداد، زبان وبیان، حکمت وبصیرت کی وجہ سے جیسے وہ آج بڑے انسان نظر آتے ہیں بلا شک وشبہ وہ اپنے دور کے بھی بڑے انسان تھے اس لیے کہ اس دور کے بڑوں نے انکی بڑائی کو تسلیم کر کے ان کے سامنے قولاً، فعلاً اور عملاً اپنے چھوٹے ہونے کا اعتراف کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے لوگوں کی باتیں، کام، منصوبے اور مقاصد بھی بڑے ہوتے ہیں۔

اسی لیے پاکستان کے قیام کے ایسے سوقیانہ، عامیانہ اور سطحی مقاصد نہ تھے جسکی برصغیر وپاک ہند کی امت مسلمہ کے لیے صرف وقتی اور عارضی ضرورت تھی لیکن اب 65 سال گزرنے کے بعد وہ اسباب وہ علل مفقود ہو گئے ہیں تو دوبارہ کسی متحدہ ہندوستان کی راگنی الاپنی شروع کر دی

جائے اور نہ ہی پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ مشرقی و مغربی جرمنی کی جغرافیائی تقسیم اور پھر دوبارہ انکی جغرافیائی وحدت کی طرح کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کے درمیان تقسیم دیوار برلن کی طرح کسی دیوار کی وجہ سے نہیں جس کو ہتھوڑے مار کر اور بلڈوزروں سے گرا کر دو جرمنستانوں کو ملا کر ایک، متحدہ جرمنی کی طرح دوبارہ ایک ملک کی شکل میں ڈھال دیا جائے اور نہ ہی اس تقسیم کی وجہ دونوں ممالک کے درمیان بچھی ہوئی خاردار تاروں کی وجہ سے ہے جس کو بوقت ضرورت سمیٹ کر کسی بڑے کاٹھ کباڑ کے اسٹور میں ڈال کر دونوں ملکوں کے حدود فاصلہ کو ختم کر کے پھر سے انہیں یکجا کر دیا جائے ایسا بالکل نہیں ہے کہ دونوں ممالک ہندوستان اور پاکستان کے مابین فرق اور وجہ امتیاز واختلاف کچھ اور شے یا سبب ہو، بلکہ یہ فرق اسلام اور کفر کا ہے۔ پاکستان کی پہچان اسلام ہے۔ بالفاظ دیگر پاکستان کا دوسرا نام اسلام اور اسلام کا دوسرا نام پاکستان ہے۔ اسی جہ سے ہم پاکستان سے محبت اور وفاداری کو اسلام سے محبت اور وفاداری سمجھتے ہیں اور پاکستان سے نفرت اور غداری کو اسلام سے نفرت اور غداری گردانتے ہیں۔ اور جس طرح اسلام غالب ہونے کے لیے آیا ہے مغلوب ہونے کے لیے نہیں اسی طرح پاکستان غالب ہونے کے لیے بنا ہے مغلوب ہونے کے لیے نہیں اگر چہ پاکستان اپنی پیدائش کے دن سے آج تک دشمنان دین وملت کے ہاتھوں کئی بار مجروح ہو کر صدمات سے دوچار ہو چکا ہے لیکن خود اسلام اپنے آغاز سے لیکر تا امروز اپنوں اور اغیار کے ہاتھوں کئی بار مبتلائے مصیبت ہوا۔ بظاہر اس دین خداوندی کی شمع کی لو بجھتی نظر آنے لگی لیکن **واللہ متم نورہ وکرہ الکافرون** کے مصداق یہ دین اور وطن بھی سلامت اور باقی رہنے کے لیے ہیں اسی لیے ہر مصیبت اور امتحان سے اسلام بھی اور پاکستان بھی سرخرو ہو کر نکلا اور آئندہ بھی کسی آزمائش میں کامیاب وکامران رہیں گے۔ (ان شاءاللہ)

ہمارے قائدین علامہ اقبال اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے لیے پاکستان ان کے دین وایمان اور عقیدہ و مذہب کا معاملہ تھا یہ دین و مذہب بمعنی اسلام کبھی ناکام نہیں ہو سکتے اسی طرح

پاکستان بھی بحیثیت وطن اور اسلامی ریاست کے ناکام نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ اس مملکت کو اسلام کے لیے تجربہ گاہ بنا کر پاکستان کی ریاست کو توسیع دے کر پوری دنیا کو پاکستا بنانا چاہتے تھے۔ وہ پاکستان کی تقلیل، تصغیر اور اس کی تقسیم کے ہرگز قائل نہ تھے بلکہ وہ اس مملکت کی توسیع (Expansion) کر کے دنیا بھر کے، ہندوستان، کفرستان، نصارستان، یہودستان اور منافستانوں کو اسلامستان بنا کر پاکستان کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ پاکستان کا ابتدائی نقشہ اگر چہ مشرقی و مغربی پاکستان پر مشتمل تھا لیکن اسکا حتمی اور مکمل نقشہ پورے کرہ ارضی (GLOBE) پر محیط ہے۔ موجودہ ہندوستان سمیت تمام کفرستان آج نہیں تو کل پاکستان اور اسلام کے جھنڈے تلے آجائے گا۔ اس کا سبب کوئی جذباتی نعرہ (Emotional Slogan) یا دیوانوں کی بڑ نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا وعدہ ہے (جو بلاشک وشبہ سچا اور پورا ہونے والا ہے) کہ اللہ تعالیٰ زمین کی خلافت اہل ایمان کے سپرد کر دے گا۔ ہمیں یہ خطہ ارضی اسی لیے دیا گیا ہے کہ اسلام کو شرح صدر سے نافذ کر کے ایک عالمی مسلمان امت کے تصور کے نظریاتی اور اعتقادی بنیاد کو عملی اور تجرباتی صورت میں تبدیل کر دیں۔ اس ملک میں اسلام کے علاوہ ہر باطل نظریہ، ازم، مذہب، فکر، فلسفہ کی کلیتاً نفی کر دی جائے۔ مسلمان اور مسلمانیت کے تصور کو اجاگر کر کے عالمی امت مسلمہ کے نظریہ کو فروغ دیا جائے اور اس ضمن میں ہر قسم کے لسانی، طبقاتی، ملکی اور صوبائی تقسیم کے عنوانات کو آئینی اور سرکاری سطح پر رد کر دیا جائے۔

پاکستان میں ہم اگر صرف نظریہ اسلامی اور اسلامی وحدت کو سرکاری و نجی سطح پر فروغ دینے کی کوشش کریں تو پاکستان میں دو، تین، چار، پانچ اور دس نظریات کے پنپنے کے گنجائش خود بخود ختم ہو جائے گی کیونکہ اگر بڑے درخت کو بڑھنے کے لیے سازگار ماحول فراہم کر دیا جائے تو چھوٹے پودے اور جھاڑ جھنکار آہستہ آہستہ خود بخود دفنانے کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ نظریہ پاکستان نے آج نہیں تو کل Global State کی شکل اختیار کرنی ہے لہذا یہاں پر تعصب کی بنیاد پر اٹھنے والے جملہ نظریات کو جرم قرار دے دیا جائے اور کوئی بھی عام شخص، سیاسی قائد یا مذہبی لیڈر جو اس ارضِ پاک کے خلاف منفی پروپیگنڈا میں ملوث ہو اسکی صورت خواہ تحریری کی ہو یا

تقریر، زبانی انٹرویو ہو یا خطاب کی، اسے جڑ سے اکھاڑنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے خلاف لکھنے اور بولنے والے پاگل اور خبطی دانشوروں، صحافیوں، سیاستدانوں، اینکر پرسنز اور دوسرے ذہنی طور پر پراگندہ اور ژولیدہ فکر افراد میں سے ہم سو (100) دوسو (200) افراد کی قربانی دینے پر راضی ہوجائیں تو یقین جانیئے تحریک پاکستان کے شہداء کی روحیں اپنی تربت میں ہم سے راضی ہوجائیں گی۔ اس عمل سے جہاں ایک طرف پاکستان ان سانپ کی آستینوں سے نجات حاصل کر لے گا دوسری طرف ان کوڑھ مغز دانشوروں کو بھی ان سوالوں کا جواب مل جائے گا کہ تحریک پاکستان کا مطلب کیا ہے کیونکہ تحریک پاکستان کے عام کارکنان بھی جو پیشے کے لحاظ سے کسان، ڈرائیور، مزدور، دوکاندار، تاجر، نائی، موچی، طلباء عام مسلمان مرد خواتین اور بزرگوں پر مشتمل تھے بغیر کسی دانش اور ظاہری تعلیم کے بھی جانتے تھے کہ پاکستان کا مطلب **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ہے۔ کیونکہ انہیں بھی معلوم تھا کہ پاکستان اسلام اور مسلمانوں کے لیے حاصل کیا جارہا ہے۔ اور اس ملک کا تصور خاکہ، نظریہ اور نقشہ، چرچل، ہٹلر، نہرو، گاندھی، لینن، اور شاعرِ مغرب شیکسپئر کا پیش کردہ نہیں ہے بلکہ شاعر مشرق، مفکر اسلام، دانائے راز اور عاشق رسول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کا پیش کردہ تصور ہے۔ جس کی مقصدیت، افادیت، حقیقیت، اہمیت، ضرورت اور مضمرات پر انہوں نے برسوں غور کیا، شکوک وشبہات کو مسکت دلائل سے رفع کیا، ہر قسم کے اعتراضات کے کافی وشافی جوابات دیئے، بانیان پاکستان کو اسلامی نظریہ اسکی افادیت وعملیت پر اتنا ہی یقین تھا جتنا صبح ہونے پر سورج کے نکلنے کا یقین ہوتا ہے۔ اس یقین محکم کا سبب یہ تھا کہ وہ پاکستان کو دارالاسلام سمجھتے تھے اور اسے دارالہجرت قرار دے کر ریاست مدینہ کا عکس آرزو جانتے تھے۔ اسی دارالاسلام ودارالایمان کے سایہ عاطفت اور گوشہ عافیت میں پناہ لینے کے لیے مسلمانان برصغیر نے تاریخ انسانی کی سب سے بڑی اور تباہ کن ہجرت کی جس میں ایک طرف اہل حق کے بے سروسامان، غیر مسلح، غیر محفوظ اور لٹے پٹے قافلے تھے جو بھوک سے نڈھال، پیاس سے جاں بلب، بیماریوں کے زد سے موت کے منہ میں، سفر کی تھکان سے چور چور، طویل اور پر پیچ رستوں کی بازیافت سے بدحال، گردوغبار کے طوفان اور موسم کی شدت وحِدّت

سے بے جان لاشوں کی مانند زندہ درگور نظر آتے تھے۔ اور دوسری طرف سکھ اور ہندو غنڈوں، قاتلوں، دہشت گردوں نے پے در پے سنگدلانہ، سفاکانہ، وحشیانہ، اور بزدلانہ حملوں کے تسلسل سے معصوم شیر خوار بچوں، باعصمت وعفت ماؤں، بیٹیوں، بہنوں، بزرگوں، ضعیفوں اور مریضوں کو لاکھوں کی تعداد میں بربریت اور تشدد سے شہید کیا، اور جن کو شہید نہ کرسکے ان کے ہاتھ، ناک، کان، زبان، بازو، ٹانگیں، آنکھیں، چہرے کاٹ ڈالے اور زندہ انسانوں کا مثلہ (Multilation) کیا گیا پوری انسانی تاریخ سفاکیت اور بہمیت (Brutality) کی اس طرح کے واقعات کا عشرِ عشیر بھی پیش نہیں کرسکتی۔ تاریخ کے اس قیامت صغریٰ میں زندگی اور موت کے مابین پل صراط پر یہ اللہ کے سپاہی بندے اور بندیاں کن کرب وآلام اور مصائب ودشدائد کی بٹھیوں سے گزرے ہیں۔ آئندہ صفحات وہ داستان غم ہیں جن میں ہر صفحہ وہر سطر شام غریباں کا منظر پیش کرتا ہے۔

نوجوان محقق ومفکر، حضرت علامہ مفتی عمیر محمود صدیقی صاحب کی محبت پاکستان کی شمع کو فروزاں رکھنے کی یہ دوسری سعی مشکور ہے۔ پوری کتاب مسلمان مظلومین، مجروحین، شہداء اور مقہورین پر ٹوٹنے والے ظلم وتعذیب کی طویل ترین تاریخ کا ایک چھوٹا سا باب ہے۔ جو ہمارے نوجوانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی تاریخ کو مت بھولیں ورنہ تاریخ اپنے آپ کو دھرایا کرتی ہے۔ اور جب آپ تاریخ کے واقعات سے سبق نہ سیکھیں تو تاریخ آپ کو بھی ایک واقعہ بنا کر رکھ دیتی ہے تاکہ لوگ آپ کے واقعہ اور حادثہ سے سبق حاصل کرسکیں۔ یہ ہمارے گمنام شہداء کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان شہداء کی شہادتوں کے روح فرسا اور لرزادینے والے واقعات کو تاریخ کے قبرستان سے برآمد کر کے اپنی عقیدت ونسبت کے پھول ان پر نچھاور کریں۔ مہاجرین تحریک پاکستان کے سچے واقعات پر مشتمل یہ کتاب، ان شہداء کو ہمیشہ یاد رکھنے کا گلدستہ ہے جس سے گلشن پاکستان سدا مہکتا رہے گا۔

ڈاکٹر حبیب الرحمن نقشبندی
Email: habibaims@hotmail.com

ہم نے پاکستان کیسے بنایا؟

عمیر محمود صدیقی نقشبندی

میں درد وغم کا قصہ پورا نہ کہہ سکوں گا
اندازہ آپ کرلیں سن کر کہیں کہیں سے

ہندوستان زمین کا وہ حصہ ہے جہاں ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے قدم رکھا۔(۱) احادیث شریفہ میں کیونکہ ہندوستان کی فتح کا ذکر ہے اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور سے ہی غزوۂ ہند کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ سب سے پہلے جس مسلمان مجاہد کی قیادت میں اہل ایمان غزوۂ ہند کی بشارت میں داخل ہوئے وہ حضرت حارث بن مرہ فہری ہیں۔ حضرت امام ابن نحاس فرماتے ہیں:

و فی سنة سبع و ثلاثین غزا الحارث بن مرة الفهری ارض الهند الی ان جاوز مکران و بلاد قندابیل(۲)

''اور سن ۳۷ ہجری میں حارث بن مرہ فہری نے ہند کی زمین پر حملہ کیا اور مکران اور قندابیل کے علاقوں سے آگے بڑھ گئے۔''

حضرت حارث بن مرہ فہری کے بعد حضرت مہلب بن ابی صفرہ ہند پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں ہے:

''۴۴ھ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد بن ابیہ کو بصرہ، خراسان اور سیستان کا حاکم مقرر کیا اور اسی سال زیاد کے حکم سے عبد الرحمٰن بن ربیعہ نے کابل کو فتح کیا اور اہل کابل کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔ کابل کی فتح کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک نامور عرب امیر مہلب بن ابی صفرہ مرو کے راستے سے کابل و زابل آئے اور ہندوستان پہنچ کر انہوں نے جہاد کیا۔(۳) اسی طرح حجاج بن یوسف نے ۸۶ھ میں محمد ہارون کو

ایک زبردست لشکر دے کر مکران کی طرف روانہ کیا جس کے نتیجے میں مکران فتح ہوا اور اسی زمانے سے سندھ میں بھی اسلام کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی۔ عباسی خلیفہ ولید بن عبد الملک کے دور میں جب راجہ داہر بن ضعیفہ نے مسلمانوں کا لوٹا ہوا مال اور مسلمان قیدی عورتوں کو واپس کرنے سے انکار کردیا تو حجاج نے خلیفہ کی اجازت سے اہل ہند سے جہاد کرنے کی اجازت لی اور پدمن نامی ایک شخص کو بھیجا۔ انہوں نے اہل دیبل سے جنگ کی اور اس میں جام شہادت نوش کیا۔ پدمن کی شہادت کے بعد حجاج نے اپنے چچازاد بھائی اور داماد عماد الدین محمد بن قاسم کو جس کی عمر صرف سترہ سال تھی ۹۳ھ میں سندھ کی طرف روانہ کیا، جس میں اللہ رب العزت نے اس کم سن مجاہد کو فتح عطا فرمائی اور راجہ داہر اس جنگ میں مارا گیا۔(۴)

حضرت سلطان محمود غزنوی علیہ الرحمۃ (۳۵۷ھ۔۴۲۱ھ) کا عالم یہ تھا کہ اپنے اوپر غزوہ ہند کو فرض کیا ہوا تھا۔ امام ذہبی فرماتے ہیں:

و فرض علی نفسه کل عام غزو الهند ،فا فتتح منها بلادا واسعة،و کسر الصنم المعروف بسومنات،و کانوا یعتقدون انه یحی و یمیت،و یقصدونه من البلاد،و افتتن به امم لا یحصیهم الا الله،و لم یبق ملک و لا محتشم الا و قد قرب له قربانا من نفیس ماله(۵)

''اور سلطان نے اپنے اوپر ہر سال غزوہ ہند کو فرض کیا ہوا تھا۔ پس انہوں نے ہند کا ایک وسیع حصہ فتح کرلیا اور معروف بت کو توڑا جس کا نام سومنات تھا۔ اور وہ (اہل ہند) یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ زندگی دیتا ہے اور

موت دیتا ہے۔ وہ اس کی طرف مختلف شہروں سے زیارت کے لیے آتے تھے۔ اس کی وجہ سے بہت سی اقوام آزمائش کا شکار ہوئیں جن کی تعداد اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور کوئی بادشاہ اور محتشم شخص ایسا باقی نہ بچا تھا جو اپنے نفیس مال میں سے اس پر قربانی نہ دیتا ہو۔''

سومنات کی فتح کے سال سلطان محمود غزنوی حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ نے سلطان کو اپنا خرقہ عطا فرمایا۔ شیخ صاحب سے رخصت ہو کر سلطان محمود غزنوی واپس آیا اور اس نے ان کے عطا کردہ خرقہ کو بڑی حفاظت سے اپنے پاس رکھا۔ جس زمانے میں محمود نے سومنات پر حملہ کیا تھا اور پرم اور دشیلم سے اس کی جنگ ہوئی تھی تو محمود کو یہ خطرہ لاحق ہوا تھا کہ کہیں مسلمانوں کے لشکر پر ہندوؤں کا لشکر غالب نہ آجائے۔ اس وقت پریشانی کے عالم میں سلطان محمود شیخ صاحب کے خرقہ کو ہاتھ میں لے کر سجدہ میں گر گیا اور خداوند تعالیٰ سے دعا کی ''اے اللہ! اس خرقے کے مالک کے طفیل میں مجھے ان ہندوؤں کے مقابلے میں فتح دے۔ میں نیت کرتا ہوں کہ جو مال غنیمت یہاں سے حاصل کروں گا اسے یتیموں اور محتاجوں میں تقسیم کر دوں گا۔'' مؤرخین کا بیان ہے کہ اس دعا کے مانگتے ہی آسمان کے ایک حصے سے سیاہ بادل اٹھے اور سارے آسمان پر محیط ہو گئے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کڑک سے ہندوؤں کا لشکر ہراساں ہو گیا اور ہندو اس پریشانی کے عالم میں آپس میں ہی ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ہندوؤں کی اس باہمی جنگ کی وجہ سے پریم دیو کی فوج میدان جنگ سے بھاگ نکلی اور یوں مسلمانوں نے ہندوؤں پر فتح پائی۔(۶)(۷)

محمود غزنوی کے بعد شہاب الدین غوری نے اسلام کے جھنڈے کو ہندوستان میں بلند فرمایا۔ اسی زمانے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ اور دیگر صوفیاء کرام نے ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر فرماتے ہوئے لاکھوں مشرکوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا کار عظیم سرانجام دیا۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو سال حکومت کی جس کا اختتام مغلیہ

سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے قبضے کی صورت میں ہوا۔ اللہ رب العزت کا قوموں کے عروج و زوال کا قانون کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل کو اللہ رب العزت نے تین آسمانی کتابیں توریت، انجیل اور زبور عطا فرمائیں۔ گیارہ انبیاء کرام کے علاوہ تمام انبیاء بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم اور حکمت کے ساتھ حکومت بھی عطا فرمائی لیکن جب انہوں نے حد سے تجاوز کیا، اللہ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اللہ رب العالمین نے ان پر ذلت، رسوائی محتاجی اور مسکنت کو مسلط فرما دیا۔

ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت کا زوال یکدم نہیں ہوا۔ صلیبی جنگوں، یورش تاتار، سقوطِ بغداد اور اسپین کے تاخت و تاراج ہونے سے انہوں نے سبق نہ سیکھا نتیجتاً ترک جہاد اور شراب و شباب میں غفلت کی زندگی نے انہیں فطرت کے قانون کے تحت اسی تباہی و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا جس کا ہر وہ گروہ حقدار ہوتا ہے جو خلاف فطرت زندگی گزارنے کا عادی ہو جائے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رنگیلا بادشاہ کے باورچی خانے کا ماہانہ خرچ تین کروڑ تھا اور ہر روز تین سو برہنہ عورتیں اپنے سامنے نچوایا کرتا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کے انتقال کے بعد سلطنت اسلامیہ میں ایسا ضعف پیدا ہوا کہ پھر اسے استحکام نصیب نہیں ہوا۔ جب مرکز کمزور ہو جائے تو بغاوتیں سر اٹھانے لگتی ہیں اور اگر بروقت اس کمزوری کا تدارک نہ کیا جائے تو پھر تمام علاقوں کو مرکز کے ساتھ جوڑے رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب سلطنت ہند کا مرکزی وجود کمزور پڑ گیا تو مرہٹوں، روہیلوں، سکھوں اور دیگر غاصبوں نے حملے شروع کر دیئے۔ پندرہویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں پرتگیزی پہلے ہی وارد ہو چکے تھے۔ ان کے بعد فرانس اور برطانیہ سے بھی لوگوں نے آنا شروع کیا لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی صدیوں پر محیط عظیم الشان سلطنت برطانوی قوم کے ہاتھوں زوال پذیر ہوئی۔

جہانگیر کے دور میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے تجارت کی غرض سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان کی آمد کا قصہ یوں ہے کہ انگلستان میں جیمس اول نے سر ٹامس رو کو ۱۶۱۵ء میں اپنا

سفیر بنا کر بھیجا۔اس کے ساتھ ایک مسیحی پادری بھی وارد ہوا تھا۔سرٹامس رو نے اپنی زبان دانی، جاذب توجہ شخصیت اور کثیر جہتی صلاحیتوں سے جہانگیر کے ہاں مقام حاصل کرلیا۔(۸)ایک مرتبہ شاہی محل کی ایک عورت بیمار پڑ گئی۔بادشاہ نے ہر قسم کا علاج کروایا مگر وہ عورت تندرست نہ ہوسکی۔ بادشاہ اس کی صحت کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور اس کی گری ہوئی صحت وحسن نے بادشاہ کو بھی پریشان کر دیا تھا۔سرٹامس رو نے اپنے ذاتی معالج سے اس عورت کا علاج کروایا جس سے وہ بالکل صحتیاب ہوگئی۔بادشاہ نے سرٹامس رو کو بلوایا اور انعام واکرام سے نوازنا چاہا مگر اس نے سونے اور چاندی کے بجائے بادشاہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا جس کے لیے اسے بھیجا گیا تھا۔اس نے بادشاہ سے عرض کی:

''آپ کی عنایات اس سے قبل بھی بہت ہیں ایک اور عنایت کا محتاج ہوں۔اگر وہ پوری ہو جائے تو صرف مجھے ہی نہیں بلکہ میری پوری قوم کو مستفید ہونے کا موقع میسر آئے گا۔''اس طرح اسے انعام واکرام کی بجائے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کا پروانۂ تجارت حاصل ہوگیا۔''(۹)

اس کا اثر یہ ہوا کہ دو سال کے اندر ہی مغلیہ سلطنت میں انگریزوں کی پانچ کوٹھیاں آگرہ، احمد آباد، برہان پور، بہروج اور سورت میں قائم ہوگئیں سرٹامس رو نے جہانگیر سے فرمان حاصل کر لیے جن کی رو سے پرتگیزوں سے اور ہالینڈ کی کمپنی سے انگریز کمپنی کو زیادہ سہولیتیں مہیا ہو گئیں۔(۱۰)

اس کمپنی کی بدولت انگریزوں نے بعد میں تقریبا دوسو سال کے اندر ہندوستان پر برطانوی حکومت کو قائم کر دیا۔ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے آخری چٹان ٹیپو سلطان تھا جس نے اپنی تلوار سے جوانمردی کے جوہر دکھاتے ہوئے انگریزوں کا مقابلہ کیا مگر بالاخر غداروں کی ابلہ فریبی اور خیانت کی وجہ سے سرنگا پٹم پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور سلطان شہید ہوگیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تلوار کا جواب تلوار سے ہی ہوتا ہے۔جس قوم کی تلوار گم ہو جائے وہ باتوں اور

خیالوں سے غاصب کا مقابلہ اور اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ٹیپو سلطان ہندوستان میں امت مسلمہ کی آخری تلوار تھا جس کی شہادت سے یہ طے ہوگیا تھا کہ ہندوستان میں اسلام کا دفاع کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔

ہندوستان میں انگریزوں کے قبضے کے ساتھ ہی نظریاتی محاذ پر بھی مسلمانوں کو زیر کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئیں۔اس نظریاتی تخریب کاری کے لیے مسلمانوں کو ہی آلہ تخریب بنایا گیا۔احادیث کا انکار کیا جانے لگا تا کہ قرآن حکیم کا تعلق صاحب قرآن ﷺ سے توڑ کر اس کی من مانی تشریح خاص مقاصد کے تحت کی جا سکے۔مسلمانوں کو انگریزوں کی حکومت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی غلامی کے آداب سیکھنے کی ترغیب دی جانے لگی۔لاتعداد مسیحی مبلغین نے ہندوستان کا رخ کیا جنہوں نے ارتداد کی تحریک کو گرم کیے رکھا تا کہ مسلمانوں کو مرتد بنا کر مسلمانوں کے ہی خلاف استعمال کیا جا سکے جس کی بڑی مثال پادری برکت اللہ کی کتب کی صورت میں موجود ہے۔قرآن اور نبی کریم ﷺ کی شان میں توہین کی جانے لگی۔منکرین جہاد کے ایک گروہ کی تربیت کی گئی تا کہ مسلمانوں میں سے روح جہاد کو ختم کر دیا جائے اور مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انگریزوں کی غلامی کو قبول کر لیں نیز ان میں کبھی اپنے مفقود کمال کو پانے کی حرص پیدا نہ ہو۔جھوٹے نبی اور جعلی امام مہدی کے ذریعے اسلام کے اندر ایک نیا نظام رائج کرنے کی کوشش کی گئی تا کہ اسلام کی شکل کو مکمل طور پر مسخ ہو کر رہ جائے۔مسلمانوں کے اپنے اندر طرح طرح کی فروعی ابحاث کو فروغ دیا گیا تا کہ مسلمان باہم دست وگریبان رہیں اور کبھی دشمن کے خلاف متحد ہو کر مقابلہ نہ کر سکیں۔اللہ کے فضل و احسان سے اس نظریاتی محاذ پر علماء، صوفیاء اور مسلمان دانشوروں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر کیونکہ مسلمان سیاسی غلامی کی زنجیریں پہنے ہوئے تھے اسی لیے ان کا جہاد بالقلم اور جہاد باللسان انہیں ذلت اور رسوائی کے عمیق گڑھوں سے نہ بچا سکا۔

۲۳ مارچ ۱۹۲۴ء بمطابق ۲۳ رجب ۱۳۴۲ھ میں مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت عثمانیہ بھی اپنے اختتام کو پہنچی جس کے نتیجے میں مسلمان مجموعی طور پر انتہائی پستی کا شکار ہو گئے۔

۳ مارچ کی صبح یہ اعلان کیا گیا:

''عظیم قومی اسمبلی نے خلافت کے خاتمہ اور دین اور سیاست سے علیحدگی کے قانون کی منظوری دے دی ہے۔''(۱۱)

جنگ عظیم دوم کے بعد برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے کا ارادہ کیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے خیال کے مطابق دانشوروں کی ایک ایسی نسل تیار کر چکے تھے کہ جس پر انگریزی تہذیب کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور وہ نام کے مسلمان تھے جبکہ ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام۔

ہندوستان میں صدیوں سے مسلمان اور ہندو آباد تھے۔جب انگریزوں نے جمہوریت کی بنیاد پر ہندوستان کا فیصلہ کرنا چاہا تو مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں کانگریس کی خیانت سے آگاہ ہونے کے بعد متحدہ ہندوستان کے بجائے ایک علیحدہ ریاست کی تحریک کا مطالبہ کیا کیونکہ اگر ہندوستان کا فیصلہ مغربی طرز جمہوریت کی بنیاد پر کیا جاتا تو مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اقلیت بن کر ہندوؤں کی غلامی میں چلے جاتے۔ہندو اپنی تمام تر عیاری کے ساتھ انگریزوں کی حاشیہ برداری کے ذریعے پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔یہی وجہ ہے کہ آج تک ہندوؤں نے تقسیم ہند اور پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جبکہ ان کے رہنما عظیم ترین ہندوستان بنانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس میں مسلمانوں کے مقدس مقامات بھی شامل ہیں۔وہ مسلمان جو آج بھی متحدہ ہندوستان کے حامی ہیں اور وجود پاکستان کے مخالف ہیں انہیں کم از کم اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ وہ اپنے اس طرز فکر سے مشرکین کے گروہ کی تائید کر رہے ہیں جو قرآن حکیم کے مطابق مسلمانوں کے سب سے شدید ترین دشمن ہیں۔اللہ رب العزت نے فرمایا:

لتجدن اشد الناس عداوة للذين امنوا اليهود و الذين اشركوا(۱۲)

''آپ یقیناً ایمان والوں کے حق میں بلحاظ عداوت سب لوگوں سے زیادہ

سخت یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے۔''

البیرونی اور ہندو

ہندو جو ۳۵ کروڑ دیوتاؤں پر ایمان رکھتے ہیں جن میں ۴۰ ہزار ذاتیں ہیں اور ہر ایک کا اپنا اپنا بھگوان ہے وہ اپنے دین، زبان، رہن سہن، عادات واطوار اور طرز معاشرت میں مسلمانوں سے کلی طور پر مغایر ہیں۔مسلمانوں کے عظیم ریاضی دان، ماہر فلکیات، جغرافیہ دان، مؤرخ، معدنیات، طبقات الارض، خواص الادویہ کے ماہر اور آثار قدیمہ کے عالم جلیل ابوریحان البیرونی ۹۷۳ء میں خوارزم میں پیدا ہوئے۔سلطان محمود غزنوی کی فتح خوارزم کے بعد آپ سلطان کے ساتھ غزنی تشریف لے آئے۔غزنی سے آپ نے ہندوستان کا سفر کیا اور دس برس کا طویل عرصہ یہاں کی زبان سیکھ کر ہندو مذہب وتمدن اور طرز معاشرت کا مطالعہ کیا۔آپ نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ''**ماللھند**'' کے نام سے جمع فرمایا ہے۔اس کتاب کے باب اول میں آپ نے ہندوؤں کی مسلمانوں سے بے تعلقی کے کئی ایک اسباب بیان فرمائے ہیں۔ان اسباب کا مطالعہ بالخصوص ان لوگوں کے لیے انتہائی ضروری ہے جو ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں یا ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں:

پہلا سبب زبان کا اختلاف:

منجملہ ان کے ایک سبب یہ ہے کہ ہندو قوم ہم لوگوں سے ان تمام چیزوں میں جو قوموں کے درمیان مشترک ہوتی ہیں، مغایر ہیں اور مغایرت کے اسباب میں سب سے پہلی چیز زبان ہے۔گو زبان کی مغایرت میں دوسری قومیں بھی اسی طرح باہم مغایر ہیں۔کوئی شخص جو مغایرت رفع کرنے کے کے لیے یہ زبان حاصل کرنا چاہے، آسانی سے نہیں کرسکتا۔

دوسرا سبب دین کا اختلاف:

بے تعلقی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندو دین میں ہم سے کلی مغایرت رکھتے

ہیں۔نہ ہم کسی ایسی چیز کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے یہاں مانی جاتی ہے اور نہ وہ ہمارے یہاں کی کسی چیز کو تسلیم کرتے ہیں۔اگر چہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع کم کرتے ہیں اور بحث ومناظرہ کے سوا جان، بدن اور مال کو نقصان نہیں پہنچاتے ،لیکن غیروں کے ساتھ ان کی یہ روش نہیں ہے۔غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا،شادی بیاہ کرنا،ان کے قریب جانا یا ساتھ بیٹھنا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے۔اور جس چیز میں غیر قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہو جن دو چیزوں پر ضروریات زندگی کا مدار ہے۔اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں۔(مزید برآں) کسی طریقے سے اصلاح (حال) کی صورت ہی نہیں ہے،اس لیے کہ گو نجس چیز طاہر سے مل کر طاہر ہوسکتی ہے لیکن ہندوؤں میں کسی شخص کو جو ان کی قوم سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونے کے رغبت یا ان کے دین کی طرف میلان رکھتا ہے،اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت نہیں ہے۔اور یہ ایسی حالت ہے جو ہر رشتے کو توڑ دیتی ہے اور کامل طرح پر منقطع کر دیتی ہے۔

تیسرا سبب رسم وعادات اور طرز معاشرت کا اختلاف:

قطع تعلقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ رسم وعادت میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری ہیئت ولباس وغیرہ سے تقریباً ڈراتے ہیں اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے اور شیطان کو خدا کا مخالف یا دشمن قرار دیتے ہیں۔اگر چہ اس نسبت کا استعمال عام طرح پر ہم لوگوں کے حق میں کیا جاتا ہے،لیکن وہ ہمارے اور کل دوسری قوموں کے درمیان مشترک ہے۔ہم کو یاد ہے کہ

ان میں سے ایک (ہندو) نے ہم سے اس لیے انتقام لیا کہ ایک ہندو راجہ اپنے ایک دشمن کے ہاتھ سے جس نے ہم لوگوں کے ملک سے آکر حملہ کیا تھا، مارا گیا۔اس کا وارث اور اس کے بعد ملک کا راجہ اس کا لڑکا ہوا جو اس کے مارے جانے کے وقت ماں کے پیٹ میں تھا۔بچہ کا نام سگر رکھا گیا تھا۔جوان ہو کر لڑکے نے ماں سے باپ کا حال دریافت کیا اور ماں نے جو حالت گزری تھی، بیان کر دی۔جوان راجہ جوش میں آکر اپنے ملک سے باہر نکلا اور دشمن کے ملک میں جا کر ان قوموں سے پورا انتقام لیا یہاں تک کہ قتل اور خون ریزی سے تنگ آ گیا اور جو لوگ بچ گئے ،ان کو ذلیل کرنے اور سزا دینے کے لیے ہمارا ہی لباس پہننے پر مجبور کیا۔ہم نے یہ قصہ سن کر راجہ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہم کو ہندو بننے اور اپنی رسمیں اختیار کرنے کی سزا نہیں دی۔

ان کے بعد کچھ اسباب ایسے ہیں جن کو بیان کرنا گویا ہندوؤں کی ہجو کرنا ہے لیکن وہ ان کے اخلاق میں سمائے ہوئے ہیں اور کسی سے مخفی نہیں ہیں اور حماقت ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک،انسان ہیں تو ان کی قوم، بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ، دین ہے تو وہی جوان کا مذہب ہے اور علم تو وہ جوان کے پاس ہے۔اس لیے یہ لوگ بہت تعلّی کرتے ہیں اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس ہے،اس کو بہت سمجھتے ہیں اور خود پسندی میں مبتلا ہو کر جاہل رہ جاتے ہیں۔جو کچھ یہ جانتے ہیں،اس کو بتلانے میں بخل کرنا اور غیر قوم والے درکنار،خود اپنی قوم کے نا اہل لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ چھپانا ان کی سرشت میں داخل ہے۔اس کے علاوہ ان کے گمان میں بھی نہیں ہے کہ دنیا میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر اور ان شہروں کے باشندوں کے سوا دوسری جگہ بھی انسان ہیں اور ان کے ماسوا دوسرے لوگوں کے پاس بھی علم ہے۔یہ حالت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر ان سے خراسان وفارس کے علم اور

اہل علم کا ذکر کیا جائے تو مخبر کو جاہل سمجھیں گے اور مذکورہ بالا عیب کی وجہ سے ہرگز اس کو سچا نہیں مانیں گے۔حالانکہ اگر یہ لوگ سفر کریں اور دوسرے لوگوں سے ملیں جلیں تو اپنی رائے سے باز آجائیں۔باایںہمہ ان کے اسلاف اس درجہ بے خبر نہیں تھے۔(۱۳)

چوتھا اختلاف:

ہم میں اور ہندوؤں میں بڑا اختلاف یہ ہے کہ ہم آپس میں سب کو برابر سمجھتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر فضیلت صرف تقویٰ کی بنا پر دیتے ہیں۔یہ اختلاف ہندوؤں اور اسلام کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔(۱۴)البیرونی کے مطابق ہندوؤں میں چار ابتدائی طبقات برہمن، کشتر، بیش اور شدر کے نیچے ادنیٰ درجہ کے ذلیل لوگ ہیں جن کا شمار کسی طبقہ میں نہیں ہے۔مختلف پیشوں جیسے دھوبی، موچی، ملاح، جلاہا وغیرہ کے اعتبار سے ان کی تقسیم کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ ان سب کو چاروں ذات والے اپنی آبادی میں سکونت پذیر ہونے نہیں دیتے۔ہادی، ڈوم، چنڈال اور بدھتو یہ لوگ کسی فرقہ میں بھی داخل نہیں ہیں۔ان کی حالت اولاد الزنا کی طرح ہے کہ وہ سب ایک ہی طبقہ میں شمار ہوتے ہیں۔ان میں سب سے بدتر بدھتو ہیں، یہ صرف معمولی مردہ جانور کھا لینے پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ کتا وغیرہ تک چٹ کر جاتے ہیں۔(۱۵)

لنگ پوجا

البیرونی نے جہاں ہندوؤں کے بتوں کا ذکر کیا ہے وہاں مہادیو کے لنگ (عضو تناسل) کی پوجا کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اس کی مورتی بنانے کا طریقہ بھی بیان کیا ہے۔البیرونی کے مطابق ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ لنگ کی صورت غلط بنانے کے سبب ملک میں خرابی ہوتی ہے۔گول حصے کو چھوٹا یا پتلا بنانے سے ملک میں خرابی ہوتی ہے اور جن اطراف کے لوگوں نے اس کو بنایا ہے، ان میں برائی ظاہر ہوتی ہے۔اس میں گہرائی اور بلندی کم ہونے سے لوگ بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔اگر بناتے وقت اس پر کسی کانٹے وغیرہ کی چوٹ لگے گی، راجہ اور

اس کے گھر والے ہلاک ہوں گے۔اگر اس کے اٹھا کر چلنے میں راہ میں ٹکر لگے اور اس ٹکر سے نشان پڑ جائے، بنانے والا ہلاک ہوگا اور ملک میں خرابی اور بیماریاں پھیلیں گی۔البیرونی کے مطابق سومنات لنگ کی عبادت کا سب سے بڑا اور مقدس حصہ تھا جسے سلطان محمود غزنوی نے اکھڑوا کر ٹکڑے کر دیا تھا اور اوپر کے حصے کو توڑ کر مع اس کے سونے کے جڑاؤ اور چمکیلے غلاف کے، اپنے دارالسلطنت غزنی لے گئے۔اس کا ایک جز غزنی کے میدان میں چکرسوام، ایک پیتل کے بت کے ساتھ، جو تھانیسر سے لایا گیا تھا، پڑا ہے اور ایک جز وہاں کی جامع مسجد کے دروازے پر ہے جس پر پاؤں کی مٹی اور نمی پونچھی جاتی ہے۔(۱۶)

ہماری نئی نسل جس کا واسطہ کبھی ہندو قوم کے مذہب، معاشرت اور اسلام دشمنی سے نہیں پڑا انہیں چاہیے کہ وہ ثریا حفیظ الرحمٰن کا سفرنامہ ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔اس کتاب کے پیش لفظ میں غلام ربانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''سندھ میں سکھر کے قریب ''سادھ بیلو' نام سے دریا کا ایک جزیرہ ہے جس میں ایک تاریخی مندر ہے۔قیام پاکستان کے بعد ایک بار میں نے اس کو دیکھا۔اس کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی جیسے کوئی Neglected جگہ ہو۔تاہم سنگ مرمر کے بنے ہوئے کمرے موجود تھے۔ایک کمرے میں دلچسپ منظر نظر آیا۔فرش پر مردانہ عضو تناسل کے ہم شکل مرمر کے چھوٹے بڑے کئی اعضاء بنے ہوئے تھے۔ترجمان نے بتایا کہ قیام پاکستان سے پہلے سکھر سے بڑے بڑے ہندو تاجروں کی بہو بیٹیاں کشتیوں پر سوار ہو کر مندر میں تشریف لاتی تھیں، باری باری ہر ایک اس کمرے میں تشریف لے جاتی۔دروازہ بند کرتیں۔پتھر کے بنے ہوئے شو لنگ سے کچھ رسومات ادا کرتیں تاکہ شادی کے بعد برکت حاصل ہو۔میں نے ترجمان سے رسومات کی تفصیل نہیں پوچھی''۔(۱۷)

ثریا حفیظ الرحمٰن ان کی عبادت اور مندروں کے بارے میں تفصیلاً تحریر فرماتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مہاراشٹر اور کرناٹکا میں رینوکا دیوی کے آگے لڑکیاں اور عورتیں عریاں ہو کر پوجا کرتی ہیں۔۔مدھیہ پردیس کے کئی مندوروں میں انسان کی بلی (قربانی) دی جاتی ہے۔ویسے بھی ہندوؤں میں دولت حاصل کرنے کے لیے جو کئی قسم کے تنترک (جادو) کیے جاتے ہیں ان کے لیے انسانی خون ضروری سمجھا جاتا ہے۔عمارات کی مضبوطی کے لیے سنگ دل ہندو کم سن بچوں کا خون اور ننھے منے اجسام بنیادوں میں چنتے ہیں اڑیسہ کے مندروں میں بھگوانوں اور دیویوں کے مجسمے دیکھنے میں نہایت شرمناک ہیں۔''(۱۸)

درج بالا حوالہ جات سے ہندو تہذیب وتمدن اور ان کے مذہب کا مسلمانوں سے مکمل طور پر الگ ہونے کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔وہ قوم جو اپنے سوا کسی کو انسان سمجھنا گوارا نہ کرے بلکہ ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر رویہ رکھنا جائز سمجھے، کروڑوں معبودانِ باطلہ کے آگے سجدہ ریز ہو، ہزاروں طبقات اور ذاتوں پر ایمان رکھتی ہو، گائے، بندر، چوہے یہاں تک کہ عضو تناسل کی عبادت کرتی ہو۔مسلمانوں کو ملیچھ سمجھتی ہو اور ان سے مس ہوئی چیزوں کو ناقابل استعمال خیال کرتی ہو، کیا ایسی قوم کے ساتھ مل کر مسلمان جو اسلام کو ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں جو دنیا میں آنے سے پہلے سے لے کر قبر کی آغوش تک ہدایات فراہم کرتا ہے، اپنا نظام عدالت، سیاست، معیشت، دفاع وغیرہ کو بحسن خوبی چلانے پر قادر ہو سکتے تھے؟۔ برطانوی حکومت کے دور میں پورے ہندوستان کے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارموں پر پانی بھی مذہب کی تقسیم کے ساتھ ہی ملتا تھا یہاں تک کہ دو مٹکے الگ رکھے جاتے تھے ایک پر ہندو پانی اور دوسرے پر مسلم پانی لکھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ کانگریس کی ابلہ فریبی اور خیانت کی وجہ سے مسلمان قائدین

نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں اور اسلام کا ہندوستان میں دفاع کرنے کا واحد حل ہندو مسلم دوستی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک علیٰحدہ ریاست کا حصول ہے جہاں ان کا قومی تشخص قائم رہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق قرآن وسنت کے نظام کو قائم کر سکیں۔

پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا تو رمضان المبارک کی ۲۷ تاریخ یعنی شب قدر تھی۔اس مملکت کے شبِ قدر میں عطا کیے جانے میں یہ راز ہے کہ یہ تحفہ تمہیں قدر والی رات میں عطا کیا گیا ہے لہٰذا اس کی قدر کرو۔پاکستان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آٹھ صدیوں پر محیط سلطنت کے اختتام اور سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد یہ پہلی ریاست تھی جو اسلام کے نام پر قائم کی جا رہی تھی۔قدرت نے جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہم اور قدرتی وسائل سے مالا مال خطہ ارضی ہمیں آزادی کی نعمت کے طور پر عطا فرمایا جس کی بنیاد ''**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**'' ﷺ پر ہے۔نظریۂ پاکستان کے حوالہ سے ہماری کتاب ''محمد رسول اللہ ﷺ کا پاکستان'' انتہائی اہمیت کی حامل ہے جس میں ہم نے بانیان پاکستان کی تحریر و تقریر کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ بانیان پاکستان کے نزدیک پاکستان کے حصول کا مقصد ایک اسلامی فلاحی ریاست کا قیام ہے جہاں دین سیاست سے الگ نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ہماری ہدایت کا مرکز ہوگا۔نظریہ پاکستان کے بارے میں تو پرویز نے بھی یہی لکھا ہے۔پرویز لکھتے ہیں:

''انہوں نے ٹیکنیک یہ اختیار کر رکھی ہے کہ اسلام یا نظریہ پاکستان جیسی اصطلاحات کا مفہوم متعین نہ کیا جائے، انہیں مبہم رکھا جائے۔ہمارے ہاں یہ شعر جو زبان زدِ خلائق ہے کہ:

پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!

معلوم نہیں کہنے والے کے سامنے اس کا وہ مفہوم تھا یا نہیں جو قرآن کریم کی رو سے اوپر بیان کیا گیا ہے۔لیکن بات اس نے پتے کی کہی تھی۔حقیقت یہی ہے کہ پاکستان (یا اسلامی مملکت) کی اساس ''لا الہ الا

اللہ'' ہے''۔(۱۹)

یہاں ہم وہ سوال اٹھانا چاہتے ہیں جو علامہ محمد اسد نے قیام پاکستان سے چند ماہ قبل اپنی تحریر What do we mean by Pakistan? میں اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟(۲۰) یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا قیام پاکستان کے وقت تھا۔ ہمارا عمل اور طرز فکر اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ہم اسلام نہیں چاہتے جبکہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہماری نجات صرف اسلام ہی میں ہے اور پاکستان اسلام کے نام پر ہی قائم ہوا ہے اور رشتۂ ایمان کی بنیاد پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔ جب ہم نے ایمان کے بجائے قوم وزبان کے اختلافات کی بنیاد پر اس کی بنیاد رکھنا چاہی تو ہمارا ایک بازو ٹوٹ کر ہم سے الگ ہو گیا، یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اپنے خطبہ الہ آباد میں بیان فرمایا:

One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa. If today you focus your vision on Islam and seek inspiration from the ever-vitalising idea embodied in it, you will be only reassembling your scattered forces, regaining your lost integrity, and thereby saving yourself from total destruction. One of the profoundest verses in the Holy Quran teaches us that the birth and rebirth of the whole of humanity is like the birth and rebirth of a single individual.

Why cannot you who, as a people, can well claim to be the first practical exponents of this superb conception of humanity, live and move and have your being as a single individual? I do not wish to mystify anybody when I say that things in India are not what they appear to be. The meaning of this, however, will dawn upon you only when you have achieved a real collective ego to look at them. In the words of the Quran, "Hold fast to yourself; no one who erreth can hurt you, provided you are well guided" (5:104).(21)

ایک سبق میں نے مسلمانوں کی تاریخ سے سیکھا ہے۔ اپنی تاریخ کے نازک ترین مواقع پر یہ اسلام ہی ہے جس نے مسلمانوں کو نجات عطا کی ہے، نہ اس کے برعکس۔

اگر آج آپ اپنی نظر کو اسلام پر مرکوز رکھیں اور اس میں موجود ہمیشہ تواں بخش تصور سے فیض حاصل کریں گے تو آپ اپنی منتشر قوتوں کو باہم اکٹھا کر لیں گے اور اس ذریعے سے آپ خود کو مکمل تباہی سے بچالیں گے۔ قرآن کریم کی دقیق ترین آیات میں سے ایک آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ پوری انسانیت کی ولادت اور ولادت نو ایک فرد واحد کی ولادت اور ولادت نو کی طرح ہے۔ آپ کیوں نہیں زندگی گزار سکتے اور تحریک

دے سکتے اور اپنے وجود کو ایک فرد واحد کے طور پر قائم کر سکتے جو بحیثیت ایک قوم زیادہ بہتر دعویٰ کر سکتے ہیں انسانیت کے اس غیر معمولی تصور کے سب سے اول عملی شارح ہونے کے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ انڈیا میں اشیاء ایسی نہیں ہیں جیسی بظاہر نظر آتی ہیں تو میں کسی کو اچنبھے میں نہیں ڈالنا چاہتا اس کا مطلب البتہ آپ پر صرف اس وقت منکشف ہوگا جب آپ ایک حقیقی مجموعی خودی کو ان کو دیکھنے کے لیے حاصل کر لیں گے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:

یایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضر کم من ضل اذا اھتدیتم (المائدۃ ۵:۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم اپنی جانوں کی فکر کرو، تمہیں کوئی گمراہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تم ہدایت یافتہ ہو چکے ہو۔''

پاکستان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد دنیا میں ایک اور نظریاتی ریاست وجود میں آئی جس کا نام ''اسرائیل'' ہے۔ وہ لوگ جو متحدہ ہندوستان کا راگ الاپتے رہتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ اسرائیل سے سبق سیکھیں۔ بائبل کی عہد نامہ قدیم کی پہلی کتاب پیدائش (Genisis) کے مطابق خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی اولاد کو ایک مخصوص خطہ زمین عطا فرمائے گا۔ پیدائش میں ہے:

18 In the same day the Lord made a covenant with Abram, saying, Unto thy seed have I given this land, from the river of Egypt unto the great river, the river Euphrates:19 The Kenites, and the Kenizzites, and the Kadmonites,20 And the Hittites, and the Perizzites, and the Rephaims,21 And the Amorites, and the

Canaanites, and the Girgashites, and the Jebusites.(22)

یہودی اس خطے کو The Promised Land یا Greater Israel کے نام سے یاد کرتے ہیں اپنی ذلت و رسوائی کے مختلف ادوار اور Diaspora سے گزرنے کے بعد مردہ قوم یہود کو Russian Poland کے ایک یہودی مفکر Judah Leib (Leon)Pinsker (۱۸۹۱ء۔۱۸۲۱ء) نے زندہ کیا اور اپنے مضمون Auto-Emancipation(1882) کے ذریعے ان میں آزادی اور قومیت کا شعور پیدا کیا اور ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ تمہاری کامیابی ایک Fatherland حاصل کرنے میں ہے۔(۲۳) پنسکر نے اس مضمون میں یہودیوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے پرانے آبائی علاقے یروشلم یا کسی دوسرے علاقے کے بارے میں جلد از جلد فیصلہ کریں کہ اب وہی ان کا آبائی ملک ہوگا جہاں سے کوئی ان کو نہیں نکالے گا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق وہاں زندگی گزار سکیں گے۔ اسی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے Theodor Herzl نے ایک مضمون The Jewish State(1896) تحریر کیا جس میں اس نے Jewish Question کو زیر بحث لاتے ہوئے Palestine یا Argentine میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ اگر ہم فلسطین کا انتخاب کر لیں تو فلسطین کا نام ہماری قوم میں ایک جوش و ولولہ کو پیدا کر دے گا اور اس طرح ہم لوگوں کو با آسانی اس طرف متوجہ کر دیں گے۔(۲۴)

بالآخر اپنی عالمی سازشوں کے نتیجے میں یہودیوں کی صہیونی تنظیم نے لاتعداد انسانوں کا خون بہا کر اسرائیل حاصل کر لیا۔ ان دونوں حضرات کی خدمات کے صلہ میں ان کی باقیات کو قیام اسرائیل کے بعد اسرائیل میں دفن کیا گیا۔ اسرائیل نے جس خطۂ زمین کے حصول پر ابتداء میں اکتفاء کیا وہ ان کا مطلوبہ حصہ نہ تھا تاہم وہ اپنے عالمی منصوبے کے تحت نیل سے فرات تک The Promised Land کی تکمیل کے لیے شب و روز اپنی جان و مال اور عزت کی قربانی دے رہے ہیں تاکہ اس مختصر سے خطے میں توسیع کے بعد اصل مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔ جس میں مسلمانوں کے مقدس مقامات بھی شامل ہیں اور حالیہ ہونے والی تمام جنگوں اور مشرق وسطیٰ کے بدلتے

ہوئے جغرافیہ کا اس سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جب یہودی اپنے عالمی منصوبے کے تحت اس قدر جامع منصوبہ بندی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں تو کیا مسلمان عالمی سطح پر United States of Islam یا ایسا متحدہ ہندوستان بنانے کا خواب نہیں دیکھ سکتے جس کا نام پاکستان ہو؟ جو کبھی حقیقت میں ان کے زیر حکومت رہا ہے۔ لیکن ہماری نئی نسل ایسا خواب نہیں دیکھ سکتی کیونکہ نظریہ پاکستان اس کی نظر سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ وہ ہندو مشرکانہ اور مغربی تہذیب میں اس قدر رنگ چکی ہے کہ اب بظاہر ایک مسلمان اور کافر میں فرق نظر نہیں آتا۔ جس کا سب سے بڑا ذمہ دار پاکستانی آورہ میڈیا ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو بوسنیا کے ان مسلمانوں سے درس عبرت حاصل کرنا چاہیے جن کو محض مسلمان ہونے کے جرم میں بدترین مظالم کا نشانہ بنایا گیا اور اہل مغرب نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جبکہ وہ مسلمان ان کی اپنی اختراع کردہ اصطلاح میں بنیاد پرست و متشدد نہیں تھے۔

پیش نظر کتاب ہجرت آزادی کی مسلمانانِ ہند کے خون سے لکھی گئی سچی داستانوں کا مجموعہ ہے۔ آزادی ایک نعمت ہے مگر یہ نعمت آگ و خون کا دریا عبور کرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ ہجرت آزادی کے وقت لاکھوں مسلمان مردوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں نے جس طرح اپنی جان، مال، عزت و آبرو کی قربانی دی اس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ ہماری نئی نسل سے ہجرت آزادی کے واقعات اور دشمن کے چہرے کو چھپانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے تاکہ ان میں دوست و دشمن کی تمیز ختم ہو جائے اور جنگ سے قبل ہی مسلمان اپنی اسلامی تہذیب و تمدن کو بھول کر ہندو تہذیب میں ایسے گم ہو جائیں کہ ان کو با آسانی غلام بنا لیا جائے۔ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے اور باہمی اختلافات کو کم کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ انہیں دشمن کا اصل چہرہ دکھا دیا جائے تاکہ وہ اپنے اختلافات بھول کر ہمہ جہتی جنگ میں اپنے قلم، زبان، دماغ، تلوار اور وسائل کا انسان دشمن لوگوں کے خلاف استعمال کریں۔ اللہ رب العزت نے اپنی راہ میں ہجرت کرنے والوں کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

فا لذین هاجروا و اخرجوا من دیارهم و اوذوا فی سبیلی و قاتلوا و قتلوا لاکفرن عنهم سیاتهم و لادخلنهم جنات تجری من تحتها الانهار ثوابا من عند الله و الله عنده حسن الثواب (۲۵)

جن لوگوں نے وطن چھوڑ دیئے اور اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے تو میں ضرور ان کے گناہ ان سے مٹا دوں گا اور انہیں یقیناً ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، یہ اللہ کے حضور سے اجر ہے اور اللہ ہی کے پاس بہتر اجر ہے۔''

مشرکین مکہ نے جب مسلمانوں کو تکالیف پہنچانے میں انتہا کر دی تو اللہ رب العزت نے انہیں ہجرت کا حکم دیا اور انہوں نے اپنا وطن چھوڑ کر مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ مشرکین اور مسلمان اپنے رنگ و نسل اور قبائل کے اعتبار سے بظاہر ایک ہی تھے مگر ''کلمہ طیبہ'' نے انہیں دو علیحدہ قوموں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے اس کا سبب وحید ان کا مسلمان ہونا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد سے آج تک ہندوستان میں مسلمانوں کے کشت و خون کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اسلام کے ضابطۂ حیات ہونے پر ایمان لاتے ہیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر برما، فلسطین، کشمیر، افغانستان، شام، عراق اور دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے جن علاقوں پر بھی سینکڑوں سال حکومت کی وہاں کافروں کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں نے نہ تو جبراً ان کو اپنے مذہب میں داخل کیا اور نہ ہی ان کی نسل کشی کی۔

تقسیم ہند سے پہلے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اہانت رسول ﷺ کی وجہ سے یا مذہبی رسومات و ایام کے مواقع پر بعض اوقات فساد کی آگ بھڑک ہی جایا کرتی تھی مگر تقسیم ہند

کے وقت مختلف شہروں میں اور بالخصوص مشرقی پنجاب میں جہاں کی ریاستوں سے ۵۲ لاکھ مہاجرین پاکستان آئے (۲۶) جس طرح سے حکومت کی فوج، پولیس اور ہندوؤں وسکھوں نے بندوقوں ،رائفلوں، برین گنوں، اسٹین گنوں، بموں، توپوں، برچھیوں، نیزوں، تلواروں، کلہاڑیوں، کرپانوں اور دیگر ہتھیاروں سے لاکھوں مسلمانوں کی نسل کشی کی وہ فقید المثال ہے۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں توہین کی گئی۔ مسلمانوں کو زبردستی ہندو اور سکھ بنایا گیا۔ مساجد میں سور اور جانور چھوڑ دیئے گئے۔ قرآن حکیم کے اوراق میں سودا لپیٹ کر دیا جانے لگا۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو نذر آتش کیا گیا۔ ایک شقی القلب شخص نے سو بچوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ آگ میں بھون ڈالا۔ لاشوں کے ٹکڑے کر کے ان کو سلاخوں میں پرو کر آگ پر پکایا گیا۔ بچوں کو ذبح کر کے ان کے اعضاء کاٹ کر ان کا گوشت ان کی ماؤں کے مونہوں میں زبردستی ڈال کر چبانے پر مجبور کیا۔ مردوں کے عضو تناسل کاٹ دیئے گئے۔ والدین کو ان کی اولاد کا خون پینے پر مجبور کیا گیا۔ لاشوں کو درختوں پر لٹکایا گیا۔ بچوں کو اچھال کر نیزوں میں پرویا گیا۔ معصوم بچوں کو فوجی بوٹوں سے کچلا گیا۔ کم سن کلیوں کی نازک ٹانگیں پکڑ کر انہیں چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ماں باپ کے سامنے بچوں کے مونہوں میں نیزہ مار کر حلق کے پار کر دیا گیا۔ ان کے کان، ناک، ہونٹ کاٹ کر والدین کی جھولی میں ڈال دیئے گئے اور کہیں دودھ پیتے بچوں کو کیلوں سے ٹھونک کر دیوار میں ٹانگ دیا گیا۔ سب سے برا حال مسلمان عورتوں کا تھا۔ کئی لڑکیوں کو ان کے والدین اور بھائیوں نے عصمت کی حفاظت کی خاطر خود اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیا یا لڑکیوں نے خودکشی کر لی۔ لاتعداد لڑکیاں اغواء کر لی گئیں۔ جن میں سے بے شمار آج بھی اپنی کوک سے کافر بچوں کو جنم دے رہی ہیں اور ان کی آنکھیں کسی محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کا انتظار کرتے کرتے پتھرا چکی ہیں۔ جو زندہ ہاتھ لگیں ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں۔ والدین اور بھائیوں کے سامنے جوان لڑکیوں کو برہنہ کر کے انتہائی بے دردری کے ساتھ ان کی عصمت دری کی گئی۔ جنہیں آسمان نے بھی کبھی برہنہ سر نہ

دیکھا تھا ان کے کپڑے اتار کر برہنہ جلوس نکالے گئے۔ سرعام مسلمانوں کی عصمت کا جنازہ نکال دیا گیا۔ بوڑھوں کے ہاتھ پیر کاٹ کر انہیں سب کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ وہ مسلمان جو کسی طرح جان بچا کر اپنے گھر بار اور جائیداد کو چھوڑ کر کیمپ میں پہنچتے وہ وہاں **لا یموت فیھا و لا یحیی** (نہ مرتے تھے نہ جیتے تھے) کی کیفیت سے دوچار ہو جاتے۔ کئی کئی دن کھانا اور پینے کا پانی نہیں ملتا۔ وہ خواتین جو ہمیشہ باپردہ رہتیں ان کیمپس میں بغیر دوپٹے تھیں۔ اگر کھانا دیا جاتا تو اس میں غلاظت اور کانچ پیس کر ملا دیا جاتا۔ کئی مسلمان زہر ملا ہوا پانی ہی پینے کی وجہ سے موت کا شکار ہو گئے۔ کیمپس میں طرح طرح کے وبائی امراض پھیل گئے۔ بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سسک سسک کر مرنے لگے۔ رہی سہی کسر حفاظت پر مامور فوجیوں اور پولیس نے مسلمانوں کو گولیاں مار کر، ان کی بیٹیاں اغواء کر کے پوری کر دی۔ ان کیمپس میں یہ منظر بھی آسمان نے دیکھا کہ بعض موقع پرست مسلمان اس حال میں صاف پانی کا ایک گلاس تین سو روپے میں فروخت کر رہے ہیں۔ یوں دریا عبور کرنے، کھانا یا پانی خریدنے اور جان و آبرو کی حفاظت میں مسلمانوں کی سونے، چاندی اور روپے کی صورت میں جمع پونجی بھی اونے پونے داموں صرف ہو گئی۔

وہ مسلمان قافلے جو ٹرکوں، بسوں اور بیل گاڑیوں پر یا پیدل ہی پاکستان کی طرف ہجرت کے لیے روانہ ہوئے راستے میں ان کے قافلوں پر حملے کیے گئے۔ لڑکیوں کو اغواء کر لیا گیا اور لاکھوں کا قافلہ ہزاروں میں اور ہزاروں کا قافلہ چند سو میں اور سینکڑوں کا قافلہ چند نفوس میں لٹا کٹا پاکستان پہنچتا۔ بے شمار افراد سفر کی صعوبتوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے داغ مفارقت دے جاتے اور کئی منزل پر پہنچ کر دم توڑ دیتے۔ ان قافلوں کے بارے میں کیمبل جانسن لکھتا ہے:

> ''جب ہمارا طیارہ ہندوستان کی طرف مڑا تو ہم نے مسلمانوں کے اترے ہوئے اور افکار سے بوجھل چہرے دیکھے۔ یہ مہاجرین آہستہ آہستہ لائل پور لاہور کی جانب بڑھ رہے تھے ان کا سب کچھ لٹ چکا

تھا۔آسائش،سکون، مال و متاع، گھربار، وہ خالی ہاتھ تھے۔وہ دریائے بیاس کی طرف آئے۔مہاجرین کا کارواں اتنا لمبا پھیلا ہوا تھا کہ اس کے ایک سمت سے دوسری سمت تک گذرنے کے لیے ہمارے طیارے کو سوا گھنٹہ لگا اور وہ بھی اس صورت میں کہ طیارہ ایک سو اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا،۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قافلہ کا سلسلہ ۴۵ میل تک چلا گیا تھا۔'' (۲۷)

وہ اسپیشل ٹرین جو پاکستان روانہ ہوتی اس کے ڈبوں میں انسان بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیئے جاتے۔سینکڑوں مردٹرین کے اوپر سفر کرتے جن میں سے کئی ایک راستے میں ہی نیچے گر کر فنا ہو جاتے۔ان ٹرینوں پر منظّم انداز میں حملے کیے جاتے اور پوری ٹرین راستے میں ہی کاٹ دی جاتی۔مال واسباب لوٹ لیا جاتا اور خواتین کو اغواء کر لیا جاتا۔اس طرح جب یہ ٹرینیں پاکستان پہنچتیں جہاں مسافروں کے اہل خانہ ہار اور پھول لیے دیدہ و دل بچھائے منتظر ہوتے تو ان پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ٹرینیں انسانی کٹے ہوئے اعضاء سے بھری ہوتیں۔ٹرینوں سے خون بہہ رہا ہوتا۔کئی چشم دید افراد کا بیان ہے کہ کئی ڈبوں میں صرف گوشت کی گٹھریاں ملتی تھیں کوئی ایک نفس بھی زندہ پاکستان نہ پہنچ پاتا۔ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

''پھر شور بلند ہوا۔امرتسر سے گاڑی آ گئی۔امرتسر سے گاڑی آ گئی۔سب لوگ پلیٹ فارم کی طرف بھاگے،لیکن مہاجر جوں کے توں بیٹھے رہے۔جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔میں نے سائیکل کو تالہ لگایا اور ان جانے میں اندر کی طرف چل پڑا۔پلیٹ فارم پر پہنچا تو بو کا ایک ریلا آیا۔میں رک گیا۔لوگ ناک پر رومال رکھے گاڑی کے ڈبوں میں داخل ہو رہے تھے۔جب وہ باہر نکلتے تو چہروں پر کراہت کے آثار نمایاں ہوتے۔میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ گاڑی میں داخل ہوا جائے۔اس کے باوجود میں ادھر

کھنچا جا رہا تھا۔یوں جیسے خوف نے ہپناٹائیز کر رکھا ہو۔بادل ناخواستہ میں ڈبے کی طرف بڑھا۔دروازے میں رک گیا۔وہاں خون کا چھپڑ لگا ہوا تھا۔سامنے ایک بوڑھی عورت گٹھڑی کی طرح پڑی تھی۔آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔سامنے پیٹ سے نکلی ہوئی آنتوں کا ڈھیر لگا تھا۔دیر تک میں اس بڑھیا کو گھورتا رہا۔خون کی بو سے طبیعت مالش کر رہی تھی۔سر چکرا رہا تھا۔نظر دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔گاڑی کے اندر داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی دروازے میں کھڑے کھڑے ڈبے کا جائزہ لیا سارے ڈبے میں کٹے ہوئے گوشت کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔دو بازو اوپر تختے سے لٹک رہے تھے،دو کٹے ہوئے سر فرش پر لڑھک رہے تھے۔ایک بچہ ہک سے لٹک رہا تھا۔(۲۸)

متعدد مقامات پر ایسے دلخراش مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ لاتعداد لاشیں سڑکوں اور میدانوں میں پڑی سڑ رہی ہیں۔کہیں ان لاشوں کو اکٹھا کر کے جلا دیا گیا اور کہیں گدھ،چیل،کوے اور کتے مسلمانوں کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھاتے رہے۔یہ ایسا دردناک منظر تھا کہ دیکھنے والا سکتے میں آ جائے اور انسانیت پر سے اس کا اعتبار ہمیشہ کے لیے اٹھ جائے۔جن علاقوں میں مسلمانوں کو قتل کر کے ان کا مال واسباب لوٹ لیا گیا۔مساجد کو تاخت وتاراج کر دیا گیا اور مسلمانوں کو وہاں سے ہجرت پر مجبور کیا گیا ان میں سے قابل ذکر نام درج ذیل ہیں:

۱۔دہلی	۲۔پانی پت	۳۔پالم	۴۔گڈھ مکتیشر
۵۔میرٹھ	۶۔آگرہ	۷۔سہارنپور	۸۔دہرہ دون
۹۔پیلی بھیت	۱۰۔روہیلکھنڈ	۱۱۔بریلی	۱۲۔شاہجہاں پور
۱۳۔مرادآباد	۱۴۔حسن پور	۱۵۔بنارس	۱۶۔جوالا پور
۱۷۔مسوری	۱۸۔متھرا	۱۹۔علیگڑھ	۲۰۔اترولی

۲۱۔ہاتھرس	۲۲۔چندوسی	۲۳۔خورجہ	۲۴۔ہاپوڑ
۲۵۔کانپور	۲۶۔ہروارا	۲۷۔بدایوں	۲۸۔الہ آباد
۲۹۔پٹیالہ	۳۰۔امرتسر	۳۱۔فریدکوٹ	۳۲۔نارنول
۳۳۔جالندھر	۳۴۔لدھیانہ	۳۵۔انبالہ	۳۶۔فیروزپور
۳۷۔الور	۳۸۔بھرتپور	۳۹۔ڈیگ	۴۰۔باندی کوئی
۴۱۔بیانہ	۴۲۔جبلپور	۴۳۔ساگر	۴۴۔رانچی
۴۵۔احمد آباد	۴۶۔بھوپال	۴۷۔پٹنہ	۴۸۔گیا
۴۹۔مونگھیر	۵۰۔چھپرا	۵۱۔آسنسول	۵۲۔کلکتہ
۵۳۔ہاوڑہ	۵۵۔سیالدہ	۵۶۔حیدرآباد	۵۷۔بیدر
۵۸۔جالنا	۵۹۔نانذیر	۶۰۔اورنگ آباد	۶۱۔عثمان آباد

۶۲۔گلبرگہ(۲۹)

فسادات کا آغاز کلکتہ سے اگست ۱۹۴۶ء میں کیا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان شہید ہوئے اور ان کے مال واسباب کو لوٹ لیا گیا۔ آئن اسٹیفن نے فسادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''پولیس کے مردہ خانے میں داخل ہونے کے لیے آلۂ تنفس کی ضرورت تھی کیونکہ وہاں سڑی ہوئی لاشوں کے چھت تک انبار لگے ہوئے تھے۔ ملٹری پولیس کے انگریز نان کمیشنڈ افسروں کے ساتھ میں نے تین گھنٹے ایک جیپ میں شہر کی سڑکوں پر گشت کیا ہم نے جو کچھ دیکھا وہ موجودہ دنیا کے فوجی میدان کارزار میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔(۳۰)

سر فرانسس ٹکر اس بارے میں لکھتا ہے:

''باگ بازار اسٹریٹ کے علاقہ میں ایک چھوٹی سی مسلم بستی میں ہمارے آدمیوں نے دیکھا کہ سب کچھ جل چکا تھا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا

تھا۔ یہاں تک کہ رہنے والے یا تو بھاگ گئے تھے یا بیدردی سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ تین ننھے ننھے معصوم بچوں کی لاشیں اس جرم کی شہادت دے رہی تھیں۔

اس حادثہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہمیں تین مختلف ذرائع سے ایک ہی اطلاع ملی وہ یہ تھی کہ اس مسلم بستی کو جلا کر خاک سیاہ کرنے والے نوغنڈے تھے جنہیں ایک مشہور شخص نے جرات دے کر اس کام پر مامور کیا تھا۔

اس علاقہ میں لاشوں کو زیادہ قریب سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ کس بہیمت اور شقاوت کے ساتھ لوگ ہلاک کئے گئے تھے۔ بہت سی لاشیں مسخ کر دی گئی تھیں۔ ایک لاش تو ہم نے ایسی دیکھی کہ ایک آدمی کو ٹخنوں سے باندھ کر ٹریموے الیکٹرک جنکشن سے لٹکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ رکھے گئے تھے۔ پیشانی پر سوراخ کر دیا گیا تھا تا کہ دماغ سے اتنا جریان خون ہو کہ فوراً مر جائے اور ایسا ہی ہوا۔ یہ منظر اتنا دلخراش اور جگر فگار تھا کہ حیرت ہوتی ہے۔ جن سپاہیوں کو یہ لاشیں اتارنے کا اور قریب پڑے ہوئے ایک بورے میں لپیٹنے کا حکم دیا گیا تھا یہ منظر دیکھ کر موقع واردات پر اپنے ہوش وحواس وہ کس طرح سلامت رکھ سکے۔

اس تفتیش نے ایک اور اہم حقیقت واضح کر دی جواب تک نظر سے اوجھل تھی۔ بہت سی لاشیں بوریوں اور کوڑے دان میں بند پڑی سڑ رہی تھیں اور اب اس وجہ سے نمایاں ہونے لگی تھیں۔ لیکن سوہا بازار میں تو وسیع پیمانہ پر قتل عام کے واقعات کے نشانات ملے۔ کوئی گلی لاشوں سے خالی نہ تھی۔ ایک کمرے میں پندرہ، دوسرے میں بارہ لاشیں ملیں۔ بازار کے مغربی حصہ میں ایک رکشا اسٹینڈ تھا۔ تمام رکشا ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے اور ظاہر

تھا کہ رکشا کھینچنے والے سب کے سب مجموعی طور پر قتل کر دیئے گئے تھے۔اس قتل گاہ میں ہم نے دو زندہ بچے برآمد کئے دونوں بری طرح زخمی تھے اور ایک کے زخم تو سڑ گئے تھے۔جیسا کہ سمجھا جا سکتا ہے۔یہ دونوں بچے حد درجہ بدحواس اور سراسیمہ تھے بلکہ تقریباً پاگل ہو چکے تھے۔ان کے ذہنی اعصاب بالکل مفلوج ہو چکے تھے اور جس چیز نے انہیں دیوانہ بنا دیا تھا۔اور اب کبھی یہ نارمل حالت میں واپس نہیں آسکیں گے۔''(۳۱)

اس کے بعد اکتوبر میں بہار کو شہادت گاہ بنایا گیا۔کہا جاتا ہے کہ جب قیامت کے دن تحریک پاکستان کے شہداء اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں گے تو اس قافلے کی قیادت شہدائے بہار کریں گے۔نواکھلی کے فرقہ وارانہ فساد کو بنیاد بنا کر یہاں کے مسلمانوں پر ایسا ظلم کیا گیا جو کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔۲۵ اکتوبر سے ۱۰ نومبر تک بہار کے پانچ اضلاع میں مسلمانوں کو شدید قتل عام جاری رہا۔۵ نومبر تک بہار کے صرف دو اضلاع میں تیس ہزار مسلمان فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔(۳۲)

آئن اسٹیفن بہار کے قتل عام کے بارے میں لکھتا ہے:

''مؤرخ یہ تسلیم کریں گے کہ بہار کا سانحہ تقسیم کے نزاعی موضوع پر فیصلہ کن اثرات ثبت کر گیا۔اتنے زبردست قتل عام کے بعد جو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہوا ایک حکومت کے تحت ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے امن و صلح کے ساتھ مل جل کے رہنے کا امکان ختم ہو گیا۔''(۳۳)

لیفٹیننٹ جنرل ٹکر نے ان معلومات کی بنیاد پر جو اسے جنرل آفیسر کمانڈنگ مشرقی کمان کی حیثیت سے ملی تھیں، لکھا ہے:

''۱۹۴۶ء کی بہیمانہ وارداتوں میں سانحہ بہار عظیم ترین سانحہ تھا۔ہندوؤں کے زبردست ہجوم پوری طرح تیار ہو کر نکلتے اور گنتی کے ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے جن کے آباو اجداد اور خود ان ہندوؤں کے آباو اجداد

دوستی، محبت اور خلوص کے ساتھ ہمسایوں کے طور پر رہتے آئے تھے۔آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نسل کشی کا یہ بھیانک منصوبہ کس کے ذہن کی پیداوار تھا۔ہمیں تو بس اتنا علم ہے کہ اس منصوبے کے تحت زبردست مسلح ہجوم وقت پر جمع ہوتے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا۔تھوڑی ہی دیر میں سات آٹھ ہزار مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا، ماں کے سامنے ان کے سینے سے لپٹے ہوئے بچوں کو قتل کرنے کے بعد ماؤں کو بھی تہ تیغ کر دیا گیا''۔(۳۴)

ہیکٹر بولتھو لکھتا ہے:

''جون کے آخر اور جولائی کے آغاز میں کشت وخون شروع ہو گیا۔ایک انگریز نے جو ایک کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اس نے اپنے مکان کی کھڑکی سے دیکھا کہ سمندر کے ساحل پر کام کرنے والا ایک تنومند مزدور ایک جہازی سامان اٹھانے والا آنکڑا لیے کھڑا ہے۔اس کو اپنی قوت کا اندازہ ہوا اور پھر اس نے ایک عورت پر زور آزمائی شروع کر دی جو قریب ہی کھڑی تھی۔اس نے عورت کے کپڑے پھاڑ کر اس کا جسم چیر ڈالا۔پھر وہ سڑک پر آگے بڑھا اور اس نے یہی سفاکی کا عمل دیگر پانچ عورتوں کے ساتھ کیا''۔(۳۵)

پاکستان کا قیام رمضان المبارک میں عمل میں آیا۔اس سال بھی عید الفطر اور یوم آزادی کی تاریخ ایک دوسرے سے قریب ہے۔اُس سال مسلمانوں کی پہلی عید الفطر کیسی گزری اور اس دن جس ظلم و بربریت کا اظہار کیا گیا اس کا اندازہ وقار انبالوی صاحب کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے:

''لیکن ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کے روز عید الفطر تھی۔اس روز خوف و خطر کی

فضاؤں میں جالندھر کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں عید کی نماز ادا کرنے
کے لیے عیدگاہ میں جمع تھے اور ابھی پہلی رکعت میں سجدہ ریز ہوئے ہی تھے
کہ ہندوؤں سکھوں نے تلواروں، کنڈاسوں، برچھیوں اور بندوقوں سے
مسلح ہوکر ان پر حملہ کر دیا اور آن واحد میں سینکڑوں مسلمانوں کے سر تن سے
جدا کر دیئے گئے جو اس وحشیانہ حملے سے جان بچا کر عیدگاہ سے باہر بھاگے
انہیں بھالوں کی نوک پر دھر لیا گیا۔ اس طرح جالندھر کی عیدگاہ لاشوں سے
پٹ گئی۔ اس کے بعد سکھانن ڈپٹی کمشنر کی سربراہی میں فرقہ پرست ہندو
سکھ طے شدہ پروگرام کے مطابق جالندھر کے آسودہ حال اور ذی اثر
مسلمانوں کے گھروں سے زبردستی پردہ نشیں عورتوں کو گھیر کر عیدگاہ تک
لائے یہاں ان کے برقعے اور ان کی چادریں ہی سروں سے نہ اتاریں
بلکہ ان کے لباس اتار کر انہیں ننگا کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مردوں کو
عید مبارک کہیں اور قیام پاکستان کی خوشی میں ان کی لاشوں کے آس پاس
رقص کریں۔ یہ وحشیانہ سلوک اور سنگدلانہ کاروائی ایسی تھی کہ جس کی انسانی
تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی لاشوں پر ان کو
رونے بھی نہ دیا گیا۔ برہنہ حالت میں حیا کی ماری عورتیں جب سکڑنے
سمٹنے اور ایک دوسرے کیساتھ لپٹنے لگتیں تو ان کو بھالوں کی نوک چبھو چبھو
کر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ کیا جاتا بلکہ چرکے اور کچوکے اس
طرح دیئے جاتے کہ وہ تڑپنے لگتیں اور قاتل قہقہے لگاتے''۔(۳۶)

عید کے دن مسلمانوں کو جو تحفہ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے بھیجا گیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے
خواجہ افتخار لکھتے ہیں:

''انہوں نے عید کے موقعہ پر ہندوستان سے لاہور آنے والی ایک مال

گاڑی کے ڈبے میں مسلمان عورتوں کی کٹی ہوئی چھاتیاں، معصوم بچوں کی
گردنیں اور کٹے ہوئے ہاتھ عید کے تحفے کے طور پر اسلامیان پاکستان کو
ارسال کئے۔ جب وہ ڈبہ لاہور کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو اس پر ''پاکستانی
مسلمانوں کے لیے تحفہ'' کے اشتعال انگیز الفاظ لکھے ہوئے تھے''۔(۳۷)

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے وقت تقریباً ۲۰ لاکھ سے زائد مسلمان شہید اور اس سے
زیادہ زخمی ہوئے۔ تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ سے زائد افراد نے اپنے گھروں کو خیر آباد کہا۔(۳۸) سکھ
اکالی دل، اکالی سینا، راشٹریہ سیوک اور دیگر سکھ و ہندو جتھے حکومت ہند کی فوج اور پولیس کی سرپرستی
میں مسلمانوں کے اس قتل عام میں شریک رہے کیونکہ حکومت ہند نے پاکستان کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا
جبکہ سکھوں نے مشرقی پنجاب سے مسلمانوں اور ان کے آثار کے نشانات تک مٹا ڈالے تاکہ وہاں
ایک علیحدہ سکھ ریاست کی بنیاد رکھی جا سکے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ پاکستان قائم ہی نہ ہو اور اگر قائم ہو
ہی جائے تو قیام کے ساتھ ہی یہ عمارت فوراً منہدم ہو جائے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں
سے مسلمانوں کو خارج کر کے ان سے اسلحہ واپس لے لیا گیا۔ متعدد مقامات پر گھر گھر تلاشی کے بعد
اطمینان کر لیا گیا کہ مسلمانوں کے پاس اب مزاحمت کے لیے ایک چھری اور چاقو بھی باقی نہیں رہا۔
جب مسلمان احتجاج کے لیے نکلتے تو صرف مسلمانوں کے لیے کرفیو لگا دیا جاتا اور ہندو و سکھ با
آسانی دندناتے پھرتے۔ ہزاروں ہندو و سکھ جتھوں کی صورت میں مسلمان آبادیوں میں داخل
ہوتے اور ان نہتے، بے بس اور تنہا مسلمانوں کو با آسانی اپنی ہوس کا اس طرح نشانہ بناتے کہ تاتاری
بھی ان کی شاگردی پر نازاں ہوں۔ اس کیفیت میں مسلمان فوج اور بالخصوص بلوچ رجمنٹ کا نام
تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف سے لکھا جائے گا جنہوں نے کئی ایک عصمتوں کو لٹنے اور لاتعداد
جانوں کو تلف ہونے سے بچایا تاہم اگر ہماری اس وقت کی قیادت دور بینی سے کام لیتے ہوئے
مسلمانوں کو اس عذاب کے آنے سے پیشتر تیار رہنے کی تربیت دیتی یا بروقت غیر معمولی اقدامات
کیے جاتے تو شاید اس قدر بڑی تباہی سے ایک نوزائیدہ ملک دوچار نہ ہوتا۔ اس کے باوجود جب

کافروں کی طرف سے نعرے لگتے:

جو مانگے گا پاکستان
اس کو دیں گے قبرستان

مسلمان جوش وولولے کے ساتھ نعرے لگاتے:

بٹ کے رہے گا ہندوستان
لے کے رہیں گے پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

ہندوستان کی طرف سے ۱۹۴۷ء سے لے کر تا حال مسلمانوں پر اسی طرح ظلم وجبر جاری ہے۔ مسلمانوں کی اس نسل کشی کو محض فرقہ وارانہ فسادات کا نام دے کر دبا دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں ہونے والا ظلم وستم اور دیگر ہندوستان کے شہروں میں مسلمانوں کا ریاست کی زیر نگرانی منظّم قتل عام اس بات کی واضح دلیل ہے حکومت ہند ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ راشد شاز ہندوستان میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۷ء تک فساد زدہ علاقوں کی ایک اجمالی فہرست اس طرح بیان کرتے ہیں:

آندھرا پردیش: عادل آباد، حیدر آباد، کریم نگر، کرنول، میڈک، نلگنڈا، نظام آباد، رنگا ریڈی۔

آسام: کچھار، درانگ، گول پارہ، کام روپ، نوگونگ۔

بہار: بھاگل، بھوج پور، چمپارن، (مغربی ومشرقی) دربھنگہ، گیا، گریڈیہ، گوپال گنج، ہزاری باغ، مدھو بنی، مونگیر، نالندہ، پٹنہ، پورینہ، رانچی، سنتھال پرگنہ، سیوان، سنگھ بھوم اور سیتھا مڑھی۔

دہلی: سنٹرل دہلی، مشرقی دہلی اور شمالی دہلی۔

گجرات: احمد آباد، بڑودا، بانس کنٹا، بھوچ، جام نگر، جونا گڑھ، کھیدا، پانچ محل، سابر کنتھا اور سورت۔

کیرالہ: کنانور، ملام پورم، ٹریچوی، تریوندرم۔

کرناٹک: بنگلور، بیدر، دھارواڑ، گلبرگہ، کولار، میسور، ساؤتھ کنرا۔

مدھ پردیش: بھوپال، چھندواڑہ، داموہ، جبل پور، کھٹمنڈو، کھارگون، منڈسور، رائے گڑھ، رائے سن، رتلام، ساگر، سیہور، سیونی، شاجاپور، اجین اور ویدشا۔

مہاراشٹر: احمد نگر، آکولا، امراوتی، گریٹر بمبئی، بلڈانہ، ناسک، پربھنی، پونے اور تھانے۔

اڑیسہ: بالاسور اور کٹک۔

راجستھان: بھلواڑہ، چتور گڑھ، جودھ پور، کوٹہ، ناگپور، پالی، اودے پور۔

تامل ناڈو: آرکوٹ (شمال وجنوب) کوئمبٹور، دھرماپور، مدورائی، رمناپورم، تیرونلویلی، ٹرچی۔

یوپی: آگرہ، علی گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بدایوں، بہرائچ، باندہ، بارہ بنکی، بریلی، بستی، بجنور، بلند شہر، دیوریا، فیض آباد، فتح پور، غازیپور، گونڈہ، گورکھپور، جونپور، کان پور، لکھنو، متھرا، میرٹھ، مراد آباد، مظفر نگر، نینی تال، پیلی بھیت، پرتاب گڑھ، رائے بریلی، رام پور، سہارنپور، شاہ جہاں آباد، سیتا پور، وارانسی۔

مغربی بنگال: کلکتہ، مرشد آباد، ندیا، پرگنہ۔(۳۹)

رئیس احمد جعفری جبل پور بھارت میں ۱۹۶۱ء میں ہونے والے مسلمانوں کے کشت وخون کا ذکر کرنے کے بعد ہندو اخبارات کا تجزیہ اس طرح نقل فرماتے ہیں:

> ''نئی دہلی ۲۶ مئی۔ بھارت میں ہر بارہ دن کے بعد ایک مسلمان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ گزشتہ دس برس کے فسادات سے متعلقہ اعداد و شمار کو مدنظر رکھتے ہوئے بھارتی اخبارات نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ بھارت کے کسی نہ کسی علاقہ میں سات روز کے بعد مسلمانوں کے خلاف فساد برپا ہوتا ہے۔ فی الحقیقت بھارت میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا جب کسی نہ کسی مسلمان کو فرقہ وارانہ فسادات میں مجروح

نہ کیا جاتا ہو۔اخبارات نے کہا ہے کہ بھارت میں مسلمان اقلیت کو جن
مظالم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے فی الحقیقت وہ وسیع پیمانہ پر نسل کشی ہے جس کی
تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔''(۴۰)

یہ مظالم قیام پاکستان سے تا حال جاری ہیں اور خاص مقاصد کے تحت ان کی تفصیلات میڈیا پر نشر نہیں کی جاتی۔ان فسادات کی تصاویر اور ویڈیوز با آسانی انٹرنیٹ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔اندرا گاندھی کے دور میں ۱۹۸۱ء میں جب بہار کے فسادات میں مسلمانوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ قتل کیا گیا تو اندرا گاندھی (امن کی دیوی) مسلمانوں کی لاشوں سے اٹھنے والے تعفن سے ناک اور منہ پر کپڑا رکھ کر دورے پر آئیں انہوں نے لاشوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور رپورٹر کے بقول ''تو وہ بھی اپنے آنسو نہیں روک سکیں۔''(۴۱)(۴۲) چند سال قبل آسام، گجرات اور احمد آباد وغیرہ میں ہونے والے فسادات کے مناظر دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔کاش کہ وہ نئی مسلمان نسل جو اپنے دشمن کو دوست سمجھ بیٹھی ہے اور ان کو خود سے بہتر سمجھتی ہے وہ ان حقائق کو جاننے کی کوشش کریں تا کہ ان کی آنکھوں سے بے وقوفی اور معصومیت کی پٹی اترے اور وہ اپنا دفاع کرنے کے قابل ہو سکیں۔ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے منتری ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ مل کر دنیا کے مختلف ممالک سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے لیے بے شمار سیل قائم کیے۔ان میں ہسپانیہ کے سیل کو انتہائی اہمیت تھی۔اس سیل کی زیر نگرانی ایک وفد اسپین بھیجا گیا تا کہ ان تمام اسباب و علل کو جمع کیا جا سکے جن کی وجہ سے اسپین میں مسلمانوں کی سات سو سالہ حکومت زوال کا شکار ہوئی۔پھر ان تمام معلومات کو جمع کرنے کے بعد ان میں جدید اضافے کیے گئے اور ان تمام تجربات کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور نسیاً منسیاً بنانے کی پالیسی تشکیل کی گئی۔تاریخ شاہد ہے کہ جب مسلمان شراب و شباب میں غفلت کی زندگی گزارنے لگیں اور ان میں جہاد ختم ہو جائے تو پھر تباہی و بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔شکیب ارسلان نے زوال امت کے درج ذیل اسباب بیان فرمائے ہیں:

۱۔جانی اور مالی جہاد سے پہلو تہی
۲۔اپنے دین اور قوم سے غداری اور دشمنوں سے وفاداری۔
۳۔جہالت اور کم علمی
۴۔اخلاق کا زوال
۵۔علماء اور حکمرانوں کا زوال
۶۔دردناک بزدلی اور مایوسی
۷۔الحاد پروری اور قدامت پسندی
۸۔اسلامی تہذیب اور اسلام سے بدگمانی (۴۳)

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان نے مکمل طور پر پہلے دن سے ہی ایک نظریاتی جنگ اہل پاکستان پر مسلط کر رکھی ہے۔اسی لیے جب ۱۹۷۱ء میں پاکستان بھارتی و بین الاقوامی سازشوں اور اپنوں کی خیانت سے دولخت ہوا تو اندرا گاندھی نے مسلمانوں سے ایک ہزار سال کا بدلہ لینے اور نظریہ پاکستان کو خلیج بنگال میں ڈبونے کا دعویٰ کیا۔آج بھی آپ تمام پاکستانی چینلز کو ایک ایک کر کے دیکھتے چلیں جائیں آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ اسلامی نظریات کو ختم کر کے مسلمانوں میں الحاد و ذہنی ارتداد کو پروان چڑھانے کے لیے ۲۴ گھنٹے صرف کیے جا رہے ہیں۔مسلمانوں کی اس قدر ذہنی تخریب کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے ذریعہ نجات یعنی اسلام ہی کو اپنے زوال کا سبب سمجھ کر غیروں کی تہذیب کو اپناتے چلے جا رہے ہیں۔

سکھوں نے ہندوؤں کی زیر نگرانی جو مظالم مسلمانوں پر ڈھائے اس کی تفصیل آپ کو آئندہ آنے والے اوراق میں مل جائے گی۔ماسٹر تارا سنگھ نے جنھوں نے سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف تشدد پر ابھارا تھا ۲۴ ستمبر کے اپنے بیان میں اعتراف کیا:

''ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ہمارے سکھ اور ہندو بھائی اس
فرقہ وارانہ جنگ میں مسلمانوں عورتوں اور بچوں پر شرمناک حملوں کے

مرتکب ہوئے ہیں۔'' (۴۴)

ڈیلی میل لندن نے ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لکھا کہ جب سکھوں نے پچاس مسلمانوں کو بے دردی سے دہلی کے پرانے اسٹیشن پر ذبح کیا تو پولیس وہاں کھڑی دیکھتی رہی اور کسی ایک دہشت گرد پر بھی فائر نہیں کھولا گیا۔☆ اللہ تعالیٰ نے سکھوں کو ان کے ہندو بھائیوں کے ہاتھوں ہی جس طرح ذلت و رسوائی سے دوچار کیا وہ دنیا میں ان کے لیے اخروی عذاب کی ایک جھلک بن کر ان کے سامنے آ گیا۔ جب سکھوں کی جانب سے خالصتان کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور ان میں علیحدگی پسند تنظیموں نے جنم لیا تو بھارتی حکومت نے قوت کے ساتھ ان کے اس مطالبہ کو کچل دیا۔ ۳ جون ۱۹۸۴ء میں بھارتی فوج نے امرتسر میں سکھوں کے مقدس ترین مقام گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا جسے بھارتی فوجی تاریخ میں آپریشن بلیو اسٹار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس آپریشن میں ۵۰۰ سے زائد سکھوں کو قتل کیا گیا اور ان کی مذہبی عبادت گاہ کے کئی حصے منہدم کر دیئے گئے۔ اس کے بعد Operation Wood rose کا آغاز کیا گیا جس میں ہزاروں سکھوں کے گھروں میں گھس کر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ (۴۵)

اس آپریشن میں اپنے لوگوں کے قتل عام اور مذہبی مقامات کی توہین کی وجہ سے سکھوں نے اپنا بدلہ اس صورت میں لیا کہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو پرائم منسٹر اندرا گاندھی کو اس کے دو سکھ محافظوں نے اس کے اپنے ہی گھر میں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد سکھوں کو گھروں سے نکال نکال کر ہندوؤں نے خالصتان مانگنے اور اندرا گاندھی کو قتل کرنے کی پاداش میں اتنی بے دردی سے قتل کیا کہ اس کیفیت کو قلم سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ثریا حفیظ الرحمٰن جو ان تمام حالات کی چشم دید گواہ ہیں ان کی کتاب سے چند اقتباسات ذکر کرنا مناسب ہوگا:

''دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب میرے شوہر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے تو دونوں مہمانوں نے بتایا کہ انہوں نے صدر بازار کے ایک گھر سے اپنا کچھ سامان لینا ہے۔ انہوں نے ٹیلی فون کر کے ادھر کے حالات پوچھے تو جواب ملا کہ صدر بازار کے سارے علاقہ میں آتش زنی اور لوٹ مار کا بازار گرم

ہے، سڑکیں سرداروں کی لاشوں سے پٹی پڑی ہیں۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہے۔ اس وقت تو سرداروں کو گھروں سے نکال نکال کر بجلی کے کھمبوں سے باندھ کر زندہ جلایا جا رہا ہے۔''

''خیر جب گھر سے نکلے تو ہر طرف گہرے کالے دھوئیں کے بادل چھا رہے تھے۔ سڑکوں پر جا بجا موٹروں کی شیشوں کی کرچیاں بکھری پڑی تھیں۔ جلی ہوئی کاریں، بسیں، ٹرک، سکوٹر اور آئل ٹینکر راستہ روکے ہوئے تھے۔ سرداروں کی املاک شعلوں کی نذر ہو رہی تھیں، دوکانیں لوٹی جا رہی تھیں اور جگہ جگہ سرداروں کو کھمبوں سے باندھ کر پیٹرول چھڑک کر زندہ جلایا جا رہا تھا۔ کوئلہ ہوئے ٹیکسی سٹینڈز اور ٹیکسیاں شمشان بھومیوں کے مناظر پیش کر رہے تھے۔ سکھوں کو زندہ جلانے کے لیے پٹرول، مٹی کا تیل اور گن پوڈر، بے تحاشہ استعمال ہو رہا تھا۔''

''جمعہ دو نومبر کی رات بہت ہولناک تھی۔ پرانے شہر میں پوری طرح کرفیو لگا ہوا تھا۔ نئی دہلی میں بھی کئی جگہوں پر کرفیو نافذ تھا۔ لیکن ٹرانس یمنا کی حالت تو حشر کے میدان میں یوم حساب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ سکھ چنڈال پوریاں یعنی نو آباد سکھ کالونیاں صفحہ ہستی سے مٹا دی گئی تھیں۔ گلیوں بازاروں میں سکھ خاندانوں کی متعفن لاشیں کتے اور سور بھنبھوڑ رہے تھے۔ بچی کھچی سردارنیاں چیتھڑے لٹکائے پاگل ہو کر سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی تھیں۔ نئی نویلی دلہنوں کے سہاگ لٹ چکے تھے اور غنڈے ان کے جسموں کو نوچ نوچ کر اور کاٹ کاٹ کر کتوں کے آگے ڈال رہے تھے۔ ایسی قتل و غارت گری ہوئی کہ ہر بستی مذبح خانہ بن گئی۔ ٹخنوں تک انسانی خون میں لتھڑے ہوئے ہندو درندے، غول بیابان بن چکے تھے۔ یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ میں صرف ایک عمارت

کے مکینوں کو اس جہان سے رخصت کرنے کی چھوٹی سی خبر لکھ رہی ہوں۔ایک ہی کنبے کے لوگ جو ایک بلڈنگ کے (احاطے) میں اکٹھے ہنستے بستے رہ رہے تھے۔اس احاطے کے اکیس آدمیوں میں سے صرف ایک اسی سالہ بوڑھے کو دانستہ زندہ رکھا گیا۔باقی سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔جوان لڑکیوں کو چماروں کے سپرد کر دیا گیا اور باقی بچوں عورتوں کو کلہاڑیوں ٹوکوں سے ٹکڑے کر کے سوروں اور کتوں کے آگے ڈھیر لگا دیئے گئے''۔(۴۶)

ہندوستان کے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔سری لنکا میں بھارت کا منافقانہ کردار بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔بغاوت کو ہوا دینے اور حکومت کے خلاف باغیوں کی مدد کرنے میں بھارت کا کردار بہت منفی رہا ہے۔سری لنکا میں بھارت کی ایک لاکھ فوج نے تین سے چار ہزار تامل شہریوں کا قتل عام کیا اور لاتعداد تامل عورتوں کی عصمت دری کی۔بھارتی فوجیوں نے اس بربریت کا اظہار کیا کہ خود تامل متشددین نے اعتراف کیا کہ Indian Peace keeping Force, IPKF امن کے بجائے ملک میں دہشت گردی پھیلا رہی ہے۔(۴۷) یہی وجہ ہے کہ جب وزیراعظم راجیو گاندھی نے سری لنکا میں بھارتی فوج دوبارہ بھیجنے پر اپنے الیکشن کی بنیاد ڈالی تو Dhanu نامی ایک تامل کم سن لڑکی نے جس کو کئی بھارتی فوجیوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر اس کے خاندان کو قتل کر دیا تھا،ایک خودکش حملے میں راجیو گاندھی کو قتل کر دیا۔(۴۸)

برما میں مسلمانوں کے حالیہ قتل عام کے پیچھے بھی ہندو ذہنیت ہی کارفرما ہے۔نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق:

میانمار میں ۴۰ لاکھ مسلمانون کو شہید کرنے کا منصوبہ، بھارت کے ملوث ہونے کا انکشاف:

منموہن کے ۲۰۱۲ء کے دورہ کے بعد فسادات شروع ہوئے۔بھارت کے لیے صوبہ ارکان کی عالمی تجارت کے لیے وہی اہمیت ہے جو پاکستان کی گودار پورٹ کے لیے ہے۔بھارتی خفیہ ایجنسیوں کی میانمار میں بڑے پیمانے پر ہتھیاروں کی فراہمی، اب تک ۲ لاکھ مسلمان ،۳۳۰ مساجد

شہید،۱۲۰۰ بستیاں نذر آتش کی گئیں۔

''لاہور(نیوز ڈیسک) بھارت میانمار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے اس مقصد کے لئے جون ۲۰۱۲ء میں بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ نے میانمار کا دورہ کیا ان کے ساتھ انتہا پسند ہندو تاجروں کا ایک وفد بھی شامل تھا۔میانمار کے صوبہ ارکان کی اکثریت کی آبادی ۴۰ لاکھ پر مشتمل ہے۔یہ علاقہ سمندر سے لگتا ہے۔عالمی تجارت کے لیے جو اہمیت گوادر پورٹ کی پاکستان کے لیے وہی بھارت کے لیے صوبہ ارکان کی ہے۔ارکان کا منموہن سنگھ، بھارتی خفیہ ایجنسیوں را،رام اور انتہا پسند ہندو تاجروں نے جائزہ لیا تو انہوں نے بودھ مت حکومت کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو اس صوبہ سے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔چنانچہ منموہن کے ۲۰۱۲ء میں دورے کے ایک ہفتے بعد فسادات میں ۲۰ ہزار مسلمانوں کو پلاننگ کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔شراب اور سور کا گوشت انہیں زبردستی کھلایا جا رہا ہے۔ان کے پیٹ چاک کر کے انتڑیاں درختوں پر لٹکا دی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ بودھ مذہب قبول کرو یا علاقہ چھوڑ دو۔بودھ جہاں مسلمان لڑکیاں دیکھتے ہیں ان کی عزت کا جنازہ نکال دیتے ہیں کئی خواتین عزت کی خاطر دریا میں ڈوب کر اپنی جان گنوا چکی ہیں۔بھارتی خفیہ ایجنسیوں کی ایما پر انتہا پسند ہندوؤں،انتہا پسند بودھ پر مشتمل ماگھ نامی دہشت گرد تنظیم قائم کی گئی ہے جس نے منموہن کے دورے کے بعد علاقے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھ کر مسلمانوں کو بے دخل کرنے کا گھناؤنا منصوبہ تیار کر رکھا ہے جس پر تیزی سے عمل کیا جا رہا ہے،میانمار کے صوبہ ارکان میں بھارتی خفیہ

ایجنسیاں بودھ مت کے پیروکاروں کو ہتھیار فراہم کر رہی ہیں جن سے نہتے بے گناہ معصوم جانوں کا قتل عام جاری ہے۔ گذشتہ دو برس کے دوران دو لاکھ مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ منصوبے کے مطابق یہ پروگرام ۴۰ لاکھ کلمہ گو مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے تک جاری رہے گا۔ ۱۲۰۰ بستیاں نذر آتش، ۳۰۰ سے زائد مساجد شہید، قرآن پاک کی بے حرمتی، خواتین کو وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پناہ کے لیے جنگلوں میں جانے والوں کو راستے میں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا۔ سینکڑوں خواتین سے پوجاریوں کی زیادتی، حاملہ خواتین کے پیٹ چاک، زندہ بچے نکال کر آگ میں پھینک دیئے گئے''۔ (۴۹)

اس وقت پوری اسلامی دنیا حالت جنگ میں ہے۔ ان کی جان، مال، عزت اور دین کا جنازہ نکالا جا رہا ہے۔ اس حالت میں روئے زمین کے مسلمانوں کو قوم پرستی، لسانیت اور رنگ و نسل کے اختلافات کی بنیاد پر جمع نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ اور حال سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہنود و یہود مسلمانوں کے خلاف ایک ملت ہیں۔ ہجرت آزادی میں مشرکین اور سکھوں نے بلا تفریق فرق و مسالک مسلمانوں کا قتل عام صرف اس لیے کیا کہ وہ مسلمان تھے۔ آج بھی ان کا قتل عام اسی علت کی بنا پر مختلف ممالک میں کیا جا رہا ہے۔ دشمن کی تلوار مسلمان کو قتل کرنے سے قبل اس کا مسلک و مذہب یا فرقہ نہیں پوچھتی ان کے لیے قابل گردن زنی ہونے کے لیے کلمہ گو ہونا ہی کافی ہے۔ اگر مسلمان آج بھی اپنی بقا چاہتے ہیں تو انہیں کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ پر جمع ہونا پڑے گا تا کہ اس رشتہ ایمان میں منسلک ہونے کے بعد یہ ایک دوسرے کے درد و تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے اپنے دفاع اور معیشت کو ایک کر لیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

و مالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ و المستضعفین من الرجال و النساء و الولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من

ھذہ القریۃ الظالم اھلھا و اجعل لنا من لدنک ولیا و اجعل لنا من لدنک نصیرا (۵۰)

''اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں (غلبۂ دین کے لیے) اور ان بے بس (مظلوم و مقہور) مردوں، عورتوں اور بچوں (کی آزادی) کے لیے جنگ نہیں کرتے جو (ظلم و ستم سے تنگ ہو کر) پکارتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جہاں کے لوگ ظالم ہیں اور کسی کو اپنی بارگاہ سے ہمارا کارساز مقرر فرما دے، اور کسی کو اپنی بارگاہ سے ہمارا مددگار بنا دے۔''

اگر ہم نے اللہ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کیا تو نتیجتاً ایک ایک کر کے تمام اسلامی ممالک کفر کے قدموں تلے روند دیئے جائیں گے اور ہمارا اپنا حال بھی ان سے مختلف نہ ہوگا۔ تمام عالم اسلام کو ایک کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان کو دشمن کا اصل چہرہ دکھا دیا جائے تا کہ مسلمان ایک دوسرے کے حالات سے بھی آگاہ ہوں۔ یہ عمل مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ان کو بنیان مرصوص بنانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ہم پاکستانی میڈیا کے مجموعی رویہ سے مایوس ہیں۔ اس لیے سوشل میڈیا یا دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلمانانِ عالم کا ایک دوسرے کے احوال سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ہجرت آزادی کے حقائق و واقعات میں مسلمانوں کے لیے درس عبرت ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دور ان کے عروج سے شروع ہوا اور مغلیہ سلطنت کے اختتام پر ختم ہوا۔ دوسرا دور جنگ آزادی سے شروع ہو کر تحریک پاکستان اور قیام پاکستان پر ختم ہوتا ہے۔ ہجرت آزادی میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام اور ان کا بے گھر و بے آبرو ہونا ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی غفلت اور عیاشی کا ثمرہ ہے۔ مسلمانوں نے دعوت و تبلیغ پر بھی خاص توجہ نہیں دی کہ اپنی حکومت کی مدت مدید میں ہی ان کے دماغوں کو اسلام کی عظمت کا قائل اور ان کے دلوں کو اس پیغام کی طرف مائل

کرلیا جاتا۔آئندہ اوراق میں بکھری مسلمانوں کے خون سے لکھی گئی داستانیں یہ سبق سکھاتی ہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنے مردوں،عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو فوجی تربیت دیں اور انہیں تیار رکھیں تاکہ بوقت ضرورت کم از کم اپنا دفاع کرنے کے قابل ہوں سکیں۔تعلیمی اداروں میں ایسا نصاب ترتیب دیا جائے کہ نئی مسلمان نسل میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی محبت پیدا ہو اور وہ کسی مشرک یا یہودی کو اپنا آئیڈیل بنانے کے بجائے اپنے قومی اور اسلامی ہیروز کی اتباع کرنے میں فخر محسوس کریں۔شہدائے پاکستان کے خون کا تقاضا ہے کہ ان کے پاکیزہ خون سے محمد بن قاسم،محمود غزنوی اور سلطان ٹیپو کی داستان رقم کرنے والی نئی نسل تیار کی جائے۔ہندو قوم کی صفت یہ ہے کہ وہ ہر طاقتور شے کی عبادت کرتی ہے اور کمزور ونحیف کو ملیچھ سمجھ کر کچل دیتی ہے۔بغل میں چھڑی اور منہ میں رام رام اس کا طرۂ امتیاز ہے۔اس لیے اس دشمن سے کبھی بھی خود کو غافل نہ رکھیں جس کا گٹھ جوڑ یہود کے ساتھ ہے۔

ہمارے نبی مکرم محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہندوستان کے فتح ہونے کے بشارت عطا فرمائی ہے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

> ''رسول اللہ ﷺ نے ہم سے غزوۂ ہند کا وعدہ فرمایا ہے۔پس اگر میں نے اس غزوہ کو پایا تو میں اس میں اپنی جان اور اپنا مال خرچ کردوں گا۔اگر مجھے قتل کردیا جائے گا تو میں سب سے زیادہ فضیلت والے شہداء میں سے ہوں گا اور اگر میں لوٹ آؤں گا تو میں (آگ) سے آزاد کیا ہوا ابو ہریرہ ہوں گا۔(۵۱)

اسی باب میں ایک حدیث حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں فرمایا:

> میری امت میں دو گروہ ایسے ہیں جنہیں اللہ نے (جہنم) کی آگ سے محفوظ رکھا ہے۔ایک وہ گروہ جو ہند پر حملہ کرے گا اور دوسرا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ ہوگا۔(۵۲)

> حضرت نعیم بن حماد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ ہند کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:''تمہارے لیے ایک لشکر ضرور ہند پر حملہ کرے گا۔اللہ ان کو فتح عطا فرمائے گا یہاں تک کہ وہ ان کے بادشاہوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر لائیں گے۔اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرمائے گا پھر وہ لوٹیں گے۔جب ان کا لوٹنا ہوگا تو وہ ابن مریم علیہما السلام کو شام میں پائیں گے۔''(۵۳)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی بشارت کے مطابق ہند ضرور فتح ہوگا۔اس بشارت میں ہر وہ مسلمان فوج شامل ہے جو ہندوستان کے اہل شرک سے کسی بھی زمانے میں اس نیت سے برسر پیکار ہوتا ہم مجموعی طور پر غزوہ ہند سے متعلق احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی فتح سے قبل بیت المقدس فتح ہوگا اور پھر اس کے بعد غزوۂ ہند ہوگا۔ہماری رائے میں اس لیے مسلمان فوجوں کو پہلے بیت المقدس فتح کرنا چاہئے۔فتح مکہ سے قبل بھی خیبر کے یہودیوں کو لگام دی گئی تھی۔ایک اور حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> **و خراب السند من الهند و خراب الهند من الصين (۵۴)**
>
> یعنی سندھ کی خرابی ہند سے ہے اور ہند کی خرابی چین سے ہے۔

گویا کہ اس حدیث کی روشنی میں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی خارجہ پالیسی پر بھی غور کریں کیونکہ پاکستان میں نبی کریم ﷺ کے زمانے کے سندھ میں خرابی کا ذمہ دار ہندوستان ہی ہے اور حالات یہ ثابت کررہے ہیں کہ چین کی دوستی ہندوستان کی خرابی کا سبب رہی ہے۔(۵۵)

ہم نے اس کتاب میں ہجرت آزادی کی سچی کہانیوں کو ایک جگہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ہماری نئی نسل کو معلوم ہو کہ پاکستان کس قدر قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے اور وہ شب قدر میں ملنے والی اس نعمت کی قدر کریں۔پاکستان ہمارے لیے بہت اہم ہے کیوں کہ ہم نے یہاں دفن ہونا ہے اور ہماری آنے والی نسل کا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ہم امید

کرتے ہیں کہ ان واقعات کا پڑھنا نئی پود کی ذہنی سمت کو تبدیلی کرنے اور ان کو غور وفکر پر مجبور کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ آخر میں ہم نے اورنگزیب کے عدل وانصاف کا ایک واقعہ بھی علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ کی کتاب سے نقل کیا ہے تا کہ قارئین مسلمانوں پر ظلم وستم کے ان واقعات کو پڑھنے بعد اندازہ کرسکیں کہ ہندوستان میں مسلمان حکمران ہندوؤں کے ساتھ کس قسم کا عادلانہ برتاؤ رکھا کرتے تھے۔ اس کتاب کا انتساب غزوۂ ہند میں شریک ہونے والے ہر اس سپاہی کے نام ہے جس کی راہ تکتے تکتے ہندوستان کے مظلوم انسانوں کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں۔ شاید یہ چند واقعات ان لوگوں کے دل ودماغ میں زلزلہ پیدا کرسکیں جنہیں اللہ نے اس غزوۂ ہند کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اللہ رب العزت اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائے اور راقم کو بارگاہ رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم میں اذنِ حضوری نصیب ہو۔

وماعلینا الا البلاغ

عمیر محمود صدیقی نقشبندی

۴ جولائی ۲۰۱۳ء

المرکز الاسلامی، نارتھ ناظم آباد بلاک بی کراچی

btm1432@gmail.com

حواشی

(۱) تفسیر قرطبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، المکتبۃ الشاملۃ: ج:۶/ص:۳۳۸

(۲) مشارع الاشواق الی مصارع العشاق، امام احمد بن ابراہیم، المشہور بابن نحاس، دار البشائر الاسلامیۃ، طبعہ ثالثہ، ۱۴۲۳ھ: ص:۹۱۸۔۹۱۹،

(۳) تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، المیزان، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۸ء: ج:۱/ص:۴۶

(۴) تاریخ فرشتہ: ج:۴/ص:۶۵۵ تا ۶۵۹

(۵) تاریخ الاسلام، امام شمس الدین ذہبی، المکتبۃ الشاملۃ: ج:۶/ص:۳۶

(۶) تاریخ فرشتہ: ج:۴/ص:۹۱

(۷) غزوہ ہند، عمیر محمود صدیقی، ادارہ تحقیقات اہل سنت، راولپنڈی، پاکستان، اشاعت اول جنوری ۲۰۱۲ء: ص: ۱۲ تا ۱۵

(۸) تاریخ کلیسیائے ہندو پاک، پادری برکت، نیشنل کونسل آف چرچز ان پاکستان، ۳۲۔بی شارع فاطمہ جناح۔لاہور، باردوم جنوری ۲۰۱۰ء: ج:۴/ص ۳۰۶

(۹) تاریخ کلیسائے پاکستان، ایس۔کے۔داس، جے۔ایس۔پبلیکیشنز، بیسمنٹ لودھی آرکیڈ۔۴۲ فیروز پور روڈ لاہور، پاکستان، تیسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۹۶ء: ص: ۶۷

(۱۰) تاریخ کلیسیائے ہندو پاک: ج:۴/ص ۳۰۱

(۱۱) حجاز ریلوے، نسیم احمد، الفیصل ناشران وتاجر کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور: ص:۲۲۱

(۱۲) المائدۃ:۸۲

(۱۳) کتاب الہند، ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، مترجم: سید اصغر علی، الفیصل ناشران وتاجر کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور: ص:۲۰ تا ۲۳

(۱۴) کتاب الہند: ص:۱۰۸

(۱۵) کتاب الہند: ص:۱۰۹۔۱۱۰

(۱۶) کتاب الہند: ص:۴۷۷۔۴۷۸

(۱۷) جس دیش میں گنگا بہتی ہے، ثریا حفیظ الرحمٰن، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء: ص:۲۵

(۱۸) جس دیش میں گنگا بہتی ہے: ص:۱۰۱

(۱۹)قائد اعظم کے تصور کا پاکستان، پرویز،طلوع اسلام ٹرسٹ ،بی ۲۵ گلبرگ ،لاہور،اشاعت دوم اکتوبر ۱۹۹۶ء:ص:۲۳۹

(20)Muhammad Asad, This Law of Ours, What do we mean by Pakistan, Islamic Book Trust, Kaula Lumpur 2001, Page 71

(21)Speeches and Statements of Iqbal, compiled by Shamloo, Qibal Publications, Multan Road Lahore, page 35, 36

(22)Genesis 15:18-21

(23)http://www.jewishvirtuallibrary.org/jsource/Zionism/pinsker.html

If we would have a secure home, give up our endless life of wandering and rise to the dignity of a nation in our own eyes and in the eyes of theworld, we must, above all, not dream of restoring ancient Judaea. We must not attach ourselves to the place where our political life was once violently interrupted and destroyed. The goal of our present endeavors must be not the "Holy Land," but a land of our own. We need nothing but a large tract of land for our poor brothers, which shall remain our property and from which no foreign power can expel us. There we shall take with us the most sacred possessions which we have saved from the ship-wreck of our former country, the God-idea and the Bible . It is these alone which have made our old fatherland the Holy Land, and not Jerusalem or the Jordan. Perhaps the Holy Land will again become ours۔

(24)http://www.jewishvirtuallibrary.org/jsource/Zionism/herzl2b.html

(۲۵)آل عمران:۱۹۵

(۲۶)پاکستان ناگزیر تھا،سید ریاض حسن،شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ،جامعہ کراچی،پاکستان،اشاعت چہارم اگست۱۹۸۴ء،ص:۵۴۷

(۲۷)عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن،کیمبل جانسن،مترجم،یونس احمرایم۔اے،نفیس اکیڈمی،بلاسس اسٹریٹ،کراچی، پاکستان،طبع سو،،اگست۱۹۶۶ء،:ص:۲۳۰

(۲۸)الکھ نگری،ممتاز مفتی،الفیصل ناشران وتاجرکتب،غزنی سٹریٹ اردو بازارلاہور،مارچ۲۰۱۰ء:ص:۱۹

(۲۹)۱۹۴۷ء کے آنسو،سید مصطفی علی بریلوی،اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی،۱۔جے۔۱۰/۴۵۔شاعرسید الطاف علی بریلوی،ناظم آباد،کراچی۷۴۶۰۰:ص:۱۹تا۳۵

(۳۰)۱۹۴۷ء کے آنسو:ص:۲۸۵

(۳۱)خون کی ہولی:رئیس احمد جعفری،مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازارلاہور:ص:۲۲۶۔۲۲۷

(۳۲)اخراج اسلام از ہند،مرتضٰی احمد خان،تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور،مارچ۱۹۴۸ء:ص:۷۸

(۳۳)قائداعظم جناح،جی الانہ،مترجم:رئیس امروہی،فیروز سنز لاہور:ص:۵۰۵

(۳۴)قائداعظم جناح:ص:۵۰۶۔۵۰۵

(35)Hector Bolitho , Jinnah, Creator of Pakistan, London John Murray Albemarle Street W, March 1957, page:189

(۳۶)جب امرتسر جل رہا تھا،خواجہ افتخار،الحمد پبلیکیشنز،لیک روڈ لاہور،اشاعت۲۰۱۰ء،ص:۲۶۵

(۳۷)جب امرتسر جل رہا تھا،خواجہ افتخار،ص:۲۶۶

(۳۸) ظہور پاکستان،چودھری محمد علی،مترجم:بشیر احمد ارشد،مکتبہ کارواں،کچہری روڈ،لاہور،:ص۳۱۳

(۳۹)ہندوستانی مسلمان،راشد شاز،انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز،علی گڑھ و جامعہ نگر نئی دہلی،اشاعت ۱۹۹۹ء:ص:۶۷۔۶۸

(۴۰)خون کی ہولی:رئیس احمد جعفری،مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ چوک اردو بازارلاہور:ص:۲۸

(۴۱)۱۹۴۷ء کے آنسو:ص:۲۷۵

(۴۲)عظیم قائد عظیم تحریک،ولی مظہر ایڈوکیٹ،شعبہ نشرواشاعت شہری مسلم لیگ ملتان،جلد نمبر:۱،ص:۵۵۳

(۴۳)اسباب زوال امت،شکیب ارسلان،مترجم:ڈاکٹر احسان بک سامی حقی،دعوۃ اکیڈمی،بین الاقوامی اسلامی

یونیورسٹی پوسٹ بکس ۱۴۸۵، اسلام آباد، ISBN:969-556-015-6، ملخصاً

(۴۴) جناح پیپرز: ج:۵/ص:۵۰، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۳ء، پاکستان۔کرب تخلیق، مدیر اعلیٰ زروار حسین زیدی، تلخیص وترجمہ سید نصرت اللہ شاہ، قائداعظم پیپرز پروجیکٹ کلچر ڈویژن حکومتِ پاکستان، اسلام آباد

(45)Robert A.Pape, Dying to Win, 2006 Random House Trade Paperback, United States of America, ISBN 0-8129-7338-0, Page: 156

(۴۶) جس دیش میں گنگا بہتی ہے: ص:۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۵

(47)Robert A.Pape, Dying to Win, 2006 Random House Trade Paperback, United States of America, ISBN 0-8129-7338-0, Page: 152

(48)Robert A.Pape, Dying to Win, 2006 Random House Trade Paperback, United States of America, ISBN 0-8129-7338-0, Page: 226

(۴۹) نوائے وقت۔ بروز ہفتہ، یکم جون ۲۰۱۳ء، ص:۶

(۵۰) النساء:۷۵

(۵۱) سنن النسائی، الامام احمد بن شعیب النسائی، المصباح پبلیشرز، پاکستان: باب غزوۃ الہند

(۵۲) سنن النسائی، باب غزوۃ الہند

(۵۳) الفتن، امام حافظ نعیم بن حماد نعیم بن حماد، دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، ۱۴۲۵ھ: رقم الحدیث:۱۱۵۰

(۵۴) التذکرۃ، امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری القرطبی، دار السلام، قاہرہ، طبعہ ثانیہ ۱۴۲۹ھ: ص:۶۴۸

والنہایۃ فی الفتن والملاحم، امام ابوالفداء اسماعیل بن کثیر، دار الحدیث قاہرہ: ص:۵۷

والسنن الواردۃ فی الفتن، امام ابوعمرو دانی،: رقم الحدیث:۴۵۷، بیت الافکار الدولیۃ

(۵۵) اس حوالہ سے راقم کی تحریر غزوۂ ہند کا مطالعہ کیا جائے۔

☆The Tragedy of Delhi(Through the Neutral Eye) D.M. Malik, Dec 30, 1947, page 11

ہم نے پاکستان کیسے بنایا؟

(مسلمانانِ ہند کے خون سے لکھی گئی ہجرت آزادی کی سچی داستانیں)

بہار کی تباہی

شمیم جالندھری

پولنگ کا نتیجہ دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ پنجاب میں وزارت مسلم لیگ ہی کی بنے گی۔ مگر مسلمانوں کے اپنے انتشار اور ڈیڑھ اینٹ کی سیاسی مسجدوں نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ ہماری اجتماعی قوت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ادھر ہندو کسی بھی قیمت پر پنجاب میں مسلمانوں کی وزارت کے متحمل نہ تھے۔ کیونکہ یوپی۔ بنگال اور سرحد میں کانگریس کی وزارتیں بن چکی تھیں۔ لہذا کانگریس کے ایماء پر پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے دیگر سیاسی پارٹیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک مخلوط وزارت قائم کر لی اور مسلم لیگ اتنی اکثریت میں انتخاب جیتنے کے باوجود بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔ جن جن علاقوں میں کانگریس کی وزارت قائم ہوئی تھی وہاں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آئے دن فرقہ وارانہ فساد ہونے شروع ہو گئے تھے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو نواکھلی گڑھ مکتیشر میں فرقہ وارانہ فساد کی بڑی خوفناک آگ بھڑک اٹھی جو کلکتہ، بمبئی، یوپی اور سی پی کے فساد کی بازگشت تھی۔ نواکھلی کے تھوڑے سے جی دار مسلمانوں نے بھی بڑی پامردی سے کام لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو مار دھاڑ کا جو سلسلہ ہندوؤں نے خود ہی اپنایا تھا۔ جب ''جواب عرض ہے'' کا معاملہ سامنے آیا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگے۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی ''ہندو شرناتھیوں'' کے لئے اتنے ہیکل ہوئے کہ بہ نفس نفیس ''نواکھلی'' جا پہنچے۔ اور پھر اس طرح دھرنا مار کر بیٹھے کہ اٹھنے کا نام ہی نہ لیا۔ انہوں نے ''ہندو جاتی'' کے گھروں کی ویرانی کا اتنا گہرا سوگ منایا کہ ان کی دوبارہ آبادکاری کے لئے ''مرن برت'' رکھ لیا۔ وہ ہر قیمت پر ہندوؤں کو دوبارہ وہیں آباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ حکومت، کانگریس اور پریس سب گاندھی جی کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ جملہ ہندو اخبارات نے گاندھی جی کے مہاتما پن کے وہ راگ الاپے کہ ان کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور سونے جاگنے کی تفصیل میں پورے پورے کالم سیاہ کرنے شروع کر دیئے۔ دراصل ہندو یہ چاہتے تھے کہ جس طرح بھی بن پڑے دنیا والوں کی

آنکھیں اور کان گاندھی جی کے مہاتما پن کی طرف لگائے رکھیں۔ اور اپنے جابرانہ منصوبوں کو اس طرح پایہ تکمیل تک پہنچائیں کہ مسلمانوں کو اس امر کی مطلق خبر نہ لگ سکے کہ مستقبل قریب میں ہندو ان کی جسارت کی انہیں کیا سزا دینا چاہتے ہیں۔ نواکھلی میں تھوڑے سے ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے جو معمولی اذیت پہنچی تھی۔ اس پر پوری ہندو جاتی سیخ پا ہو رہی تھی۔ کیونکہ شرناتھیوں سے زیادہ گاندھی جی واویلا کر رہے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کے اعلان ''راست قدم'' پر کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد کا بہانہ کر کے ہندو سکھوں نے مل کر اچانک اسلامیان ہند پر وہ قیامت توڑی کہ دریائے ''ہنگلی'' کا پانی مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ ان گنت مسلمانوں کو بے خبری کے عالم میں بے دست و پا کر کے قتل کیا گیا۔ اور ان پر ایسے ایسے مظالم روا رکھے گئے جس سے انسانیت کی اجلی پیشانی داغدار ہو گئی۔ اس کے بعد ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو ''یوم ماتم'' کے موقعہ پر بمبئی میں پھر یہی خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ مسلمانوں کی اس تباہی کے لئے ہندوؤں نے سکھوں کو کرائے پر خرید رکھا تھا۔ جنہیں اپنی ''کرپان'' اور ''جھٹکے'' پر بڑا ناز تھا۔ بلاشبہ انہوں نے مسلمانوں کا جھٹکا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ایک طرف گاندھی جی کی تمام ''ادم شانتی'' کی صدا بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ جس نے عوام کے خیالات کا دھارا ''نواکھلی'' کی طرف موڑے رکھا۔ دوسری طرف ''کالی دیوی'' کے پجاری ''بہار'' میں مسلمانوں کے لئے مکمل تباہی کا پروگرام ترتیب دیتے رہے۔ جس میں تمام سکھ ''ریاستیں''، راشٹریہ سیوا سنگ، اکالی دل، ہندو مہا سبھا اور کانگریس یہ سب پارٹیاں بڑے جوش و خروش سے سرگرم عمل تھیں۔ مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے ہر ممکن ذرائع مکمل کرنے کے بعد ہندوؤں نے ''یوم نواکھلی'' منانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو بہار میں پٹنہ کے مقام پر ہندوؤں نے ''یوم نواکھلی'' کے سلسلہ میں ایک بہت بڑے اجتماع کا انتظام کیا۔ جس میں نواکھلی کے ہندوؤں کی مظلومی اور مسلمانوں کے مظالم کی بیشمار من گھڑت داستانیں بیان کی گئیں۔ اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ ساری فضا مسموم ہو کر رہ گئی۔ نتیجتاً طے

شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن کا سورج نکلنے سے پہلے پٹنہ اور اس کے گردونواح کے دیہاتوں میں بیک وقت ہندو اور سکھوں کے مسلح جتھوں نے نہتے مسلمانوں پر اچانک یلغار کردی۔ اور چشم زدن میں بڑے منظّم طریق پر کشت وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ سکھوں کی بہت بڑی جمعیت اس تخریبی کاروائی میں ماردھاڑ پر معمور تھی۔ جملہ ہندو اور سکھ ریاستوں کے جنگ جو افراد پیدل وگھڑسوار فوجی جو سامان جنگ سے پوری طرح لیس تھے حشرات الارض کی طرح ہر طرف پھیل گئے۔ بلوائیوں نے اپنے مرتب شدہ پروگرام کے مطابق دیہاتی آبادیوں کو گھیر لیا۔ اور پھر ڈھول بجاتے اور نعرے لگاتے گھوڑے اور ہاتھیوں پر سوار آتشی اسلحہ کے ذخائر ہمراہ لئے بے خبر نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ بلوائی پہلے تو فائرنگ کرکے لوگوں کو گھروں میں پناہ لینے کے لئے مجبور کردیتے اور پھر گھیرا تنگ کرنا شروع کرتے۔ جب مسلمانوں کی پھیلی ہوئی آبادی تھوڑی سی جگہ میں سمٹ جاتی تو اس علاقے میں پٹرول چھڑک کر آگ لگا دیتے۔ اول تو گھرے ہوئے مسلمان انہیں آتشکدوں میں جل کر بھسم ہوجاتے۔ لیکن اس کے باجود جو لوگ جان پر کھیل کر مقابلے کے لئے سامنے آجاتے تو انہیں سکھوں کی خون آشام کرپانیں اور فوجیوں کی گولیاں فوراً موت کے گھاٹ اتار دیتیں۔ اس دوران ہندوؤں کے مقرر کردہ غنڈے مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر تمام زر ومال لوٹ لیتے۔ معصوم بچوں کو ماؤں کی گود سے زبردستی چھین کر انہیں سنگینوں پر اچھالتے یا میخوں سے دیواروں پر گاڑ دیتے۔ بوڑھوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان پر کتے چھوڑ دیتے۔ بے بسی سے مرنے والوں کی جانکنی کا تماشا دیکھتے۔ خوش ہوہوکر ''بجرنگ بلی'' کے نعرے لگاتے۔ جوان عورتوں اور نا کتخدا لڑکیوں کو بالوں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گھروں سے باہر لے آتے۔ اور پھر کھلے میدانوں میں ان کی بے عزتی کرتے۔ لباس تار تار کرکے انہیں برہنہ رقص پر مجبور کرتے نافرمانی پر سنگینیں مار مار کر ان کا جسم چھلنی کردیتے۔

۱۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء سے لیکر ۴ نومبر ۱۹۴۶ء تک بہار کے حکام نے اس تباہی اور بربادی اور خوں ریزی کی ایک خبر بھی اپنے علاقے سے باہر نہ نکلنے دی کیونکہ بلوائیوں نے حملہ کرنے سے

پہلے تار کے ذرائع اور ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے تھے۔ اور جگہ جگہ سے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی تھیں۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کرکے آمدورفت وپیغام رسانی کے تمام ذرائع منقطع کردیئے تھے۔ رہی سہی گذرگاہوں کی بھی مکمل طور پر ناکہ بندی کررکھی تھی۔ گویا حکومت نے بہار میں بلوہ کرنے والوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی تاکہ نہتے مسلمانوں پر من مانا تشدد کرسکیں۔ مسلسل ہفتہ بھر تک بے پناہ تباہی کے باعث جب مسلمان اکثریت والے تمام علاقے خالی ہوگئے۔ تو اس کے بعد اخبارات نے بہار کی تباہی کا اعلان کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ ''بہار کے دیہات میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے ہیں''۔ ادھر گاندھی جی نواکھلی میں بیٹھے ''ہنوز رام نام'' جپ رہے تھے۔ ادھر ان کے چیلے چانٹوں نے بہار کے مسلمان کی مکمل بیخ کنی کرڈالی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد جب یہ ہولناک خبریں دوسرے صوبوں میں پہنچیں تو رضا کار اور مسلم لیگی کارکن پٹنہ پہنچے تو انہوں نے ایسے ہولناک مناظر دیکھے جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ مسلمانوں کے سینکڑوں دیہات میں سے کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں بچا تھا۔ جو اس ظلم وتشدد کا آنکھوں دیکھا حال بتاسکتا تمام راستے سڑکیں اور گلیاں مسلمانوں کی بے کفن لاشوں سے اٹی پڑی تھیں۔ جنہیں آوارہ کتے اور گدھ نوچ نوچ کر کھارہے تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں خانماربرباد لوگ اپنے آبائی گھربار چھوڑ کر دوردراز علاقوں میں پناہ کے لئے بھٹکتے پھرتے۔ مگر حکومت بہار اس ہولناک منظر کی طرف سے آنکھیں بند کئے چپ سادھی بیٹھی تھی۔

پنجاب اور دوسرے علاقوں سے پہنچے ہوئے مسلمان رضا کاروں نے خود ہی بے گھر لوگوں کے لئے پناہ گاہیں بنائیں۔ اور تندہی سے ریلیف کا کام شروع کردیا۔ پنجاب مسلم لیگ نیشنل گارڈ رضا کاروں کے بے شمار وفد بہار جا پہنچے۔ اور رات دن تباہ حال مسلمانوں کی بحالی کے کام میں مصروف ہوگئے۔ مسلمانوں کی گلی سڑی عریاں لاشوں کو اٹھانے اور دفنانے کا کام بھی انہی لوگوں نے سرانجام دیا۔ پنجاب مسلم لیگ خواتین کمیٹیوں نے بھی اپنی بساط کے مطابق بہار میں ویلفیئر کا کام کیا۔ لاہور سے فاطمہ بیگم صدر زنانہ پروونشل مسلم لیگ کی معیت میں بہت سی خواتین

بہار پہنچیں اور وہاں سے واپسی پر خواتین کا وفد بہار کے بہت سارے مہاجرین کو اپنے ہمراہ لاہور لے آیا۔ زنانہ مسلم لیگ نے نواں کوٹ ملتان روڈ پر ''بہار کالونی'' کے نام سے ایک مہاجر کالونی ترتیب دی۔ جس کی زمین اور مکانیت سب کچھ مسلم لیگی خواتین اور مخیّر لوگوں کا مرہون منت تھا۔ کیونکہ رضا کار اور کارکن خواتین نے باہم مل کر ان بے گھر مہاجر مسلمانوں کے لئے بہت سا چندہ جمع کیا۔ پھر اس روپے سے ضرورت کے مطابق کوارٹر تعمیر کروائے گئے اور ان سب بہاری مسلمانوں کو یہاں یکجا آباد کر دیا۔ اور ان کے گذر بسر کے لئے مناسب اقدام کئے۔

ضلع لدھیانہ، فیروز پور، اور امرتسر وغیرہ سے خواتین کا کوئی وفد بہار نہیں پہنچا۔ البتہ مسلم لیگ خواتین کمیٹی جالندھر نے اس المیہ کو بے طرح محسوس کیا۔ اور محض احتجاجی جلسوں اور قراردادوں کی زبانی اور کاغذی کاروائی پر اکتفانہ کرتے ہوئے ''بہار'' میں خواتین کا ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا جو پانچ خواتین پر مشتمل تھا۔

۱۔ بیگم غلام دستگیر صاحب ایڈوکیٹ نائب صدر خواتین مسلم لیگ کمیٹی جالندھر

۲۔ شمیم جالندھری۔ جنرل سیکرٹری خواتین مسلم لیگ کمیٹی جالندھر

۳۔ بیگم میاں احسان الحق صاحب سیشن جج۔ خزانچی خواتین مسلم لیگ کمیٹی جالندھر

۴۔ آنسہ کشور بنت شیخ اقبال ایڈوکیٹ۔ معاون سیکرٹری خواتین مسلم لیگ کمیٹی جالندھر

۵۔ بیگم ملک صاحبہ ممبر ایگزیکٹیو خواتین مسلم لیگ کمیٹی جالندھر۔

بہار کے ستم رسیدہ افراد کے لئے گرم و سرد لباس۔ کمبل، بستر اور بہت سی ادویات اکٹھی کیں۔ انتظام کرنے کے بعد روانگی کا وقت بھی متعین کر لیا۔ اسی دوران موسم سرما کی بارش کا آغاز ہو چکا تھا۔ کئی دنوں کے لئے جھڑی لگ گئی۔ چھاجوں پانی برسا۔ اور گلی کوچے جھیلوں کے مناظر پیش کرنے لگے۔ خنک ہوا کے دوش پر آنے والی برفانی لہر نے سب کچھ منجمد کر دیا۔ بارش کے ساتھ اولوں کی بوچھاڑ نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ سردی کی شدت نے نزلہ بخار، نمونیے کو دعوت دے ڈالی۔ جس نے گھر گھر بسیرا کر لیا۔ روانگی کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔ مگر جملہ خواتین

میں سے اس وقت ایک خاتون بھی اپنی گھریلو ذمہ داریوں، بیماروں کی تیمارداریوں کے باعث سفر کے قابل نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود راقم الحروف تن تنہا ہی اس سفر پر روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا اس دن جالندھر مسلم لیگ کے چند عہدہ دار رضا کاروں کے علاوہ ڈاکٹر ولی محمد سیکرٹری سٹی مسلم لیگ جالندھر نیشنل گارڈ کے بارہ رضا کاروں کو ہمراہ لئے ''پٹنہ'' جا رہے تھے۔ لہذا ہم سب جالندھر سے ایک ہی ٹرین میں سوار ہوئے۔ میرے ہمراہ میری ذاتی خادمہ ''جینا'' بھی شریک سفر تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر شہر کے معززین نے ہمیں ''خدا حافظ'' کہا۔ یہ لمبا اور طویل سفر بخیر و خوبی گذر گیا۔ آخر تیسرے دن ہم لوگ پٹنہ پہنچے تو مسلم لیگ کے کارکن رضا کاروں نے ہمیں سارے کیمپ دکھائے۔ جہاں بے گھر مسلمانوں کو پناہ دی گئی تھی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے عموماً اور پنجاب کے خصوصا بہت سے کارکن ان کیمپوں میں رات دن انتھک کام کر رہے تھے۔ رات دن مصیبت زدگان کو کیمپوں میں پہنچانا۔ بیماروں کی دیکھ بھال خوراک و لباس کی فراہمی۔ اور بے گور و کفن لاشیں اکٹھی کر کے انہیں سپرد خاک کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل تھا۔ اس انہماک میں انہیں اپنے سر و پا کا ہوش تک نہ تھا۔ دردمند و صاحب ثروت اور بے شمار سرکردہ مسلمان بہار کے مسلمانوں کے دکھوں میں برابر کے شریک تھے۔ لاہور سے ایم کے میر صاحب اور امرتسر سے شیخ صادق حسن صاحب رضا کاروں کی تنظیم کے کرتا دھرتا تھے۔ چونکہ جالندھر کی طرف سے راقم الحروف خواتین کی تنہا نمائندہ تھی۔ لہذا مجھے بھی مردانہ گروپوں کے ہمراہ جا کر تمام تباہ شدہ علاقے دیکھنے پڑے۔ شیخ صادق حسن صاحب چونکہ مردانہ گروپوں میں سب سے زیادہ پختہ کار اور عمر رسیدہ تھے۔ لہذا میری جائے نشست بمعہ میری خادمہ کے ہمیشہ شیخ صاحب موصوف کی جیپ یا ٹرک میں مخصوص ہوتی تھی۔ متواتر چھ دن تک ہم لوگ پٹنہ کے گرد و نواح کے برباد شدہ علاقے دیکھتے رہے۔ ہر جگہ ہم نے تباہی و بربادی کا ایک ہی طرح کا بھیانک منظر دیکھا۔ اس وقت تک ان علاقوں میں کئی جگہ کٹے ہوئے انسانی اعضاء پڑے ملتے تھے۔ ہر جگہ کنوئیں لاشوں سے اٹے پڑے تھے۔ گاؤں کے گاؤں راکھ اور کوئلوں کے ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ مسجدیں شہید ہو چکی

تھیں۔قرآن کریم کے اوراق جگہ جگہ گندگی کے انباروں پر بکھرے ہوئے تھے۔خواتین کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں درختوں کی موٹی ٹہنیوں سے بندھی ہوئی ابھی تک لٹک رہی تھیں۔جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ظالموں نے ان بے گناہوں کو بالوں سے پکڑ کر درختوں سے باندھ رکھا تھا۔اور جا بجا پیروں سے نکلی ہوئی قیمتی جوتیاں کانچ کی ٹوٹی ہوئی بہت قیمتی چوڑیاں۔اس امر کی شاہد تھیں کہ اچھے اچھے گھرانوں کی خواتین کو فرش خاک پر بڑے بے دردانہ انداز میں گھسیٹا گیا اور مارا پیٹا گیا تھا۔ میدانوں اور سڑکوں پر سوکھا ہوا انسانی خون اس بربریت کا نوحہ خواں تھا۔گاؤں کے گاؤں اس طرح اجڑ گئے تھے کہ اب ان میں زندگی کی رمق باقی نہ تھی۔ایسے وحشت ناک منظر دیکھ کر میرے دل کا خون ہوگیا۔آنکھوں کے آنسو خشک راتوں کی نیند کافور اور بھوک و پیاس یکدم ختم ہوگئی اور دماغ کھولنے لگا۔اس دوران کئی صحافیوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے سہمے ہوئے انداز میں بتایا:''ہماری زبانوں پر قفل آنکھوں پر پٹیاں اور قلموں پر پہرا لگ چکا ہے۔ہم جو کچھ بھی لکھتے ہیں یہ سب حکومت کی منشا کے عین مطابق ہے''۔اس میں ہمارے اپنے ضمیر کی آواز شامل نہیں ہوتی۔کیمپوں میں بے شمار پناہ گزیں ایسے تھے۔جو اپنے ہوش وحواس کھو چکے تھے۔اور جن کے ہوش قائم تھے ان پر بھی خوف وہراس اس شدت سے اثر پذیر تھا کہ عالم بیچارگی میں خاموش بیٹھے ایک ایک کا منہ تکتے رہتے۔البتہ اس وقت تک جن لوگوں نے دل ودماغ پر قابو پالیا تھا۔وہ ایسی ایسی ہولناک حقیقتیں سناتے جو سننے والوں کے کانوں کی راہ سے پگھلے ہوئے شیشے کی طرح دل کی گہرائیوں میں اتر جاتیں۔

مختصراً یہ کہ چھٹے دن ہم لوگ پٹنہ کے ایک قصبہ''تلہاڑا''میں گئے۔ہماری گذرگاہ کے دائیں بائیں دیہاتوں کے جلے ہوئے انبار''تلہاڑا''تک چلے گئے تھے۔جب ہم لوگ منزل مقصود تک پہنچے تو وہاں ہو کا عالم طاری تھا۔انسانی خون کی سڑاندھ انتہائی غلاظت کی عفونیت کے مارے سانس تک لینا دشوار ہوگیا۔جلی ہوئی عمارتوں کے اپنے مساکین کے جاہ وجلال کا ماتم کررہے تھے۔ہم لوگ چلتے چلتے ایک بہت بڑی سوختہ حویلی کے سامنے رکے۔پٹنہ سے چلتے

وقت مہاجر کیمپ سے جس مقامی رہنما کو ہم اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔وہ بے ساختہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔جب ذرا دل کو سکون ہوا تو اس نے بتایا:''یہ اس علاقے کے ذیلدار کی حویلی ہے۔جو بہت دلاور شخص تھا۔آخری دم تک موت اور دشمنوں کے ساتھ برسرپیکار رہا۔آخر جب ''اکائی''پر''دہائی''غالب آگئی تو ظلم ڈھانے والوں نے اس شیر دل کو قابو کر کے اس سامنے والے درخت کے ساتھ باندھ دیا۔اور پھر ایک ایک کر کے اس کے اعضاء کاٹ کر اس کی آنکھوں کے سامنے بھوکے پالتو کتوں کو کھلا دیئے۔پھر اس کے سامنے بے شمار انسانوں کو ذبح کیا اور ان کی بوٹیاں اور تازہ خون زبردستی اس مجبور انسان کے منہ میں ٹھونسا۔اس کے بعد چوپال کی زمین پر گھاس وپھونس بچھا کر ایک سو کے قریب برہنہ نوعمر مسلمان زادیوں کو لایا گیا۔جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں تکلیف دہ مجرموں جیسی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔اس حالت میں اس خشک گھاس پھونس پر انہیں''پاکستان کا رقص''کرنے کا حکم دیا گیا۔یہ دیکھ کر وہ ہاتھ پاؤں بریدہ انسان تڑپ اٹھا اور بے عزتوں پر لعنت ملامت کے تیر برسانے لگا۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ظلم کنندہ اور مشتعل ہوگئے اور ان شیطانوں نے گھاس پھونس میں آگ لگا دی۔اور اس کے گرد گھیرا ڈال کر زور زور سے ڈھول پیٹنے لگے۔اور اس بندھے ہوئے مظلوم شخص کے زخموں میں سنگین مار مار کر کہنے لگے۔''مرنے سے پہلے اپنے پاکستان کا رقص اچھی طرح دیکھ لو''۔

ادھر مظلوم عورتیں پہلے تو آگ کی لپیٹ میں آکر بری طرح تڑپیں اور پھر جل بھن کر خاک ہوگئیں۔ادھر اس بہادر انسان نے درخت کے تنے سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔رہنما کی زبانی یہ دلخراش حقیقت سن کر ہم سب کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور بڑے سے بڑے صابر انسان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔اس کیفیت میں میری طبیعت یکا یک نڈھال ہوگئی۔اور تیز بخار نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔مگر اسی حالت میں میں نے وہاں سے کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں لمبے بالوں کی لٹیں اور خوبصورت سلیپروں کے چند پیر اکٹھے کئے اور پھر رہنما کے ہمراہ جا کر مسجد سے ملحقہ وہ کنواں دیکھا جو عورتوں اور بچوں کی لاشوں سے بھرا ہوا

تھا۔ اس کنویں کا پانی منڈیر سے ذرا نیچے تھا۔ جس سے تعفن اور بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اور پھر وہ مسجد بھی دیکھی جہاں ایک شیر دل لڑکی سائرہ نے اپنے باپ کی تلوار سے پندرہ بلوائیوں کو جہنم واصل کیا تھا اس ہنگامے میں بہت سے لوگوں نے کسی نہ کسی طرح جلتے ہوئے گھروں سے نکل کر اس مسجد میں پناہ لے لی۔ جن میں سائرہ خاتون یہ لڑکی بھی شامل تھی۔ جس کے باپ بھائی، خاندان کے اور بھی چند افراد جوان مردی سے لڑتے ہوئے پہلے شہید ہو چکے تھے۔ مردوں کے ختم ہو جانے کے بعد سائرہ نے اپنے باپ کی تلوار سنبھال لی۔ جب باہر سے بلوائی ایک ایک کر کے اندر داخل ہونا شروع ہوئے تو یہ باہمت لڑکی اچانک ان پر وار کر کے انہیں شدید زخمی کر دیتی اور مسجد میں چھپے ہوئے دوسرے لوگ اسے گھسیٹ کر فوراً دوسری طرف لے جاتے تھے۔ آخر جب باہر سے بلوائی یکدم مسجد کے اندر گھس آئے اور اپنے ساتھیوں کو خاک وخون میں غلطاں دیکھا تو وہ سب کے سب یکبارگی سائرہ پر ٹوٹ پڑے۔ اور پلک جھپکتے ہی اسے شہید کر دیا۔ مگر شہید ہو جانے کے بعد بھی تلوار بدستور سائرہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ سائرہ کا دایاں ہاتھ سوج کر گُپا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے تلوار کا دستہ ہاتھ کی سوجن میں پھنس کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ جب رضا کاروں نے اس جانباز لڑکی کو سپرد خاک کیا تو وہ تلوار اس کے ساتھ ہی دفن کر دی۔ میرا بخار لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ سر بری طرح گھومنے لگا اور مجھ میں مزید پیدل چلنے کی ہمت نہ رہی تو میں واپس آ کر جیپ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ شیخ صادق حسین صاحب بھی جلد ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس لوٹ آئے اور ہم لوگ پٹنہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ بخار کی شدت نے دو دن تک مجھے بری طرح صاحب فراش کئے رکھا۔ تیسرے دن جب میں ڈاکٹر صاحب کے مطب سے واپس آ رہی تھی تو راستے میں ایک آٹھ نو سال کی معصوم بچی ملی۔ جو سڑک کے ایک طرف اوندھے منہ پڑی زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر کیمپ میں لے آئی۔ باوجود کوشش کے اس کے کسی وارث کا پتہ نہ چلا۔ یہ بچی جو ہولناک حوادث سے دوچار ہو کر دماغی توازن بھی کھو بیٹھی تھی۔ کبھی ہنسنے لگتی تو لگاتار گھنٹوں ہنستی رہتی۔ کبھی رونے لگتی تو رو رو کر خود کو ہلکان

کر لیتی۔ کھانا سامنے ہوتا تو اپنی بساط سے بڑھ کر کھا لیتی مگر از خود کبھی نہ مانگتی۔ چاہے فاقوں پہ فاقہ گذر جائے۔ کئی دنوں تک ڈاکٹر کی بھرپور توجہ کے بعد جمیلہ کی طبیعت قدرے درست ہوئی تو اس نے اپنی تباہی کی مکمل داستان مجھے سرگوشی کے انداز میں سنائی۔ وہ ذرا ذرا دیر کے بعد گھبرا کر اس طرح ادھر ادھر دیکھتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی دہشت ناک چیز سے بے حد خوف زدہ ہے۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے نام یاد آتے جا رہے تھے۔ اسے اپنا گھر اس کا نقشہ اپنے سرسبز لہلاتے ہوئے فصلوں سے بھرے کھیت باربرداری کے جانور، دودھ دینے والی گائے اور بھینس سب ایک ایک کر کے یاد آ گئیں۔ اس نے مجھے اپنا نام جمیلہ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح بلوائیوں کو دیکھ کر مارے ڈر کے وہ بھوسے کے ایک ڈھیر میں چھپ گئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے انتہائی بے رحمی سے اس کا سارا کنبہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اور پھر وہ رات کے گھپ اندھیرے میں اپنے اجڑے ہوئے گھر کی پناہ گاہ سے نکلی اور بے ارادہ ایک سنسان سڑک پر چلدی۔ آخر کار وہ پیدل چلتے چلتے پٹنہ پہنچ گئی تھی۔ میں نے ساری داستان سن کر اس کے گال تھپتھپائے اور کہا۔ ''آج سے تم میرے ساتھ رہو گی۔ کوئی فکر نہ کرو''۔ یہ سن کر وہ اس طرح مجھ سے چمٹ گئی۔ جیسے بچھڑا ہوا بچہ ماں سے لپٹ جائے۔ وہ برابر سسکیاں بھر بھر کے رو رہی تھی۔ میں اسے ہولے ہولے تھپکیاں دیتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ گہری نیند سو گئی۔ دوسرے دن ہم لوگ مشرقی بنگال میں ''احسن سول'' کا کیمپ دیکھنے گئے تو چھوٹی جمیلہ بھی میرے ہمراہ تھی۔ وہ اس قلیل عرصہ میں مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ لمحہ بھر کے لئے بھی میرا دامن نہ چھوڑتی تھی۔ کیمپ میں بے شمار بچوں اور تباہ حال لوگوں کو دیکھ کر ایک بار پھر وہ مغموم و پریشان ہو کر رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے بہلایا۔

احسن سول میں مہاجرین کا یہ بہت بڑا کیمپ تھا۔ وہاں بہار کے خانماں برباد اس قدر شکستہ دل ہو چکے تھے۔ کہ وہ دوبارہ اس سرزمین پر آباد نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ اب انکا مستقبل کیا ہو گا۔؟ کیونکہ ان کیمپوں میں کانگریسی حکومت کا برتاؤ ان بدنصیبوں کے

ساتھ بڑا ہی سنگدلانہ اور جابرانہ تھا۔ دراصل کانگریس حکومت بھی دل سے یہ چاہتی تھی۔ کہ اب بہار میں تباہ حال مسلمانوں کے قدم دوبارہ نہ جمنے پائیں کیونکہ مسلمانوں کا کوئی ''مقدس انسان'' گاندھی جی کی طرح بہار میں دھرنا مار کر یہیں آ کر بیٹھا اور نہ کسی نے بہاریوں کی دوبارہ آبادکاری کے لئے ''مرن برت'' رکھے۔ البتہ صرف نام کا ایک 'سرحدی گاندھی' اس وقت بھی کانگریس حکومت کے تال پر تگنی کا ناچ ناچتا رہا تھا۔ لیکن اس نے مسلمانوں کی اس قیامت خیز تباہی میں اپنے نام کی لاج بھی نہ رکھی۔ ادھر جب جی بھر کے تباہی کے پروگرام کی تکمیل ہو چکی تو ''گاندھی'' جی نے مگرمچھ کے ٹسوے بہاتے ہوئے بہار میں آ کے پھر ''مرن برت'' کا اعلان کر دیا۔ اور مہاتما پن کا لبادہ اوڑھے بدستور اسلامیان ہند کی نگاہوں میں سمائے رہے۔ جب کانگریسی حکومت کے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم دوبارہ نہ جمنے دیئے تو نتیجۃً دسمبر ۱۹۴۶ء کی آخری تاریخوں تک کئی لاکھ بہاری مسلمان ہجرت کر کے سندھ کی طرف چلے آئے اور کم از کم چھ سات لاکھ مسلمان مشرقی بنگال میں آباد ہو گئے۔ احسن سول کا کیمپ دیکھنے کے بعد بنگال سے واپس آتے وقت ڈھائی سو بہاری پناہ گزیں ہمارے ہمراہ جالندھر آ گئے۔ یہ لوگ احسن سول کے کیمپ ہی سے ہمارے ساتھ ہو لئے تھے۔ پٹنہ کے ریلوے اسٹیشن پر معزز شہریوں مسلم لیگی کارکنوں اور رضا کاروں نے بڑی حسرت اور اہتمام کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔ ریل کی چار بوگیوں کو یکجا کر کے ان پر مسلم لیگ کے جھنڈے لگا کر انہیں صرف مہاجرین کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ جس میں ڈھائی سو بہاری مہاجرین ہمارے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ ان کے کھانے پینے کا بھی مکمل انتظام کر دیا گیا۔ سفر کے دوران ہر بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن یا جنکشن پر مسلم لیگی عہدیدار اور کارکن بہاری مہاجرین کے لئے سامان خورد نوش اور پہننے اوڑھنے کے لئے ڈھیروں نئے لباس و بستر وغیرہ لئے حاضر ہوتے تھے۔ کئی جگہ تو یہ ہنگامہ میلے کا سماں پیدا کر دیتا تھا۔ کئی اسٹیشنوں پر گاڑی کو ان مہاجرین اور ورکروں کی وجہ سے کافی لیٹ ہونا پڑتا تھا۔ جالندھر مسلم لیگ کے کارکن، سٹی مسلم لیگ کے سیکرٹری ڈاکٹر ولی محمد اور نیشنل گارڈ کے رضا کار سب کے سب واپس

آتے ہوئے بھی ہمارے ہم رکاب تھے۔

جب ہم لوگ جالندھر شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو سارا پلیٹ فارم استقبال کرنے والے معززین سے بھرا ہوا تھا۔ میاں احسان الحق ریٹائرڈ سیشن جج، کپتان حمید اللہ صاحب، سید بشیر حسین صاحب چیئرمین میونسپلٹی کمیٹی جالندھر حمید اللہ بیگ سٹی صدر مسلم لیگ۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور بے شمار مسلم لیگیوں نے شہر والوں کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ مسلم لیگی خواتین بھی بہت بڑی تعداد میں ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچی ہوئی تھیں۔ ریلوے اسٹیشن کی تقریب ختم ہونے کے بعد بہاری مہاجرین کو ایک جلوس کی شکل میں جی ٹی روڈ پر سے گذار کر تکیہ کرم اللہ شاہ میں لے جایا گیا۔ جہاں فوری طور پر مہاجرین کے ٹھہرانے کا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔

اس اثنا میں مسلم لیگی خواتین بہاری مہاجرین کی آمد سے پہلے ان کی سہولت کے پیش نظر بہت سا نقد روپیہ، بستر، کمبل، پہننے کے کپڑے، کھانے اور کھانا پکانے کے برتن اور ہر قسم کا اناج و دیگر ضروریات زندگی کی اشیاء جمع کر چکی تھیں۔ مخیّر لوگوں نے دل کھول کر آنے والوں کی اعانت کی رہنے کو مکان دیئے۔ ان کے مستقل روزگار کے لئے پوری پوری تگ و دو کی۔ جوان لڑکے اور لڑکیوں کی شادیاں کرائیں۔ بچوں کی تعلیم کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ اور ان کو ہر قسم کا آرام پہنچانے کا ہر شہری نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ مسلم لیگ خواتین کمیٹی نے اپنے بساط سے بڑھ کر ہر ممکن خدمت سرانجام دی اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ (۱)

آٹھ سید زادیاں

شمیم جالندھری

قصر استقلال کی ذمہ داری سنبھالے دو ماہ ہوگئے۔ مہاجرین کی آمد کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ ایک شام دن بھر کی کوفت سے خستہ حال ہونے کے باعث میں نے ان اسپر وکھائی اور باہر والے لان میں ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئی۔ میرے خیالات کا سلسلہ مجھے ماضی کے دھندلکوں میں لے گیا۔ جہاں میرے لئے بہت کچھ تھا۔ اس وقت بظاہر میں ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی مگر میرے دل و دماغ نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہے تھے۔ یکا یک گیٹ پر کسی نے زوردار دستک دی۔ ساتھ ہی کچھ غیر مانوس سی آوازیں بھی سنائی دیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔ ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے یا پھر اوپر سے چھلانگ لگا کر اندر آجائیں گے''۔ اسی وقت چوکیدار چلایا۔ ''کون ہے باہر؟ ٹھہرو ذرا، ابھی دروازہ کھولتا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے دروازے کا چھوٹا دروازہ کھول کر کہا ''ایک آدمی اندر آ کر بات کرلے''۔ مگر باہر والے پورا زور لگا کر یکے بعد دیگرے تین اجنبی اندر گھس گئے۔ پھاٹک پر شور وغل سن کر میں اس طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ ان تینوں میں سے ایک میری طرف بڑھ آیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا: ''محترمہ اس ادارے کی تمام مہاجر لڑکیاں دکھا دیں۔ ہم لوگ جلدی میں ہیں''۔ وہ کیوں میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ کے پاس ڈپٹی کمشنر صاحب یا ڈائریکٹر آف انڈسٹری کا ''اجازت نامہ'' ہے؟ آپ کا ان مہاجرین سے کیا تعلق ہے؟ میری باتیں سن کر وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک شخص سفید لباس میں ملبوس کوئی معزز شہری معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا پوری یونیفارم میں فوج کا حوالدار میجر تیسرا ڈرائیور تھا۔ ان میں سے ملٹری کا حوالدار سب سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ ''اب کیا ہوگا؟'' اس پر اس کے سفید پوش ساتھی نے پورے اطمینان اور بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ محترمہ اس حوالدار کا نام حیدر گل ہے۔ اور یہ ایک ناکردہ گناہ میں گرفتار ہوگیا ہے۔ آپ اس کی مدد کریں۔

اسے مہاجر لڑکیاں دکھا دیں۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ ''بغیر اجازت نامہ'' کے میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میں نے جواب دیا۔ آخر آپ کو ان مہاجرات سے کیا کام ہے؟ کہنے لگا پرسوں شام کے وقت حیدر گل نے امرتسر کے گولڈن ٹیمپل سے آٹھ سید زادیوں کو نکال کر لاہور پہنچایا گیا تھا جن کی کلائیوں پر غیر مسلموں نے ہندووَانہ نام کندہ کر رکھے تھے۔ چند ہندوؤں نے کل جالندھر کیمپ کمانڈر کے پاس جا کر حیدر گل کے خلاف آٹھ غیر مسلم لڑکیوں کا اغوا کر کے لے جانے کا الزام لگا دیا۔ جس پر بیچارے کا کورٹ مارشل ہوگیا اور اب اسے پاکستان سے ان آٹھ لڑکیوں کو واپس لے جانے کے لئے صرف اٹھارہ گھنٹے کی مہلت ملی ہے۔ اب اگر یہ ان لڑکیوں کو واپس لے جا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت نہ پیش کرسکا تو کل دن کے گیارہ بجے اسے گولی سے مار دینے کا حکم ہو چکا ہے۔ اسے لاہور پہنچنے میں دو دن گزر گئے ہیں۔ میں ازراہ ہمدردی اس کے ساتھ پھر رہا ہوں۔ کیونکہ یہ لاہور کے حدود اربعہ سے ناواقف ہے۔ آپ مہربانی کر کے اس کو لڑکیاں دکھا دیں جس کے لئے میں بھی ہمیشہ آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی حیدر گل نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ دیکھئے ان تمام مہاجرات کے نام اور پتے اس پر درج ہیں۔ میں نے دیکھا۔ عطیہ سلطانہ، رضیہ سلطانہ، دختران سید جعفر علی شاہ ساکن موضع گھمٹی ضلع امرتسر عمر ۱۶، ۱۸ سال۔ نیلم جہان نسیم جہان دختران سید الطاف حسین شاہ ساکن موضع گھمٹی ضلع امرتسر عمر ۱۴، ۱۶، ۱۸ سال۔ طاہرہ بانو، قدسیہ بانو دختران عمر دراز خان ساکن موضع گھمٹی ضلع امرتسر عمر ۱۵، ۱۷ سال۔ فاطمہ بیگم سید یوسف شاہ ساکن موضع گھمٹی ضلع امرتسر عمر ۱۶ سال۔

اس پر میں نے حیدر گل کی مصیبت سے متاثر ہو کر کہا۔ ''یہ سب سید زادیاں ہیں ہندوؤں نے انہیں غیر مسلم کس طرح ثابت کیا ہوگا''۔ کہنے لگا محض اس لیے کہ ان ظالموں نے ان بیچاریوں کے بازوؤں پر ہندوانہ نام گدوا رکھے ہیں۔ میں نے انہیں رجسٹر داخلہ منگوا کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ادارے میں تو اب تک بچوں والی بے سہارا عورتیں ہی داخل ہوئیں ہیں اتنی چھوٹی عمر کی ایک بھی لڑکی نہیں آئی ہے''۔ رجسٹر دیکھ کر ان کے پرامید چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ سورج

غروب ہونے والا تھا اور شام کی سیاہی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جارہی تھی ۔ وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔مگر حیدر گل نے تعظیم سے جھک کر لجاجت کے ساتھ کہا۔ باجی! اگر آپ میری تھوڑی سی مدد کریں تو شاید میرا کام بن جائے ۔رات سر پر آرہی ہے خواتین کے کیمپوں میں ہمیں کون گھسنے دے گا۔ یہ کہہ کر وہ امید وبیم کی حالت میں کھڑا رہا مجھے اس کی حالت پر رحم آرہا تھا میں نے کہا ''میں تمہارے کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی مگر میں تمھاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟'' انہوں نے پرامید ہوکر کہا ''آپ صرف دو چار کیمپوں میں ہمارے ساتھ چلیں ۔آپ کی وجہ سے ہمیں ان مہاجرات کو تلاش کرنے میں بڑی آسانی ہوگی''۔ ''ٹھیک ہے''میں نے فیصلہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ ۔''خدا تمہارا حامی اور مددگار ہو''۔ یہ کہہ کر میں نے مائی مریم اور چوکیدار زرغون کو ساتھ لیا اور ان کی فوجی وین میں جا بیٹھی۔ہم نے یکے بعد دیگرے لاہور کے تمام مہاجر کیمپ دیکھ ڈالے مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ جوں جوں رات بھیگ رہی تھی ۔حیدر گل کا برا حال ہورہا تھا۔ آخر تھک ہار کر ہم لوگ رات ساڑے بارہ بجے دوبارہ قصر استقلال میں پہنچ گئے ۔کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے ۔گھر پہنچ کر میں نے چائے بنوائی مگر حیدر گل نے اصرار کے باجود اسے چھوا تک نہیں۔ وہ اپنی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ دوسرے لوگ چائے پی کر تازہ دم ہوئے تو میں نے حیدر گل سے پوچھا۔''پرسوں تم ان مہاجرات کو پاکستان لے کر آئے تھے تو انہیں کس کے سپرد کیا تھا؟'' کہنے لگا اس وقت تو میرا دماغ ماؤف ہورہا ہے۔صرف اتنا یاد ہے کہ میں انہیں والٹن کیمپ میں لے گیا تھا ار پھر وہیں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے امید کا سہارا لیتے ہوئے کہا یقیناً وہ اب تک وہیں ہوں گی ۔تمہیں انہیں وہیں تلاش کرنا چاہئے تھا۔اس نے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور بولا میں گیا تو سب سے پہلے وہیں تھا مگر ناکام لوٹا ہوں ۔اب تو رات بھی بہت زیادہ گزر چکی ہے۔میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا تم اس کی فکر نہ کرو ہمیں وہیں چلنا چاہئے ۔ یہ کہہ کر میں نے والٹن کیمپ میں فون کیا تو وہاں کے رضا کار اور کارکن ابھی تک جاگ رہے تھے ۔انہوں نے بتایا کہ مہاجروں کا ایک اور قافلہ بہت جلد پہنچنے والا ہے کیمپ کے

اندر شور شرابہ کی آوازیں بھی فون میں برابر آرہی تھیں ۔ میں نے انہیں اپنے آنے کی اطلاع کردی اور خدا کا نام لے کر ایک بار پھر اس فوجی وین میں سوار ہوگئے ۔ہم تقریباً رات کے ڈیڑھ بجے والٹن کیمپ میں پہنچے جہاں مہاجروں کی ایک عجیب وغریب دنیا قائم تھی۔ خاک وخون میں لتھڑے ہوئے انسان فرش خاک پر اوندھے سیدھے پڑے تھے اور رضا کار بدستور اپنے کام میں منہمک تھے۔ہم نے دفتر میں پہنچ کر یہ معلومات حاصل کرلیں کہ اس ہفتہ میں مہاجرات کہاں کہاں بھیجی گئی ہیں۔تو پتہ چلا کہ ہفتہ عشرہ سے یہ کام بند ہے پھر ہم نے انہیں حقیقت حال سے آگاہ کر کے سارے کیمپ میں مہاجرات کی تلاش شروع کردی ۔کیمپ انچارج نے کمال مہربانی کی اور ہمارے ساتھ چند رضا کار بھیجے تاکہ وہ ہمیں درست راستہ دکھاسکیں۔ اس بیرک تک بھاگ دوڑ کرتے ہوئے ہم لوگ تھک کر چور ہوچکے تھے۔دوڈھائی گھنٹوں کی محنت شاقہ کے باوجود اس کیمپ کا نصف حصہ ہی بمشکل دیکھا جاسکا۔ بیرکوں میں روشنی مدھم سی تھی اور مہاجروں کی بہت بڑی تعداد فرش زمین پر سوئی پڑی تھی۔ کچھ لوگ جاگ اور اونگھ رہے تھے۔

جوں جوں رات سمٹ رہی تھی بے چارے حیدر گل کا عالم یاس میں دل ڈوب رہا تھا۔ ایک بیرک کے اختتام پر اس نے رک کر کہا۔ باجی اب تو میری ہمت جواب دے گئی۔صبح کا سورج نہ جانے میرے لئے کتنا قیامت خیز ہوگا۔میں نے اسے ڈھارس بندھاتے ہوئے جواب دیا''مایوس کیوں ہورہے ہو؟''ابھی تو تلاش کے لئے نصف سے زیادہ کیمپ پڑا ہے۔ ہاں تم یہ تو بتاؤ کہ تم نے انہیں یہاں لاکر کس جگہ اتارا تھا؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ وہ جگہ تو ریلوے لائن سے ملحق تھی۔ شاید ان بیرکوں کے دوسری طرف ہو۔اس وقت اندھیرے میں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔اس پر ایک رضا کار بولا چلو میں تمھیں اس جگہ پر لے چلتا ہوں ۔ یہ کہہ کر وہ آگے آگے چل پڑا ہم پھر جلدی ہی ریلوے لائن کے قریب والی بیرکوں میں پہنچ گئے ۔ جو چند لمبے لمبے برآمدوں پر مشتمل تھیں ۔ وہاں پڑے ہوئے مہاجر بھی کچھ سو اور کچھ رو رہے تھے۔ ہم نے ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھنا شروع کردیا۔فرش خاک پر لیٹی ہوئی بہت سی خواتین میں ایک

سفید سی نازک کلائی پر اچانک مجھے کچھ غیر زبان میں کندہ میلے میلے حروف نظر آئے۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور ٹارچ کی تیز روشنی اس کے ڈھکے ہوئے چہرے پر ڈالتے ہوئے پوچھا کیا تم رضیہ ہو؟ میری آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور کھوئی کھوئی حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی نہیں۔ میں عطیہ ہوں۔ رضیہ وہ لیٹی ہوئی ہے۔ میں نے پھر سوال کیا: کیا تم سب لڑکیاں یہاں اکھٹی ہو۔ کہنے لگی ہاں مگر آپ کیوں پوچھتی ہیں؟ یہ سنتے ہی میں نے حیدر گل کو آواز دی اور کہا یہاں آؤ۔ دیکھو کیا یہ وہی لڑکیاں ہیں۔ اس پر سب کے سب برآمدے میں گھس آئے۔ حیدر گل سب سے آگے آگے بھاگا آرہا تھا۔ مارے خوشی کے اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس اثناء میں ساری لڑکیاں اور ارد گرد سوئی ہوئی عورتیں بیدار ہو چکی تھیں۔ لڑکیوں نے بھی حیدر گل کو پہچان لیا۔ ان سیدزادیوں کی باہوں پر ہندوانہ نام مایا دیوی، سیمتّری، کوشلّیا، پریم کماری، بلونت کور، راجہ کور، رام دلاری اور پدماوتی'' لکھے ہوئے تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا ہم سیدزادیاں موضع گھمٹی کی رہنے والی ہیں۔ ہمارا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا جب سکھوں نے ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں پر حملہ کیا تو نکل بھاگنے کے سب راستے پہلے مسدود کر دیئے گئے تھے۔ مار دھاڑ کے بعد انہوں نے پورے گاؤں کے چاروں طرف آگ لگا دی۔ نہتے جوان مردوں نے بڑی ہمت دکھائی مگر جلد ہی سکھ ان پر غالب آ گئے۔ اور انہوں نے گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر ڈھیر لگا دیئے۔ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتوں کو پکڑ پکڑ بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا۔ پھر گاؤں کی تمام خوبصورت لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک لیا اور پیدل چلا کر امرتسر کے گولڈن ٹیمپل میں لے آئے اور ایک بہت ہی چھوٹے سے کمرے میں سب کو بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ صبح ہوتے ہی باری باری سب صحت مند اور خوب صورت لڑکیوں کے بازوؤں پر زبردستی ہندوانہ نام کندہ کروانے شروع کر دیئے۔ جن لڑکیوں نے مزاحمت کی انہیں اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ بیہوش ہو گئیں۔ اور پھر اسی حالت میں ان کی باہوں پر ہندوانہ نام کندہ کر دیئے گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہندو اور سکھوں

کے ہجوم میں انہیں بلا تخصیص تقسیم کر دیا گیا جنہیں غیر مسلم اس وقت گھسیٹ کر لے گئے۔ ہم ابھی گولڈن ٹیمپل ہی میں تھیں کہ پاکستان بلوچ رجمنٹ کے سپاہی پہنچ گئے۔ جنہوں نے بہادری سے ہمیں ان کے چنگل سے نکال کر پاکستان پہنچا دیا۔ ان کی دکھ بھری داستان سنتے سنتے صبح کاذب نمودار ہونے لگی۔ حیدر گل نے جب ان لڑکیوں کو واپس جالندھر لے جانا چاہا تو والٹن کے کیمپ انچارج نے انہیں وہاں بھیجنے سے انکار کر دیا۔ ہم نے بہتیرے حربے استعمال کئے مگر وہ بدستور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر کار میرے اصرار پر انہوں نے طریق کار کو باضابطہ طور پر عمل میں لائے ہوئے وہ آٹھ نوعمر مہاجرات میری تحویل میں دے دیں۔ میں نے جالندھر بلوچ رجمنٹ کے کمانڈر کے نام خط لکھا۔ مائی مریم اور چوکیدار زرغوں کی حفاظت میں حیدر گل کے ہمراہ جب چند گھنٹوں کے لئے جالندھر بھیجنا چاہا تو ان مہاجر لڑکیوں نے دوبارہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ اور مجھ سے بار بار لپٹ کر زار و قطار رونے لگیں۔ اس پر میں نے انہیں سمجھایا۔ ''میری بچیو! یہ تمہارا بھائی، تمہارا نجات دہندہ، تمہاری عزتوں کا رکھوالا آج تمہاری خاطر بے گناہ گرفتار بلا ہو گیا ہے۔ اس وقت اس کی جان خطرے میں ہے۔ کیا تم اپنے محسن کے احسان کا بدلہ نہ چکاؤ گی؟ مجھے یقین ہے کہ تم شام کو سورج ڈھلنے سے پہلے میرے پاس واپس پہنچ جاؤ گی۔ آؤ اس دین میں سوار ہو جاؤ۔ مائی مریم اور زرغون بھی تمہارے ساتھ جا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے انہیں فوجی دین میں سوار کر دیا۔ حیدر گل سراپا تشکر بنا فخر سے سر بلند کئے کھڑا تھا۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا اور قصر استقلال میں واپس آ گئی''۔

سارا دن عجیب سی بے چینی میں گزرا۔ شام کو عصر کی نماز کے بعد میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا اور میری نظریں بار بار باہر کے پھاٹک کی طرف اٹھنے لگیں۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ خدا خدا کر کے مغرب کی اذان ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی فوجی وین کا ہارن سنائی دیا۔ پھاٹک کھلا تو حیدر گل قوم کی مقدس امانت لے کر حسب وعدہ پہنچ گیا تھا۔ ساری مہاجر لڑکیاں دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئیں تو میں نے خدائے برتر کا شکر ادا کیا۔ حیدر گل اپنی کامیابی پر بے

حد مسرور تھا۔اس نے اظہار تشکر کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔''باجی پرسوں سے میرے حلق میں پانی کا ایک گھونٹ اور چنے کا ایک دانہ تک نہیں گیا۔میں نے قسم کھا رکھی تھی جو آپ کے توسط سے پوری ہوگئی ہے۔اب چائے پلا دیجئے۔پھر چائے سے فارغ ہوکر حیدر گل نے کہا۔اب آپ اپنا کوئی ذاتی کام میرے سپرد کردیں۔مجھے بہت خوشی ہوگی۔کیونکہ میں آج پھر ہندوستان واپس جارہا ہوں۔کسی عزیز کے نام کوئی پیغام بھیجنا چاہیں تو پہنچادوں گا۔عین اسی وقت مجھے اپنی چھوٹی بہن فردوس اور کرنل بھائی کا خیال آ گیا جوان دنوں ریاست کپورتھلہ میں پھنسے ہوئے تھے۔میں نے ان کا ذکر کیا تو کہنے لگا۔آپ میری ذاتی فوجی ڈائری میں ان کے نام پیغام لکھ دیں۔ان شاءاللہ میں انہیں وہاں سے نکال کر صحیح سلامت آپ کے پاس پہنچادوں گا۔میں نے تائید غیبی سمجھتے ہوئے حیدر گل کی فوجی ڈائری میں کرنل بھائی کے نام یہ پیغام لکھ دیا۔''حامل پیغام حیدر گل قابل صد اعتماد ہے۔آپ لوگ اس کی معیت میں فوراً لاہور پہنچ جائیں''۔

اس کے بعد ایک ہفتہ عشرہ کے اندر حیدر گل نے میرے عزیزوں کو ہندوستان سے نکال کر پاکستان پہنچادیا۔وہ سیدزادیاں بہت دنوں تک قصرِ استقلال میں رہیں۔ریڈیو اوراخبارات کے ذریعے نشر کئے جانے والے پیغامات کی وساطت سے اس ادارے کی اکثر مہاجرات کی رسائی اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں تک ہوجایا کرتی تھی۔اسی طرح ایک دن اچانک قدسیہ بانو کے والد سید الطاف حسین اور نسیم جہاں وفہیم جہاں کے والد سید جعفر علی شاہ ایک روزنامے کے چند اوراق لئے قصرِ استقلال میں پہنچ گئے۔اپنی بچیوں کو زندہ سلامت و بحفاظت پاکر خدا کا شکر بجالاتے ہوئے باضابطہ کاروائی کے بعد اپنے خاندان کی تمام لڑکیوں کو اپنے ہمراہ حیدر آباد لے گئے جہاں ان دنوں وہ لوگ ہجرت کے بعد مقیم تھے۔(۲)

داستان ہجرت

محمد اقبال سہیل

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہوشیار پور میں تقسیم کے وقت صورت حال نہایت کٹھن ہوچکی تھی۔انگریز، ہندو اور سکھ سب مل کر ہوشیار پور کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کررہے تھے۔راقم والد صاحب کے ساتھ پروفیسر ظفر حسین آزاد (شعبہ عربی ادبیات ڈھاکہ یونیورسٹی) سے ملنے گیا تو راستے میں انکے گھر تک پہنچتے پہنچتے غیر معمولی صورت حال دیکھی۔پروفیسر صاحب مرحوم ومغفور تحریک پاکستان کے نہایت فعال کارکن تھے ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے کھولا۔دیکھتے ہی ابا جی سے کہنے لگے ایسی خطرناک حالت میں خالی ہاتھ آئے ہو؟ والد صاحب نے فرمایا خالی ہاتھ ہرگز نہیں آیا۔یہ کہہ کر جیب سے پستول نکال کر دکھایا تو پرفیسر صاحب مطمئن ہوگئے کہنے لگے کہ بچوں کو قافلے کے ساتھ نہ بھیجنا، ورنہ چوراسی عبور نہ کرسکو گے لاہور جاکر کانوائے کا انتظام کرنا پھر ابا جان سے کہا سردار! یہ ہماری تاریخ کا بے حد کٹھن مرحلہ ہے ہم قائداعظم کا ہرگز ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔جس نے قائداعظم کا اس مرحلے پر ساتھ دیا۔اس نے اسلامی تاریخ سے وفا کی۔ابا جی نے اتنا کہا پروفیسر صاحب! پاکستان ان شاءاللہ بن کر رہے گا، ہم لوگ واپس آئے تو محلے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ہوشیار پور کے ایک مسلمان نوجوان کو سکھوں نے قتل کر کے ہمارے محلے کی طرف پھینک دیا تھا۔دوسرے روز ہوشیار پور کی جامع مسجد کے عقب سے، جہاں کوتوالی تھی اور جس کا انسپکٹر پولیس سکھ تھا۔تحریک پاکستان کیلئے مسلم لیگ کی قیادت میں بڑا ہی منظم جلوس نکلا۔والد صاحب قبلہ نماز پڑھ کر اس جلوس میں چلے گئے۔مجھ سے کہہ گئے کہ گرفتار ہوجاؤں تو سیدھے گھر جاکر والدہ کو اطمینان دلانا اور آخری دم تک لڑنا۔تم چھوٹے ہو لیکن گھبرانا نہیں۔جلوس بھیم سین سچر، خضر حیات ٹوانہ کے خلاف بڑے پرجوش نعرے لگا رہے تھا۔اتنے میں پولیس نے پہلے ہوائی فائرنگ کی اور پھر لاٹھی چارج شروع کردیا۔ابا جی گرفتار ہوگئے، میری ٹانگ پر لاٹھی لگی اور میں گر گیا۔کسی نے سہارا دیا اور میں لنگڑاتا ہوا گھر پہنچا۔والدہ کو بتایا پہلے تو انہیں یقین نہ آیا، پھر

ہمیں انہوں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا آپکے ابو ان شاء اللہ واپس آ جائیں گے۔ ہوشیار پور کی کایا پلٹ گئی۔ ہر جگہ ہر روز مسلح تصادم ہونے لگے۔ اسلحہ نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان قتل ہو رہے تھے۔ انگریز بہادر کی سکھوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت کے ہولناک نتائج سامنے آ رہے تھے والد صاحب قبلہ چوتھے روز بمشکل کوتوالی نکلے اور گھر پہنچے۔ زخموں سے چور تھے۔ ظالموں نے لوہے کی راڈ سے والد صاحب پر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے مزید بتایا کہ انگریز ہندو سکھ پولیس نے مسلمانوں کے ساتھ انتہائی انسانیت سوز سلوک کیا ہے۔ ایک انگریز نے کوتوالی میں آ کر مسلمانوں کے منہ پر تھوکا اور کہا کہ پاکستان میری جوتی کے نیچے ہے۔ مجھے یاد ہے ہم لوگ اکثر شاہ نور جمال کے راستوں پر آم لینے جایا کرتے تھے۔ جاتے یا آتے ہوئے تازہ گنے کا رس پیتے۔ اس جگہ پر ہندوؤں نے گھات لگانا شروع کر دی اور ایک روز ایک مسلمان کو قتل کر کے وہیں پھینک دیا۔ والد صاحب آگ بگولا ہو گئے، کہنے لگے مسلماں اب پوری تیاری کر لینی چاہیے۔ ''چوہ'' ایک جگہ تھی جہاں ہندو صبح صبح پوجا پاٹ کرتے تھے۔ وہاں سے گزرنے والے مسلمان کو قتل کرنا ان کا روز کا شیوہ بن گیا تھا۔

ایک روز صبح کے قریب چوک سراجاں میں، جہاں ہم رہتے تھے۔ یہ اطلاع آئی کہ حملہ ہوگا؛ چنانچہ وہاں کے شیخ رفیق کی حویلی کے نیچے جمع ہو کر لاٹھیوں، تلواروں اور پستولوں سے تیاری کی۔ وہ دن بڑا سخت تھا۔ تین سو سکھوں اور ہندوؤں نے بندوقوں سے چوک سراجاں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے بمشکل نوئے پچانوے نوجوان تھے۔ پاکستان زندہ باد، لے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں کے سائے میں وہ نوجوان سر دے رہے تھے۔ ایک گرتا تو دوسرا میدان میں آ جاتا۔ اُنکے نعروں کی بلندی اور انکی دفاعی پھُرتی کسی طرح بیان نہیں کی جا سکتی ایک زخمی نوجوان کو چارپائی پر ہمارے مکان کے سامنے سے لے جایا جا رہا تھا تو ابا جان مرحوم نے نکل کر اسے چُوما اور کہا بیٹا! اب پاکستان ضرور بن جائے گا۔ تیرے خون کی قسم! پاکستان بن کر رہے گا۔ نوجوان کہنے لگا: یہ انگریز، ہندو اور سکھ یہ سمجھتے ہیں کہ نہتے ہونے کی وجہ سے ہم قائداعظم کا

ساتھ چھوڑ دینگے اور تحریک پاکستان ناکام ہوگی۔ ہرگز نہیں: خاندان کا بچہ بچہ کٹے گا اور پاکستان بنے گا۔ چوک سراجاں کی یہ جنگ تین چار روز تک طول کھینچ گئی۔ اسے ہوشیار پور کے مسلمانوں کی طرف سے کسی اسلحے کے بغیر ایک فیصلہ کن دفاعی جنگ کہا جا سکتا ہے۔ قوموں کے لیے وہ یوم تجدید نو کا دن ہوتا ہے جب اسکے نوجوان ایثار و قربانی کی بلندیوں کو چھو جائیں۔ دو آبے کے نوجوان نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ تحریک پاکستان میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کر سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہوشیار پور میں فسادات سے پہلے ایک روز میں ابا جان (مرحوم) کے ساتھ کمپنی باغ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ غالبا ڈاکٹر کے پاس جا رہے تھے۔ راستے میں کوئلے کا ایک ہندو تاجر ملا۔ اس کا نام شاید موتی لال تھا کہنے لگا شیخ صاحب، کہاں کا رخ ہے؟ ابا جان نے کہا ڈاکٹر کے پاس۔ کہنے لگا اپنا بندوبست کر لیں۔ ابا جان نے پوچھا اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ اس نے ہنستے ہوئے کہا کیا آپکو شنکر چاریہ کے الفاظ یاد نہیں؟ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے مسلمان یہاں مہمان ہیں، بہتر ہے وہ اب کوچ کر جائیں۔

وہ رات بے حد طویل تھی۔ چوک سراجاں پر حملے کی دوسری رات، حملہ آوروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پہلے روز پچاس نوجوان شہید ہوئے۔ دوسرے روز ساٹھ۔ شام ہونے سے پہلے دو چار ایسے دلدوز واقعات ہوئے کہ مسلمانوں کی غیرت اور جوش میں زبردست اضافہ ہوا۔ بزرگ اور نوعمر بھی میدان میں اترنے لگے۔ عصر کے وقت سے دست بدست لڑائی ہو رہی تھی ایک نوجوان مسلمان گرا، خون کے فوارے نکل رہے تھے اس نوجوان کا گھر لڑائی کے میدان کے بالکل سامنے تھا۔ گھر کا ایک چھوٹا سا بچہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ خواتین کو ہوش نہ رہا بچہ ابا ابا کہتے ہوئے دروازے سے نکل کر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف بھاگا۔ سکھوں نے بچے کو پکڑ لیا اور چلا چلا کر اعلان کیا دیکھو ہم مسلے کے بچے کے ساتھ کیا کرتے ہیں مسلماں دم بخود تھے کہ یہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔ سکھوں نے بچے کو اوپر اچھالا اور نیچے سے نیزے پر اسے لے لیا بچے کی چیخ اس قدر دلدوز تھی کہ آسماں تک لرز اٹھا۔ اس نے تڑپ تڑپ کر وہیں جان دے دی۔ ابھی مسلمان اس رنج میں غلطاں پیچاں تھے۔ کہ یکا یک ایک نوجوان بجلی کی مانند نکلا اور جس سکھ نے بچے کو پکڑ کر اچھالا تھا،

اسے گرایا، ٹانگوں سے پکڑ ، پوری قوت سے اپنے سر کے اوپر چاروں طرف گھمانا شروع کیا۔ چوتھے راؤنڈ پر اس نوجوان نے اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا کر اس سکھ کو دیوار پر دے مارا اس کا سر پھٹ گیا اس نوجوان نے ایک بڑا پتھر لیا اس پر دے مارا اور برق رفتاری سے مسلمانوں میں آ شامل ہوا۔ مسلمانوں کے جوش کی انتہا نہ تھی ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نوجوان 'دسوہہ' سے اپنی بہن کو لینے آیا تھا۔ یہ وہ بستی جہاں مسلمانوں نے سب سے زیادہ قربانیاں دی تھیں۔ وہ نوجوان اس گلی میں پھنس گیا جس کی ہندو سکھوں نے ناکہ بندی کی تھی۔ دوسرا واقعہ اور زیادہ جگر خراش تھا مغرب کی نماز سے پہلے مسلمانوں کے مورچوں میں زبردست ہلچل ہوئی۔ بڑے زور زور سے اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ والد صاحب قبلہ رائفل لیکر نکلے اور مورچوں پر پہنچ گئے ۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی ۔ والدہ ماجدہ مصلے پر تھیں۔ محلّہ کی بعض خواتین ہمارے ہاں جمع تھیں۔ نوعمر لڑکوں نے چھتوں پر اینٹ گنوں ، بڑے بڑے پتھروں ،غلیلوں اور گرم پانی سے مورچہ بنا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھر نعرے لگنے شروع ہو گئے ۔ پورا محلّہ اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اتنے میں والد صاحب قبلہ کے ساتھ دو بزرگ اور تین نوجوان ایک چارپائی پر خون میں لت پت انتہائی خستہ حالت میں، ایک مسلمان نوجوان خاتون کو لیے گھر پہنچے ۔ یہ خاتون اپنے بھائیوں کے ساتھ لدھیانے سے ہوشیار پور آئی تھی۔ اور اپنی نانی سے ملنے چوک سراجاں آ رہی تھی ۔ یہ نوجوان لڑکی ابھی نئی نئی لاہور سے بی اے کر کر لدھیانے آئی تھی۔ سکھوں اور ہندوؤں نے اُس کے بھائی اُس کے سامنے قتل کیے، پھر اسکا سینہ کاٹ لیا، اور چوک سراجاں کی طرف پھینک دیا۔ والدہ ماجدہ نے لڑکی کو سنبھالا وہ زندگی کے آخری دموں پر تھی۔ والد صاحب قبلہ فوراً سجدے میں گرے اور رو رو کر اللہ سے دعا مانگی کہ مسلمان خواتین کی عزت کسی طرح محفوظ فرما محلے کے بزرگ بھی آ گئے تھے۔ والدہ ماجدہ نے لڑکی کی سرعت سے، مرہم پٹی کی ۔ تھوڑی دیر بعد اسکی آنکھیں کھلیں۔ اپنے بھائیوں کا نام پکارتی رہی اور پھر بے ہوش ہوگئی اور آدھی رات تک بے ہوش رہی ۔ جب وہ دوبارہ ہوش میں آئی ، والدہ

ماجدہ نے اسے پانی پلایا، قرآن مجید پڑھا، وہ سنتی رہی۔ پھر اسے ہچکی آئی اور ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سبھی نے اسکے لیے دعا کی۔ اس لڑکی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے مسلمانوں کی غیرت کو للکارا تھا۔ تھوڑی دیر بعد والد صاحب آئے اور کہا کہ اب سارے گھر مورچے ہوں گے خواتین بھی اب پوری طرح تیاری کر لیں والد صاحب قبلہ دوسرے بزرگوں کے ساتھ مل کر ساری رات مختلف مورچوں پر نوجوانوں کا ساتھ دیا۔ رات بھر کھڑے ہو کر سکھوں اور ہندوؤں پر فائرنگ کی ۔ مزاحمت کی رات ، والد صاحب فائرنگ کرتے کرتے تھک جاتے تو سجدے میں چلے جاتے محلے کے دوسرے بزرگوں نے ایک دوسرے سے تعاون کا ایک نظام قائم کر دیا تھا۔ گھر گھر جا کر احوال پوچھتے رہے۔ ایک انگریز افسر چوک سراجاں کا معاینہ کرنے آیا تو وہ مسلمانوں کی باہمی اخوت اور قربانی دیکھ کر کہنے لگا: ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں کا غلط اندازہ لگایا ہے اور یہی غلط اندازہ پاکستان بنا کر رہے گا۔

خاندان کے خاندان شہید ہوئے بچے ویران وخستہ حالت میں پاکستان پہنچے۔ بے شمار لوگ حواس کھو بیٹھے اور جو برداشت کر گئے انہیں دوسری آفات لے بیٹھیں، لیکن پھر بھی پاکستان کا مطالبہ پورے شعور سے جاری تھا۔ چوک سراجاں جب خالی ہونا شروع ہوا تو ہم لوگ بھی جامع مسجد کے قریب شیخ جان محمد کی حویلی سے ملحق ایک مکان میں منتقل ہو گئے لیکن وہاں پہنچنے کے لیے ایک لمبے دوراہے کو، جسکا نام توڑ تھا عبور کرنا ضروری تھا۔ انتہا پر ایک مندر تھا جس سے ہندو غنڈے فائرنگ کرتے تھے اور سرکاری پولیس انکی مدد کرتی چنانچہ اس لمبے دوراہے کو توڑ کو عبور کرتے ہوئے بے شمار مسلمان شہید ہوئے پھر یوں بھی ہوا کہ مسلمان نوجوان چھتوں پر سے ہوتے ہوئے مندر کے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے آگ کے شعلے اس طرف پھینکے۔ ہندوؤں کو اس طرف مشغول رکھ کر بے شمار مسلمان خاندان توڑ عبور کر گئے قافلوں کی صورت میں جلدی جلدی نکل گئے اور ہم لوگ آخری خاندان کے طور پر ابا جی کا انتظار کرتے رہے، وہ کانوائے لینے لاہور چلے گئے تھے۔ ایک ہفتے سے اوپر ہو گیا لیکن والد صاحب نہ آئے۔ اس عرصہ میں ہمارے پرانے نوکر محمود نے خبر

دی کہ ہندوؤں اور سکھوں نے سارے ہوشیار پور کی مساجد سے قرآن مجید لے کر سڑکوں پر پھینک دیئے ہیں اور بدمست ہو کر اغوا شدہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی سڑکوں پر کر رہے ہیں۔اس موقع پر مرہٹی فوج کا ایک دستہ جامع مسجد کے قریب آن پہنچا،محمود شولا پور کا تھا،مرہٹی جانتا تھا،اس نے اس دستہ کے افسر سے بات کی اور سڑکوں پر قرآن مجید کی بے حرمتی کا موضوع چھیڑا۔اس افسر نے کہا جب تک تمھارے لیے کانوائے لاہور سے نہیں آجاتا،تمھیں کوئی نہ ستائے گا البتہ دوسروں کے ہم ذمہ دار نہیں۔

والد صاحب قبلہ گیارہویں روز کانوائے لے کر پہنچے۔معلوم ہوا دریائے بیاس چڑھا ہوا تھا،اس لیے آنے میں روکاوٹ ہوئی۔ہم لوگوں کے سوا پورے علاقے میں کوئی بھی نہ رہا تھا۔ والدہ ماجدہ اس دوران میں راتوں کو تہجد کی نماز پڑھ کر مسلسل دعا کرتیں۔انکی دعاؤں اور انکی عزیمت نے ہمیں اتنے دن زندہ رکھا،ورنہ چاروں طرف موت کے سائے بڑھ رہے تھے۔ابا جان نے قرآن مجید کی بے حرمتی کا واقعہ سنا تو بے حد متاثر ہوئے،بڑی دیر تک روتے رہے،پھر اٹھے انہوں نے اپنی رائفل سنبھال کر بلوچ رجمنٹ کے سربراہ سے بات کی۔اس رجمنٹ کے کچھ نوجوان کانوائے لے کر آئے تھے۔تاریخ میں انکی شجاعت اور بہادری کی مثال لکھی جائے گی۔ابا جان نے کہا میں کر سڑکوں سے قرآن مجید اٹھاتا ہوں اور کانوائے ہم سب کو لے کر لاہور روانہ ہو جائے۔وہ کسی قافلے کے ساتھ آجائینگے۔اس پر بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں نے کہا شیخ صاحب :پاکستان بنا ہی قرآن مجید کی وجہ سے ہے۔ہم اسے سڑکوں پر کیسے چھوڑ سکتے ہے؟ادھر والدہ نے بھی یہی کہا،چنانچہ دوسرے اور تیسرے روز بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کے ساتھ مل کر ہم سڑکوں اور گلیوں سے قرآن مجید اٹھا رہے تھے۔مرہٹہ فوج نے اس مرحلے پر اتنا ساتھ دیا کہ ہم پر حملہ نہ ہوا۔کوئی پچاس بوریاں بھر گئیں جنہیں ایک کنویں میں دفن کر دیا گیا کچھ ساتھ لے آئے۔قرآن مجید کی جس طرح بے حرمتی کی گئی تھی اسکا بڑا ہی المناک اثر ہم سب پر ہوا تھا۔قرآن مجید اٹھاتے وقت مختلف محلوں اور گلیوں میں ہمیں مسلمان عورتیں بڑی دردناک حالت میں ملیں۔ان بلوچی

مجاہدین نے انہیں احترام سے ایک جگہ دفن کر دیا۔بعض محلوں میں مجھے یاد ہے کہ خون ہی خون تھا۔چھوٹے چھوٹے بچوں کی لاشیں بھی دیکھیں،انہیں بھی دفن کیا۔بلوچ رجمنٹ کے خلوص اور لگن نے اس ظلمت میں روشنی کی اور چوتھے روز ہوشیار پور سے ہم وہاں کے بزرگوں کو یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تجھے اہل دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں گنج لٹا گئے
یہ گدا گران دیار غم،یہ قلندران تہی مدد (فراق)

راستے میں اکا دکا مسلمان عورتیں ملتی گئیں انہیں بھی ساتھ لیتے آئے۔سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی درندگی کا جی بھر مظاہرہ کیا تھا ہوشیار پور سے نکلتے وقت ایک عورت زخمی حالت میں پڑی ملی۔والد صاحب نے اٹھایا تو اسکی ٹانگیں اور سینہ کٹے ہوئے تھے ایک مشہور خاندان کی نوجوان لڑکی تھی ابا جی کو معلوم ہوا تو ضبط نہ کر سکے اس خاتون نے صرف اتنا کہا:آپ جایئے چاچا جی غم نہ کریں۔اتنا سب کچھ ہو جانے پر پاکستان تو بن گیا۔مجھے خوشی ہے کہ میں امت کے کسی کام تو آئی۔اس خاتون کے کلمات نے بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کو رلا دیا۔۱۹۴۷ء کی خون آشامی جنھوں نے دیکھی ہے وہی بتا سکتے ہیں کہ اس قدر بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور اجتماعی ہجرت کسی مجبوری،ڈر یا گھبراہٹ کے نتیجے میں ہرگز نہ تھی،بلکہ سادہ سے سادہ ترین مسلمان خواتین نے بھی پورے شعور اور ہواس کے ساتھ پاکستان کے حق میں فیصلہ کر کے قربانیوں کی عظیم مثالیں پیش کی تھیں۔کانوائے پر بلوچ نوجوانوں نے سٹین گن اور تھری ناٹ تھری رائفلوں کی حفاظت لے کر تیزی سے ہوشیار پور کو خیر باد کہا۔

شام چوراسی پہنچے تو دجلہ خوں بنا ہوا تھا معلوم ہوا یہاں کے نوجوانوں نے مسلسل چار دن تک پندرہ ہزار سکھوں اور ہندو غنڈوں کو روکے رکھا اور اس دوران میں مسلمان گھرانوں کے قافلوں کی صورت میں روانہ کیا۔نہر چڑھی ہوئی تھی ہم عبور نہ کر سکتے تھے ہزاروں مسلمان شہیدوں کے سر بہتے دیکھے۔ہم سب نے اتر کر دعا کی۔بلوچی نوجوانوں نے فوجی روایات کا پاس کرتے

ہوئے کنارے پر کھڑے ہو کر ان گزرتے سروں کو سیلوٹ کیا۔ کانوائے کے فوجی قائد نے کہا کہ ہم صبح کسی بھی وقت اسے عبور کر سکیں گے۔ اب یہیں ڈیرہ ڈال لیتے ہیں؛ البتہ شبخون کا خطرہ شدید ہے۔ رات کو بلوچ فوج کے ایک نوجوان نے بتایا کہ ہوشیار پور میں مرہٹہ فوج کے لوگوں نے انہیں بتایا تھا کہ وہاں پندرہ روز میں ساڑھے تین ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ اغوا ہونے والی خواتین کی تعداد کا علم نہ ہو سکا البتہ بعض جگوں پر مسلمان خواتین نے شدید مزاحمت کی یہاں تک کہ جلتے ہوئے کوئلوں ابلتے ہوئے پانی کا استعمال بھی اپنی دفاع میں کیا تھا۔

ہم سب جاگتے رہے کوئی ڈیڑھ دو بجے کے قریب چاند کی روشنی میں شمال وجنوب سے یکا یک بڑی تعداد میں سکھ، ست سری اکال کے نعرے لگاتے قریب آ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں نے یہ طریقہ استعمال کیا تھا کہ وہ آس پاس چھپ گئے تھے اور کانوائے کے کچھ مردوں کے پاس رائفلیں پہلے سے تھیں، کچھ کو تھما دی گئیں۔ جب وہ قریب آئے تو ان پر سامنے سے فائرنگ کی گئی وہ سمجھے کانوائے کے لوگ گہری نیند میں ہیں ابھی اس بوکھلاہٹ سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ چاروں طرف سے بلوچ رجمنٹ کے سٹین گنوں نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ اسکے بعد وہ غنڈے ایسے بھاگے کہ صبح تک کوئی خبر نہ ملی۔ تہجد کی نماز کے ساتھ نہر میں پانی اترنا شروع ہو گیا تھا، نہر عبور کی۔ پانی کم ہونے کے باجود اس قدر سرخ تھا کہ رات کو بھی اسکی سرخی دن کی سرخی کی طرح تھی۔ یہ تحریک پاکستان پر قربان ہونے والے شہیدوں کا خون تھا۔ نہر عبور کر کے ہم سب شدت تاثر سے کانپ رہے تھے کہ ایک طرف سے کراہنے کی آواز آئی۔ ایک بزرگ ڈاکٹر نصیر الدین آگے بڑھے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے؟ نسوانی آواز تھی۔ وہ فوراً لپکے۔ ایک خاتون خون میں لت پت پڑی تھی، پانی پلا کر مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس خاتون نے مرتے وقت صرف اتنا کہا: شام چوراسی کی جنگ میں میرے والد اور سات بھائی، چچا اور انکے چار لڑکے شہید ہو گئے۔ تین بہنیں لڑتے لڑتے نہر میں ڈوب گئیں۔ والدہ کو انہوں نے قتل کر دیا، میں چھپ گئی لیکن انہوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ جب قریب آئے تو میں نے چھرے اور ٹوکے سے دو کو

زخمی کر دیا۔ انہوں نے جھلا کر میرا یہ حشر کیا ہے۔ آخری سانس لینے سے پہلے کہا:

"پاکستان کو میرا اسلام پہنچا دیجئے۔۔"

خاتون کو دفن کر کے ہم تیزی سے جالندھر پہنچے۔ یہاں کا کیمپ قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تایا جی کو تلاش کیا، معلوم ہوا کہ وہ لاہور روانہ ہو گئے۔ ابا جی پیر صاحب بسی شریف کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں نے منع کیا۔ جالندھر کے مسلمانوں نے جس بے جگری، دردمندی اور زبردست قربانی سے تحریک پاکستان کے لیے کام کیا، وہ تاریخ پاکستان کا روشن باب ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے تحریک پاکستان کو تابنجی قربانیوں سے ہمکنار کیا۔ جالندھر کیمپ کے واقعات بڑے دلدوز تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک خاتون آخری دموں پر تھی، اسے معلوم ہوا ہم کانوائے پر پاکستان جا رہے ہیں تو ابا جان نے اس کو بلا کر کہا: یہ میرے زیورات ہیں۔ خاندان کے سارے مرد شہید ہو چکے ہیں، ان زیورات کو قائداعظم تک پہنچا دیں۔ شاید پاکستان کے لیے کام آئیں۔

اس سفر میں والدہ ماجدہ نے خواتین کی بڑی مدد کی۔ بڑی ہمت دلاتی تھیں، ہجرت کا مسئلہ تھا۔ ایک بزرگ شیخ نوردین نے دوائیں اپنے ساتھ لے لی تھیں۔ جنہیں وہ بڑی لگن سے تقسیم کرتے ان کے اس جذبے کا سب پر بہت اچھا اثر پڑا۔ واہگہ پہنچ کر ہم سب نے نماز پڑھی۔ خدائے بزرگ برتر کا شکر ادا کیا۔ مل کر شہیدوں پر سلام بھیجا۔ یہ بڑا دل فگار منظر تھا، مجھے یاد ہے مجھ پر سانس کی تکلیف کا پہلا حملہ ہو چکا تھا اور میں اس آرزو کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوا تھا ہندو بھیڑیوں اور سکھ غنڈوں نے برطانوی آقاؤں کی خاطر جس درندگی کا کھیل مسلمانوں کے ساتھ کھیلا تھا، تاریخ ہمیں ایک ایسا موقعہ دے کہ ہم اپنا حساب بے باق کر سکیں۔ جنگ تمنا کرنے کی چیز نہیں، لیکن ۱۹۴۷ء کی خون آشامیوں کو یاد کر کے سینہ افلاک سے آہ سوزناک اٹھتی ہے۔ (۳)

معصوم خون

ابو جواد

۲۸ اگست ۱۹۷۳ء کو جب میں انوپ گڑھ سے فرار ہوا تو بوجوہ چند میل دور جا کر دو سکھ کسانوں نے مجھے دوبارہ پکڑ لیا۔ سرجیت سنگھ اور مہندر سنگھ نامی یہ دونوں سکھ کہہ رہے تھے کہ اگلے روز تمہیں دوبارہ انوپ گڑھ پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہیں ایک باوقار سکھ خاتون سے ملاقات ہوئی جسے میں نے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں اور چھوٹی موٹی اسمگلنگ کرتا ہوں۔ مجھے ایک کمرے میں بند کر کے دونوں سکھ کہیں باہر چلے گئے۔ میں خاصی دیر زمین پر لیٹا اپنی سعی کی ناکامی پر افسوس کرتا اور سوچتا رہا کہ تقدیر میں لکھی ہوئی سیاہیاں تدبیر سے نہیں دھل سکتیں۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر بیٹھ گیا اور گھسٹ کر کھڑکی کے سامنے جا بیٹھا اور بے مقصد ہی باہر دیکھتا رہا۔ اس دوران ان دونوں افراد کی صورت دوبارہ نظر نہ آئی۔ صحن میں درختوں کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ اس وقت وہ مہربان عورت کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور تھوڑی دیر مجھے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس کے آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے جنہیں اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کیا اور پھر ٹھہری ہوئی آواز میں گویا ہوئی: ''بیٹا تم یہ اسمگلنگ کا گندا دھندا کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے پاکستان انہی غلیظ کاموں کے لئے حاصل کیا تھا؟''۔ اس کے لہجے میں عجیب سی کاٹ تھی جسے محسوس کر کے میں بری طرح چونک اٹھا۔ میں چاہنے کے باوجود اسے نہ بتا سکا کہ اے مہربان ہستی میں ہرگز اسمگلر نہیں ہوں بلکہ.....اب اس کی آواز میں غصے کا عنصر نمایاں تھا ''جواب دو۔ کیا ہم نے لاکھوں جانوں کا نذرانہ اس لئے پیش کیا تھا کہ تم لوگ اپنی چند دنیاوی آسائشیں حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی گھٹیا حرکتوں پر اتر آؤ؟''۔ اس کی اس بات نے مجھے پوری طرح ہلا کر رکھ دیا کیونکہ اس نے لفظ ''ہم'' استعمال کر کے اپنی شخصیت کو انتہائی پراسرار بنا لیا تھا۔ اپنی حالت زار بھول کر اب میری خواہش تھی کہ اس کی شخصیت کی پوشیدہ گتھیاں کسی طرح معلوم ہو سکیں۔ میں نے جواب دیا ''ماں جی! میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسمگلنگ کے دھندے میں پڑ

کر میں نے کوئی مستحسن کام نہیں کیا، لیکن آپ کے لہجے میں میرے لئے جو حد درجہ اپنائیت ہے اسے محسوس کر کے میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ آخر آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟'' یہ سن کر چند لمحوں کے لئے وہ خاموش رہی، پھر بولی ''میں صرف انسانیت کے ناتے سے تمہیں سمجھا رہی ہوں ورنہ میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ''۔ اس دوران اس نے چارپائی کھینچ کر کھڑکی کے سامنے کر لی تھی اور اس پر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے چند ثانئے توقف کے بعد اس سے پوچھا: ''ماں جی! آپ نے اپنی گفتگو کے دوران اردو کے بعض ٹھیٹھ الفاظ استعمال کئے ہیں اس کے علاوہ بھی آپ کی باتوں میں جو خلوص اور پیار ہے وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں آپ سے پوچھنے کی جسارت کروں کہ آپ میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھے آپ میں کسی ایک آدمی کی ماں کا چہرہ نظر نہیں آتا بلکہ آپ صرف ''ماں'' لگتی ہیں۔ آپ جیسی نفیس خاتون مہندر سنگھ جیسے حیوان کے ساتھ کیسے زندگی بسر کر رہی ہیں۔'' کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ اٹھی اور اس نے کہا: ''میں حویلی کا بڑا دروازہ بند کر آؤں تا کہ ان کے آنے کا پتہ چل سکے''۔ واپس آ کر وہ کچھ دیر بیٹھی سوچوں میں گم رہی پھر کہنے لگی: ''بیٹا! میں ان لوگوں میں سے نہیں جو زندگی گزارتے ہیں بلکہ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جن پر سے زندگی گزرتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا اپنی بات کا سرا کہاں سے پکڑوں۔ یادوں کا ایک ہجوم ہے اور ہر یاد پوری عمر پر محیط ہے۔ میں مشرقی پنجاب کے ضلع سنگرور کے ایک چھوٹے سے گاؤں راج گڑھ میں پیدا ہوئی۔ اس گاؤں کی اکثریت ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ پندرہ بیس گھرانے مسلمان تھے۔ میرے والد گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اور اور ساتھ ہی گاؤں کی اکلوتی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے موقع پر میں سولہ سترہ سال کی ایک لاابالی سی لڑکی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی دس سال کا تھا۔ میں نے گھر ہی میں والد صاحب سے اردو اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارا چھوٹا سا گھرانہ ہر طرح سے مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ پورا گاؤں میرے والد صاحب کا احترام کرتا تھا لیکن شاید یہ خوشیاں زیادہ دیر ہمارا مقدر نہ تھیں۔ قیام پاکستان کے اعلان

کے فوراً بعد شمالی ہندوستان کے طول وعرض میں ہندو مسلم دنگے فساد پھوٹ پڑے۔ انسانی اور اخلاقی قدریں محض قصہ ماضی بن کر رہ گئیں۔ سالہا سال سے اکٹھے رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ ان حالات میں میرے والد نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے مشورے کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا، لیکن ہندوؤں اور سکھوں کو یہ بات بھی گوارا نہ تھی اور عین ہماری روانگی کے وقت آس پاس کے گاؤں سے مسلح جتھے وہاں پہنچ گئے اور چشم زدن میں تمام مردوں کو تہہ تیغ کر دیا۔ نوجوان لڑکیوں کو ان کی ماؤں کے سامنے اجتماعی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ آج بھی جب میں اس دلخراش منظر کو چشم تصور سے دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ ابن آدم ذلت کی ان گہرائیوں تک جا سکتا ہے۔

میرا معصوم بھائی باقی بچوں کی طرح ڈرا سہا کھڑا تھا۔ جب اس نے چند حیوانوں کو میری طرف بڑھتے دیکھا جن پر میری منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا تو بھاگ کر میرے سامنے آ گیا اور مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ تبھی ایک منحنی سے ہندو نے اپنی کلہاڑی کا زوردار وار اس معصوم کی گردن پر کیا جس سے اس کا سر تن سے جدا ہو کر دور جا پڑا۔ اس پر اس ظالم نے شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہاری گردن اتنی کمزور ہے تو اپنی کلہاڑی تمہارے گندے خون سے بھرشٹ (ناپاک) نہ کرتا۔ اب مجھے اپنی کلہاڑی گنگا جل سے دھو کر پوتر کرنی پڑے گی''۔ یہ کہہ کر وہ بھی شیطانی کھیل میں شامل ہو گیا۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹ کر گرا۔ تمام بوڑھی عورتوں کو قتل کرنے کے بعد سب لڑکیوں کو وہ ایک حویلی میں لے گئے اور سب قطار بنا کر کھڑے ہو گئے اور باری باری اپنے ''اشرف المخلوقات'' ہونے کا ثبوت فراہم کرتے گئے۔ نئے آنے والے قطار کے آخر میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے۔ اس عمل میں زندہ بچ جانے والی چند خوش نصیبوں یا بدنصیبوں میں، میں بھی شامل تھی۔ اس کے بعد میں ایک کے ہاتھوں سے دوسرے تک پہنچتی رہی۔ آخر سوہن سنگھ نے مجھے اپنے گھر ڈال لیا اور شادی بھی کر لی۔ وہ کانگڑہ کے گاؤں راسپورہ کا سرپنچ تھا اور بہرحال ایک ہمدرد انسان ثابت

ہوا۔ شادی کے سات سال بعد سوہن سنگھ سورگباش ہو گیا اور اس کے چھوٹے بھائی مہندر نے مجھ سے شادی کر لی۔ یہاں راجستھان میں بھی ہم نے زمین خریدی ہوئی ہے اس لئے میں یہاں کچھ عرصہ مہندر کے پاس رہتی ہوں اور پھر کانگڑہ میں اپنے بچوں کے پاس چلی جاتی ہوں۔ سرجیت سنگھ یہاں والی زمین میں مہندر کا حصے دار ہے''۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو کر اپنی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی اپنی انگلیوں سے صاف کرنے لگی۔ میں گنگ سا بیٹھا اس کے پرعصمت چہرے کو تکے جا رہا تھا۔ ایک سوال جو میرے ذہنوں میں خاصی دیر سے کلبلا رہا تھا، زبان پر آ ہی گیا: ''ملکی حالات نارمل ہونے کے بعد آپ پاکستان کیوں نہیں گئیں''۔ یہ سن کر وہ خفیف سا مسکرائی اور پھر سنجیدہ ہو گئی: ''تقسیم ہند کے کچھ عرصے بعد حالات واقعی نارمل ہو گئے تھے۔ میں چاہتی تو پاکستان جا سکتی تھی، لیکن اس معاملے میں چند باتیں آڑے آئیں ورنہ اس جنت ارضی میں جانے کی خواہش، جس کے لئے ہم نے لاکھوں جانوں کا بلیدان دیا، کسے نہیں ہو سکتی؟ میں شروع میں کرب اور اذیت کے جس جہنم سے گزری تھی اس کے بعد اپنی نظروں میں خود ہی اتنا گر گئی تھی کہ اپنے آپ کو اس مقدس دھرتی پر پاؤں رکھنے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے بعد میری اولاد ہو گئی اور میں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر جانے کی ہمت اپنے اندر پیدا نہ کر سکی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری بیٹیاں یہاں ساری عمر اچھوتوں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ میری غیر موجودگی میں ایک مسلمان عورت کی بیٹیاں ہونے کے ناطے ان سے ہریجنوں جیسا سلوک ہوتا۔ ویسے جہاں تک پاکستان سے محبت کا تعلق ہے یہ میرے اور میرے رب کے درمیان معاملہ ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ اگر میرے بچوں کو کوئی بیماری یا تکلیف ہوتی ہے تو میں ان پر پاکستان پڑھ کر پھونک مارتی ہوں اور میرا سچا رب میرے اس اندھے اعتقاد کی لاج رکھتے ہوئے ان کی تکلیف دور کر دیتا ہے۔ میری ہر سانس میں یہ پوتر نام رچا بسا ہے۔ جہاں تک اس وقت پاکستان جانے کا تعلق ہے، صاف بات یہ ہے کہ اب میں وہاں جانا ہی نہیں چاہتی۔ مجھے معلوم ہے کہ دور کے ڈھول کتنے سہانے ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر میرا بنایا ہوا حسین خوابوں کا شیش محل یقیناً ٹوٹ جائے گا کیونکہ میرے سپنوں کا پاکستان وہ نہیں

جو وہاں کے حکمرانوں کا پاکستان ہے۔ میں مورکھ نہیں ہوں، مجھے اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ پاکستان تو ہے مگر کوئی پاکستانی نہیں۔ کوئی پٹھان ہے، تو کوئی بلوچی ہے، کسی کے لئے سندھی اجرک ہی سرمایہ حیات ہے تو کوئی پنجاب کی پگ پر داغ نہ لگنے کو اپنی ساری زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے روز مجھے اپنا معصوم بھائی کتنا یاد آیا جس کی نازک گردن ہندو بلوائیوں نے کلہاڑی کے ساتھ دھڑ سے الگ کر دی تھی۔ اگر تم میرے پاکستان میں کبھی پہنچو تو لوگوں کو بتانا کہ زمین کا یہ خطہ اتنی ارزاں شے نہیں''۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں کتنی ہی دیر بت بنا اس خاتون کے آئینے میں اپنے چہرے کی سیاہیاں دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے مجھے اپنے قد کی کوتاہی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ لمحوں کا فاصلہ صدیوں میں طے ہوتا محسوس ہوا۔ شام رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی۔ جب وہ اٹھی اور کہنے لگی: ''تمھیں بھوک لگی ہوگی۔ میں تمہارے لئے روٹی لے کر آتی ہوں۔''

کچھ دیر کے بعد لوٹ کر آئی تو بولی: تمہارے کمرے کا دروازہ تو بند ہے اور چابی مہندر لے گیا ہے۔ کھڑکی کی سلاخوں سے ہی روٹی پکڑلو۔'' دو روٹیوں کے اوپر ہی اس نے کریلوں کا سالن رکھ دیا اور مجھے سلاخوں میں سے روٹیاں دوہری کر کے پکڑا دیں۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے باہر سے پانی انڈیلا جو میں نے اوک لگا کر پی لیا۔ پھر اس نے یہ کہتے ہوئے کہ ''میں تمھارے لئے دروازہ تو نہیں کھول سکتی'' کھڑکی میں سے چارہ کاٹنے والی درانتی لا کر مجھے دی اور بولی'' دیوار کچی مٹی کی ہے رات ان کے سونے کے بعد تم اگر درانتی سے دیوار کریدو گے تو تھوڑی دیر بعد اس میں شگاف ہو جائے گا کہ تم باہر نکل سکو۔ یہاں سے پاکستانی سرحد چار میل دور مغرب میں ہے۔ اگر قسمت نے تمہارا ساتھ دیا تو اپنے وطن پہنچ جاؤ گے۔ میں اب جاتی ہوں کیونکہ وہ دونوں اب آنے والے ہیں، کہیں انہیں شک نہ ہو جائے۔ خدا تمہیں کامیاب کرے!'' یہ کہہ کر وہ عظمتوں کی امین ہستی وہاں سے چلی گئی۔ میں اپنے فرار سے زیادہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔(۴)

روشن چراغ

تہمینہ فرحی مناظر

۱۴ اگست یوم آزادی پاکستان! تجدید عہد وفا کا دن!

ہر طرف جشن بہاراں کا سماں ہے۔ شہر کی تمام عمارتوں پر پاکستان پرچم لہرا رہے ہیں۔ قوم کے نونہال سبز پرچم ہاتھوں میں لئے جلوس کی شکل میں قومی نغمے گاتے گلیوں بازاروں سے گزر رہے ہیں۔ صبح دم مساجد میں نماز کے بعد ان شہیدوں کی ارواح کو ثواب پہنچایا گیا جنہوں نے حصول پاکستان کی جدّ وجہد میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ پھر پاکستان کی خوشحالی کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔ میں بھی اس روز بہت خوش تھی۔ وہ میری سہیلی کا گھر تھا جہاں اس وقت میں موجود تھی۔ شام کو شہر میں چراغاں کا منظر تھا۔ میری سہیلی کا مکان بھی سرو چراغاں کی طرح منور تھا۔ ہم مکان کی چھت پر کھڑی جشن آزادئ پاکستان کے ان مسرور کن لمحات سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک میری نظر ساتھ والے مکان کی چھت پر پڑی۔ اس کچے مکان پر ایک ضعیف العمر خاتون سفید چادر اوڑھے چھت کی منڈیر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چراغ روشن تھا۔ چراغ کی لو کو ہوا سے بچانے کے لئے انہوں نے دوسرے ہاتھ کی اوٹ بنائی ہوئی تھی۔ چھت کی منڈیر پر پہلے ہی سے موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ان موم بتیوں کے درمیان یہ بزرگ خاتون روشن چراغ رکھنے جا رہی تھیں۔ ان بزرگ خاتون کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے چراغ ان کے ہاتھ سے گر جائے گا۔ میری سہیلی اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرف متوجہ تھی۔ ان کے مکان کی چھت ساتھ والے مکان سے تھوڑی سی نیچی تھی۔ میں ساتھ والے مکان کی چھت پر چلی گئی۔ اور بزرگ خاتون کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا: لائیے اماں جی! میں چراغ منڈیر پر رکھ دیتی ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے کہیں گر نہ پڑے۔ بزرگ خاتون نے اپنی جھریوں والا پرنور چہرہ اوپر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا تقدس تھا۔ وہ شفقت آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئیں: ''یہ چراغ میں ہر سال اپنے ہاتھ سے منڈیر پر روشن کرتی ہوں یہ کبھی نہیں

گرے گا بیٹی!'' اور پھر انہوں نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے مٹی کا روشن چراغ منڈیر پر موم بتیوں کے درمیان رکھ دیا۔ ان کے معمر چہرے پر ایک پُرجلال خاموشی تھی۔ پھر ان کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر جیسے اپنے آپ سے گویا ہوئیں: ''یہ شہیدوں کا چراغ ہے بیٹی! اس میں میرے بھائیوں بہنوں اور بچوں کی روشنی ہے۔ یہ سارے پاکستان کی روشنی ہے۔ یہ روشنی اسی طرح سلامت رہے گی''۔ پھر خاتون کے دونوں ہاتھ بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئے: ''اللہ پاک! اپنے پیارے رسول ﷺ کے صدقے! بچوں کی قربانیاں قبول کر! پاکستان پر اپنی رحمت کا ہمیشہ سایہ رکھنا!'۔ آمین کہہ کر انہوں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور مجھے دعائیں دیتی ہوئی نیچے چلی گئیں۔ میں گم سم چھت پر کھڑی تھی۔ معمر خاتون کے جذبہ حب الوطنی نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنی سہیلی کی چھت پر آ گئی۔ میں نے اس سے خاتون کے بارے میں پوچھا۔ میری سہیلی نے بتایا: ''ان بزرگ خاتون کا نام حرمت بی بی ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ ضلع نکودر میں اپنے بھائی بہنوں اور بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ جب پاکستان بنا اور ہندو سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا تو اس خاتون کا پورا خاندان شہید کر دیا گیا۔ تب یہ جوان تھیں۔ اس دن سے لے کر آج تک یہ یوم آزادی کی رات کو اپنی چھت کی منڈیر پر چراغ روشن کرنا کبھی نہیں بھولتیں''۔ ''اچھا!'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''میں اس عظیم خاتون سے ملنا چاہتی ہوں''۔

دوسرے روز میں اپنی سہیلی کے توسط سے اس بزرگ خاتون سے ملنے ان کے مکان پر گئی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ انہوں نے اپنی بہو کو میرے لئے چائے لانے کو کہا۔ میری سہیلی مجھے وہاں چھوڑ کر چلی گئی۔ تب میں نے بزرگ خاتون (حرمت بی بی) سے کہا وہ مجھے ۱۹۴۷ء کے واقعات سنائیں تاکہ میں انہیں پاکستان کی نئی نسل کے سامنے پیش کر کے انہیں بتا سکوں کہ ہم نے پاکستان کے لئے کتنی بڑی قربانیاں دیں ہیں اور پاکستان کا وجود ہمارے لئے کتنا مقدس اور انمول ہے۔ حرمت بی بی ایک پل کے لئے ماضی کے تصورات میں گم ہو گئیں، جیسے وہ بیتی ہوئی تلخ یادوں

کو سمیٹ رہی ہوں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ''نکودر میں ہمارا ہنستا بستا گھرانہ تھا۔ ہمارے کنبے میں میرے بھائی اور بہنوں کے علاوہ ان کے بچے بھی تھے۔ اس زمانے میں خاندان کے سب افراد ایک ہی جگہ، اکٹھا رہنا پسند کرتے۔ ان میں پیار محبت بھی بہت تھا۔ ہمارے بڑے مکان میں کھلا آنگن اور برآمدوں میں ایک دوسرے سے متصل کمرے تھے۔

ایک زینہ اوپر چھت پر جاتا تھا جہاں ایک کوٹھڑی میں سوکھی لکڑیاں اور کچھ پرانے صندوق پڑے تھے۔ نکودر میں ہندو سکھوں کی بڑی آبادی بھی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ اگرچہ مسلمانوں کے پرانے تعلقات تھے لیکن ان کا رہن سہن ہم سے بہت مختلف تھا۔ ہندو بظاہر مسلمانوں سے ہنس ہنس کر ملتے مگر اصل میں وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے۔ شہر کے سارے کاروبار پر ہندو اور سکھوں کا قبضہ تھا۔ اگر کوئی مسلمان منڈی میں دوکان خرید کر اپنا کاروبار شروع کرتا تو ہندو سازش کر کے اسے وہاں سے نکال دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ نکودر میں مسلمانوں کے پاس کوئی بھی بڑا کاروبار نہیں تھا۔ چند گنتی کے مسلمان آڑھت وغیرہ کرتے۔ ہولی کے دنوں میں ہندو نشہ وغیرہ کر کے جلوس نکالتے۔ اس جلوس میں وہ ایک دوسرے پر رنگ اچھالتے۔ کوئی مسلمان نظر آ جاتا تو اس پر بھی رنگ پھینک دیتے۔ واہیات حرکتیں کرتے۔ مسلمانوں کے مکانوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ نیچے آؤ تم بھی ہولی کھیلو۔ راستے میں مسجد آ جاتی تو وہ اور زور سے ڈھول تاشے بجانے لگتے، چنانچہ ہولی کے موقع پر نکودر میں ضرور فساد ہو جاتا۔ ہندو برہمن کے قریب سے اگر کوئی مسلمان گزر جاتا وہ بھرشٹ یعنی پلید ہو جاتا اور فوراً گھر جا کر نہاتا۔ ہندو عورتیں بھی ہمارے گھر میں بہت کم آتی تھیں۔ جب آتیں تو ہم سے دو گز کے فاصلے پر بیٹھ کر بات کرتیں۔ میرے گھر میں ایک عیسائی عورت کام کرتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ ہندو عورتیں جب آپکے گھر سے واپس جاتی ہیں تو دوبارہ گنگا کے پانی سے نہا کر اپنے آپ کو پاک کرتی ہیں۔ ہندو اور سکھوں کے گھروں کے برتن ہم مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کے کھانے ہم سے الگ تھے۔ ان میں ذات پات بھی بہت تھی۔ مسلمان گائے کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھاتے تھے اور ہندو ''گئو

ماتا'' کی پوجا کرتے تھے۔ ہر ہولی، دیوالی پر ہندو مسلم فساد ضرور ہو جاتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمان تو صدیوں سے اکٹھے ہی رہتے آ رہے تھے وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انڈیا میں کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں ہندو اور سکھ، مسلمانوں پر حملے نہ کرتے۔ تب قائداعظمؒ نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کیا اور ان کے لیے الگ اسلامی ریاست ''پاکستان'' کا مطالبہ کر دیا۔

ہندوستان کی فضا ''پاکستان زندہ باد'' ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ پوری مسلمان قوم نے ان کا ساتھ دیا۔ نکودر شہر کے دوسرے مسلمان گھرانوں کی طرح ہمارے گھر میں بھی ہر وقت پاکستان کا ذکر ہونے لگا۔ میرے بھائی اور والد صاحب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ ہم عورتیں بھی زنانہ مسلم لیگ کے جلسے جلوسوں میں شرکت کرتیں۔ مسلمانوں میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ پاکستان کا لفظ ہی ایسا تھا جس کے زبان پر آتے ہی چہرے چمک اٹھتے اور ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی۔ ہندو اور سکھ اپنا تمام زور لگا رہے تھے کہ پاکستان نہ بنے تا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد مسلمان ان کے غلام بن جائیں لیکن ہمارے قائداعظمؒ نے ہندوؤں اور سکھوں کے اس ناپاک ارادے کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ ان کی عقل و حکمت نے ہر دشواری کا قلع قمع کیا اور یوں منزل آسان تر ہوتی گئی۔

ایک روز ہمارے والد صاحب نے آ کر بتایا کہ انگریز اور کانگریس نے مسلمانوں کے جائز مطالبے کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور جلد ہی پاکستان کے قیام کا اعلان ہونے والا ہے۔ یہ خبر سن کر اس وقت ہمارے گھر میں قرآن خوانی کرائی گئی۔ ہم سب نے نوافل ادا کئے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر یہ دعا مانگی کہ اے پاک پروردگار! پاکستان کو ابدی وجود بخشنا اور پھر ایک روز ریڈیو پر اعلان ہوا کہ پاکستان کا قیام ۱۴ اگست کو عمل میں آ جائے گا۔ اس وقت نکودر کا کوئی مسلمان گھرانہ ایسا نہ تھا جہاں سے ''پاکستان زندہ باد'' اور ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے نہ بلند ہوئے ہوں۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں اور سکھوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے۔ وہ مسلمانوں کی جانوں کے دشمن تو پہلے ہی تھے، اب کانگریس کی جماعت، ہندوؤں

اور سکھوں کو شہ دے رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کے عزائم خاک میں ملا دیں۔ ایک دن چھوٹا سا جلوس سبز جھنڈیاں اٹھائے ایک بازار میں سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک ہندو حلوائی نے مسلمانوں پر کھولتا ہوا گھی پھینک دیا۔ دو مسلمان وہیں شہید ہو گئے۔ ہندو اور سکھ بلم، تلواریں کرپانیں اور بندوقیں لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمانوں نے بھی کافروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن شہر کی مسلمان پولیس سے پہلے ہی ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ ساری پولیس ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ پولیس کے ساتھ ساتھ ہندو فوج بھی غنڈوں کے ساتھ مل گئی تھی۔ ایسے میں مٹھی بھر مسلمان بھلا کیسے ان کا مقابلہ کرتے؟ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگائی جانے لگی۔ توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گھر لوٹے جانے لگے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا۔ کرفیو لگا مگر قتل و غارت گری جاری رہی۔ کرفیو کھلتے ہی ہندو غنڈے، ہندو پولیس کی مدد سے دوبارہ مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیتے۔ آخر مسلمان شہر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جس کا جدھر سینگ سمایا، بال بچوں کے ہمراہ بھرا گھر چھوڑ کر چل پڑا۔ ہمارا اپنا خاندان بھی بچتا بچاتا شہر سے نکل کر ایک قریبی گاؤں میں آ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پاکستان کیسے پہنچا جائے۔ ابھی باقاعدہ مہاجر کیمپ نہیں بنے تھے۔ نکودر کے بعض محلوں کے مسلمان ایک اسکول کے احاطے میں جمع ہو گئے لیکن اسی رات ہندو غنڈوں نے حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ شہید کر دیئے گئے۔

ہم لوگ فوراً اپنے گاؤں آ گئے۔ یہاں ہمارا ایک پرانا مکان تھا۔ خیال تھا کہ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد جالندھر کی طرف چلے جائیں گے۔ میرے والد اور بھائی کے پاس دو رائفلیں تھیں۔ ہم نے بھی سبزی ترکاری کاٹنے والی چھریاں اپنے پاس رکھ لی تھیں کہ اگر کافروں نے حملہ کیا تو آخری دم تک لڑیں گی۔ میرے بھائیوں اور بہنوں کے بچے اور میری بھابیاں بھی ساتھ تھیں۔ تھوڑا بہت اناج ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے، لہٰذا روٹی پکا کر پیاز کے ساتھ کھا لیتے۔ والد صاحب اور بھائی باری باری رات کو مکان کی چھت پر پہرہ دیتے۔

اس مکان میں آئے ہمیں ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات ''ست سری

اکال' اور ''ہر ہر مہادیو' کے فلک شگاف نعرے سنائی دیئے۔ والد صاحب اور بڑے بھائی چھت پر ہی تھے۔ والد صاحب نے عورتوں کو بلند آواز میں مخاطب کیا'' کافر حملہ کرنے آرہے ہیں۔ جب تک ہم زندہ ہیں تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔ ہم عورتیں اور بچے چپ تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے قریب آتے ہی ہمارے مکان پر فائرنگ شروع کردی۔ والد صاحب اور بھائیوں نے بھی گولیوں کا جواب گولیوں سے دیا۔ ہر طرف ایک ہولناک شور گونجنے لگا۔ ہم نے کیواڑ بند کر کے اندر سے کنڈی لگادی۔ ڈر کے مارے ہمارا برا حال تھا۔ چھوٹی سی بے ضرر چھریاں ہمارے پاس تھیں مگر گولیوں اور تلواروں کے آگے ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم نے عہد کرلیا تھا کہ اس سے پہلے کہ کوئی ہماری عزت پر حملہ کرے ہم اپنی جانیں پاکستان پر قربان کردیں گی۔ دس پندرہ منٹ تک ہندو اور سکھ فائرنگ کرتے رہے۔ ہماری جوابی فائرنگ سے وہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ گاؤں کے چند ایک مسلمان گھروں سے چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر چھت سے ہمارے والد صاحب اور بھائی نیچے آگئے۔ انہوں نے بتایا کہ گولیاں ختم ہوگئیں ہیں لیکن وہ آخری دم تک ہندوؤں کا مقابلہ کریں گے۔ بھلا وہ خالی بندوقوں سے نیزوں، رائفلوں اور کرپانوں کا کہاں تک مقابلہ کرسکتے تھے۔ اور پھر ہوا یہ کہ سکھوں اور ہندوؤں نے ہمارے مکان کے دروازے کے آگے چارپائیاں کھڑی کر کے انہیں آگ لگادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بلند ہونے لگے۔ دروازہ جل کر گر پڑا تو ہندو اور سکھ نعرے لگاتے اندر گھس آئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک کہرام برپا ہوگیا۔ اندھیرے میں بلم، کرپانیں اور تلواریں چلنے لگیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ہندوؤں نے میرے والد اور بھائیوں کو تلواروں اور کرپانوں کے وار کر کے شہید کردیا۔ ذرا سی دیر میں میری بہنوں اور بھابیوں کی کٹی پھٹی لاشیں صحن میں بکھری پڑی تھیں۔ سکھوں نے بچوں کو ہوا میں اچھال کر نیزوں میں پرودیا۔ میرا خاوند، میرے پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں بھی شہید کردی گئیں۔ میں نیم جان نیم بے ہوش سی ہوکر اپنے بھائی بندوں کی لاشوں کے درمیان دم سادھے پڑی تھی۔ اتنے میں میرے سب سے چھوٹے بچے علی رضا نے جو شدید زخمی تھا، پانی مانگا۔

اس کی آواز سن کر ایک سکھ چلایا'' یہ ابھی زندہ ہے''۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار کے ایک ہی وار سے ننھے علی رضا کی گردن تن سے جدا کردی۔ میرے دل پر چھریاں سی چلنے لگیں۔ میں چیخنا چاہتی تھی مگر میرے حلق سے کوئی آواز نکل نہ سکی۔ دہشت نے جیسے میرا گلا بند کردیا تھا۔ ہندو اور سکھ کرپانیں اور تلواریں لہراتے، قہقہے لگاتے مکان سے نکل گئے۔ آنگن میں چالیس کے قریب لاشیں پڑی تھیں۔ فرش پر ہر طرف خون ہی خون تھا۔ پھر خدا جانے کہاں سے مجھ میں طاقت آگئی۔ میں نے لیٹے لیٹے سر اٹھا کر دیکھا لاشوں کے ڈھیر میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ میں نے اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی لاشوں کو پرے ہٹایا تو دیکھا کہ ان کے نیچے میری چھوٹی بہن اپنے معصوم بچے کو سینے سے لگائے لیٹی ہے۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے بچے کو سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ بچے نے دوسری بار آواز نکالی تو میں نے بچے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولی: ''خضراں! آواز نہ آئے اس کی'' میری بہن نے بچے کے منہ پر اپنا خون آلود ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ دیر ہم بھی بے جان لاشوں کی طرح وہیں پڑے رہے۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے وہاں سے جاچکے ہیں تو ہم اپنے پیاروں کے لاشوں کے درمیان سے اٹھے اور گرتے پڑتے مکان سے باہر آگئے۔ چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اچانک ایک طرف سے آواز آئی: ''چل کے دیکھو کوئی زندہ نہ ہوان میں!'' اتنا سننا تھا کہ ہم واپس بھاگیں اور دوبارہ لاشوں میں آکر چھپ گئیں لیکن سکھوں یا ہندوؤں میں سے کوئی اندر نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد میری بہن کے بچے کے حلق سے پھر کراہ نکلی۔ میری بہن نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے خشک اور سہمی ہوئی آواز میں کہا: ''باجی! خدا کے لئے بچے کا گلا دبادو۔ کہیں اس کی آواز سن کر سکھ واپس نہ آجائیں''۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ ہم آدھا گھنٹہ وہیں پڑے رہے۔ اب بہت دور سے ہندوؤں اور سکھوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میری بہن پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے خاوند، میرے بھائیوں اور بہنوں کے بچوں اور والدہ اور والد صاحب کی لاشوں کو اندھیرے میں تک رہی تھی۔ میں نے اپنی بہن کا بازو پکڑ کر

اسے اٹھایا اور کہا ''خدا کو یہی منظور تھا۔ پاکستان پر ہم نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ اب ہمیں کسی طرح پاکستان پہنچنا ہے۔ خدا ہماری مدد کرے گا''۔ ہم مکان سے نکل کر اندھیروں میں ایک جانب چل پڑیں۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ جگہ جگہ موت کے سائے تھے۔ آباد گھروں کے بجائے اب ہر طرف کھنڈر تھے۔ منہدم اور جلی ہوئی عمارتیں تھیں۔ ہم دونوں گرتی پڑتی آگے بڑھتی رہیں۔ مجھے صرف یہ یقین تھا کہ جس طرف ہم جا رہی ہیں ادھر جالندھر جانے والی جرنیلی سڑک آجاتی ہے۔ ہم کھیتوں میں چلنے لگیں۔ کھیتوں میں جگہ جگہ مسلمانوں کی لاشیں دکھائی دیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مسلمان جان بچانے کے لئے جرنیلی سڑک کی طرف بھاگے تھے مگر سکھوں یا ہندوؤں نے انہیں راستے ہی میں قتل کر دیا۔ میری بہن کے ہونٹوں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک کراہ سی نکل جاتی تھی۔ کبھی وہ پیچھے گاؤں کی طرف دیکھنے لگتی جہاں اس کے خاوند اور خاندان کے دوسرے بچوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

ستاروں کی مدھم روشنی میں ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے میں راستہ تلاش کرتی جا رہی تھی۔ ان کھیتوں سے کئی بار اپنے خاوند کے ساتھ گزر کر میں گاؤں آتی تھی۔ نکودر سے بھٹنڈہ کی طرف جاتے ہوئے ہم جرنیلی سڑک پر بس سے اتر جاتے اور پھر پیدل ہی کھیتوں کھیت ہوتے ہوئے گاؤں پہنچ جاتے۔ مزید نصف گھنٹہ چلنے کے بعد اب مجھے دور سے جرنیلی سڑک نظر آنے لگی تھی۔ جس وقت ہم سڑک پر پہنچے تو وہاں ایک مہیب سناٹا تھا۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی پھر کچھ ہی دیر بعد ہمیں کچھ لاشیں اوندھی پڑی نظر آئیں۔ میری بہن نے خوفزدہ ہو کر کہا: ''باجی واپس گاؤں چلو۔ یہاں بھی سکھ آجائیں گے''۔ اچانک مجھے بھٹنڈہ کی جانب سے آتی ہوئی کسی لاری کی روشنی نظر آئی۔ میری بہن ڈر کر درختوں کے نیچے چھپ گئی۔ میں ہمت کر کے وہیں کھڑی رہی۔ دل میں ایک موہوم سی آس تھی کہ شاید اس لاری میں بھٹنڈہ کے مسلمان بیٹھے ہوں اور وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ پاکستان لے چلیں۔ لاری کی روشنی اب مجھ پر پڑ رہی تھی۔ اچانک میرا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں یہ سکھوں کی لاری نہ ہو۔ میں بھی گھبرا کر درختوں کی طرف دوڑ

پڑی، لاری قریب آ پہنچی اور سڑک کی ایک جانب کھڑی ہوگئی۔ میں نے درخت کی اوٹ سے دیکھا یہ لاری نہیں تھی بلکہ فوجی ٹرک تھا۔ میرا خون خشک ہوگیا۔ ضرور یہ ہندو فوجی ہیں اور ہمیں اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں نے اپنی بہن سے کہا کہ گاؤں کی طرف بھاگ چلو۔ عین اسی وقت ٹرک میں سے دو فوجی کود کر سڑک پر اتر آئے۔ ان میں سے ایک نے بلند آواز میں کہا: ''ہماری بہنو! اگر تم مسلمان ہو تو ٹرک میں آجاؤ۔ ہم بلوچ رجمنٹ کے مسلمان فوجی ہیں''۔ یہ سننا تھا کہ میرے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ اس زمانے میں بلوچ رجمنٹ مسلمان مہاجروں کو اپنی حفاظت میں پاکستان پہنچانے پر مامور تھی۔ ان کی نفری مختصر تھی جب کہ مہاجرین لاکھوں کی تعداد میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود جس طرح اپنی جان پر کھیل کر بلوچ رجمنٹ کے جیالے مجاہدوں نے مسلمانوں کو پاکستان تک پہنچایا، ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ کے لئے پاکستان کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے ہمیں اپنے ٹرک میں سوار کرالیا۔ ٹرک میں پہلے ہی کچھ مسلمان عورتیں اور بچے سہمے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں کئی عورتیں شدید زخمی تھیں۔ تھوڑی دیر میں فوجیوں نے ہمیں جالندھر کے مہاجر کیمپ تک پہنچا دیا۔ کیمپ میں بے شمار مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں پڑے تھے۔ تیسرے دن کیمپ میں مجھے میرا بڑا لڑکا علی احمد مل گیا مگر لوٹ مار، آتش زنی اور مسلمانوں کا قتل عام دیکھنے کے بعد اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ میں اسے اپنے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ میری تو دنیا ہی لٹ چکی تھی۔ سب کچھ گنوانے کے بعد بیٹا ملا بھی تو اس حال میں کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ کچھ دنوں تک ہم مہاجر کیمپ میں بدنصیبی کے دن گزارتے رہے۔ آخر ایک دن ہمارا قافلہ اللہ کے نام لے کر پاکستان کی طرف روانہ ہوا۔ یہ بڑا لمبا قافلہ تھا۔ عورتوں اور بچوں کو قافلے کے درمیان میں گڈوں اور ریڑھوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ہزاروں مسلمان مرد، عورتیں اور بچے اس قافلے میں شامل تھے۔ راستے میں سکھوں کے جتھے قافلے پر حملہ کرتے اور جب تک بلوچ رجمنٹ کے جوان فائرنگ کرتے ہوئے ہماری حفاظت کو آتے، سکھ کئی ایک مسلمانوں کو شہید کر جاتے۔ اس وقت واقعی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم شدید بھوک

اور پیاس کے عالم میں موت کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔ آخر کسی نہ کسی طرح ہم آگ اور خون کا دریا پار کر کے پاکستان کی پیاری سرزمین پر پہنچ گئے۔ ''پاکستان زندہ باد'' ''اسلام زندہ باد'' کے نعرے گونجنے لگے۔ میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ خاندان کے چالیس افراد شہید ہو گئے تھے لیکن میں اس خوشی کو بیان نہیں کر سکتی جو مجھے پاکستان کی سرحد پر پاکستانی جھنڈے کو لہراتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ خوشی آج بھی میری رگ و پے میں زندہ ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ ہمیں پاکستان کی شکل میں اپنا آزاد ملک حاصل ہوا اور ہندوؤں کی غلامی سے نجات ملی۔ ہم لوگ روکھی سوکھی کھا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ میں اس عمر میں بھی گھر پر سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہوں۔ مجھے یہ فخر ہے کہ میں پاکستان کی باسی ہوں اور اسلام کا نام آزادی کے ساتھ لے سکتی ہوں''

حرمتے بی بی کی داستان ختم ہوگئی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر مجھے عجیب پاکیزہ سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے روشن کئے ہوئے چراغ کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو: ''یہ روشن چراغ میرے شہید بچوں کی نشانیاں ہیں۔ ان سے پھوٹی ہوئی کرنیں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ مستقبل میں بھی ہمیں اسی روشنی میں آگے بڑھنا ہے اور اپنے پیارے وطن پاکستان کو اور زیادہ ترقی یافتہ، مضبوط اور خوشحال بنانا ہے۔ حرمتے بی بی خاموش تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ جس وطن عزیز کی خاطر حرمتے بی بی نے عزم و استقلال کے چراغ روشن کئے ہیں، میں ان کے لئے اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہوں!!(۵)

عصمتوں کا نذرانہ

عبدالقادر

سابق متحدہ پنجاب کے اضلاع میں گورداسپور خوشحال اور پرامن ضلع سمجھا جاتا تھا۔ میری پیدائش گورداسپور شہر کے گھڑی دروازے میں ہوئی مسلمانوں کا یہ محلّہ ایک طویل گلی پر مشتمل تھا۔ گلی کے سرے پر ایک سڑک تھی جہاں مکان بھی تھے اور دکانیں بھی۔ اس طرف سے گلی بل کھاتی پہلے اوپر چڑھتی جہاں محلے کی مسجد تھی۔ جس میں پانچ وقت اذان گونجتی۔ مسجد سے یہ گلی پھر نیچے کو اترتی اور بالآخر ایک دیوار کے پاس جا کر ختم ہو جاتی۔ دیوار کے پیچھے آم، امرود اور کیلوں کا ایک بڑا باغ تھا۔ اس کے آگے گھنے کھیت تھے۔ جن میں فصلیں لہلہایا کرتیں۔ گھڑی دروازے کی مسلمان آبادی میں تقریباً ہر پیشے کے لوگ تھے جن میں سرکاری ملازم، اہل حرفہ، دکاندار اور فوجی سب ہی شامل تھے اسی گلی میں ہمارا گھر تھا جس میں میرے والد، چچا اور ہم بہن بھائی ایک مشترکہ خاندان کی حیثیت میں رہتے۔ میرے والد ایک جج کی عدالت میں ریڈر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مجھ سمیت ان کے تین بیٹے تھے میرا ایک بھائی فوج میں کپتان تھا اور دوسری وٹرنری ڈاکٹر، میں نے ۱۹۴۷ء میں ایف اے میں داخلہ لیا تھا۔ ہماری ایک بہن بھی تھی جو مجھ سے چھوٹی تھی۔ ان دنوں وہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی میرے چچا نور محمد کی بازار میں کریانے کی چھوٹی سے دکان تھی۔

چچا نور محمد مسلم لیگ کے پر جوش اور سچے کارکن تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۴۷۔۱۹۴۶ء میں ان کی دکان اکثر بند رہتی۔ مسلم لیگی کارکن ہونے کے ناطے سے چچا جلسوں اور جلوسوں کے انتظامات میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ ان کے لئے باقاعدگی سے دکانداری کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ میرے والد کو اپنے چھوٹے بھائی سے بہت پیار تھا۔ وہ ان کی سرگرمیوں پر اعتراض نہیں کرتے تھے، البتہ انہیں یہ مشورہ ضرور دیتے کہ وہ محتاط رہیں۔ جب والد صاحب انہیں احتیاط برتنے کی تاکید کرتے تو چچا ہنس کر کہتے: ''بھاجی! اب احتیاط کے دن گزر گئے اب تو ہمیں ہر قیمت پر پاکستان حاصل کرنا ہے''۔ یہ چچا جان ہی تھے جنہوں نے مجھے پاکستان کی اہمیت

سے آگاہ کیا تھا میرے دونوں بڑے بھائی تو کبھی کبھار ہی گھر آتے سب سے بڑے بھائی جو کیپٹن تھے۔ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لینے یورپ بھی گئے تھے اور اب واپسی کے بعد ان کی پوسٹنگ میرٹھ چھاؤنی میں ہوئی تھی۔ وہ سال میں ایک دو بار ہی گھر آتے ان سے چھوٹے بھائی پٹھانکوٹ کے وٹنری ہسپتال میں تھے۔ وہیں ان کی بیوی بچے بھی تھے وہ دوسرے تیسرے ماہ چھٹی پر ضرور آتے رہتے تھے۔ گھر میں چھوٹا میں تھا یا میری بہن اس لئے چچا جان ہم سے بہت پیار کرتے۔

چچا جان نے بتایا کہ ہمارے لئے پاکستان کیوں ضروری ہے۔ انہی نے مجھے علامہ اقبالؒ کے خطبہ الٰہ آباد سے متعارف کروایا مجھے قائداعظم کی عظمت کے واقعات بھی سنائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انہی نے اپنے عملی واقعات اور تجربات بتا کر مجھے پر واضح کیا ہندو کے ساتھ ہمارا نبھا کیوں نہیں ہوسکتا چچا جان نے جب بازار میں چھوٹی سی کریانے کی دکان کھولی تھی تو ہندو بنیوں نے اندر ہی اندر ان کے کاروبار اور دکان کو ٹھپ کرانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی یہ چچا جان ہی کی ہمت اور دیانت تھی کہ وہ ہندو بنیوں اور دکانداروں کے مقابلے پر ڈٹے رہے، کوئی معمولی ہمت والا شخص ہوتا تو دکان چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا۔ اب وہی دکان اکثر بند رہا کرتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے: ''یہاں دکان اور کاروبار کا کیا ہے بہت وقت پڑا ہے کاروبار کیلئے پہلے پاکستان بننا چاہیے۔ پاکستان کیلئے ایسی ہزاروں دکانیں قربان کرسکتا ہوں''۔ چچا جان ہی نے مجھے زندگی کا شعور بخشا۔ اسکول میں اور کالج میں بہت سے باتیں جنہیں میں پہلے نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ اب انہی چیزوں کا پورے غور و فکر سے مشاہدہ کرنے لگا تھا۔ ہندوؤں کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ کوئی مسلمان طالب علم ترقی نہ کرے۔ ذہین مسلمان طالب علموں کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کر دیتے تھے۔ ہندو اساتذہ کا بھی یہی رویہ تھا۔ وہ غبی اور نالائق مسلمان طالب علموں کو نظر انداز ہی نہیں بلکہ ان کی حق تلفی بھی کرتے تھے وہ ہمیں ذلیل اور اچھوت سمجھتے تھے ہمارا ان کا پانی تک الگ تھا۔

چچا جان نے ایک بار کہا تھا! ہندوؤں کے ہاتھوں ہمارا دین و ایمان خطرے میں ہے۔ اس لئے بھی ہمیں پاکستان کی ضرورت ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کیونکہ یہ میرے مشاہدے

میں آ رہا تھا کہ ہندو ہمارے مذہب اور قومی شخصیتوں کا مذاق اُڑاتے تھے۔ میری بہن نسرین بھی مجھے یہی بتاتی کہ اسکول میں ہندو لڑکیاں کس طرح مسلمان لڑکیوں کے خلاف سازشیں کرتی ہیں اور ان کا مذاق اڑاتی ہیں اور ہندو استانیاں ان کی پشت پناہی کرتی ہیں۔ میرے دل میں چچا جان نے پاکستان کے لئے محبت پیدا کر دی۔ میری بہن بھی پاکستان کے قیام کیلئے دعائیں مانگنے لگی۔ گورداسپور مسلم اکثریت کا ضلع تھا۔ اس کی پاکستان میں شمولیت یقینی تھی۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ میری بہن نے اپنے ہاتھوں سے پاکستان کا پرچم بنایا جس کے لئے میں اپنے جیب خرچ سے سبز و سفید کپڑا بڑے شوق سے خرید کر لایا تھا۔ اس پرچم کو لہراتے دیکھ کر میری والدہ دعا کرتیں۔ ''یا خدا۔۔۔ اس ملک کو ہمیشہ سلامت رکھنا۔۔۔'' چچا جان ان دنوں بہت مضطرب تھے۔ ایک دن وہ گورداسپور میں ہوتے تو دوسرے دن لاہور۔ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ والد صاحب چچا جان کو سمجھاتے کہ اب وہ گھر ہی پہ رہا کریں۔ میرٹھ میں میرے کیپٹن بھائی کے بارے میں تو والدین کو زیادہ فکر نہ تھی لیکن پٹھانکوٹ میں مقیم وٹرنری ڈاکٹر بھائی کے بارے میں ہم سب فکر مند رہتے تھے بہت دنوں سے وہ خود آئے تھے نہ کوئی ان کا خط ہی آیا تھا۔ میرے والد صاحب خاندان کے سربراہ تھے پریشان اور مضطرب تو وہ رہتے تھے لیکن اپنے اضطراب کو چھپائے ہوئے تھے۔ ایک دن شام کو جب ہوا بند تھی اور ہم سب گھر کے صحن میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، چچا جان نے اچانک کہا: ''پنڈت شام لال نے مجھ سے شرط لگائی ہے کہ گورداسپور ہندوستان میں جائے گا''۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ والد صاحب نے کہا گورداسپور کے ضلع میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ شام لال ایسا آدمی نہیں ہے کہ وہ شرط لگائے۔ اس نے شرط لگائی ہے کہ اگر گورداسپور ہندوستان میں شامل نہ ہوا تو اپنی شاندار دکان مجھے دے دے گا۔ اور تم نے شرط لگائی۔۔۔ والد صاحب نے پوچھا بھائی صاحب یہ شرط اس نے درجنوں آدمیوں کے سامنے لگائی ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ ہندو بڑا کائیاں اور سازشی ہے انگریز سے اس کی ملی بھگت ہے۔ کشمیر کے ساتھ پٹھانکوٹ کی تحصیل لگتی ہے۔ میں بہت خطرہ محسوس کرتا ہوں بھائی صاحب۔

میں نے اس زمانے میں محسوس کیا کہ حالات بہت بگڑ چکے ہیں۔ اندر ہی اندر کوئی طوفان پرورش پا رہا تھا۔ دل گھبراہٹ سی محسوس کرتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے حوصلے جوان تھے۔ ہم پاکستان کی منزل کے قریب پہنچ گئے تھے اس لئے ہمارے دلوں میں ایک انوکھا عزم پروان چڑھ رہا تھا۔ جس روز تقسیم کا اعلان ہو۔ اس روز ہم پر کیا بیتی میں کچھ بتا نہیں سکتا۔ ہمارے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ کانگریس اور نہرو نے مل کر ماؤنٹ بیٹن کی مدد سے ریڈ کلف سے اپنی مرضی کا بٹوارہ کرا دیا تھا۔ گورداسپور کی تین تحصیلیں بٹالہ، گورداسپور اور پٹھانکوٹ ہندوستان میں سازش کے تحت شامل کر دی گئی تھی۔ یوں کشمیر پر بھارت نے اپنے غاصبانہ قبضے کے لئے بنیاد رکھ دی۔ جس روز تقسیم کا اعلان ہوا ہم سب اپنے بڑے سے ریڈیو کے اردگرد جمع تھے۔ ہمارے ماتھے ٹھنک رہے تھے دلوں کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ جس وقت گورداسپور کے ہندوستان میں شامل ہونے کا اعلان ہوا چچا جان یک دم بپھرے ہوئے اٹھے ان کے جسم میں جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ انہوں نے ریڈیو کے اوپر ایک ایسا زوردار گھونسا مارا کہ ریڈیو ٹوٹ کر ادھر ادھر بکھر گیا۔ ہم سب انہیں دیکھتے رہ گئے اور وہ اُٹھ کر تیزی سے چل دیئے۔ شام کو چچا جان کی لاش گھر آئی۔۔۔۔۔ پہلی جان کا نذرانہ تھا جو ہمارے خاندان نے پاکستان کے حضور پیش کیا۔ سب جانتے تھے کہ کانگریسی لیڈر پنڈت شامل لال اور اس کے غنڈوں نے چچا کو چھرے گونپ کر شہید کر دیا تھا۔ لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سوگوار محلے کے تمام مسلمان جنازے میں شامل ہوئے ہر شخص سہما ہوا تھا۔ غیر یقینی مستقبل کا خوف سب کے چہروں پر دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے چچا جان کو اس قبرستان میں دفن کر دیا جہاں ہمارے دادا اور عزیزوں کی کئی قبریں تھیں۔ مسلمانوں کا یہ وہ قبرستان تھا جس پر ہندو چند مہینوں کے بعد ہل پھیرنے والے تھے۔

ہمارا وہ گھر جو قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا۔ اب اس پر اداسی مسلط تھی۔ ۱۴ اگست کا دن ایسے عالم میں آیا کہ دل ملول بھی تھا اور مسرور بھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ مسلمانوں کے لئے ایک وطن ایک آزاد وطن معرض، وجود میں آ گیا تھا۔ دُکھ اس بات کا تھا کہ ہمارے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی۔

ہمارا شہر، ہمارا ضلع بھارت میں شامل کر دیا گیا تھا اور فضا میں شدید تناؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اپنے والدین اور گلی محلے کے بزرگوں کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کسی کو بھی ہندوؤں اور سکھوں سے خیر کی امید نہیں تھی۔ اس کے باوجود جو کچھ ہوا وہ اندازوں سے بھی بڑھ کر ہولناک تھا۔ عیدالفطر کا دن آ گیا۔ یہ عید میں کبھی نہ بھول سکوں گا ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ صبح میں نے والد صاحب کے بعد غسل کیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، نئے کپڑے بنوائے گئے تھے نہ بنوانے کا کسی کو خیال ہی آیا تھا۔ والد صاحب کے ساتھ میں بچپن سے عیدین کی نماز پڑھنے کمپنی باغ جایا کرتا تھا۔ پورے شہر میں میلے کا سا ماں ہوتا تھا، ہر چہرہ کھلا دکھائی دیتا تھا ہم عیدی لے کر کتنے خوش ہوا کرتے تھے لیکن یہ عید بہت سوگوار اور اداس تھی۔

والد صاحب گہری سوچوں میں گم چلتے جا رہے تھے میں ان سے دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔ میرا اپنا دل خود بخود بوجھل ہو گیا تھا۔ راستے میں جو جاننے والے ملے ان کے چہرے بھی اترے ہوئے اور مسکراہٹیں اداسیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ جوش، وہ مسرت جو عید کے دن خود بخود چہروں پر دکھائی دیا کرتا تھا اس عید پر مفقود تھا۔ سب سر نہوڑائے چلے جا رہے تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم عید کی نماز بھی اداسی کے دباؤ میں پڑھی گئی۔ نماز کے بعد لوگ اداسی سے بوجھل دلوں کے ساتھ گلے مل رہے تھے۔ کوئی بھی ہنس نہیں رہا تھا سہمی سہمی سرگوشیوں میں باتیں ہو رہیں تھی۔ بچے بھی جو عید کے دن ہنستے کھیلتے ضد کرتے اور شور مچایا کرتے تھے۔ خوفزدہ دکھائی دے رہے تھے۔، جب ہم عید کی نماز کے بعد اپنے گھر کی طرف واپس آ رہے تھے تو جان پہنچان والے وہی ہندو اور سکھ جو ایک برس پہلے آگے بڑھ کر دکھاوے یا دنیاداری کے لئے ہی سہی، ہمیں عید کی مبارکباد دیا کرتے تھے آج ہمیں عجیب نظروں سے گھور رہے تھے ان کے چہروں پر بے نیازی یا لاتعلقی نہیں تھی بلکہ وہ ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جو یہ کہہ رہی تھیں کہ ہم جلدی ہی تم سے نمٹ لیں گے۔ گلی میں پہنچ کر والد صاحب نے آہستہ سے مجھے کہا شاید اپنے گھر میں یہ ہماری آخری عید ہے۔ اگر تمہارے دونوں بھائی بھی یہاں ہوتے تو بہتر تھا۔ خورشید کو تو آج یہاں ہونا چاہیے

تھا۔خورشید میرے وٹرنری ڈاکٹر بھائی کا نام تھا۔ میں کیا جواب دیتا، خاموش رہا گھر کے اندر اداسی چھائی ہوئی تھی امانے سویاں دیں تو ان کا ذائقہ بھی بدلا بدلا محسوس ہوا۔ایسی روکھی پھیکی عید کو تو کبھی تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ والد صاحب کو بار بار اپنے بھائی ہمارے چچا یاد آرہے تھے جو پاکستان پر قربان ہو گئے تھے۔ چند دنوں کے بعد شہر میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔اکا دکا مسلمان کیلئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اپنے محلے سے باہر جاسکیں۔مسلمانوں کے بعض محلوں کو آگ لگا کر لوٹ لیا گیا۔خطرہ تیزی سے بڑھ رہا تھا محلے کے تمام مسلمان ہمارے ہاں جمع ہوئے۔عورتوں کا حال تو دیکھا نہیں جاتا تھا۔وہ چہرے جو گلاب کی طرح کبھی سرخ اور تر و تازہ تھے۔اب مرجھائے مرجھائے دکھائی دے رہے تھے۔سب چاہتے تھے کہ ان کا گھر ان سے نہ چھوٹے لیکن خطرہ اتنا قریب آچکا تھا کہ سب گھر چھوڑ کر کیمپ میں جانے پر مجبور تھے۔میرے والد چونکہ سرکاری ملازم تھے اس لئے علاقہ کا سکھ تھانیدار انہیں کہہ گیا تھا کہ وہ اس طرح کی کوئی ذمے داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنا محلّہ خالی کر کے کم سے کم سامان کے ساتھ کیمپ میں چلے جائیں۔

میں وہ منظر ساری عمر نہیں بھول سکتا جب ہم لوگ اگلی صبح اپنے اپنے محلے سے نکلے محلے کے تقریباً ہر گھر میں گائے یا بھینس تھی لیکن کوئی اپنے ان چہیتے پالتو جانوروں کو ساتھ لے کر نہیں جا سکتا تھا پولیس کے کچھ سپاہی ایک تھانیدار کی قیادت میں وہاں موجود تھے جو میرے والد کی درخواست پر وہاں آئے تھے۔ان کے علاوہ وہاں درجنوں ہندو اور سکھ بھی پہنچ چکے تھے۔ان میں پنڈت شام لال بھی تھا میرے چچا جان کا قاتل سب ہندو اور سکھ مسکرا رہے تھے۔ان کی آنکھوں میں لوٹ مار کرنے کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ان کے چہروں پر ہمارے لئے حقارت تھی ہر شخص بار بار اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر بچے بھی رونے لگے تھے۔خود میری آنکھیں خود بخود آنسو بہانے لگی تھی۔ والد صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ والدہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔میری بہن نسرین بھی رو رہی تھی اس وقت مجھے کیپٹن اور وٹرنری ڈاکٹر بھائی

بہت یاد آئے۔خدا جانے وہ کہاں تھے اور کس حال میں تھی۔

اپنی گلی اور اپنے مکانوں کو چھوڑ کر نکلنا بہت مشکل تھا ایک ایک قدم منوں بھاری ہو رہا تھا۔ ہر شخص نے اپنے مکان کا تالا گا دیا تھا۔اس امید میں کہ چند دنوں کے بعد اپنے گھروں کو واپسی ہو جائے گی لیکن بہت سے چہرے ایسے جو صاف بتا رہے تھے کہ اب واپسی ممکن نہیں۔اب یہ گھر ہمیشہ کیلئے پرائے ہونے والے ہیں یہ گھر جنہیں ہمارے بزرگوں نے تعمیر کیا تھا۔جن میں ان کا خون پسینہ شامل تھا اب غیروں کے ہونے والے تھے۔ان گھروں کے ساتھ زندگی موت، محبتوں اور شفقتوں کی ان گنت اور انمٹ یادیں وابستہ تھیں۔لیکن یہ گھر اب ہمیشہ کیلئے چُھٹ رہے تھے آہوں سسکیوں اور چیخوں کے ساتھ گلی چھوڑی گئی۔ جب سینکڑوں مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل یہ قافلہ اپنے محلے کی مسجد کے سامنے رکا تو یکدم خاموشی چھا گئی، یکدم آنسو اور آہیں تھم گئے ایک پر ہیبت سناٹے نے سب کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔وہ لوگ تھوڑی دیر پہلے اپنے اپنے گھر اپنے گھروں میں اپنی قیمتی چیزیں، مال اسباب چھوڑ کر جاتے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔ واویلا کر رہے تھے اب وہی خدا کے گھر کے سامنے رکے تھے۔سب کی آنکھیں مسجد کے در و دیوار محراب اور مینار پر جمی تھی۔سب کے چہروں پر ایک ہی سوال تھا۔ہم اپنی مسجد کس کے حوالے کر کے جا رہے ہیں۔اس مقدس مسجد کی دیکھ بھال کون کرے گا۔کون اس کی صفائی کرے گا۔کون۔۔۔؟ کون۔۔۔؟ یہ مسجدیں جن میں کئی نسلوں کے افراد نے خضوع و خشوع سے نمازیں پڑھی تھی۔کیا اب وہاں کبھی اذان نہیں گونجے گی؟

میں اس وقت ایک عجیب طرح کی تھرتھری اور لرزش اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔گلی میں رہنے والے استاد ماسٹر عبدالرحمٰن نے سب چہروں پر لکھا ہوا یہ سوال پڑھ لیا تھا۔ وہ آگے بڑھے سب لوگوں پر اک نگاہ ڈالنے کے بعد مسجد پر ان کی نگاہ تھوڑی دیر کیلئے گڑ گئی پھر وہ کھنکھارے، گلا صاف کر کے بوجھل آواز میں کہنے لگے۔ بھائیو! اب ہمیں چلنا ہے۔مسجد خدا کا گھر ہے اس کی حفاظت خدا کرے گا۔انشاءاللہ ایک دن آئے گا۔جلد

آئے گا۔ جب ہم واپس آئیں گے اور مسجد میں پھر سے اذان گونجا کرے گی۔ ماسٹر عبدالرحمٰن کے کلمات نے دلوں کو ڈھارس بندھائی رکے اور تھمے ہوئے قدم پھر حرکت میں آ گئے۔ ہندو اور سکھ طنز سے مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو انسانی نہیں ہوتی جب ہم گلی سے باہر نکل کر بازار کی طرف نکلے اور کھلی جگہ پر پہنچے تو ہندو اور سکھ پیچھے رہ گئے تھے۔ کچھ بھینسیں اور گائیں جو اپنے مالکوں کے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ انہیں روک رہے تھے۔ ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے۔ بھینسیں ڈکرا رہی تھی۔ ایک بار پھر آہوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

اپنے محلے سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کے قریب کیمپ تک ہم کیسے پہنچے یہ تین میل کا فاصلہ ایسا فاصلہ تھا جو شاید برسوں پر محیط ہو گیا تھا۔ چند پلوں پر میں آج تک اس فاصلے کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکا۔ ایک خواب کی سی کیفیت تھی جس میں چل رہا تھا۔ اس فاصلے کے درمیان میں اپنے گرد و پیش کو یکسر فراموش کر گیا تھا۔ ایک ایسی کیفیت تھی جو اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر کبھی طاری نہیں ہوئی خود فراموشی کی کیفیت جس میں حواس شل اور ماؤف ہو جاتے ہیں کیمپ کی حدود میں پہنچتے ہی ایک بدلی ہوئی دنیا دکھائی دی ایک ایسی دنیا آباد ہو چکی تھی جو غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی بارشوں کی وجہ سے کیچڑ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اس کیچڑ میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے کچھ تنبو بھی موجود تھے لیکن ان کی حالت بھی خراب تھی جہاں جگہ مل گئی وہاں ہم بھی بیٹھ گئے۔ ان گنت لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ سوال۔۔۔ سینکڑوں سوال۔۔۔ زبانوں پر سوال، ہونٹوں پر سوال اور پھر ہر شخص کی ایک داستان تھی سب کی داستان ایک جیسی تھی۔ سب کے گھر چھٹ گئے تھے سب اپنے گاؤں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سب کو ڈھور ڈنگر، گھر بار مال اسباب پیچھے رہ گئے تھے۔ سب بھوکے تھے سب تکلیف میں تھے سب کی آنکھوں میں آنسو تھے آنسو جو بہہ رہے تھے آنسو جو آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے اور پھر ان میں وہ بھی تھے جو زخمی تھی۔ وہ بھی تھے جن کے عزیز راستے میں گاؤں سے کیمپ تک پہنچتے پہنچتے سکھوں اور ہندوؤں نے قتل کر دیئے تھے اور اب یہ لاشیں اپنے سینے سے لگائے رو رہے تھے یہ لاشیں جو اب وہ کبھی اپنے سینے سے اتار نہیں

سکیں گے جب تک وہ زندہ رہیں گے ان لاشوں کو سینے سے چمٹائے رکھیں گے۔ یہ میں اس وقت نہیں جانتا تھا لیکن آج جب کچھ لاشیں خود میرے سینے پر لیٹی ہوئی ہیں تو میں بھی اس المیے کو اچھی طرح جان چکا ہوں۔ کیمپ میں بھوک تھی غلاظت تھی، بیماری تھی۔ مرنے والوں کا نوحہ تھا۔ مستقبل کا کچھ علم نہیں تھا۔ جدائی اور ہجر کی داستانیں تھی اور بارش تھی آسمان سے پانی برس رہا تھا خدا کی بے گھر مخلوق بھیگ رہی تھی وہ چند گھنٹوں کی مسافت طے کر کے اپنے اپنے محفوظ گھروں میں جا سکتے تھے لیکن نہیں جا سکتے تھے ان کے گھروں کے دروازے ان کے لئے ہی بند ہو گئے تھے۔ گھر کی طرف جانے والی سب راہوں پر موت کھڑی تھی بندوقیں، رائفلیں، گنڈاسے، لاٹھیاں، چُھرے اور کرپانیں لے کر، واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ جو کچھ جس کے پاس تھا وہ اس میں اپنے دوسرے بھائی کو شریک کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کھانے پینے اور پیٹ بھرنے کا سلسلہ کب تک چلتا، بڑے تو پھر بھی صبر کر لیتے اور ویسے بھی ان کی بھوک مر چکی تھی۔ وہ محض زندہ رہنے کیلئے چند لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیتے تھے لیکن بچے تو بھوک سے بلبلا اٹھتے تھے سارے کیمپ میں یہی حال تھا اور لٹے پٹے لوگوں کو مزید لوٹنے کے لئے کیمپ سے کچھ فاصلے پر ہندو بنیئے دکانیں لگا کر بیٹھ گئے تھے، نمک مرچ، دال اور آٹے ایندھن کا بھاؤ سونے کے مول ہو گیا تھا۔ اور اس کیمپ میں کتنے تھے جو اپنے ساتھ پیسے لے کر آئے تھے یوں قیمتی سے قیمتی چیز اونے پونے بکنے لگی سونے کی وہ چوڑیاں برسوں پیسے جمع کر کے کبھی کسی نے اس بھلے زمانے میں تین سو روپے میں بنوائی تھیں۔ اب وہی سونے کی چوڑیاں تیس روپوں میں بک رہی تھیں۔ برسوں کی سینتی اور سنبھالی ہوئی قیمتی چیزیں ٹکے سیر بکنے لگیں۔ اور کیمپ میں اعلان ہو چکا تھا کہ لوگوں کو پاکستان کی سرحد تک پہنچانے کے انتظام کئے جا رہے ہیں لیکن کب اور کیسے؟ ان سوالوں کا جواب کسی کو نہیں دیا گیا تھا میں سارا دن ادھر اُدھر کیمپ میں گھومتا رہتا۔ آج بھی وہ دن یاد آتے ہیں تو میں ہر چیز سے بیزار ہو جاتا ہوں کیمپ میں وہ بھی تھے جن کے چہرے ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے جو صفائی اور نفاست کا بہت خیال رکھتے تھے اب ان کے چہرے میلے، بال الجھے اور لباس میلے کچیلے دکھائی دیتے تھے پھٹے کپڑے برے حال

میں چہروں پر خوف اور بھوک کی پرچھائیاں وہ چہرے جنہیں کبھی آسمان نے نہیں دیکھا تھا اب وہ کیمپوں میں اپنے چہرے چھپاتے پھرتے تھے آنکھیں ویران تھیں اور مایوسیاں چہرے پر کھنڈی ہوئی تھیں۔کیمپ میں گھومتے کتنے ہی جانے پہچانے چہرے اور لوگ دکھائی دیئے سب کے حالات ایک جیسے تھے سب ایک ہی بات پوچھتے تھے۔ پاکستان کب جائیں گے ہر روز افواہیں کیمپ میں پھیلتیں سکھ اور ہندو کیمپ پر حملہ کرنیوالے ہیں، راتوں کی نیند اڑ گئی تھی اور دنوں کا چین کافور ہو چکا تھا۔ بہت کچھ بک چکا تھا پھر بھی کھانے کو کچھ نہ رہا تھا والدہ نے ایک دن والد صاحب سے کہا گھر میں آٹے کی دو بوریاں پڑی ہیں، والد صاحب عجیب انداز سے مسکرائے پھر بولے اچھا۔۔۔دیکھو۔۔۔میں نہیں جانتا کیسے پولیس کے ایک سپاہی کا انتظام کرنے میں والد صاحب کامیاب ہو گئے لیکن مجھے علم ہے کہ اس کے لئے انہیں کیمپ انچارج کی بہت منت سماجت کرنی پڑی ہوگی۔ میرے شدید اصرار کے بعد والد صاحب مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ گھر کی طرف اپنے محلے کی طرف میں اور والد صاحب چل پڑے ہمارے ساتھ ایک سکھ سپاہی تھا جو بہت بیزار دکھائی دے رہا تھا۔ گورداسپور شہر پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی نئے نئے چہرے دکھائی دے رہے تھے جان پہچان والے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی والد صاحب سے آنکھ ملانے کی کوشش نہ کی بلکہ حقارت سے مسکرا دیئے جب ہم اپنے محلے کے بازار والے سرے پر پہنچے تو والد صاحب اچانک رک گئے بازار کھلا تھا وہ دکان بھی کھلی تھی جو چچا جان کی تھی وہاں ایک لمبی چوٹی والا بنیا بیٹھا سودا تول رہا تھا یہ دکان تھی جسے چچا جان نے بڑی محنت اور مقابلے کے بعد قائم کیا تھا۔اس دکان کو انہوں نے پاکستان پر قربان کر دیا تھا۔ اور خود بھی پاکستان کیلئے شہید ہو گئے والد صاحب نے اپنی آستین سے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھے اور گلی کی طرف بڑھ گئے۔ گلی کے اندر ہم چند گز کا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ والد صاحب کے قدم اچانک رک گئے میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ سر گھوم رہا تھا میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھیں گلی کے دو رویہ مکانوں کے دروازے کھلے تھے وہ سب گھر جن کے مالک تالے لگا کر گئے تھے وہ تالے ٹوٹ چکے تھے سب گھر

لوٹے جا چکے تھے۔اور سب دروزاے کھلے تھے ہر گھر کا صفایا ہو چکا تھا۔اور گلی کاغذوں اور کتابوں کے انبار سے اٹی ہوئی تھی گلی کا فرش کاغذوں اور پھٹی کتابوں سے ڈھنپا ہوا تھا۔

ہر قیمتی چیز، ہر کارآمد چیز لوٹ لی گئی تھی۔ کتابیں پیسوں اور چھپی ہوئی قیمتی چیزوں کی تلاش میں پھاڑ کر گلی میں پھینک دی گئی تھی انسانوں کی عقل و دانش، فکر و فلسفے اور علم و تجربات پر مشتمل قیمتی کتابیں ورق ورق گلی میں ڈھیر تھیں بکھری پڑی تھیں مردہ بے جان لاشوں کی طرح فریاد کرتی ہوئی زبانِ خاموشی سے آہ و بکا کر رہی تھیں۔ان میں قرآن پاک کے اوراق بھی پھڑ پھڑا رہے تھے والد صاحب کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ بھول گئے کہ کتنی منت سماجت کے بعد وہ سپاہی کا انتظام کر کے اپنی گلی میں اپنے گھر میں رکھی آٹے کی بوریاں لینے آئے ہیں۔ میں نے ایسا منظر پھر کبھی نہیں دیکھا۔۔اپنی گلی میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی پھٹی پرانی، دریدہ، بکھری، ورق ورق کتابوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔۔۔ہر گھر کا دروازہ کھلا تھا۔۔۔ہوا میں کاغذ پھڑ پھڑا رہے تھے۔آہیں بھر رہے تھے۔سکھ سپاہی نے دُرشت لہجے میں کہا، آگے چلو میاں صاحب میں تمہارا نوکر نہیں ہاں کہ ایتھے کھلوتا رہواں (آگے چلو میاں صاحب میں تمہارا نوکر نہیں ہوں کہ یہاں کھڑا رہوں) والد صاحب نے اپنی آنسوؤں سے تر بتر چہرہ اوپر اٹھا۔ایک نگاہ میری طرف دیکھ پھر رندھی ہوئی آواز میں کہا: ہمیں واپس کیمپ لے چلو۔سکھ سپاہی حیران سا رہ گیا۔ بادشاہو کی گل اے ہن اپنی گلی وچ آ کے واپس جا رئے او۔۔۔ہاں ہم آگے نہیں جا سکیں گے۔ والد صاحب نے سسکی لیتے ہوئے کہا ہم آگے جا ہی نہیں سکتے بس چلو۔ ہم تیزی سے پیچھے لوٹے۔ جب کیمپ پہنچے تو والد صاحب نے والدہ سے کہا۔گھر لٹ چکا ہے۔آٹا تو کیا وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔۔۔میں جانتا ہوں ہم نے اپنے لٹے ہوئے گھر کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن حقیقت وہی تھی جو والد صاحب نے بیان کر دی تھی۔ والدہ نے میری بہن نسرین کو گلے سے لگا کر اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔میں جانتا ہوں۔وہ کیوں رو رہی تھیں کتنے برسوں سے وہ پیسہ پیسہ جوڑ کر محبت سے امنگوں اور دعاؤں کے ساتھ نسرین کا جہیز تیار کر رہی تھی۔ جواب لٹ چکا تھا۔

والد صاحب سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور وہ اٹھ کر چل دیئے کیمپ میں لٹے پٹے دیہات کے لٹے پٹے مسلمانوں کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بھوک، بیماری اور غلاظت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب زخمیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خاندان جن کے عزیز شہید ہو گئے تھے، ان کے قصے سنے نہیں جاتے تھے۔ سب سے ہولناک واقعات عورتوں کے اغوا اور عصمت لٹنے کے تھے۔ ایسے واقعات سن کر میرا جوان خون کھولنے لگتا جی چاہتا کوئی ایسی چیز ہاتھ آ جائے کہ جس سے میں ظالم ہندوؤں اور سکھوں کا صفایا کر سکوں۔ بھوک، بیماری، برسات کی بارشوں اور غلاظت نے کیمپ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ لوگ مر رہے تھے۔ بچے مر رہے تھے، کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ بس آنسو بہا سکتا تھا خدا سے دعا مانگ سکتا تھا، پاکستان پہنچنے کے خواب دیکھ سکتا تھا بین اور ماتم کر سکتا تھا۔ ایک دن میں نے والد صاحب اور والدہ کو کُھسر پُھسر کرتے دیکھا۔ والدہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کبھی انکار میں سر ہلاتیں کبھی اقرار میں آنسو ان کی آنکھوں میں چھلک جا رہے تھے۔ اس شام والد صاحب نے مجھے علیحدگی میں بتایا۔ بیٹے تم پر بھاری ذمے داری آ پڑی ہے۔ صبح ایک قافلہ پاکستان جانے والا ہے دس ٹرکوں کا انتظام ہوا ہے تم جانتے ہو کہ دس ٹرکوں میں کتنے لوگ جا سکتے ہیں کسی نہ کسی طرح میں نے تمہیں اور نسرین کو بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے ہم تمہارے بعد آنے والے قافلے میں آئیں گے۔ نسرین کا خیال رکھنا بیٹا اور دیکھو اگر اس کی عزت کو خطرہ لاحق ہو تو تمہیں ایک باغیرت مسلمان اور بھائی کا فرض ادا کرنا ہے۔ یہ کہہ کر والد صاحب نے مجھے ایک چھری جو اپنے تہ بند میں چھپا رکھی تھی نکال کر دے دی میں نے وہ چھری اپنی شلوار کے نیفے میں چھپا لی۔ والد صاحب نے وہ سب باتیں جو زبان سے نہ کہہ سکتے تھے اپنی دھندلی آنسوؤں سے بھری نظروں سے کہہ دیں۔ وہ رات کیسے بیتی میں کیسے بیان کروں۔ والد صاحب کو اک چپ لگ گئی تھی۔ والدہ بار بار نسرین کو چومتی اور سینے سے لگاتی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتی تھی۔ والد صاحب نے جب بھی زبان کھولی کہا۔ تریموں ہیڈ کے پار پاکستان ہے وہاں سے سیدھے لاہور اپنے ماموں کے ہاں چلے جانا ہم تمہیں وہاں آن ملیں گے۔ تمہارے

بھائی بھی ان شاء اللہ وہاں تمہیں آن ملیں گے۔ پاکستان، لاہور میں ماموں کا گھر۔۔۔ راستے ۔۔۔ والدین سے جدائی۔۔۔ راہ کے خطرے۔۔۔ میں بہت کچھ سوچتے ہوئے بھی کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔ علی الصبح والد صاحب نے ہمیں جگا دیا۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ نسرین اٹھتے ہی رونے لگی بار بار والد سے لپٹی تھی بار بار والدہ صاحب کی طرف دیکھتی تھی والد صاحب نے بوجھل لہجے میں کہا۔ اب چلو دیر نہ کرو۔ والدہ نے ہمیں جانے کتنے آنسوؤں اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا وہ سراپا دعا بنی کھڑی تھیں۔ انسان کو جان کتنی پیاری ہوتی ہے۔ موت کا خوف کتنا ہولناک ہوتا ہے۔ انسان یکدم کتنا خودغرض بن جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا۔

دس ٹرک تھے لیکن ہر شخص ان پر خود یا اپنے کسی عزیز کو سوار کرانے کے لئے لڑ مر رہا تھا۔ دوسروں کو دھکے دے رہا تھا، کچل اور روند رہا تھا، چیخ اور چلا رہا تھا۔ پولیس ڈنڈے برسا رہی تھی لیکن وہ ڈنڈے کھا رہے تھے والد صاحب کسی نہ کسی طرح مجھے اور نسرین کو ایک ٹرک میں سوار کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ ٹرک انسانوں سے ٹھنسا ہوا تھا۔ آدمی ایک دوسرے کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا سانس لینے کیلئے زور لگانا پڑتا تھا۔ ہزاروں افراد نیچے کھڑے چیخ رہے تھے، دھکے دے رہے تھے پولیس کے ڈنڈے کھا رہے تھے رو رہے تھے آنسو بہا رہے تھے سوار ہونے والوں کو چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ شور اتنا تھا کہ کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ میں آنسوؤں سے بھیگی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ٹرک چلنے لگے۔ میری نگاہیں اپنے والد پر گڑ گئیں جو انسانوں کے ہجوم میں سر جھکائے کھڑے تھے میں جانتا ہوں اس وقت وہ ہمارے لئے دعائیں کئے چلے جا رہے تھے اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے گورداسپور شہر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ راستے۔۔۔ اور ٹرکوں کو گھورتی ہوئی ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھیں۔۔۔ ہم پاکستان جا رہے تھے پاکستان جسے مسلمانوں نے اپنی ان تھک جدوجہد اور قربانیوں سے بنایا تھا جس کیلئے میرے چچا جان نے جان دی تھی۔ ٹرک چلتے رہے اور پھر جب دوپہر کا وقت ہوا جب پیاس سے ہونٹ خشک ہو چکے تھے، ٹرک اچانک رک گئے گنتی کے ہندو سپاہیوں نے حکم دیا! ٹرکوں سے اتر جاؤ۔ ایک میل کے فاصلے

پر تریموں ہیڈ ہے وہاں تک پیدل جانا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کو نظر انداز کر کے ٹرکوں سے اترنے لگے، جلدی جلدی۔۔ سب سے آگے نکل جانے کے لئے چھلانگیں لگانے لگے۔ میں نے نسرین کو اتارا اور ہجوم میں کھو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن میرے قابو سے باہر ہو رہی تھی کسی انجانے خوف نے دل کی حالت غیر کر دی تھی۔ اور پھر وہی ہوا۔

ابھی ہم تریموں ہیڈ سے نصف میل دور تھے کہ چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ واہگورو کی فتح، ہرے رام اور بھارت زندہ باد کے کریہہ اور کانوں کو پھاڑ دینے والے نعرے۔۔ مسلح ہندو اور سکھ قافلہ لوٹنے آگے بڑھ رہے تھے ان کے ہاتھوں میں بلمیں، کرپانیں، گنڈاسے اور بندوقیں تھی۔ اور پھر ہم پر گولیاں برسنے لگیں۔۔۔ قیامت ٹوٹ پڑی شور، چیخیں، ظالموں کے نعرے زخمیوں کی چیخیں، مرنے والوں کی چیخیں۔۔۔ عورتوں کی چیخیں بچاؤ بچاؤ۔۔ شکتی دھوپ، چندھیا دینے والی دھوپ اور اس میں چمکتی بلمیں اور کرپانیں۔۔۔ وہ ظالم عورتوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ عورتوں کو پکڑ کر نوچ کھسوٹ رہے تھے میں نسرین کی طرف بھاگا۔ اس کا دوپٹہ گر کر اس کے پاؤں سے الجھا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں میری معصوم بہن۔۔ میں نے اک نگاہ اس کی طرف بڑھتے سکھوں اور ہندوؤں پر ڈالی اور پھر تیزی سے اپنی بہن کی طرف لپکا۔۔۔ میری آنکھوں نے دیکھنا بند کر دیا۔ میرا ہاتھ شلوار کے نیفے کی طرف بڑھا چھری باہر نکالی۔۔ بہنوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو بھائی انہیں کندھا دے کر الوداع کرتے ہیں تب بہنوں کے ہاتھوں پر مہندی لگی ہوتی ہے۔ چہرے حیا سے گلنار ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی بہن کو رخصت کر دیا۔۔۔ چھری کا ایک وار، اور دوسرا وار خون خون وہ چیخی نہیں اس نے گلہ نہیں کیا اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دی اس کا پاک جسم زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

اور پھر میں ان مظلوم عورتوں کی طرف بڑھا جن پر سکھ حملہ کر رہے تھے میں آنکھیں بند کر کے ان بہنوں، ان بیٹیوں کے سینوں اور پیٹ پر چھری کے وار کرتا چلا گیا۔ ہاں ان کو میں ناپاک ہاتھ نہ لگنے دوں گا۔ یہ پاکستان جا رہی تھیں۔ ان کے جسم پاکستان پر قربان کر دوں

گا۔ ان کی روحیں پاک اور بے داغ حالت میں پاکستان جائیں گی۔ کسی غیر کا ہاتھ ان کے جسم کو نہ چھو سکے گا۔ اور پھر اچانک ایک گولی میری ٹانگ کو چیرتی ہوئی آگ لگاتی ہوئی نکل گئی۔ چھری میرے ہاتھ سے گر گئی میں اندھا دھند بھاگا۔ کسی طرف؟ کس سمت؟ مجھے کچھ نہیں معلوم نہ تھا۔ میں کب گرا؟ کہاں گرا۔۔۔؟ کچھ معلوم نہیں۔۔۔ بہت عرصے تک مجھے یہ بھی احساس نہ رہا کہ میں زندہ ہوں یا مردہ۔۔۔ جب ہوش آیا تو میں آس پاس بکھری لاشوں کے پاس لیٹا ہوا تھا۔ وہ مجھے بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں خون میں لت پت تھا ٹانگ زخمی تھی جانے کتنا خون بہہ چکا تھا میں دم سادھے لیٹا رہا۔ کچھ سوچنا چاہا لیکن کچھ سوچ نہ سکا پھر بے ہوش ہو گیا۔۔۔ ہوا بند تھی شام ہو چکی تھی جب مجھے پھر ہوش آیا۔۔ میں لاشوں میں سے اٹھا گھسٹتا لڑکھڑاتا چل پڑا میرے پیچھے گورداسپور تھا۔ میرے ماں باپ تھے میری بہن کی لاش تھی چچا جان کی قبر تھی مسلمانوں کا صدیوں پرانا ماضی تھا۔ لیکن میں ایک سرمستی اور بے خودی کی کیفیت میں پاکستان کی طرف بڑھ رہا تھا کس طرح میں کچھ اور لوگوں میں شامل ہوا جو میری طرح خستہ حال تھے کس طرح تریموں ہیڈ تک پہنچا تھا کس طرح پاکستان کی سرحد تک پہنچا، کن لوگوں نے مجھے تھاما میری دیکھ بھال کی کچھ یاد نہیں۔۔۔ فجر کی اذان سن کر میری آنکھ کھلی میں اب اس سرزمین میں تھا جہاں مسجدوں میں اذانیں دی جاتی تھیں۔ جو آزاد تھا جو اپنا تھا، جو پاکستان تھا۔۔۔ اپنے گندے خون سے لت پت کپڑوں ہی میں۔۔۔ میں سجدے میں گر گیا۔ اپنے جیسے کچھ زخمیوں کے ساتھ میں چل نکلا۔ پھر ایک گمنام سے اسٹیشن سے ریل گاڑی پر سوار ہوا۔ جب لاہور پہنچا تو میری ٹانگ سے پیپ رس رہی تھی مجھ سے چلنا دوبھر تھا کس نے سہارا دیا۔ ٹانگے میں بٹھایا اپنے ساتھ شاہ عالمی لے گیا جہاں ماموں جان کا گھر تھا۔ ماموں جان کا گھر جلا ہوا تھا پاس پڑوس سے معلوم ہوا کہ فسادات میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر جلا دیئے تھے ان میں ماموں جان کا گھر بھی تھا اب وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے ان کا پتہ مل گیا وہی مہربان مسلمان بھائی مجھے تانگے میں سوار کر کے ماموں جان کے گھر چھوڑ گیا۔ دوسرے دن ہسپتال میں تھا جہاں چند دنوں کے بعد میری وہ ٹانگ کاٹ

دی گئی جس میں زہر پھیل گیا تھا۔ میری ٹانگ اپنے وطن پاکستان کی نذر ہو چکی تھی میں نے ایک ٹانگ کے سہارے اپنے وطن اپنے پاکستان میں زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ اور پھر تلاش۔۔۔ ریلوے اسٹیشن، مہاجرین کے کیمپ ایک دن دو دن، ہفتے بیت گئے اور پھر دل کو قرار آ گیا میرے ماں باپ، میرے دونوں بھائی پاکستان کی راہ میں شہید ہو چکے تھے۔ میں اکیلا ہی رہ گیا تھا۔ میں نے تعلیم حاصل کی نوکری اختیار کی اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں میری ایک ہی بیٹی ہے میری بیوی مر چکی ہے اور میرا نواسہ مجھ سے پوچھتا ہے میں ۱۴ اگست کو کیوں روتا ہوں۔۔۔۔ میں نے سب کچھ بیان کر دیا ہے لکھ دیا ہے میں اس لئے روتا ہوں کہ ہماری نئی نسل وہ قربانیاں بھول گئی ہے جو ہم نے پاکستان کے لئے دی تھیں۔(۶)

خونِ دل سے ہم نے برسوں تک جلائے ہیں چراغ
تب کہیں جا کر ہوئی یہ صبحِ آزادی نصیب

جب موت قریب سے گزر گئی

محمد لطیف

میں ایک غریب گھرانے کا فرد ہوں۔ اگست 1947ء میں جماعت ہفتم کا طالب علم تھا۔ میرا گاؤں لوہیاں جنکشن ضلع جالندھر مشرقی پنجاب میں واقع تھا۔ میری تاریخ پیدائش 1932ء ہے۔ اس لحاظ سے تب میری عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اب جبکہ میں ستر کے پیٹے میں ہوں، یہ داستان ہجرت تحریر کر رہا ہوں۔ 14 اگست 1947ء کو جب پاکستان کے نام سے علیحدہ مملکت کے قیام کا اعلان ہوا اس وقت موسم گرما کی تعطیلات تھیں اور رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ نماز تراویح ادا کرنے کی غرض سے مسجد جایا کرتا جو ہمارے گھر سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد حالات دگرگوں ہونے شروع ہوئے پھر عیدالفطر بھی پہرے داروں کے حفاظتی سائے میں ادا کی گئی۔ سکھ اپنے ہتھیار لئے پھرتے رہتے لیکن ہمارے گاؤں میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت تھی لہٰذا قتل و غارت کا کوئی واقعہ نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ سکھ شرنارتھی پاکستان سے کوچ کر کے ہمارے گاؤں آ گئے لیکن انہیں بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی کیونکہ۔ اردگرد کے دیہات میں بھی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ 15 ستمبر کو میرے ننھیال موگہ (ضلع فیروزپور) سے ہجرت کر کے بے سروساماں ہمارے ہاں آ گئے۔ یہ مع بچے اور مستورات تقریباً تیس افراد تھے۔ مردوں کی تعداد سولہ کے لگ بھگ تھی۔ ہندو واویلا کرنے لگے کہ میرے والد (سلامت علی) نے ان پر حملہ کرنے کے لئے باہر سے نفری منگوالی ہے۔ حالانکہ وہ بیچارے بالکل نہتے اور بے سروساماں ان کے پاس آئے تھے۔

مقامی ہندو اور سکھ زمینداروں نے ہم سے مطالبہ کیا کہ انہیں ہمارے حوالے کر دو ورنہ تمہارا مکان تہ و بالا کر دیں گے۔ لیکن گاؤں کی پنچایت کے مسلمان ارکان نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ہندوؤں اور سکھوں نے باہر سے اکالی سکھوں کی صورت میں نفری منگوانی شروع

کی اور رات کو ان کے حملے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ جلد ہی اکیلے دکیلے مسلمان شہید بھی کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کے پاس کوئی خاص اسلحہ نہ تھا، وہ صرف لاٹھی اور برچھے سے مسلح تھے۔ آتشیں اسلحہ برائے نام تھا۔ ہمارا گاؤں جنکشن ہونے کے باعث کافی بڑا تھا، یہاں سے لدھیانہ، جالندھر اور فیروز پور گاڑیاں جاتی تھیں۔ آبادی تقریباً پانچ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ پولیس چوکی، مڈل اسکول اور ہسپتال موجود تھے۔ آخر مسلمانوں نے متوقع خطرے کے پیش نظر فیصلہ کیا کہ گاؤں خالی کر دیا جائے کیونکہ آتشیں اسلحہ کا لاٹھی اور برچھے وغیرہ سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ریاست کپورتھلہ کا علاقہ ہمارے گاؤں سے دو میل دور تھا۔ اس وقت ریاست میں امن و امان تھا لہٰذا ریاست کے نزدیکی شہر سلطان پور لودھی گاؤں کے اکثر لوگ ہجرت کر گئے جو اس وقت تحصیل کا درجہ رکھتا تھا۔ راستہ میں اکالیوں سے مڈبھیڑ ہوئی مگر مسلمانوں کو زیادہ تعداد میں دیکھ کر نزدیک نہ آئے۔

میرا خاندان اور موگہ سے آئے ہوئے مہمان بھی سلطان پور لودھی منتقل ہو گئے۔ وہاں ہم سب اکٹھے نہ رہ سکے کیونکہ جسے جہاں کرایہ پر مکان ملا، وہ وہاں سما گیا۔ ہم چند ضروری اشیاء ساتھ لے کر آئے تھے اور مکان کو تالا لگا دیا گیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ چند دن بعد امن و امان ہو گا، تو واپس چلے جائیں گے لیکن خدا کو ہماری واپسی منظور نہ تھی۔ ہم اپنے ساتھ ایک بھینس لے آئے تھے لہٰذا اس کا کچھ دودھ بیچ دیا کرتے اور کچھ اپنے استعمال میں لاتے۔ چند دن سکون سے گزرے۔ ایک دن دودھ خریدنے والے ایک سکھ نے بتایا کہ تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ، آج رات کپورتھلہ سے فوج آ رہی ہے اور وہ یہاں کی پولیس کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو تہ تیغ کر دے گی۔ ہم نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ لیکن وہی ہوا جس کا اس سکھ نے ذکر کیا تھا۔ نماز عصر کے بعد شہر میں فوج آ گئی اور مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگی۔ چیخ و پکار اور رونے پیٹنے کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔ ہم اہل خانہ بھاگ کر ایک پرانی مگر بڑی حویلی میں منتقل ہو گئے۔ اس کا ایک بہت بڑا لکڑی کا دروازہ تھا۔

اس میں ہمارے علاوہ تقریباً چار سو افراد بھاگ کر جان بچانے کی خاطر آ گئے۔ اندر

سے بڑے بیرونی دروازے کو بند کر دیا گیا اور اس کے آگے بڑے بڑے شہتیر اور رکاوٹیں رکھ دی گئیں۔ قتل و غارت جاری تھی۔ آخر سکھوں کی فوج (ریاست کپورتھلہ کی فوج) حویلی کے نزدیک آ گئی۔ انہوں نے کئی دستی بم حویلی کے اندر پھینکے اور دروازہ توڑنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ حویلی میں کچھ لوگ سابقہ فوجی اور پولیس کے ریٹائرڈ سپاہی بھی تھے، انہوں نے تمام لوگوں کو کہا کہ آپ شور و غل نہ کریں اور بچوں کو چپ کرائیں۔ حویلی میں کھوئی (چھوٹا سا کنواں) تھی جس میں لوگ کپڑے باندھ کر لٹکاتے جب وہ پانی سے بھیگ جاتے تو نچوڑ کر بچوں کو پانی پلاتے۔ ڈول یا بالٹی استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی کہ مبادا باہر کے فوجیوں کو آواز سے پتا چل جائے کہ لوگ اب کس طرف ہیں۔ ہمارے کچھ سابق فوجیوں نے ان فوجی سکھوں کی باتیں سن لیں جو حویلی کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے کہ اب اسلحہ ختم ہو چکا ہے اور اس حویلی میں سینکڑوں لوگ ہیں۔ ممکن ہے ان کے پاس بھی اسلحہ ہو لہٰذا مزید فوج اور اسلحہ کپورتھلہ (جو کہ وہاں سے بتیس میل کے فاصلے پر تھا) سے منگوایا جائے اور خود شراب نوشی کی جائے۔ جب اسلحہ پہنچ جائے گا تو اس حویلی پر بھرپور حملہ کر کے مسلمانوں کو ختم کر دیں گے۔ اس کے بعد حویلی میں موجود مسلمان سابق فوجیوں نے انہیں شراب پیتے اور شراب کے نشے میں مدہوش ہو کر گرتے دیکھا تو انہیں نے سب حویلی والوں سے کہا کہ اچھا موقع ہے، ہم حویلی سے بحفاظت نکل کر نزدیکی کماد کے کھیتوں میں چھپ چھپا کر مسلمان گاؤں کا رخ کرتے ہیں۔ بصورت دیگر اسلحہ اور فوج آ جانے اور دن کا اجالا ہو جانے پر یہ لوگ ہم پر حملہ کر دیں گے۔ جس سے کسی کا بھی بچنا محال ہو گا۔

بعد کو ان دس بارہ اشخاص نے بھاری بھرکم سامان دروازہ کے آگے سے ہٹا کر دروازہ کھولا اور دروازے کے سامنے کی طرف پڑے ہوئے سکھ فوجیوں کو اس خوبی سے واصل جہنم کیا کہ ان کی آواز تک نہ نکل سکی پھر ان جانبازوں نے حویلی سے افراد کو ٹولیوں کی صورت میں باہر نکال کر قریبی کھیتوں تک پہنچایا اور انہیں کہا کہ تم آگے چلتے ہوئے کسی مسلمان قافلے سے جا ملو۔ اس طرح

انہوں نے سب لوگوں کو حویلی سے باہر نکالا جس میں میرے اہل خانہ بھی شامل تھے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے راستے میں بہت سی کٹی پھٹی لاشوں سے گزر کر میں کماد کے کھیت تک پہنچا۔ وہاں سے آگے ہم ساری رات چلتے رہے۔ یہ غالباً شوال کے آخری دن تھے لہٰذا چاند کافی دیر بعد معمولی سا نکلا اور اس کی روشنی میں سمت کا اندازہ ہوا۔ آخر ہم تلونڈی چوہدریاں میں ہزاروں لوگوں کے قافلہ سے جا ملے۔ دو دن وہاں قیام کے بعد پیدل پاکستان کی سمت روانہ ہوئے اور جی ٹی روڈ پر آ گئے جو لاہور سے براستہ امرتسر دہلی جاتی تھی۔ یہ سڑک بھی غیر محفوظ تھی۔ مگر پاکستان ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھا لہٰذا چلتے گئے۔ بارش دن میں کئی بار ہوتی گئی اور قافلے ملنے سے یہ ایک بہت بڑا قافلہ بن گیا جو بیل گاڑیوں، گدھوں، گدھا گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں پر مشتمل تھا۔ اس میں بوڑھے جوان اور بچے سب پاکستان کی سرزمیں مقدس پر پہنچنے کے لئے بے تاب تھے۔ سب لوگ اپنی بھوک پیاس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے رواں دواں تھے۔ ہم لوگ ایک روپیہ میں ایک گلاسی (چھوٹا گلاس) چاول خرید لیتے اور جہاں قافلہ رکتا وہیں ہماری والدہ عموماً بارش کے دوران انہیں پکا لیتیں اور ہمیں کھلاتی تھیں۔ بعض دفعہ چنوں پر گزارہ کرنا پڑا۔ ہم بارش ہی کا پانی پیتے تھے کیونکہ یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ہندوؤں نے جی ٹی روڈ کے نزدیکی کنوؤں میں زہر ڈال دیا ہے۔

قافلے کی لمبائی اور چوڑائی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ قافلے کو امرتسر تک پہنچنے میں آٹھ دن لگے۔ میرے خیال میں یہ قافلہ کم از کم تین چار میل لمبا اور تقریباً تین چار میل چوڑا تھا۔ جی ٹی روڈ پر بھی قافلوں پر حملے ہوتے رہے جن میں ہزاروں لوگ شہید ہوئے۔ پہلے سے گزرے ہوئے قافلے کے لوگوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ خوش قسمتی سے ہمارا سامنا بلوچ رجمنٹ کی ایک کمپنی سے ہو گیا۔ جو غالباً ہمارے بعد آنے والے کسی بڑے قافلے کی حفاظت کے لئے جا رہی تھی۔ کپتان نے جب ہمارے قافلے کو دیکھا تو کچھ نفری قافلے کی حفاظت کے لئے چھوڑ دی، یوں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سکھوں کے حملے بند ہو گئے اور قافلہ بحفاظت امرتسر تک پہنچ گیا۔ امرتسر سے سکھ پناہ گزینوں (شرنارتھیوں) کو لینے کی غرض سے کچھ بسیں پاکستان

جا رہی تھیں، سپاہیوں نے ان بسوں میں قافلے کے کئی خاندان سوار کرائے تا کہ تھکے ماندے لوگ آرام سے پاکستان پہنچ سکیں۔ لیکن چالیس بسوں میں سے صرف دس بسیں ہی پاکستان پہنچ سکیں جن میں ہمارا خاندان بھی سوار تھا۔ باقی بسوں کو جو ہمارے آگے تھیں امرتسر ہی میں گزرتے وقت بم مار کر تباہ کر دیا گیا تھا۔ چونکہ ہماری زندگی باقی تھی لہٰذا جب آخری دس بسیں شہر سے گزر رہی تھیں، تو بلوچ رجمنٹ کے چند سپاہی پہنچ گئے۔ انہوں نے ہم سے آگے جانے والی بسوں کا تباہ شدہ ملبہ اور سینکڑوں لاشوں اور زخمیوں کو تڑپتے ہوئے دیکھ لیا تھا لہٰذا ہمیں واہگہ چیک پوسٹ پر پہنچا کر ہی واپس ہوئے۔

واہگہ پہنچ کر ہم سب لوگ اپنی سوہنی اور پاک دھرتی دیکھ کر سجدہ ریز ہو گئے اور شکرانے کے نفل ادا کئے۔ پورے پندرہ دن بعد ہمیں روٹی کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی۔ جب زندہ دلان لاہور نے ہمیں کھانا کھلایا۔ وہاں سے ہم والٹن کیمپ آ گئے۔ لیکن جب وہاں ہیضہ کی بیماری پھیلی تو چند دن بعد ہمارے بزرگ پھر لاہور اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں ہندوستان سے آنے والی ریل گاڑیوں میں سوار مسلمانوں کا حشر دیکھا۔ گاڑی کے کسی ڈبے میں کوئی مسلمان زندہ نہ تھا، سب کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا تھا۔ ہمارے دل دہل گئے اور سب پریشان ہو گئے۔ بہر حال یہ اطمینان تھا کہ ہم اب پاکستان آ چکے ہیں اور اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ ایک مال گاڑی پر سوار ہوئے اور براستہ لائل پور (فیصل آباد) گوجرہ پہنچے۔ جب وہاں دل نہ لگا تو چند دن بعد پھر ریل کی چھت پر سوار ہو کر خانیوال آ گئے۔ وہاں سے اوکاڑہ پہنچے۔ جہاں تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔ ہمارا قیام ایک سرائے میں تھا جو اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ روزگار کا کوئی بندوبست نہیں تھا لہٰذا سرائے والوں نے دال مسور اور روٹیاں پکا کر دیں۔ میں اسٹیشن کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ایک آنے کی دو روٹیاں اور دال مفت بیچتا۔ جس سے گزارے کے لئے پیسے مل جاتے۔ بعد کو ہم نزدیکی گاؤں ہری پور (نزد گوگیرہ) چلے گئے۔ جہاں ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ موجود تھے۔ مگر ہمارا کوئی نزدیکی رشتہ دار نہ تھا۔ لہٰذا وہاں چند دن قیام کیا۔ پھر ہم ٹبہ سلطان پور تحصیل میلسی، ضلع وہاڑی آ گئے۔ وہاں ہمیں

نزدیکی بستی ساندہ میں ایک ایک ایکڑ فی فرد کے حساب سے رقبہ الاٹ ہوگیا۔ساندہ میں کسی غیر مسلم کا مکان نہ تھا لہٰذا اپنا مکان بنا کر بیٹھ گئے۔ چونکہ ہندوستان میں ہماری زمین نہیں تھی اس لئے چند سال بعد یہ رقبہ کسی اور کو دے دیا گیا اور ہم پھر فارغ ہوگئے۔خوش قسمتی سے والد صاحب درزی کا کام جانتے تھے لہٰذا وہ کپڑے سینے کے ساتھ ساتھ مقامی مسجد میں نماز پڑھانے لگے۔ یوں خداوند تعالیٰ نے گزر بسر کا ذریعہ بنا دیا۔ میں ہندوستان میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا اور نزدیک صرف ایک پرائمری اسکول تھا لہٰذا 1952ء تک نہ پڑھ سکا۔ٹبہ سلطان پور کے اسکول کو مڈل کا درجہ ملا تو وہاں سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے جے۔وی کورس میں داخلہ لے لیا۔اور پھر محکمہ تعلیم میں بتیس سال ملازمت کی۔ 1984ء میں ریٹائر ہوا۔اس وقت تک میرے بیٹے اچھے عہدوں پر فائز ہو چکے تھے لیکن میں فارغ بیٹھنا گناہ سمجھتا ہوں لہٰذا سب تحصیل میں وثیقہ نویسی اور اسٹامپ فروشی کا کام شروع کیا جو بفضل خدا روزی کا اچھا سبب بن گیا۔میرا بڑا بیٹا کیمیکل انجینئرنگ کر کے اٹامک انرجی کمیشن، جوہر آباد (خوشاب) میں بطور پرنسپل انجینئر کام کر رہا ہے۔اس سے چھوٹا بیٹا مکہ معظّمہ میں کام کرتا ہے۔ایک بیٹا ٹبہ سلطان پور میں دکان کر رہا ہے۔ سب سے چھوٹے بیٹے نے طبیہ کالج بہاولپور سے تعلیم حاصل کر کے بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی میں بی آئی ایم ایس (بیچلر آف اسلامک میڈیسن اینڈ سرجری) کے تین سالہ کورس میں داخلہ لے رکھا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا شکر ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔۔۔یہ سب کچھ مجھے خداوند تعالیٰ کی مہربانی اور پاکستان کی بدولت حاصل ہوا ہے۔اگر ہم ہندوؤں کے غلام ہوتے تو یقیناً اتنی اچھی حیثیت میں نہ ہوتے۔ پاکستان زندہ باد۔(۷)

گوہانہ ہندو بھیڑیوں کے نرغہ میں

پروفیسر منظور الحق صدیقی

ضلع رہتک کی تحصیل گوہانہ میں مسلمانوں پر جو افتاد پڑی، ان پر جو مظالم ہوئے اور ان کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی اس کا ہدف زیادہ تر مسلم راجپوت تھے۔یہی مسلمانوں کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔کہنے کو تو یہاں مسلم راجپوتوں کے بارہ گاؤں تھے مگر وہ منتشر تھے۔علاقہ نہری تھا اس لئے فوج میں جانا ان کے لئے مجبوری نہیں تھی۔مسلم راجپوتوں کے مقابلے میں دوسرے مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی مگر وہ اور زیادہ منتشر تھے۔تحصیل میں 199 گاؤں اور دو قصبے تھے۔قصبہ گوہانہ کا ہندو جاٹوں نے محاصرہ کیا، کچھ خون بھی بہا مگر مجموعی طور پر قصبے کے مسلمان محفوظ رہے۔اس تحصیل کے مسلم راجپوتوں کے اجداد شہنشاہ فیروز شاہ تغلق (1388-1351ء) کے دور میں اور اس کے بعد مختلف اوقات میں زبدۃ الاولیا حضرت قاضی قوام الدین صدیقی کی اولاد (علماء و مشائخ قصبہ مہم شریف) کے دست حق پرست پر اسلام لائے تھے۔اس تحصیل میں قصبہ مہم رہتک سے اٹھارہ اور دہلی سے ساٹھ میل کے فاصلے پر اس قدیم شاہراہ پر واقع ہے جو دہلی سے ملتان کو جاتی تھی۔اس قدیم قصبے میں، برصغیر میں مسلم عہد کا قدیم ترین کتبہ (1049ء) موجود ہے۔یہاں کی تاریخی عمارت مغل حکمرانوں کی ایک خاتون بیکہ بیگم کی بنوائی ہوئی جامع مسجد ہے جس کے مینار خاصے بلند ہیں۔اکثر نمازی ان میناروں پر چڑھ کر حد نظر تک اردگرد کا نظارہ کرتے۔علماء و مشائخ کے اس مسکن پر 1947ء میں حملہ نہیں ہوا کیونکہ گردونواح کے جاٹوں میں یہ مشہور تھا کہ یہاں کے پیروں اور مشائخ کے مقبروں سے محیر العقول باتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔وہ احتراماً اسے ''مہم شریف'' کہتے تھے۔ایک زمانہ تک یہ علم و عرفان کا مرکز رہا ہے۔

ہم گوہانہ تحصیل کے مسلم راجپوتوں کے صرف چار دیہات کی تباہی کے ذکر پر اکتفا کریں گے یعنی چاندی، گڑوال، پوٹھی اور کاہنی۔

چاندی کے مسلمان

مسلم راجپوتوں کا قصبہ چاندی رہتک سے نزدیک بڑی سڑک سے سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ دہلی سے رہتک براستہ بٹھنڈا ہوتی ہوئی ریل کی پٹڑی لاہور آتی تھی۔ اس پر رہتک سے دوسرا ریلوے اسٹیشن کھرینٹی ہے جو چاندی سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ 24 اگست 1947ء کو چاندی کے رہنے والے تاج محمد کے بیٹے منشی اور امام الدین کھرینٹی ریلوے اسٹیشن سے رہتک جانے کے لئے ریل میں بیٹھے۔ یہ الگ الگ ڈبوں میں تھے۔ ابھی گاڑی تھوڑی دور چلی تھی کہ بغیر کسی اشتعال کے مسلمانوں کے خلاف اپنے کینہ کا اظہار کرنے کے لئے ہندوؤں نے امام الدین کا تمام سامان چھین لیا پھر اسے قابو کر کے اس کے کپڑے اتارے اور اسے اگلے اسٹیشن سامڑا گوپالپور پر ریل سے اتار دیا۔ یہ پھر بھی خوش قسمت تھا کیونکہ اسکے بھائی منشی کے ڈبے میں کچھ درندہ صفت بھی سفر کر رہے تھے۔ انہوں نے منشی کا ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کاٹ کر اسے شہید کر دیا اور اسکی لاش پلیٹ فارم پر پھینک دی۔ اگلے روز 25 اگست کو گردونواح کے ہندو جاٹوں نے موضع چاندی کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں نے درختوں پر اور راجباہ میں اپنے مورچے بنا لیے۔ دو دن تک مقابلہ ہوتا رہا۔ کچھ مارے گئے۔ تیسرے روز فوجی دستہ آ گیا۔ بھارتی فوج کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مسلمانوں کے قتل عام میں حملہ آوروں کی مدد کرتی ہے چنانچہ جوشیلے مسلمان نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ فوج کا مقابلہ کیا جائے۔ اس غلط فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے دلیر نوجوان فوجی گولیوں اور دستی بموں سے شہید ہو گئے۔ 27 اگست کو چاندی کے باشندوں کو صدیوں پرانا اپنا آبائی گاؤں چھوڑنا پڑا اور یہ قافلے کے ذریعے پہلے موضع لاہلی اور وہاں سے پاکستان آ گئے۔ عبدالمجید ولد نبی بخش کو اپنے گاؤں سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ اس نے گاؤں نہ چھوڑا اور کہا کہ اسے ہندوؤں سے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اس کے زیادہ تر دوست ہندو ہیں، لیکن رات ہونے سے پہلے انہی ہندو دوستوں نے اسے اس کے مکان میں بے دردی سے قتل کر دیا۔ چاندی میں 80 مسلمان شہید کیے گئے۔ زخمیوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

گڑوال کی بہادر عورتیں

اس کی حد قدیم ریاست جنید سے ملتی تھی۔ اس گاؤں کے مسلمانوں پر 6 ستمبر 1974ء کو حملہ ہوا۔ 7 ستمبر کو ریلیف ہسپتال رہتک میں چھ زخمی لائے گئے جن میں پانچ خواتین تھیں جن کی حالت نازک تھی۔ دیگر زخمی نہ جانے کہاں کہاں گئے ہوں گے؟ یہاں شہید بھی بہت ہوئے جن کے ناموں کا ہمیں علم نہیں۔ زخمیوں میں دو فقیر شوکت اور جانی تھے جو سوسا کے بیٹے تھے اور حملے میں گنڈاسوں سے زخمی ہو کر قریبی گاؤں بڑودہ چلے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی عورتوں نے بھی بلوائیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔

پوٹھی کے دلیر مسلمان

سڑک کے راستے رہتک سے گوہانہ جاتے ہوئے سترہ کلومیٹر پر موضع پوٹھی ہے۔ آگے آٹھ کلومیٹر گوہانہ ہے۔ 1947ء میں یہاں کی کل آبادی پونے دو ہزار تھی جس میں ڈھائی تین سو غیر مسلم تھے اور تجارت ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مسلمان راجپوتوں کا موضع تھا لیکن چاروں طرف سے غیر مسلم دیہات سے گھرا ہوا تھا۔ ہندو تقسیم ہند سے پہلے ہی قریبی گاؤں ماہرہ کے موٹر ڈرائیور اور سولہ سترہ مسلمانوں کو شہید کر چکے تھے۔ کئی دیہات کے مسلمان اپنے صدیوں پرانے گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیے گئے۔ راستے قطعاً غیر محفوظ تھے۔ مگر پوٹھی کے مسلمانوں نے اپنے بچاؤ کے انتظامات کر رکھے تھے۔ انھوں نے گاؤں کے باہر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچے بنا لیے۔ یکم ستمبر 1947ء کی رات گیارہ بجے قریبی گاؤں موی کے نمبردار منشی نے اطلاع دی کہ کل صبح حملہ ہوگا۔ راتوں رات جوانوں نے مورچے سنبھال لیے۔ ایک چوبارے پر نور محمد اور رئیس حاجی شریف الدین کے فرزند محمد یاسین کو دوربین دے کر بٹھا دیا گیا۔ 2 ستمبر کی صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب انھوں نے بتایا کہ موضع ربڑہ سے ہزارہا مسلح لوگ پوٹھی کی طرف آ رہے ہیں۔ اگلے مورچے میں فوجی حوالدار منصب علی خان، عبدل، الٰہی بخش، جمال دین، وزیر محمد اور محمد شافع وغیرہ بیٹھے تھے۔ جب یہ دھاڑ چار سو میٹر کے فاصلے پر آ گئی تو حوالدار منصب علی خان نے دیسی

توپ داغ دی۔ گولا حملہ آوروں کے اوپر سے ہوتا ہوا ر بڑہ گاؤں میں جا گرا جس سے دو مویشی اور ایک عورت جاں بحق ہو گئے۔ حملہ آوروں کی پیش قدمی کچھ دیر کے لئے رک گئی۔ اتنے میں منصب علی خان نے دوسرا گولہ داغ دیا جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور سینکڑوں حملہ آور مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ افراتفری میں بھگدڑ مچ گئی۔ اگلے مورچے والوں نے ان کا تعاقب کیا اور رائفلوں سے متعدد کو ہلاک کر دیا۔ مسلمانوں میں سے صرف ممتاز محمد شہید ہوئے۔ دس بجے کے قریب چوبارے سے نور محمد نے دیکھا کہ حملہ آور پھر آ رہے ہیں۔ اس دفعہ وہ تعداد میں اور بھی زیادہ تھے۔ مدافعین نے فاصلے فاصلے پر دیسی ساخت کی چار توپیں رکھی ہوئی تھیں۔ حملہ آور بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے توپوں کے دھانے کھول دیئے گئے۔ سینکڑوں حملہ آور مارے گئے اور باقی راہ فرار اختیار کر گئے۔ خوش قسمتی سے کوئی مسلمان شہید نہیں ہوا۔

سہ پہر کو چوبارے سے اطلاع آئی کہ حملہ آور پھر آ رہے ہیں اور اس دفعہ تعداد میں اور بھی زیادہ ہیں۔ اچانک فیصلہ ہوا کہ گاؤں کی تمام عورتیں اور بچے حاجی شرف الدین کی حویلی میں آ جائیں، ہر طرف آدمی دوڑا دیئے گئے۔ جلدی اور گھبراہٹ میں خواتین اپنے بچوں کو لے کر خالی ہاتھ حویلی میں چلی گئیں اور مرد اپنے مورچوں میں چلے گئے۔ اس دفعہ حملہ آور چاروں طرف سے آئے۔ ابتدا جانب غرب سے ہوئی۔ اس حملے میں رائفل کی گولی سے شہید ہونے والا پہلا جواں مرد محمد رفیق تھا۔ حملہ آوروں نے آگے بڑھ کر اس طرف کی دیسی توپ پر قبضہ کر لیا۔ توپ بھری ہوئی تھی۔ توپچی بھاگ اٹھا کیونکہ جاٹ اچانک اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ یہ بری خبر ملتے ہی عبدل اور محمود رائفلیں لے کر دوڑے۔ جاٹوں نے توپ کا منہ پوٹھی گاؤں کی طرف کر دیا تھا۔ درمیانی عرصے میں انہیں توپ چلانے والا بھی میسر آ گیا۔ وہ توپ داغنا ہی چاہتا تھا کہ محمود کی رائفل کی گولی نے اسے ڈھیر کر دیا۔ انھوں نے دو چار اور گرائے، تو باقی جاٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمود نے توپ کا منہ ان کی طرف کر کے گولا چلا دیا۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ متعدد مرے اور زخمی ہوئے۔ جنوب کی طرف سے جو حملہ ہوا ہو زیادہ خطرناک تھا۔ حملہ آوروں کے پاس کئی رائفلیں

تھیں۔ ان میں سابقہ اور رخصت پر آئے ہوئے فوجی بھی تھے۔ یہ گولیاں برساتے آگے بڑھتے چلے آئے۔ مدافعین نے ابھی تک ان پر ایک گولی بھی نہیں چلائی تھی کیونکہ وہ اوٹ میں تھے اور حملہ آور کھلی جگہ پر! جب حملہ آور بالکل قریب آ گئے تو مدافعین نے ان پر گولیاں چلائیں جس سے کئی حملہ آور وہیں ڈھیر ہو گئے اور ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ اب مسلمان مورچوں سے باہر نکلے اور لاٹھیوں سے کئی کو ہلاک کر دیا۔ انھوں نے تین فوجی رائفلوں پر قبضہ بھی کر لیا، جو فوجی بھگوڑے وہاں چھوڑ گئے تھے۔ قبضہ کرنے والے غازی یہ تین تھے: بشیر، نور محمد اور منصف علی۔ انہوں نے اور دوسرے برچھی بردار مسلمانوں نے بھاگنے والے حملہ آوروں کا بہت دور تک پیچھا کیا اور ان میں سے سینکڑوں کو ہلاک کیا۔ اب دن ڈھل گیا اور اندھیرا چھانے لگا۔ موضع پوٹھی کے شمال میں گھنا جنگل تھا۔ بہت سے مسلح ہندو جنگل میں چھپے ہوئے تھے کہ شب خون ماریں اور لوٹ مار کریں گے۔ رات گئے درختوں کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کچھ جاٹ آگے بڑھے۔ تین مسلمانوں نے انہیں دیکھ لیا اور ان کا راستہ روکا۔ ان تین میں ایک اکبر تھا۔ یہ تینوں مقابلہ کرتے رہے۔ دوسری جانب سے کچھ جاٹ اس طرف بڑھے۔ پہلے آنے والے جاٹوں نے سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں لہٰذا جاٹوں کے ایک گروہ نے اندھیرے میں دوسرے پر حملہ کر دیا۔ وہ اندھیرے میں اپنوں پر برچھیاں چلاتے اور لاٹھیاں برساتے رہے۔

اس ہنگامے میں اکبر شہید ہو گیا۔ اس کے ساتھی نے یہ خبر حاجی شریف الدین کو سنائی۔ وہاں سے عبدل اپنی رائفل لے کر دوڑا۔ اسے معلوم تھا کہ ادھر جاٹ لڑ رہے ہیں اس لیے کسی احتیاط کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے اس نے پے در پے فائر کیے۔ اتنے میں اور مسلمان بھی آ گئے۔ ہندو حملہ آور لاشیں چھوڑ کر روپوش ہو گئے۔ حاجی شرف الدین بھی وہاں پہنچ گئے۔ اکبر کی لاش تلاش کی گئی، مگر اندھیرے میں تمیز کرنا مشکل تھا، دور تک لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ لوگوں نے کہا حاجی صاحب پتا نہیں چل رہا کہ اکبر کی لاش کونسی ہے۔ اس پر حاجی صاحب برہم ہوئے اور تلخی سے کہا ''ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر دیکھو جس کے سر پر چوٹی نہیں، اسے اٹھا لاؤ۔'' بغیر چوٹی کے

تین لاشیں ملیں جنہیں اٹھا کر لائے اور ممتاز خاں شہید کی لاش کے ساتھ رکھ دیا۔ یہ تین شہداء اکبر، بشیر اور محمد تھے۔ اس شمالی مورچے میں یہی تین مسلمان شہید ہوئے۔ مرنے والے ہندوؤں کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ پھر اطلاع ملی کہ حملہ آور جاٹ کچھ گھروں کا سامان لوٹ رہے ہیں اور انھیں آگ لگا رہے ہیں۔ حاجی شرف الدین کی حویلی گاؤں کے مشرق میں ایک طرف ہٹ کر تھی اور اس کے سامنے چوڑی سڑک تھی۔ مسلمان اس سڑک کی نگہداشت اور حویلی کی حفاظت کر رہے تھے۔ اس حویلی میں سارے گاؤں کی خواتین اور بچے تھے۔ گاؤں کو لٹتے دیکھا تو کچھ لوگ اپنے گھروں کو بچانے کے لئے بڑھے۔ جس جاٹ کے ہاتھ جو مال لگتا وہ اسے لے کر دوسرے کو بتائے بغیر اپنے گاؤں کا راستہ لیتا کہ حملہ اسی نیت سے کیا تھا۔ صبح ہونے کو آئی تو گاؤں میں ایک حملہ آور بھی نہیں تھا۔ اس طرح بہیمانہ قتل و غارتگری اور لوٹ مار کے پہلے چوبیس گھنٹے گزرے۔

رہتک میں ردعمل

پوٹھی پر حملہ 2 ستمبر کو ہوا۔ اسی روز مقصود راجپوت اور اس کے دو ساتھی اپنی گھوڑیوں کو سرپٹ دوڑا کر چودھری جان محمد کے پاس رہتک پہنچے۔ خبر سنتے ہی مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، مگر انھوں نے جوش کو ہوش پر غالب نہ آنے دیا اور کسی جوشیلے سے جوشیلے مسلمان نے بھی پوٹھی پر حملہ آوروں کا انتقام لینے کے لئے رہتک کے کسی ہندو پر حملہ کر کے حالات کو خراب نہیں کیا۔ مسلمانان رہتک نے جمعدار ظفر یاب علی خاں، حاجی عاشق علی، شیخ عزیز الدین اور شیخ ذکیر الدین پر مشتمل ایک وفد بنایا جس کے قائد میجر (ر) منظور احمد خادم تھے جو رہتک میں حکومت پاکستان کے ضلعی رابطہ افسر تھے۔ یہ وفد ڈپٹی کمشنر رہتک وزیر چند سے ملا۔ اس روز رہتک میں انبالہ ڈویژن کے کمشنر ٹنڈن بھی موجود تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ فوجی دستہ فوری طور پر پوٹھی بھیجا جائے اور اس کے ساتھ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی بھی ہوں۔ حاکموں نے یہ بھی فیصلہ سنا دیا کہ پوٹھی کے مسلمان اب وہاں نہیں رہ سکتے اور انہیں پاکستان جانا پڑے گا۔ مسلمانوں کی دو ٹرانسپورٹ کمپنیاں تھیں جن کی بسیں ضلعی انتظامیہ نے اپنی تحویل میں لے لی تھیں۔ وفد نے مطالبہ کیا کہ یہ کمپنیاں ڈرائیور، ان

کے معاون اور محافظ دیں تا کہ بسیں مسلمانان پوٹھی کو رہتک کیمپ میں لے آئیں۔

حکام ضلع اور فوج کی آمد

3 ستمبر کی صبح فوجی دستہ پوٹھی پہنچا۔ کئی سو حملہ آوروں کو ٹھکانے لگا کر پوٹھی والوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ فوجی دستہ آتے دیکھ کر فیروز نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو ان فوجیوں کو ٹھکانے لگا کر ان کا اسلحہ چھین لیا جائے؟ حاجی شرف الدین نے کہا ''یہ بات ٹھیک نہیں، انہیں مارو گے تو اور فوجی آجائیں گے اور انہیں بھی مار دو گے تو مزید فوجی آجائیں گے۔ فوج کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے اچھا برتاؤ کرو۔'' فوج گاؤں میں آگئی اور کہا، اب فکر نہ کرو ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ تمام اسلحہ ہمارے پاس جمع کرا دو۔ گاؤں والوں نے کہا کہ ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ لوگ دو لاشیں لے کر آگئے۔ یہ معشوق شہید اور غلام دین شہید تھے۔ میجر اسلحہ لینے پر مصر تھا۔ اس نے کہا، جو رائفلیں جاٹوں سے چھینی ہیں، وہ تو واپس کرو۔ اتنے میں ڈی سی اور ایس پی بھی آگئے۔ کچھ دیر بعد تھانہ بڑودہ کے سب انسپکٹر پولیس عنایت حسین خان آگئے۔ بڑودہ گوہانہ کے مغرب میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ عنایت حسین خان کے ساتھ الیاس خان گوہانوی اور موضع نگر کے امجد خاں تھے۔ یہ گوہانہ ٹرانسپورٹ کمپنی کی دو لاریاں بھی ساتھ لائے۔ ایک لاری کا ڈرائیور محفوظ علی خاں اور دوسری لاری کا ڈرائیور محمد اعظم تھا۔ عنایت حسین خان ایک دلیر اور نہایت ہی کامیاب پولیس افسر تھا۔ پوٹھی آنے سے پہلے انھوں نے بڑودہ اور نگر کے مسلمانوں کو راتوں رات محفوظ علی خاں کی لاری میں گوہانہ پہنچا دیا تھا۔ آج کل یہ لوگ زیادہ تر جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں آباد ہیں۔

افسران ضلع نے سربرآوردہ مسلمانوں سے کہا کہ ان کے انخلا کا فیصلہ ہو چکا ہے لہٰذا آپ لوگ اپنے اپنے مکان چھوڑ کر اسکول میں چلے جائیں۔ ایک لاری حویلی کے دروازے کے سامنے کھڑی کر دی گئی۔ اس میں جتنی عورتیں اور بچے آسکتے تھے، ٹھونس دیئے گئے۔ محمد اعظم ڈرائیور انھیں گوہانہ چھوڑ کر لاری واپس لے آیا۔ ایک ایک کر کے سب مسلمان مردوں کو اسکول بھیج

دیا گیا۔ حویلی حاجی شرف الدین میں موجود باقی ماندہ پچاس بچے اور عورتیں بھی لاری میں ٹھونس دیے تھے۔ ڈرائیور محمد اعظم اسکول گیا ہوا تھا۔ میدان خالی دیکھ کر جاٹوں نے گھروں کو لوٹنا شروع کر دیا اور موقع پا کر عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی لاری کو آگ لگا دی۔ آگ لگانے والے لاری سے باہر کھڑے تماشا دیکھنے لگے اور کسی کو نیچے اترنے نہ دیا۔ یہ جانکاہ خبر سن کر محفوظ علی خاں ڈرائیور، احمد خاں پٹھان اور مہتاب اسلحہ لے کر لاری کی طرف دوڑے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک لڑکا لاری سے چھلانگ لگا کر بھاگا۔ احمد خاں سمجھا کہ یہ جاٹ لڑکا ہے، اس نے اسے گولی ماری اور وہ وہیں مر گیا۔ یہ لڑکا مسلمان تھا۔ جلتی لاری کے قریب ایک عورت نالی میں پڑی آواز دے رہی تھی ''ہے کوئی مسلمان جو مجھے پانی پلا دے۔''

جلتی ہوئی لاری میں سے ایک ماں نے اپنی بچی کو باہر پھینک دیا جسے حملہ آوروں میں سے کوئی شخص اپنے گھر لے گیا۔ دو تین روز بعد وہ اس بچی کو دفتر مسلم لیگ رہتک دے گیا۔ بعد میں مؤلف کتاب نے اسے اس کے والد کے پاس بھجوا دیا۔ یہ نیاز محمد کی بیٹی تھی جو سنا گیا ہے کہ اب کوٹ میلا رام، ضلع ملتان میں رہتے ہیں۔ وہ لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ رشیدے گاؤں میں رہتی ہے۔ جلنے والی لاری میں گاؤں کی عورتیں اور بچے، چند بیمار، معذور اور معمر مرد تھے، یہ بے بس، کمزور اور ناتواں لوگ آگ میں جلا دیئے گئے اور اس وقت جلائے گئے جب بھارتی فوج اور ضلع کے ڈی سی اور ایس پی بظاہر ان کی حفاظت کے لئے گاؤں میں موجود تھے۔ اس بے محابہ انسان سوزی سے متعصب ڈپٹی کمشنر وزیر چند کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ پوٹھی کے جیالے مسلم راجپوت جو اب تک اپنا گھر بار چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے، مجبوراً ترک وطن پر نیم رضامند ہو گئے۔ 3 ستمبر کی شام چار بجے رہتک سے گوہانہ اور ہریانہ ٹرانسپورٹ کی سات لاریاں پوٹھی پہنچ گئیں۔ ہر لاری میں مسلم لیگ نیشنل گارڈز کا ایک مسلح جوان بھی تھا۔ لاریوں کا قافلہ موضع سانگھی ضلع رہتک کے شیخ کندن کی سرکردگی میں پوٹھی پہنچا۔ یہ سب جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنا کہا سنا معاف کروا کر آئے تھے۔ اسکول میں جتنے مسلمان تھے، وہ اب ان لاریوں کے پاس آ گئے۔ سب انسپکٹر پولیس عنات حسین

خاں اپنی رائفل لیے ان لاریوں کی حفاظت کرتا رہا۔ ایک لاری ڈرائیور محفوظ علی گوہانہ لے گیا اور باقی سات لاریاں رہتک جانے کے لئے چل پڑیں۔ راستے میں سب سے اگلی لاری کے انجن میں کوئی نقص پڑ گیا، لیکن کوئی ڈرائیور اپنی گاڑی سے اتر کر اسے ٹھیک کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ یہ سب سواریوں کے لیے بڑا ہی صبر آزما لمحہ تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی ایک لاری کو آگ لگا کر ۸۵ بے گناہوں کو بھون دیا گیا تھا۔ گاڑی ٹھیک کرنے میں پندرہ بیس منٹ لگے اور اللہ اللہ کر کے یہ قافلہ روانہ ہوا۔ راستے میں موضع مکڑولی میں درخت کاٹ کر سڑک پر ڈال دیئے گئے تھے۔ دور سے جاٹوں نے ان لاریوں پر بندوقوں سے گولیاں برسائیں جس سے ڈرائیور اسلام الدین خاں اور ایک کلینر شہید ہو گئے۔ اس لاری کو امام الدین چلا کر رہتک لایا۔ پوٹھی میں مسلمانوں کے ایک معمر بزرگ، دو سن رسیدہ مرد، جوان اور ستر عورتیں اور بچے شہید ہوئے۔ یہ کل نوے بنے۔ مختلف بیانات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ درست معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آوروں کے کم و بیش دو ہزار جوان مارے گئے۔ نوے مسلمان شہداء کے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، لواحقین کا حال تو ہم تک پہنچا ہے مگر ان جاٹ ماؤں کا کیا حال ہوا ہو گا جن کے کم و بیش دو ہزار کڑیل جوان لوٹ مار کے لالچ میں مارے گئے اور پوٹھی ایسا امیر گاؤں بھی نہیں تھا۔ مظلومین پوٹھی رہتک پہنچے تو قلعے کے نیچے، دلی دروازے کے باہر مسلمانوں نے چائے سے ان کی تواضع کی۔ ان سے ملنے، حال پوچھنے اور ان کی مدد کرنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ لیکن ضلعی حکام کے ارادے کچھ اور تھے۔ ان سب کو شب بسری کے لئے عیدگاہ لے جایا گیا۔ پھر اعلان کیا گیا کہ ''ان سب کو بھوانی کیمپ بحفاظت پہنچایا جائے گا۔ اگر کسی نے پوٹھی والے کو اپنے گھر میں رکھا تو وہ سزا کا مستوجب ہو گا۔'' اس کے باوجود بہت سے لوگ شہر میں اپنے رشتے داروں کے پاس چلے گئے۔

رہتک سے پاکستان تک

راؤ رستم علی خاں کلانوری لکھتے ہیں ''پوٹھی والوں کو رہتک کے بجائے بھوانی منتقل کیا گیا۔ جب ان کے مردوں سے بھری ہوئی موٹریں ہانسی دروازے لے جائی گئیں تو وہاں بزدل

ہندو بھیڑیئے نہتے مسلمانوں کو نئی تیار شدہ فصل کی طرح کاٹنے لگے۔ ان ظالموں نے بچوں، بوڑھوں اور بے بس عورتوں تک کو قتل کرنے سے گریز نہ کیا۔ راجپوت سورماؤں کے لئے اس سے زیادہ شرمناک حرکت اور کیا ہوسکتی ہے۔ عجیب لرزہ خیز منظر تھا۔ ایک قیامت برپا تھی۔ کچھ مسلم راجپوتوں نے لاریوں سے کود کر ہندو حملہ آوروں کو للکارا، شیروں کی طرح جھپٹ کر ان کے ہتھیار چھینے اور پھر انہی ہتھیاروں سے کئی ہندوؤں کی کھوپڑیاں جسموں سے جدا کر دیں مگر 'کھن جیتے سورما ہارے' کی مثال وہ جوان بھی شہید کر دیئے گئے۔ پھر بلوائیوں نے آدمیوں سے بھری ہوئی ایک لاری پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ عورتوں اور بچوں کی دلخراش چیخ و پکار ان کی انسانیت جھنجھوڑنے کے لئے کافی تھی مگر انہیں ان کی شرمناک سازش نے پتھر دل بنا دیا تھا۔'' اس لہو رنگ ہجرت کی مختصر روداد ان بزرگ کی زبانی سنیے جو پوٹھی کے رہنے والے تھے اور جنہوں نے سارے مصائب جھیلے۔ وہ اس وقت 23 سال کے تنومند اور ہوشمند جوان تھے اور جن کی یادداشت اب بھی اچھی ہے۔ ''میں اور شوکت اوروں کے ساتھ لاری کے ذریعے پوٹھی رہتک آئے۔ رات عیدگاہ میں گزاری پھر وہاں سے پولیس زبردستی بھوانی لے گئی۔ راستے میں پہلا پڑاؤ بلیالی میں ہوا۔ اس کے بعد کھرک پہنچے تو سڑک روکی ہوئی تھی اور دونوں جانب ہتھیار بند کھڑے تھے۔ پولیس نے انہیں ہٹا دیا۔ اس سے آگے ہم ضلع حصار کی تحصیل بھواسنی میں داخل ہوئے۔ موضع بامله میں بھی رکاوٹوں کو ہٹایا گیا۔ یہاں سے بھوانی گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ بھوانی کے پاس پہنچے تو یہاں بھی رکاوٹیں ہٹائیں۔ ہمیں تحصیل کے دفتر میں ٹھہرایا گیا مگر کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔ رات وہیں گزاری۔ تحصیلدار کھیڑی کا تھا۔ ہم نے بھوک کی شکایت کی تو اس نے دال چاول کا انتظام کر دیا۔'' ''ابھی کھانا پکنے نہ پایا تھا کہ مرزا کے باغ میں چلے جانے کا حکم آیا۔ دال چاول وہیں چھوڑے اور مرزا کے باغ کی طرف چل پڑے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ بیچ شہر میں ہم بھوکے پیاسے نہتوں پر قاتلانہ حملے ہوئے۔ یہ لوٹ مار کے لئے نہ تھے کیونکہ ہم سب تہی دست تھے اور حملہ آوروں نے قتل عام شروع کر دیا۔ میرا چچا گامی ان کے بیٹے، بہو، میری بھاوج اور اس کی آٹھ

سالہ بیٹی، موضع بھینسوال کے کئی مکین، کل ایک سو اسی افراد شہید کر دیے گئے۔ عمر خاں زخمی ہوگیا۔ غفور کا لڑکا سلیمان اور چچا گامی بس کی چھت پر تھے، انھوں نے چھلانگ لگائی۔ وہاں جلانے کے لئے لکڑیاں رکھی تھیں، وہ اٹھا کر دلیرانہ مقابلہ کرتے کرتے جان کی بازی ہار گئے۔ حملہ آوروں نے پتھر بھی پھینکے۔ ایک پتھر کا نشان اب بھی میرے ماتھے پر موجود ہے۔'' ''اس کے بعد ہم میں سے بچے کھچوں کو پھر تحصیل کے دفتر لے جایا گیا جہاں ہمیں دو روز تک بھوکا رکھا گیا۔ دو روز بعد مرزا کے باغ لے گئے۔ وہاں پہلے سے کیمپ تھا۔ چودہ دن وہیں رہے۔ کیمپ کی طرف سے راشن بالکل نہیں ملا۔ ایک روپے کے ایک پاؤ دانے ملتے تھے۔ چودہ روز تک ہم نے بڑ بیڑی اور امرود کے ڈنڈے توڑ کر کھائے اور پھر پیدل چانگ کے لئے چل پڑے جو سات کوس دور تھا۔ بارش بہت تیز ہو رہی تھی اور راستہ معلوم نہ تھا۔ کبھی ادھر کبھی ادھر مارے مارے پھرتے رہے۔ خیر چانگ کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں کے ہندو نقل مکانی کر چکے تھے، صرف مسلمان رہ گئے تھے۔ وہاں راشن ملا۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا، بس تن کے کپڑے تھے۔ وہاں بھی چودہ دن ٹھہرے۔''

''ایک روز کلانور کی ایک جیپ آئی اور کہا کہ پوٹھی کی عورتیں، بچے اور بوڑھے بیٹھ جائیں۔ شوکت اور اس کی والدہ جیپ کے ذریعے کلانور چلے گئے۔ میں اور کرموصبح کے وقت چانگ سے چلے۔ دوسرے لوگ رات کو نکل گئے۔ چانگ سے کھرک چار کوس ہے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے ہم کلانور پہنچ گئے۔ کل سو سوا سو ہوں گے۔ کچھ سینپل میں رہ گئے تھے۔ کلانوریوں نے فیصلہ کیا کہ باہر کے آنے والے پہلے ریل کے ذریعے جائیں۔ وہاں سے ہم میں سے کچھ پیدل اور کچھ بیل گاڑیوں کے ذریعے بھوانی ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ وہاں ہمیں مال گاڑی میں لاد دیا گیا۔ میں مال گاڑی کی چھت پر بیٹھا تھا۔ ہم پھر منٹگمری (ساہیوال) پہنچا دیئے گئے۔''

کاہنی کے مسلمانوں پر کیا بیتی

رہتک گوہانہ روڈ سے ذرا ہٹ کر مشرق کی طرف کاہنی ایک بڑا گاؤں ہے۔ یہ رہتک سے شمال مشرق میں چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ نہر جمن غربی کی ایک شاخ اسے سیراب کرتی

ہے۔ستمبر 1947ء میں یہاں پانچ چھ ہزار کی آبادی تھی جن میں اسی فیصد سے زیادہ مسلم راجپوت تھے۔ چار بڑی جامع مسجدیں تھیں۔ مندر کوئی نہیں تھا۔ غیر مسلموں میں ہندو راجپوتوں کے علاوہ جینی بنیے تھے۔انھوں نے ایک معمولی سی عبادت گاہ بنائی ہوئی تھی۔تجارت پر ان کی اجارہ داری تھی۔گاؤں میں آٹھ نمبردار تھے جن میں سات مسلم راجپوت تھے اور ایک ہندو راجپوت تھا۔مسلم راجپوت زراعت پیشہ تھے۔فوج اور دوسری ملازمتیں ان کے لئے پرکشش نہ تھیں۔ یہاں ایک مڈل اسکول تھا جس کے ساتھ ہوسٹل بھی تھا۔اسکول میں زیادہ تعداد غیر مسلموں کی تھی۔ یہ گاؤں چاروں طرف سے ہندو جاٹوں کے دیہات سے گھرا ہوا تھا۔اس کے شمال میں روکھی گاؤں تھا جس کے شمال میں موضع پوٹھی ہے،جس کے جری راجپوت جو ہر مردانگی دکھا کر چند روز پہلے ہجرت کر چکے تھے۔کاہنی کے مسلمان پوٹھی کے حشر سے بڑے خائف تھے۔اس کے علاوہ ان تک گنور، حسن گڑھ، کھرکھودہ وغیرہ کے لرزہ خیز واقعات پہنچ چکے تھے کہ وہاں مسلمانوں کا بچہ بچہ سفاکوں کے ہاتھوں شہید ہو چکا ہے اور خواتین کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کا اپنے پر قیاس کر کے ہوش اڑ جاتے تھے۔اہل کاہنی کے شب و روز جانکنی کے عالم میں گزر رہے تھے۔ابھی سرکاری سطح پر تبادلہ آبادی کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ پوٹھی کے جو بہادر ہجرت کر کے پاکستان جا رہے تھے،ان کے بارے میں افواہ عام تھی کہ وہ سب راستے میں ختم کر دیئے گئے ہیں۔

کاہنی والوں کی اس کسمپرسی کا ہندوؤں کو بخوبی علم تھا۔گاؤں کی آبادی میں غیر مسلموں میں ہندو راجپوت تھے اور غیر راجپوت بھی، غیر راجپوت ہندو، مسلمانوں سے بلاوجہ خائف رہتے اور گردونواح کے دیہات کے جاٹوں سے مدد کے طالب رہتے تھے۔لیکن کاہنی اور دیگر دیہات کے ہندو راجپوت، مسلم راجپوتوں کو اپنا ہم نسل سمجھتے ہوئے ان کے لئے ہمدردانہ رویہ رکھتے اور ان لوگوں کے ہم نوا نہیں تھے جو ان کی تباہی کے درپے تھے۔وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مسلم راجپوت ہجرت کر کے پاکستان جائیں اور تحصیل گوہانہ میں ان کی عددی قوت متاثر ہو۔لیکن ہندوؤں کی عسکری تنظیم راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ اور کانگریس کی طرف سے آزاد ہند فوج کے نوجوانوں کی

تربیت یافتہ کانگریس سیوادل نے گاؤں گاؤں جا کر سردار پٹیل کا یہ پیغام پہنچایا کہ مسلمانوں کو تہس نہس کر دیا جائے اور جو کسی طرح بچ نکلیں،انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔اسی لئے دورونزدیک سے ہندو جاٹوں کی دھاڑوں نے موضع کاہن کا رخ کیا۔ 8 ستمبر 1947ء کو پڑوسی گاؤں سے ہندو راجپوتوں کا پیغام آیا کہ 1857ء کے غدر میں ہم پر جاٹ حملہ آوروں کے خلاف کاہنی کے مسلم راجپوتوں نے ہماری مدد کی تھی،ہم پر ان کا یہ احسان تھا اور اس کا بدلہ ہم اب اتارنا چاہتے ہیں۔ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے محسنوں کا گاؤں تباہ ہو۔ صلاح مشورے کے لئے موضع گھلوڑ میں راجپوتوں کی پنچایت ہوگی،تم بھی اپنے بڑوں کو اس میں شرکت کے لئے بھیج دو۔

ایک مسلمان ریٹائرڈ فوجی کپتان کی سرکردگی میں کاہنی کے چند سربرآوردہ اشخاص اس پنچایت میں شریک ہوئے۔طویل بحث ومباحثہ کا ماحصل یہ تھا کہ ہندو راجپوت کاہنی کی مدد کرنا چاہتے ہیں مگر دشمن بہت قوی ہے اور اسے ہندسرکار کی پوری حمایت حاصل ہے لہٰذا مسلمانوں کے ترک وطن کی صورت میں ہندو راجپوت ہندو جاتی کے غیض وغضب کا شکار ہوں گے کہ تم نے شکار کے نکل بھاگنے میں اس کی مدد کی۔ ہمیشہ حالات ایک نہیں رہتے، کچھ عرصے بعد حالات معمول پر آجائیں گے۔اب صرف ایک راستہ ہے کہ مسلمان، راجپوت بھائیوں کے بھائی بن کر یہیں رہیں۔کاہنی والوں کو اتنا خوفزدہ کیا گیا کہ ان کا رہنما ''اچھا'' کہنے پر مجبور ہوگیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم ہندو بن کر یہیں رہیں گے۔گو یہ سب وقت گزاری کے لئے تھا مگر،

کفر میں پہلے قدم پر ہی سنبھل جائے تو خیر
ورنہ پھسلا تو پھسلتا ہی چلا جائے گا

کے مترادف ہندوؤں نے ان لوگوں کو اتنا قابو کیا کہ دو ماہ تک کاہنی کی مساجد میں اذان نہیں ہوئی اور ان میں سے چند ایک نے تو چوٹیاں بھی رکھ لیں۔ یہ بھی شنید میں آیا ہے کہ ان دو ماہ میں کاہنی کے نمازیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا مگر یہ لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرتے تھے یا مساجد میں بغیر اذان اور بغیر جماعت نماز ادا کرتے۔خیر ماہ نومبر میں تمام اہل کاہنی ترک

وطن کر کے پاکستان آ گئے اور چوٹیوں والے چوٹیاں کاٹ کر وہیں پھینک آئے۔

نسل کشی اور بیخ کنی کی کانگریسی توجیہ

پنڈت شری رام شرما ضلع رہتک کے مخلص کانگریسی رہنما تھے۔ 1918ء میں دہلی میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں رضا کار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کے رکن، ایم ایل اے پنجاب اور وزیر رہے۔ طویل عرصہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں گزارا۔ اردو، ہندی، سنسکرت اور انگریزی میں اظہار خیال کی قدرت رکھتے تھے۔ آپ نے آزادی کے بعد 1966ء میں اپنی کتاب ''ہریانہ کا اتہاس'' شائع کرائی۔ کتاب اردو میں ہے اور رہتک سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ اتہاس تاریخ کو کہتے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مختلف سیاسی تحریکوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ آزادی ہند سے کچھ پہلے اور چند ماہ بعد تک مسلمانوں پر جو بیتی اس کے یہ عینی شاہد اور ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اس کے ذمے دار بھی تھے۔

'ہریانہ کا اتہاس' سے اقتباسات

''پنجاب میں ہندو مسلم کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ مارچ 1944ء میں مشترکہ وزارت ٹوٹ گئی۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔ ہریانہ کے زمینداروں میں یونینسٹ وقت کی مسلم دوستی نے مسلمان دشمنی کی صورت اختیار کر لی۔ آریہ سماجیوں نے اس میں رہنمائی کی۔'' ''پنڈت شری رام شرما نے آزاد ہند فوج کے نوجوانوں سے تنظیم کی شروعات کی۔ روہتک میں ان کا تربیتی اسکول کھول دیا۔ ہندو مسلم فسادات جگہ جگہ سر اٹھا رہے تھے۔ ہریانہ کے قصبات کی فضا مکدر ہو گئی۔ دیہات کی امداد کے بغیر قصباتی ہندو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔'' ''رہتک میں آزاد ہند فوج کے نوجوانوں کی تنظیم کی گئی اور ان کی زیر تربیت کانگریس سیوا دل قائم کیا گیا۔''

''پنجاب کی تقسیم کے ساتھ ہی آزادی کی آمد پر مار کاٹ ہونے لگی۔ آزاد ہند فوج کے رضا کاروں سے اس موقع پر پوری امداد ملی۔ رہتک شہر میں پندرہ اگست کو جب یوم آزادی منایا گیا

تو اناج منڈی میں آزاد ہند سپاہیوں اور کانگریس کے رضا کاروں کی ایک فوج کھڑی تھی۔ مگر اس خوشی کے خیال کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ بدامنی کی مارکاٹ کا کانٹا کھٹکتا تھا۔ ملک کے آزاد ہوتے ہی امن وامان کے بجائے کچے غدر کی صورت پیدا ہو چلی۔ مغربی پاکستان سے بڑے پیمانے پر ہندو اور سکھوں کے قتل وغارت گری کی خبریں آنے لگیں۔ ہریانہ کے زمیندار بھی جو ملتان، منٹگمری اور لائل پور کے مربعوں میں رہتے تھے، جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ ان پر ریل میں بھی حملے ہوئے۔'' ''اس سے ہریانہ کے دیہات میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ پھیل گئی۔ کلانور کے مسلم دیہات کو چھوڑ کر تقریباً تمام قصباتی اور دیہاتی مقامات پر ہندو دیہاتیوں نے مسلمانوں پر ہلہ بول دیا۔ گنور، کھرکھودہ، حسن گڑھ، پوٹھی، چاندی، بینسی وغیرہ میں جو مسلمان ہاتھ لگے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ لوگوں میں فرقہ وارانہ نفرت کا جنون بھڑکا ہوا تھا۔ یہ حالت ڈیڑھ دو ماہ تک جاری رہی۔ دلی میں بھی فرقہ وارانہ تشدد کا بازار گرم تھا۔ ہریانہ کے کانگریسی رہنما اور کارکن دہلی جاتے رہے۔ سرکردہ کانگریسی کارکن، پردھان منتری جواہر لعل نہرو، ہوم منسٹر سردار پٹیل اور مولانا آزاد سے مل کر حالات بتاتے اور رہنمائی حاصل کرتے کہ کیا کریں۔ مشکل یہ تھی کہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے راستے مختلف اور مولانا آزاد بے بسی کی حالت میں تھے۔'' ''اکالیوں اور جن سنگھ والوں کا تو کیا ذکر، کانگریس کے کچھ آدمی بھی مسلمانوں کو مارنے اور نکالنے میں لگ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ سردار پٹیل بھی ایسا چاہتے ہیں۔ ایک روز پنڈت نیکی رام نے پنڈت نہرو سے کہہ دیا کہ مسلمانوں کے قافلے بغیر کسی تشدد اور رکاوٹ کے آرام سے چلے گئے ہیں۔ اس پر نہرو جی بھڑک اٹھے اور کہنے لگے 'آرام سے چلے گئے؟ یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ یوں نہیں کہا جاتا کہ زبردستی نکال دیئے گئے۔'' ''رہتک سے دہلی آنا جانا پولیس کی حفاظت ہی میں ممکن تھا۔ راستے میں سڑک کے کنارے لاشیں نظر آتیں اور دہلی میں جلتے ہوئے مکان دکھائی دے جاتے۔'' ''کھرکھودہ جو مسلمانوں کی اکثریت کا قصبہ نما گاؤں تھا، اسے چاروں طرف سے ہندو دیہاتیوں نے گھیر رکھا تھا۔ پنڈت شری رام شرما، چودھری سری چند ایم ایل اے، چند سرکردہ آدمی،

ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک فوجی ٹرک کے ساتھ موقع پر پہنچے تو بمشکل تمام ہجوم کو گاؤں پر حملہ کرنے سے روکا جا سکا۔ مگر اگلے روز جب یہ مسلمان بچ کر دہلی کی طرف جا رہے تھے تو راستے ہی میں کاٹ ڈالے گئے۔ تحصیل رہتک میں حسن گڑھ اور تحصیل سونی پت میں کنور کی مسلم آبادی کو چاروں طرف سے حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔'' ''مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی مداخلت نہ ہوتی تو ہریانہ پرانت میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہتا۔'' ''رہتک اور ہریانہ کے دیگر قصبات میں سوئم سیوک سنگھ کی سرگرمیاں جاری تھیں اور فرقہ وارانہ مارکاٹ کے دنوں میں سنگھ کے چھوکروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔''

رہتک میں مسلمانوں کی نسل کشی

میں درد و غم کا قصہ پورا نہ کہہ سکوں گا
اندازہ آپ کر لیں سن کر کہیں کہیں سے

☆ چلتی ریل گاڑیاں روک کر تمام مسلمان مسافروں کو ہلاک کر کے ان کی لاشیں باہر پھینک دی گئیں۔

☆ مسلمانوں سے بھری لاریوں اور ٹرکوں کو آگ لگا دی گئی۔ آہ و زاری کا ایک طوفان برپا ہوا اور مرد و زن بوڑھوں اور بچوں نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس دوران بلوائی، بھارت ماتا کی جے، کے نعرے لگاتے رہے۔

☆ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے دیہاتوں پر ہندوؤں نے حملے کیے۔ مردوں، عورتوں، بوڑھوں، بچوں، بیماروں اور اپاہجوں کو لاٹھیوں، گنڈاسوں، برچھیوں اور بندوقوں سے ہلاک کر کے اپنے دھرم کا بول بالا کیا۔

☆ باپ کے سامنے بیٹے کی اس طرح اعضا شکنی کی کہ اس کا کان کاٹ کر باپ سے کہا کہ ہندو بن جاؤ۔ انکار پر بیٹے کا بازو کاٹ دیا اور پھر اصرار کیا۔ انکار پر بالآخر باپ بیٹوں کو ذبح کر دیا گیا۔

☆ مہاجر کیمپ میں محصور، مغموم، مجبور اور نہتے مسلمانوں کو ان کے بھارتی محافظ چاروں طرف، خاردار تاروں کے باہر سے ان کے جگر گوشوں اور اقرباء کی خون آلود لاشیں دکھاتے رہے جنہیں

گدھ اور کتے بھنبھوڑنے میں مصروف تھے۔

☆ مسلمانوں کو سوّر کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا۔

☆ پانچ ہزار مسلمانوں کو اس وقت شہید کر دیا گیا جب وہ مجبوراً اپنا گھر بار چھوڑ کر قافلوں کی صورت میں ہجرت کر رہے تھے۔

☆ مزید بارہ تیرہ ہزار افراد کو صرف اس سنگین جرم میں شہید کیا گیا کہ وہ مسلمان تھے۔

☆ ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب مسلمانوں کو جبراً بے وطن کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جن کی بیس بیس پچیس پچیس پشتیں اس وطن کو سنوارتی رہیں۔

☆ کم از کم دو ہزار مہاجرین ہجرت کے دوران ہیضہ یا راستے کی ناقابل برداشت صعوبتیں برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے۔ (۸)

خوبصورت سرزمین

عبدالباری خان

۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا، تو میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا میں اور میری بہن بلقیس نانی اماں کے پاس رہتے تھے۔ نانی جان ہم سے بہت پیار کرتیں۔ ممانیاں اور ماموں بھی پیار کا دم بھرتے، مجھے یاد ہے ایک دن ماموں جان نے اسکول نہ جانے پر ہلکا سا طمانچہ لگا دیا، تو نانی جان نے اتنی سی بات پر انہیں بہت ڈانٹا۔ وہ روتے ہوئے کہے جارہی تھیں: "اگر ان کی ماں زندہ ہوتی تو یہ تمھارے ہاں کیا لینے آتے!" ماموں جان نے بڑھ کر مجھے سینے سے لگایا روتے روتے انکی گھگھی بندھ گئی اور اس کے بعد انہوں نے مجھے کبھی کچھ نہ کہا۔ ایک دن میں حسب معمول اپنے اونٹ پر کھیتوں سے گھر آرہا تھا کہ ایک شخص نے چلا کر کہا: "جلد گھر پہنچو، سکھ آگئے!" اگرچہ پوری بات میری سمجھ نہ آئی لیکن میں نے اونٹ کی رفتار تیز کر دی اور گھر پہنچ کر آرام سے اترنے کے بجائے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چھلانگ لگا دی۔

نانی اماں نے مجھے دیکھا، تو گھبراہٹ بھری آواز میں بولیں: "بیٹا! اونٹ کو باندھ کر جلدی اندر آجاؤ۔ سکھ آگئے!" سکھ آگئے، تو اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کون سی بات ہے؟ سکھ تو روز ہی آتے ہیں کئی ایک تو ماموں جان کے گہرے دوست ہیں ابھی ہفتہ بھر کی بات ہے کہ تار سنگھ آیا تھا، اس کی گھوڑی گم ہوگئی تھی، وہ ماموں جان سے اس کی تلاش کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ دلیپ سنگھ چھوٹے ماموں سے اکثر ملنے آتا ہے۔ میلوں میں دونوں اکھٹے جاتے ہیں دونوں کبڈی کے بہترین کھلاڑی ہیں۔ میں مسلسل ایسی ہی باتیں سوچے جارہا تھا۔ میری سمجھ نہ آرہا تھا کہ سکھ آگئے ہیں تو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے!

میں خیالات کے اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ تکیہ رحمے شاہ کی طرف سے شور اٹھا۔ پھر ماموں دوڑتے ہوئے اندر آئے اور بڑے صندوق میں سے بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی لے کر بھاگتے ہوئے چلے گئے۔ چھوٹے ماموں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ نانی جان سخت پریشان تھیں وہ بار بار تاکید کررہی

تھیں: "سب اندر کمرے میں چلے جاؤ"۔ ہم ہونق سے کھڑے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ دو آدمی چھوٹے ماموں کو سہارا دیئے ہوئے لائے۔ وہ سخت زخمی تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر ہم سب نے رونا شروع کر دیا۔ نانی جان نے فوراً اپنا ریشمی دوپٹا جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھری اور سہارا دے کر چارپائی پر لٹا دیا۔ اب چاروں طرف قیامت کا شور بپا تھا۔ معصوم بچوں کے رونے بلبلانے، عورتوں کے چیخنے چلانے اور حملہ آور سکھوں کے نعروں اور گالیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم سب خوف بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے کہ بڑے ماموں اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ تلوار تھی جس سے خون ٹپک رہا تھا اندر آتے ہی انہوں نے نانی جان سے کہا: "ہم دشمنوں کا حملہ روکنے میں ناکام ہو گئے اور اب شاید آپ لوگوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں گے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے"۔ ماموں جان کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ مسلح سکھ گھر میں داخل ہو گئے ماموں انکی طرف پلٹے اور ان سے لڑنے لگے۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا اور اسٹیشن کی طرف بھاگنے لگا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میری منزل کون سی ہے۔ خوف کی وجہ پیر خود بخود اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں دیکھا مسلمانوں اور سکھوں کی ٹولیوں میں جگہ جگہ لڑائی ہو رہی ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں خون میں لت پت لاشیں تڑپتی نہ دیکھی ہوں۔ ان مناظر سے اور بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے، لیکن میں گرتا پڑتا اسٹیشن پہنچ ہی گیا اور جیسے ہی ایک گاڑی پلیٹ فارم پر رُکی، دوڑ کر سوار ہو گیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی چلی، تو ذرا فاصلے پر بیٹھا ہوا ایک لڑکا جلدی سے میرے پاس آ گیا۔ یہ جمشید تھا۔ ہمارے ہمسائے نتھو خان کا بیٹا۔ وہ بھی میری طرح جان بچانے کے لیے گاؤں سے بھاگا تھا اور گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو کچھ ڈھارس بندھی اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اب اکھٹے ہی رہیں گے۔ جمشید مجھ سے عمر میں کچھ بڑا تھا اور اسٹیشنوں کے بارے میں بھی اسے خاصی معلومات حاصل تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ گاڑی اس اسٹیشن پر بھی رُکے گی جس کے نزدیک تمھارا گاؤں ہے ہم وہاں اتر جائیں گے میں نے کہا: "ہاں ٹھیک ہے"۔ چنانچہ جب وہ

اسٹیشن آیا، تو ہم دونوں گاڑی سے اتر کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ سکھوں نے ہمارے گاؤں پر حملہ نہ کیا ہوگا اور اگر گاؤں میں داخل بھی ہوئے ہونگے، تو خاص ہمارے محلے کا رخ کرنے کی جرات نہ کی ہوگی۔ اس محلے میں راجپوتوں کے گھر تھے اور داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس پر بہت مظبوط پھاٹک لگا ہوا تھا۔ محلے کے بڑے بوڑھے اس پھاٹک کے قریب بیٹھے گپ شپ میں مصروف رہتے تھے اور انکا ایسا رعب تھا کہ غیر آدمی اندر داخل ہونے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچا، تو اپنے کھیتوں میں جانور چرتے نظر آئے یہ جانور ہمارے ہی تھے لیکن انھیں چرانے والے عیسائی لڑکے تھے انہوں نے مجھے دیکھا تو پہچان لیا۔ اس وقت تمھارا گاؤں میں داخل ہونا بہت کٹھن ہے شام کو جب ہم جانور گاؤں میں لے جائیں گے۔ تو ہمارے ساتھ تم بھی چلے جانا۔ مجھے بھی یہ بات مناسب معلوم ہوئی انہی کے کہنے پر میں قبرستان میں چھپ گیا اور شام کے وقت جب وہ جانور لے کر گاؤں میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں لیکن ہمارا محلّہ آباد تھا۔ گھر کے لوگ مجھے دیکھ حیران رہ گئے۔ کسی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ میں تنہا سفر کر کے یہاں آیا ہوں۔ میں نے تفصیل سے ساری باتیں بتائیں، تو یقین آیا۔ دادی اماں نے مجھے اس طرح سینے سے لگا کر پیار کیا کہ گویا اب کبھی جدا نہ ہونے دیں گی۔

ابا محترم زیرِ تعمیر مکان کا سامان لینے پٹیالہ گئے تھے اور فسادات شروع ہو جانے کی وجہ سے وہیں رک گئے تھے دادی اماں نے ڈھیروں مٹھائی میرے سامنے رکھ دی اور یقین دلانے لگیں کہ خدا کے فضل سے یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ خود میرا بھی یہی خیال تھا لیکن ذرا دیر بعد ہی ہر طرف بھاگ دوڑ شروع ہو گئی بڑا پھاٹک بند کر دیا گیا اور محلے کے جوانوں نے مورچہ بنانا شروع کر دیا۔ یکا یک حالات سنگین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے محلے کے ایک مشہور شخص ریٹائرڈ تھانیدار فضل الرحمٰن کسی کام سے پولیس چوکی گئے تو ایک سکھ تھانے دار نے تھانے میں ہی انہیں شہید کر دیا۔ گاؤں تو پہلے ہی خالی ہو چکا تھا صرف یہی ایک محلّہ تھا جس کے باشندے اپنے گھروں

میں ڈٹے ہوئے تھے صبح ہوتے ہی ساتھ والے گاؤں میں جمع ہونے والے سکھوں نے ہماری آبادی پر حملہ کر دیا، لیکن قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ مہاراجہ پٹیالہ نے جو ملٹری مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے بھیجی تھی اس کے سات مسلمان سپاہیوں نے حالات کا اندازہ کر کے اپنی جانوں کی بازی لگا دی اور بھاری ہتھیاروں پر قبضہ کر کے سکھوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک دیا۔ ان سات مجاہدوں نے چاروں طرف ایسی زبردست فائرنگ کی کہ سینکڑوں کافر ہلاک ہو گئے اور ہمیں گاؤں سے بحفاظت نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ بھی قیامت کا منظر تھا۔ ہم دوڑ رہے تھے بیل گاڑی بدحواسی کے عالم میں دوڑ رہی تھیں۔ رضیہ میری تایا زاد بہن نے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیا کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ یہ وہی گڑیا تھی جو میری امی نے مرنے سے چند مہینے پہلے اُس کے لیے بنائی تھی میں نے رضیہ کا بازو پکڑ رکھا تھا اور دادی اماں نے ہم دونوں کو سینے سے لگا رکھا تھا۔

گاؤں سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ سکھوں نے ہمارے چھوٹے سے قافلے پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ جس بیل گاڑی میں ہم تھے وہ ان کے عین نشانے پر تھی۔ وہ ہمارے کافی نزدیک آ چکے تھے میں نے رضیہ کو اس گاڑی سے نیچے گھسیٹ لیا۔ جب فخر و اور بھائی صدیق کو گولی لگی۔ تھوڑے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ سے تھے میں رضیہ کو اسی طرف لیے جا رہا تھا کہ ایک سکھ نے تاک کر فائر کیا اور گولی رضیہ کی ران میں پیوست ہو گئی اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ میں نے جلدی سے اسے گود میں اٹھا لیا۔ میرے سارے کپڑے خون میں لت پت ہو گئے لیکن میں اسے محفوظ مقام پر لے ہی آیا۔ سورج بھی بے رحمی اور بے بسی کا یہ منظر دیکھ نہ سکا اور اس نے اپنا منہ شرم کے مارے آسمان کی نیلگوں چادر میں چھپا لیا۔ ساتھ بہتی ندی کا پانی اپنے انداز پر بہہ رہا تھا اس کی رفتار اور آواز پر اس قتل و غارت گری کا کوئی اثر نہ تھا۔ میں نے رضیہ کے دوپٹے کو پانی میں بھگویا اور اسے ہوش میں لانے کے لیے پانی اس کے چہرے پر نچوڑا۔ اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں لیکن یہ بجھتے ہوئے چراغ کا آخری بار بھڑکنا تھا۔ اس ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڑیا میرے سپرد کرتے ہوئے کہا: "یہ گڑیا چچی نے بنا کر دی تھی"۔ اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا اور میں بے ہوش ہو چکا تھا جب ہوش میں آیا تو بارش ہو رہی تھی۔ لوگ اپنی بیل گاڑیوں کے نیچے سر چھپائے بیٹھے تھے دادی اماں نے مجھے بھنے ہوئے چنے اور گڑ دیا جس سے میں نے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اگلے دن ہمارا یہ چھوٹا سا قافلہ اس بڑے قافلے میں شامل ہو گیا جس کی لمبائی میلوں تک پھیلی تھی اس قافلے میں زیادہ تر حصار اور ریاست پٹیالہ کے باسی تھے۔ ہر شخص نڈھال تھا باپ بیٹے کے غم میں، بہن بھائی کی جدائی میں، کتنی مائیں تھیں جن کی بوڑھی آنکھیں اپنے تمام آنسو بہا کر خشک ہو چکی تھیں۔ کتنی دولہنیں تھیں جن کے ہاتھوں کی مہندی ابھی ماند نہ پڑی تھی۔ کس کس باپ کا نام لوں جن کی کمریں اپنے نوجوان سہاروں کو کھو کر جھک گئی تھیں مگر یہ سب کچھ قابل برداشت تھا۔ ان سب نے ایک ہی امید پر کل پونجی لٹا دی تھی اب وہ پاکستان کے باشندے کہلائیں۔ ان کے ڈھڑکتے دلوں کی ایک ہی آواز تھی کہ

پاکستان آزاد اور تابندہ پاکستان!

قافلہ چلتا رہا سینکڑوں لوگ بھوک پیاس اور بیماریوں کا شکار ہوتے رہے شام کو پڑاؤ ہوتا تو کتنے جنازے سپرد خاک ہوتے پانی کی کمیابی کا یہ حال تھا کہ جہاں کہیں جوہڑ نظر آتا، جانور انسان ایک ہی ساتھ ٹوٹ پڑتے۔ وہ دن یقیناً بہت مبارک اور مقدس تھا جب یہ تباہ حال قافلہ بیکانیر کے راستے وطن عزیز کی گود میں آ گرا۔ بچے جوان اور بوڑھے سبھی سربسجود تھے جان مال اور آبرو کی قربانی دینے کے بعد بھی اپنے خدا کے شکر گزار تھے جس نے پاک سرزمین ان کا مقدر بنا دی تھی گرد میں اٹے ہوئے چہرے جگمگا اٹھے تھے۔ دلوں کی ڈھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شیر گڑھ نام کا قصبہ ہماری منزل بنا۔ ٹوٹے پھوٹے مکان میں گھاس پھونس بچھا کر دو افراد کا یہ کنبہ زندگی بسر کرنے لگا یہاں آ کر اگرچہ کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا لیکن میرا ذہن تو سینکڑوں سوالات میں گھرا ہوا تھا میری روح کے کرب و اضطراب کو دادی اماں سمجھتی تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ میں اپنے باپ اور بہن کے لیے پریشان رہتا ہوں پھر ایسا ہوا کہ ایک دن مجھے اس تشویش سے بھی نجات مل گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو دادی اماں کو جائے نماز پر بیٹھے پایا میں دوڑ

کر انکی گود میں لیٹ گیا۔ یہ میرا معمول تھا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھرتے ہوئے بولیں "بیٹے! کچھ معلوم ہے آج ہمارے گھر کون آیا ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اندر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو"۔ میں بھاگتا ہوا اندر گیا تو سامنے میرے ابو بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا تو جذبات کی شدت سے میری وہی حالت ہو گئی جیسی رضیہ کو دفنا کر ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ چھا گئی۔ لیکن ابو کھڑے مسکرا رہے تھے میں دوڑ کر ان سے لپٹ گیا اور وہ مجھے پیار کرنے لگے۔ جب میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اپنی بہن بلقیس کے بارے میں پوچھا اور آنسوؤں اور آہوں کا ایک طوفان تھا جو انکے جسم سے پھوٹ پڑا۔ انہوں نے ہچکیاں ضبط کرتے ہوئے بتایا کہ وہ شہید ہو گئی۔ اس کے سینے پر نیزے کا گہرا زخم تھا۔ ایک سکھ دوست نے اسے سنگرور کے ہسپتال میں دلیپ کور کے نام سے داخل کرا دیا تھا۔ میں پٹیالہ سے لوٹا تو اسے وہاں سے لے آیا اور پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ہنسی خوشی راہ کی صعوبتیں برداشت کرتی رہی لیکن جس دن ہم پاکستان میں داخل ہوئے، وہ سب دکھوں سے چھوٹ چکی تھی، اپنے پیارے وطن کی گود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی تھی۔

ابو بلقیس کی کہانی سناتے ہوئے رو رہے تھے سبھی کی آنکھوں میں آنسو تھے میں روتے روتے نڈھال ہو گیا۔ بار بار خیال آتا میری ایسی پاک بہن کو ظالموں نے کیوں شہید کر دیا؟ جن گھروں میں مہاجر اترتے تھے یہ ان ہندوؤں کے مکان تھے جو ترک سکونت کر کے بھارت جا چکے تھے ہم جس گھر میں رہ رہے تھے وہ تو بہت ہی خراب و خستہ تھا ہمارے پاس جمع پونجی بھی نہ تھی ایسی پریشانی میں سید ذاکر علی شاہ کی شرافت اور خدا ترسی سہارا بنی۔ ابو جان کے ساتھ انکے پہلے سے کچھ تعلقات تھے۔ ہندوستان میں اکثر ہمارے ہاں آتے تھے۔ ہمارے حالات کا علم ہوا تو انہوں نے ابو کو دودھ کی دکان کھلوا دی اور یوں انہیں روزگار کی طرف سے بے فکری ہو گئی۔ گزشتہ واقعات یاد کرتے ہوئے جب میں اس منزل پر پہنچا تو خیال آیا کہ مہاجر اور کیا مقامی، اس پاک وطن کے لیے سبھی کے دلوں میں بے پناہ محبت تھی، لیکن اللہ ہی جانے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا اور اپنے اس

پیارے پاک وطن کو سجانے سنوارنے اور اس کے جھنڈے کو اور اونچائی پر اڑوانے کی لگن کے بجائے۔ آپس ہی میں سر پھٹول کر رہے ہیں۔ میں بہت دکھ سے ایسی ہی باتیں سوچ رہا تھا کہ ایک زخمی نوجوان تیزی سے بھاگتا ہوا میری سامنے سے گزر گیا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی اور تازہ گرم خون اسکا لباس رنگین ہو گیا تھا اس زخمی نوجوان کو دیکھا، تو مجھے یوں لگا جیسے میرے پاک وطن، میری مقدس زمین زخمی ہوگئی ہے۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ویسے ہی گرم گرم آنسو جیسے ۱۹۴۷ء میں اپنی بہن کی شہادت کا حال سن کر بہے تھے۔ آج پھر آزادی کی جستجو میں جلوس نکلا تھا۔ آج پھر گولیاں چلیں تھیں اور زخم لگانے والے ہاتھ اپنوں ہی کے تھے۔ (۹)

کیا میں منحوس ہوں؟

نسیم برڑہ

کائنات میں ہر طرف شفقت کی چاندنی پھیلی تھی اور پیار کی شبنم کے موتی جگمگا رہے تھے، زندگی کا سرسبز اور شاداب چمن لہلہا رہا تھا۔ پودے جھوم رہے تھے، ٹہنیوں پر رنگ رنگ کے خوبصورت پھول مسکرا رہے تھے، خوش قسمتی کی نرم رو اور خوشیوں کی خوشگوار ہوائیں چل رہی تھی، ذرّے ذرّے میں جگمگاتے ہوئے ستاروں کی تابانی تھی، فضاؤں میں بہاروں کا مزہ تھا، جب کہ ایک نیا پھول کھلتا، جب نوزائیدہ کلی مسکراتی، جب آسمان حیات پر ایک نیا چاند جگمگاتا تو کائنات کے حسن اور دلکشی میں اور اضافہ ہو جاتا، ان دنوں وقت قدم قدم پر زندگی کا ہمنوا تھا، اور قسمت ہر ایک گام پر قدم بوس تھی، مشیت کے فیصلے انسانی خواہشات کے عین مطابق ہوتے تھے، گویا خدا بندے سے خود پوچھتا تھا، بتا تیری رضا کیا ہے، یہ اس وقت کی بات ہے، جب قسمت اور زندگی میں، گہرا ربط تھا، اور موت نے زندگی سے دست و گریباں ہونا نہیں سیکھا تھا، یوں لگتا تھا جیسے موت اور زندگی کی راہیں، الگ الگ تھیں، ان دنوں ہم سے زندگی کا سمجھوتہ تھا، کائنات کی طویل اور عریض پنہائیوں اور محدود وسعتوں میں خوشیاں رقصاں تھیں، زندگی کتنی دلکش اور حسین تھی، اتنی حسین اتنی حسین کہ بس جیے جائیں ہمیشہ ہمیشہ، لیکن خواب کتنے حسین ہوتے ہیں، کتنے دلکش، کتنے رنگین اور حقیقتیں ان میں تلخیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا، اچانک خواب ٹوٹ گئے، حقیقتوں کا بھیانک چہرہ بے نقاب ہو گیا، چاندنی ماند پڑ گئی، شبنم کے موتی بھاپ بن کے خلاؤں میں تحلیل ہو گئے، چمن جل گیا، جوہی، مولسری، یاسمین اور موتیا مرجھا گئے، گلاب شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گر گئے، امیدوں سے بھرپور گھٹائیں وہ جل تھل شامیانے دھجیاں دھجیاں بن کر خلاؤں میں معلوم نہیں کہاں کہاں بکھر گئیں تحلیل ہو گئیں، جھلس ڈالنے والی چلملاتی دھوپ چھا گئی، یہاں وہاں تا حد نظر، تا حد زیست اب کہیں سایہ نہیں وہ سایہ دار درخت گھرے گھرے سرسبز ان کو تو بادِ سموم نے کب سے جھلس ڈالا، بہاروں کو خزاؤں نے نگل لیا، صندل کے معطر جنگلوں سے

آنے والی خوشبوئیں اور زعفران کے شفق گوں کھیتوں سے آنے والی مہک کافور ہوگئی، زندگی کی دلہن نے سہاگ کا سرخ جوڑا اتار کر موت کا سیاہ لبادہ اوڑھ لیا، خوشیاں کفن پہن کر سوگئیں پھر سب کچھ مر گیا، سب کچھ سو گیا، ہر ایک چیز کھو گئی، ہر شے چپ ہوگئی، ہر جنبش ساکت و صامت ہو گئی، اب یہاں کیا ہے، کچھ بھی نہیں، زندگی کے فلک بوس ایوانوں پر وقت کے ہاتھوں نے جتنے بھی دیئے جلائے تھے موت کے سیاہ آنچل کی ایک ہی لپیٹ نے بجھا کر رکھ دیئے، اب ہر طرف تاریکی ہے، اندھیرے ہی اندھیرے گہرے اندھیرے، زندگی کے وہ ساز جن سے کبھی روح پرور نغمے نکل نکل کر فضاؤں کو مسحور کیا کرتے تھے، موت کے ایک اشارے کی بھی تاب نہ لا سکے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے بے آواز ہو کر رہ گئے، خاموش اور چپ چاپ اب تو ان میں سے کوئی نغمہ کوئی لے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی، شاہراہ حیات پر سے گزرنے والے زندگی کے وہ کارواں کیا جانیں کہاں گم ہو گئے، وہ اپنے پیچھے دل خراش یادوں کے گرد و غبار تنہائیاں روسیاہیاں اور بے کراں سناٹے چھوڑ گئے، پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلا کر دی ہوئی آوازیں بھی انھیں اس ابدی نیند سے نہیں جگا سکتیں، کوئی پکار انھیں بیدار نہیں کر سکتی، کوئی فریاد انھیں جھنجھوڑ نہیں سکتی، زندگی کی کہانی کتنی دلکش، کتنی رنگین مگر کتنی مختصر ہوتی ہے، مگر اس کی درمیانی کڑیاں تو تلاش کرنے پر بھی نہیں مل سکتیں، زندگی ہے ہی کیا، صرف دو لفظ جن کی کبھی تشریح نہیں ہو سکی، دو لمحے جو پلٹ کر نہ آ سکے، دو کنارے جو کبھی نہ مل سکے، زندگی اور موت، موت اور زندگی ایک حقیقت ایک کہانی یہ کہانی ایک لفظ سے شروع ہو کر دوسرے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے، یہ ایک غیر مسلسل کہانی نامکمل اور مختصر کہانی اور میرے سمجھ میں تو یہ بات آتی ہی نہیں کہ اس کہانی کو کہاں سے شروع کروں، اس کا آغاز کہاں سے کیا جائے، یہ افسانہ کہاں سے شروع ہوتا ہے، کس چمن سے، کس باغ سے، کس شاہراہ اور کس مقام سے، اماں کے پہلو میں چمٹ کے سونے سے کتنی پرسکون نیند آیا کرتی تھی، ان کے سینے سے لگ کر کتنی خوشیاں ملتی تھی، لیکن اماں کے ذکر پر آ کر تو کہانی ختم ہو جاتی ہے، ابتدا ہی تو یہاں سے ہوئی تھی، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کہانی کہیں ختم نہیں ہوتی، کہیں ختم نہیں ہو سکتی، یہ شروع ہونے

سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے، یہ ختم ہوئے بغیر شروع ہو جاتی ہے، آنسوؤں سے دھندلاتی ہوئی آنکھیں، شدت غم سے بھرپور دل یادوں کے زخموں سے لالہ زار بنا ہوا، ذہن آہوں کی دھند سے تیرہ و تاریک کائنات پیچھے سے بھلا نظر بھی کیا آ سکتا ہے کہ کہانی کہاں سے شروع کی جائے، کیوں کہ کہانیاں تو زندگی کے دامن میں جگہ لیتی ہیں، اور جب زندگی کا بھرپور چمن موت کے ہاتھوں اجڑ جائے، ویران ہو جائے تو کہانیاں خود بخود قبرستان کے سناٹوں میں دفن ہو جاتی ہیں، موت زندگی کے لہلہاتے ہوئے، سرسبز و شاداب چمن اجاڑ سکتی ہے، آبادیاں ویرانے بنا سکتی ہیں، سب کچھ لوٹ سکتی ہے، سب کچھ چھین سکتی ہے، لیکن ہمارے ذہنوں سے ماضی کی یادوں کو چھین لینا تو اس کے اختیار میں نہیں ہے، اور جب موسم خوشگوار ہوتا ہے، حالات انتہائی سازگار ہوتے ہیں، وقت ہمارے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتا ہے، بھلا زندگی کے بھرے میلے میں کوئی بھی موت کے متعلق سوچ سکتا ہے۔

بڑے بھائی جان چھوٹے بہن بھائی زہرہ، فاطمہ، شاہدہ، سلیم، تسنیم، منا اور ننھا بھائی چمن زیست کی معصوم کلیاں اور شگفتہ ترین پھول تھے، اتنے بہت سے بچوں کے درمیان اماں کا تصور کر کے مجھے گلاب کا وہ پودہ بے ساختہ یاد آ جاتا ہے، جس کی مختصر سی ٹہنیوں میں بے شمار پھول کھلے ہوئے اور غنچے لگے ہوئے ہوتے ہیں، جو پھولوں اور کلیوں کے بوجھ سے جھکا پڑتا ہے، جب یہ بچے اسکول جاتے تھے تو اماں آیت قرآنی پڑھ کر ان پر دم پھونکتیں، ڈیوڑھی کے دروازے کے ساتھ تک ان کے ساتھ جاتیں جب تک وہ گلی کے آخری موڑ سے نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے وہ اس وقت تک وہیں کھڑی رہتیں اور پھر خداوند کریم سے ان کی سلامتی اور زندگی کی دعائیں مانگ کر گھر واپس آتیں، تو پھر بھی دوپہر تک بچوں کی آمد کے سلسلے میں کمروں کپڑوں کی صفائی اور کھانے کے انتظام اور مشروب کے انتظام سے فارغ نہ ہوتیں، جب وہ اسکول سے واپس آتے تو بلائیں لیتی ہوئی کھل اٹھتیں، اماں نے خود تو اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی، اس کے باوجود وہ کسی بھی تعلیم یافتہ اور سگھڑ اور معیاری خاتون سے کم نہ تھیں، ابا جان ملازمت

کے سلسلے میں اکثر باہر رہتے تھے، ہمارے ہاں کبھی بہن بھائی کی لڑائی نہ ہوئی تھی، کبھی کسی چھٹی کے دن جب ابا جان اپنے دو وجیہہ لڑکوں کے ساتھ باہر نکلتے تو عزیز و اقارب اور ہمسائے رشک بھری نظروں سے دیکھتے ابا کے دوست مبارکباد دیتے، جب بھائی جان یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو دوسرے بھائی نے میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا، اسی سال امی جان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام نسیم رکھا گیا، اس کے چند دن بعد عید کے روز جب بھائی جان علی گڑھ سے آ رہے تھے تو ایک حادثے میں وہ جاں بحق ہو گئے، اس کے ایک ماہ بعد بھائی جان کے غم سے بڑے بھائی بھی ان سے جا ملے، اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان بنا، ہمارا گاؤں شہر سے دو میل جنوب کی طرف تھا، اس سے پہلے بغض کی آگ اندر ہی اندر سلگتی جا رہی تھی، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہندوؤں اور سکھوں نے رات کی تاریکی میں مسجد کے ایک حصے کو شہید کر دیا، ان کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو طیش دلایا جائے کیوں کہ ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کم تھی، اور ہندوستان بھر میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے حالات انتہائی خراب تھے، ایک دن دسمبر ۱۹۴۷ کو ہمارے گاؤں پر ہندوؤں اور سکھوں نے زبردست حملہ کیا، گاؤں کی ہندو آبادی کھلم کھلا ہمارے مقابلے پر نہ نکلی، مگر حملہ آوروں کے حملے کو ہمارے لوگوں نے پسپا کر دیا تھا، ایک ٹرین آ کر رکی اور اس میں سے ہزاروں آدمی اترے جو لاٹھیوں اور برچھیوں سے مسلح تھے، ہمارے مکان پر اس وقت تقریباً ۲۰۰ مجاہدین پہرہ دے رہے تھے اور چاروں طرف سے دشمن کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے، اتنے میں کچھ فوجی ٹرک آتے دکھائی دیئے فوجیوں نے ہمارے گھر کے سامنے پہرہ دینے والے مجاہدین کو کہا کہ تم ہتھیار ڈال دو ہم تم کو پاکستان لے جانا چاہتے ہیں، میرے والد صاحب نے کہا کہ اگر پاکستان لے جانا چاہتے ہیں، تو ہتھیار لینے سے کیا فائدہ ان میں سے ایک فوجی افسر نے کہا ہم ذمے داری لیتے ہیں تمھارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کرے گا، لیکن میرے والد صاحب نہیں مانے، اور کہا کہ ہمیں ان حالات میں کسی پر بھروسہ نہیں، فوجی نے جواب دیا کتنے عرصے تک محاصرے میں رہو گے ہم تمھیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمھیں

پاکستان کی سرحد پر پہنچانے کے لیے آئے ہیں، تمھارے ہتھیار رکھنے سے ہم بے خطر حفاظت کے ساتھ تمھیں پہنچا سکتے ہیں، اگر تمھارے پاس ہتھیار ہوئے تو تمھارے ساتھ ہمیں بھی قدم قدم پر خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا، یہاں بلوائیوں نے پورے گاؤں کو گھیرے میں لے رکھا ہے، اگر اعتبار نہیں آتا تو ہمارے بڑے افسر کے پاس آ کر تسلی کر لو چنانچہ میرے والد صاحب اور تین اور سرکردہ آدمی جانے کے لیے تجویز ہوئے، میرے والد مخالفت کرتے رہے، لیکن گاؤں کے باقی لوگ فوجیوں کی بات سے متاثر تھے، ہمارے کوٹ نما گھر میں تقریباً ۵۰۰ عورتیں اور بچے تھے، راشن بھی ختم ہو رہا تھا، میرے والد نے فوجیوں کے آگے سر جھکا دیا، وہ موت کے زخموں سے پہلے ہی چور تھے، چنانچہ چاروں کے چاروں چلے گئے، اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا، عشاء تک کوئی خبر نہ ملی، جو راشن بچ رہا تھا، وہ جلدی جلدی بچوں کو پکا کر کھلایا، اس امید پر کے اب جلد چلے جائیں گے، بڑوں کو تو نام کی بھی بھوک نہ تھی، عشاء کے بعد ان چاروں میں سے ایک آدمی واپس آیا اس نے کہا بھئی دروازے کھول دو تمام مرد ہتھیار جمع کراؤ، ہم تسلی کر آئے ہیں، باقی آدمی نماز پڑھ رہے ہیں، یہ بات سن کر اور یقین کر کے کہ واقعی ہمارا آدمی ہے، اندھیرا ہونے کی وجہ سے صرف آواز ہی پہچان سکے کئی آدمی ہچکچاہٹ کرنے لگے تو فوجیوں نے کہا دیکھو تم یہاں بھی محفوظ نہیں ہو، ہماری نیت خراب نہیں، وقت ضائع نہ کرو، آنا ہو تو جلدی آؤ ورنہ تم جانو، یہ بات سن کر تمام لوگ جمع ہو کر دروازے پر ہتھیار رکھنے لگے، اتنے میں میرے ابو کی دور سے آواز ابھری مسلمانوں خبردار ہتھیار نہ دینا، نہ باہر آنا دھوکہ۔۔۔۔ اور پھر گولیوں کی بوچھاڑ آئی، اور ان کی آواز وہیں ڈوب گئی، میری والدہ نے بھی یہ آواز سن لی تھی اب ہمارا خدا کے سوا کوئی سہارا باقی نہ رہا تھا، اتنے میں فوج کا بڑا افسر آ گیا، ہمارے اکثر آدمی ہتھیار رکھ چکے تھے، اور باقی ماندہ مرنے مارنے کو تیار تھے، اور پھر فائر شروع ہو گیا، جس کا جہاں منہ آیا بھاگ رہا تھا، تمام مردوں کو تہ تیغ کر دیا گیا، کئی بھاگ بھی گئے کئی نوجوان عورتیں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو سکیں، لیکن اکثر نہ بھاگ سکیں، شدت غم سمجھیئے یا اچانک حملے کا خیال ان کے پاؤں گھبراہٹ میں شل ہو گئے ہوں، والدہ مجھے چھاتی سے لگائے دو

بچوں کو کندھے پر اٹھائے ہوئے رات کی تاریکی میں نامعلوم منزل کی طرف چل رہیں تھیں، خدا کی قدرت دیکھئے، جب حملہ شروع ہوا تو شور وغل کی آواز میں بچوں کی چیخ وپکار نمایاں تھی لیکن جب کئی عورتیں رات کے اندھیرے میں بچوں کو سینے سے لگائے بھاگ رہیں تھیں تو بچے بھی سہمے ہوئے ایسے چمٹ رہے تھے، کہ کیا مجال کہ ان کا ہاتھ ڈھیلا ہو یا ہلکی سی آواز بھی نکلے، کم سن بچوں کو یہ سلیقہ کس نے سکھا دیا تھا، صبح ہوتے ہی ہم ایک ویران جنگل میں تھے، ہمارے ساتھ تقریبا ۲۰ عورتیں تھیں جن میں نصف تعداد نوجوان عورتوں کی تھی، کئی شادی شدہ اور کئی غیر شادی شدہ، کئی ایک کے بچے ساتھ تھے، اکثر کے بچھڑ گئے جن کی یاد میں مائیں خاموش آنسو بہا رہی تھیں، اس وقت تو کوئی مرد بھی ساتھ نہ تھا، نہ کھانے کو کچھ تھا، نہ پینے کو، ہم امی کے ساتھ ۳ زندگیاں چمٹی ہوئی تھیں، تسنیم اور منا بھوک اور پیاس سے نڈھال باقی بچے اسی گاؤں میں بچھڑ گئے تھے، غموں سے نڈھال غمگین عورتوں کا یہ قافلہ ایک گھنے جنگل میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہا تھا، ہم سب جھاڑی دار درخت کی شاخوں تلے چھپے بیٹھے تھے، اور تائید غیبی کا انتظار کر رہے تھے، شاید یہ فطرت کی طرف سے تائید تھی کہ ابھی یہ قافلہ ستانے بھی نہ پایا تھا کے آن کی آن میں ایک چھوٹی سی بدلی نمودار ہوئی، چند ثانیوں میں ہی موجۂ صرصر سے سنور کر گھٹا ٹوپ بادل کی صورت اختیار کر گئی اور پھر آسمان بے خانماؤں اور مجبوروں کے اس قافلے پر کرب ودرد کے موٹے موٹے آنسو برسانے لگا، جس سے بچوں نے سیراب ہو کر پانی پی لیا، میری والدہ نے تمام قافلے والوں کو کہا کہ دیکھو کوئی مرد نہیں ہے، جو کچھ گزر گیا ہے اس افسوس سے کچھ فائدہ نہیں اب ہمیں اپنی اور ان بچوں کی زندگی بچانی ہے، ہمیں فورا تیار ہو کر چلنا چاہیے ابھی میری والدہ یہ باتیں کر رہی تھیں کہ کچھ آوازیں مشرق کی طرف سے سنائی دیں، بارش کا زور کچھ تھم گیا تھا، تمام عورتیں جھاڑیوں میں دبک گئیں، اتنے میں دیکھا کہ ہماری بستی کے چند مرد اور عورتیں اس طرف آ رہے ہیں، ہم نے ان کو دیکھ کر آوازیں دیں، چار مرد اور سات عورتیں تھیں، بچے بھی تھے ان کے ہمراہ زہرہ، فاطمہ، شاہدہ سلیم تھے، ننھے کو زہرہ اٹھائے ہوئے تھی، میری والدہ نے انھیں دیکھا تو بے اختیار ان سے لپٹ گئیں

اور سجدے میں گر پڑی، وہ بھی سب یہاں جمع ہو گئے، مردوں نے یہ مشورہ دیا کہ رات کو سفر کرنا چاہیئے، اور دن کو آرام، چنانچہ شام تک کا انتظار کرنے لگے، اس امید پر بھی کہ شاید بچھڑے ہوئے اور آملیں، ان مردوں میں سے ایک نے، میرے والد کی شہادت کی تصدیق کی، کیونکہ وہ ان کے ہمراہ تھا، اسی افراتفری میں اپنی جان بچا کر بھاگ آیا تھا، اس نے میری ماں کو کہا کہ تمہارا شوہر دوسروں کو ہوشیار نہ کرتا تو ہم بچ کر نہ آسکتے تھے، اس کے خبردار کر دینے سے کچھ لوگ تو رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، شام ہوگئی ۴۵ بچوں بوڑھوں اور عورتوں کا ایک اور جتھہ بھی آملا یہ کچھ تو ہمارے گاؤں کے تھے اور کچھ دوسرے دیہات کے، ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی تھیں جو بانٹ کر ہر ایک کو خصوصا بچوں کو دی گئیں اور پھر کسی کے پاس کچھ نہ تھا، تمام قافلہ رات کی تاریکی میں چلنے لگا، جن کے ساتھ بچے نہیں تھے، وہ دوسرے معصوم بچوں کو کندھوں پر اٹھائے سراسیمگی کی حالت میں چل رہے تھے، ابھی ہم چار پانچ میل بمشکل چلے ہونگے، کہ سامنے ایک سڑک نظر آئی، اسی نوے افراد پر مشتمل یہ قافلہ جو غیر مسلح تھا اور صرف چار پانچ تندرست جوان اس کے ساتھ تھے، سوچ میں پڑ گیا، مرد سڑک کے درمیان میں جا کر کھڑے ہوئے، اور ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی موٹر چلنے کی آواز آئی، اور اچانک موڑ کاٹنے کے بعد تیز روشنی سڑک پر کھڑے جوانوں پر پڑی، وہ تیزی سے ایک طرف کود گئے، اور پھر تمام بچوں عورتوں میں بھگدڑ مچ گئی، نیچے جنگل تھا، ابھی ۱۰ منٹ نہ گزرے تھے کہ یہ قافلہ جہاں کھڑا تھا وہاں دو موٹریں آ کر رک گئیں، اور موٹر کی آواز بند ہو گئیں، اور پھر بلانے کی آواز آئی، دیکھو سڑک پر تم کون لوگ تھے، اگر مسلمان ہو تو چلے آؤ، ہم مسلمان فوجی ہیں، بلوچ رجمنٹ کے سنو ہم کلمہ شہادت پڑھ رہے ہیں، ہم پر یقین کرو ہرگز نہ ڈرو، تمہارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی ہونگے، قدم قدم پر تمھارے لیئے خطرہ ہے، ہم تم جیسے لوگوں کو ڈھونڈ رہے ہیں، تمھاری مدد کرنا چاہتے ہیں، خدا کی قدرت کہ یہ آوازیں سن کر بچے رونے لگے ان آوازوں کے سننے سے تمام قافلے والے ٹھہر تو گئے تھے لیکن اس قافلے کا لیڈر تو کوئی نہ تھا، بچوں کے رونے کی آوازیں انھوں نے سن لی تھیں، ان

میں دو نیچے اتر آئے، ہماری طرف آتے ہوئے کہا، دیکھو ہم تمہارے پاس آ رہے ہیں، ہمارے ہتھیار ہمارے ٹرکوں میں ہیں، ماؤں بہنوں بچوں خدا کے لئے یقین کرو یہ دلاسے والی باتیں سن کر کئی عورتیں رونے لگیں، میری والدہ سے نہ رہا گیا، کہا بھائیو! اگر تم ہمارے لیے تائید غیبی بن کر آئے ہو، تو ہمارے ساتھ کوئی مرد نہیں ہے، اگر ۳، ۴ مرد ہیں تو وہ بھی گھبرائے ہوئے، اگر خدا اور رسول ﷺ کی قسم کھائی ہے تو ہم خدا اور رسول کو حاظر ناظر جان کر تم پر بھروسہ رکھتے ہیں، میری والدہ نے تمام قافلے والوں کو کہا کہ آؤ اگر یہ مسلمان نہیں ہیں تو خدا اور رسول ﷺ کی قسم کھائی ہے، اور قسمت میں ایسی موت لکھی ہے، تو ماشااللہ اگر یہ مسلمان ہیں تو ہم انھیں سلام کرتی ہیں، یہ ہمارے لیے رحمت کے فرشتے ہیں اتنے میں وہ فوجی بھی آ گئے، ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں، ان کی روشنی میں وہ اپنے ٹرکوں پر لے آئے، دو ٹرکوں میں دو دو جوان تھے اور ایک ایک ڈرائیور یہ تمام کے تمام سپاہی تھے، انھوں نے ہماری روداد سنی انھوں نے ضد کی کہ اس بستی میں ہم پھر جائیں شاید کوئی اور مسلمان مل جائیں ان کے پاس فالتو ہتھیار اور کارتوس بھی تھے جو انھوں نے ہمارے جوانوں کو دیئے ان سپاہیوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا، تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک سپاہی نے جس کے کندھوں پر تین اسٹار تھے قافلے والوں کو بتایا کہ ان شااللہ تمام قافلوں کو صحیح سلامت پاکستان پہنچا دیا جائے گا، فوجیوں کے پاس کچھ بسکٹ تھے، جوانھوں نے بچوں میں تقسیم کیے اور سب پھر نعرہ تکبیر بلند کیا، یہ نعرہ تکبیر جگہ جگہ بلند ہوتا گیا، اس سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ کوئی اور مسلمان سنے تو بے خطر آ جائے، راستے میں ۳۰، ۴۰ کسی اور گاؤں کے تباہ حال بچے اور عورتیں اور چند جوان سوار ہوئے، جب یہ قافلہ امرتسر پہنچا تو پاکستان جانے والی سڑک کا گیٹ بند تھا، مسلح پولیس اور فوج کا پہرہ تھا، ہمارے ٹرک بھی آ کر ٹھہر گئے، ہمارے کیپٹن سپاہی نے، سنتری کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا اس نے فوراً دروازہ کھول دیا جوں ہی دروازہ کھلا ہمارے ٹرک تیزی سے گزر گئے، امرتسر کے آگے چند پولیس والے مسلمان بھی سوار ہو گئے اور مزید کسی خطرے کے یہ قافلہ واہگہ کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو گیا، ہم لٹ لٹا کر پاکستان پہنچ چکے تھے، ہم ایک

کیمپ میں تھے، اس دوران سلیم کو سرخ بادہ نکلا اور جانبر نہ ہو سکا بچے اکٹھے ہو کر کنوئیں میں پتھر پھینک رہے تھے، اچانک دھم کی آواز آئی بچے سہم گئے، منا کنوئیں میں ڈوب کر ہم سے ہمیشہ کے لیئے بچھڑ گیا، لوگ کہتے ہیں یہ سب کچھ اس منحوس بچی کے طفیل ہے، امی کہتی یہ تو معصوم ہے اس کا کیا قصور ہے، پھر اچانک تسنیم بس کے نیچے آ کر کچلا گیا اس کی نعش کیمپ لائی گئی، اب تو اماں کے آنسو خشک ہو گئے تھے، زندگی کی شاہراہ پر وقت نے کتنے چراغ جلائے تھے جو مشیت نے ایک ایک کر کے بجھا کر ہر طرف اندھیرے پھیلا دیئے تھے، اتھاہ اور بے پناہ اندھیرے قسمت کی روشن اور تابناک شاہراہیں بدنصیبی کے مہیب غاروں میں کہیں بھٹک کر گم ہو گئیں، امیدوں اور آرزوؤں کے قافلے وقت کی پر پیچ گھاٹیوں میں کھو گئے، زہرہ کی منگنی طے پا گئی، سہیلیاں اکٹھی ہوئیں سرگوشیاں ہوئیں پروگرام بنایا گیا، کھانے کے لیے پھل منگوائے گئے، سہلیاں چلی گئیں، رات کو دلہن کو کھانسی اٹھی خناق ہوا اور ماں نے اپنی پروسین بیٹی کی ڈولی قبرستان بجھوائی، اور یہ کہہ کر کہ زہرہ خدا کی امانت تھی واپس لے لی۔ آنسو بہائے خاموش ہو گئیں، فاطمہ کو سرسام نے آدبوچا اور شاہدہ محرقہ بخار کا شکار ہوئی اور یوں آئے ہوئے مہمان باری باری رخصت ہو گئے، ان کی موت پاک وطن میں لکھی تھی، ماں نے اپنے گھر کو ایک سرائے سمجھ کر آنے والوں کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھا تھا، کیونکہ ہم کیمپ سے باغبانپورہ لاہور کے ایک چھوٹے سے مکان میں آ گئے تھے، سب بچے کیمپ میں سے ہی اپنے باپ سے جا ملے، اب نئے گھر میں آئے تو ننھا بھی ابو جان سے جا ملا، اور اس کے ایک سال بعد امی بھی ایک کمسن بچی کو اکیلی اور بے سہارا چھوڑ کر اپنے بچھڑے ہوؤں کو ملنے چلی گئی، شاید یہ کمسن بچی ڈائن تھی، منحوس تھی، ۳ بہنوں اور سات بھائیوں کی زندگی کے چراغ اس نے گل کر کے رکھ دیئے تھے، امی اور ابا بھی ناراض ہو کر چلے گئے، کیا جانیں خوشی کی یہ گھڑیاں اتنی مختصر کیوں ہوتی ہیں۔ (۱۰)

چھتیس برس اُدھر کی بات

مظفر بخاری

پاکستان کی منزل کو پانے کے لیے ہمیں کن حالات سے گزرنا پڑا اور کیا قربانیاں دینا پڑیں نئی نسل اسکا ٹھیک سے اندازہ نہیں کرسکتی۔ قیام پاکستان کے وقت میری عمر صرف سات سال تھی لیکن اس کم عمری میں میں نے جو کچھ دیکھا، ذہن کے پردے پر انمٹ نقش بن چکا ہے۔ میری پیدائش ضلع گورداسپور کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی جب میں نے ہوش سنبھالا تحریک پاکستان آخری مرحلہ میں داخل ہوچکی تھی اور مسلمانان ہند کا جوش وخروش قابل دید تھا۔ پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم۔ زندہ باد کے نعرے فضا میں گونجتے رہتے۔ میرے والد مرحوم کی بیٹھک گاؤں میں ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ والد صاحب پختہ سیاسی شعور کے مالک تھے۔ چنانچہ گاؤں کے مسلمان سیاسی حالات جاننے اور اظہار خیال کے لیے انہی کے پاس آتے۔ اس کے علاوہ یہ بیٹھک ایک نوع کی لائبریری بھی تھی کیونکہ والد صاحب ان دنوں چھپنے والا ہر اخبار خریدا کرتے۔ پرتاب، ملاپ، ویر بھارت، زمیندار اور نوائے وقت مستقل آتے تھے۔ میں اپنی کم عمری کے باعث صورت حال کی مناسب تفہیم سے قاصر تھا لیکن مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ نہایت اہم واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ والد صاحب کے گرد اکثر لوگ بیٹھے باتیں کرتے تو میں انکی گود میں گھسا ہوا، باری باری سب کے چہرے دیکھتا جن پر کبھی فکرمندی کی لکیریں نمایاں ہوجاتیں اور کبھی امید کی روشنی پھیل جاتی۔ شاہ جی! سنا ہے گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کی سازش ہورہی ہے؟

نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میرے والد پرزور لہجے میں کہتے، لیکن دوسرے لمحے وہ دھیمی، لیکن پرسکون آواز میں فرماتے: ویسے ہندو اور انگریز سے کوئی بعید بھی نہیں۔ پھر کیا ہوگا شاہ صاحب! وہ پوچھتے۔ ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے۔ ویسے ہمیں ہر قربانی کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ اور پھر ایک روز گاؤں کے سرکردہ سکھوں کا وفد والد صاحب کی بیٹھک میں آیا۔ ایک سردار میرے نانا ابا سے کہہ رہا تھا: شاہ صاحب حالات بہت خراب ہوچکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم بھی آپ کی مدد نہ کرسکیں

آپ کو پاکستان چلے جانا چاہیے۔

میرے خاندان کے سارے مرد دم بخود تھے۔ تمھارا بہت بہت شکریہ سرائن سنگھ! جب ہمیں مدد کی ضرورت ہوتی ہے، ہم صرف اللہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگر تم بھی ہماری مدد کرو گے تو یہ اللہ ہی کی طرف سے ہوگی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی کی رضا سے ہوتا ہے۔ نانا ابا نے کہا۔ یہ سن کر ایک اور سکھ بولا: شاہ جی! ہم نے ہمیشہ آپکو اپنے گورو کا مرتبہ دیا ہے اور آپ نے ہمیں اپنے بچوں کی طرح سمجھا ہے۔ ہم یہ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ آپکو یہ گاؤں چھوڑنے کے لیے کہا جائے لیکن حالات کچھ اتنی تیزی سے بگڑ رہے ہیں کہ آپکی زندگیاں خطرے میں پڑسکتی ہیں۔ یہ خطرہ ہمیں کس سے ہے؟ تم سے؟ میرے نانا گرجے۔ کیا تم مجھے دھمکی دینے آئے ہو؟ یہ سن کر وفد کا قائد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم سے کیسا خطرہ؟ سرکار! ہم سے کیسا خطرہ؟ ہم تو آپکے بچے ہیں۔ مائی باپ ہم تو یہ کہنے آئے تھے کہ دوسرے علاقوں سے بڑی خوفناک خبریں آرہی ہیں۔ سکھوں کے بپھرے ہوئے جتھوں نے لوٹ مار اور قتل وغارت کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ ہمارا گاؤں اب تک بچا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہمارے گاؤں پر بھی حملہ ہو، آپ عزت بچا کر چلے جائیں۔ پاکستان کی سرحد تک ہم آپکے ساتھ جائیں گے۔ اگر کسی جتھے نے حملہ کیا تو آپ سے پہلے ہم لڑیں مریں گے۔ یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بیٹھو دلیپ سنگھ! بیٹھو۔ میرے والد نے کہا اور پھر میرے نانا سے مخاطب ہوئے۔ چاچا جی! دلیپ سنگھ ٹھیک ہی کہتا ہے اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کامیاب ہوچکی ہے اب گورداسپور پاکستان کا حصہ نہیں۔ میرے والد کے سیاسی شعور پر سبھی اعتماد کرتے تھے۔ اچھا بھائیو! شکریہ! ہم کل صبح یہ گاؤں چھوڑ دیں گے۔ نانا ابا نے ایسے لہجے میں کہا گویا کوئی بات ہی نہ ہو لیکن سکھوں کے رخصت ہوجانے کے بعد میں نے دیکھا نانا ابا کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ہمارے خاندان کے تمام گھرانے ایک ہی گلی میں تھے نانا ابا نے سب گھروں کو پیغام بھجوادیا کہ صرف ضروری سامان باندھ لیں اور کل صبح رخصت ہونے کے لیے تیار رہو جائیں ہر گھر میں سامان بندھنے لگا۔ میں نے بھی اپنے بستے میں کتابیں، کاپیاں، قلم، چند کوڑیاں

ایک لٹوا ور شیشے کی چند گولیاں رکھ لیں۔ میرا ضروری سامان یہی تھا۔

اگلے روز صبح ہی صبح ہمارے گاؤں کے سکھ کرپانوں اور بلموں سے مسلح ہو کر ہماری گلی کے آگے آ کھڑے ہوئے انکے ساتھ خالی تین بیل گاڑیاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں تینوں بیل گاڑیاں ہمارے خاندان کے بچوں، عورتوں اور سامان کی گٹھڑیوں سے بھر گئیں۔ سب مرد نانا ابا کی قیادت میں پیدل چل پڑے۔ سکھوں نے چاروں طرف سے ہمیں حفاظتی حصار میں لے لیا۔ دو تین سکھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں ایک بیل گاڑی میں اپنی ماں کی گود میں بیٹھا تھا۔ وہ بار بار ویران آنکھوں سے گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب گاؤں نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایک آنسو میرے گال پر بھی پڑا جس کی جلن میں آج بھی محسوس کرتا ہوں! ہمارا قافلہ شکر گڑھ کی جانب دریائے راوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہاں سے کشتیوں کے ذریعے دریا پار کرنے کا ارادہ تھا۔ عورتیں اور بچے سہمے ہوئے تھے، مرد خاموشی سے سر جھکائے چل رہے تھے۔ ایک نئی منزل، ایک نئے وطن پاکستان کی طرف۔ ہمارے گاؤں سے دریا آٹھ دس میل کے فاصلے پر تھا اور یہ آٹھ دس میل کا سفر ہماری زندگی کے سفر کو مختصر کر سکتا تھا راستے میں کئی گاؤں پڑتے تھے۔ اگر ہمارے ساتھ بیل گاڑیاں نہ ہوتیں تو ہم ان سے بچ بچا کر کھیتوں کر راستے دریا تک پہنچنے کی کوشش کرتے لیکن مجبوراً ہمیں انہی دیہات میں سے گزرنا تھا۔ ہمارے گاؤں سے آگے موضع بدیچھ تھا۔ ہم اس میں سے گزر رہے تھے کہ اچانک پندرہ بیس سکھوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہمارے محافظ سکھوں نے بڑھ کر انہیں روکا۔ تھوڑی دیر ان میں تکرار ہوتی رہی ہم قدر فاصلے پر کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے چند منٹ کی بحث وتمحیص کے بعد ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی اتنے میں بادل امنڈ آئے اور چند لمحوں بعد تیز بارش شروع ہو گئی۔ تاہم ہمارا سفر جاری رہا۔ تین چار میل آگے جا کر پھر ہمیں ایک جتھے نے گھیر لیا۔ ہمارے محافظ جو تعداد میں بیس پچیس کے قریب تھے۔ پھر ہمارے آڑے آئے۔ اس جتھے کے لوگ چونکہ ہمارے خاندان کو بالکل نہ جانتے تھے۔ انکا رویہ خاصا جارحانہ تھا وہ بار بار آگے بڑھتے لیکن ہمارے گاؤں کے سکھ راستے کی دیوار

بن گئے۔ ان میں شدید تلخ کلامی ہو رہی تھی۔ ایک موقع پر دلیپ سنگھ نے تلوار کھینچ لی۔ دوسرں نے بھی تلواروں کے دستے پر ہاتھ رکھ لیے۔ قریب تھا ان میں خونریز لڑائی شروع ہو جاتی کہ نانا ابا میرے والد اور ماموں کو ساتھ لیے آگے بڑھے اور سکھوں کے دونوں گروہوں کے درمیان جا کھڑے ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے اپنے گاؤں کے سکھوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ وہ بادل نخواستہ پیچھے ہٹے تو انہوں نے جتھے کے ارکان سے مخاطب ہو کر کہا: دیکھو سردارو! میں نہیں چاہتا کہ ہماری وجہ سے خالصے خالصوں کا خون بہائیں۔ اگر ہمارے مقدر میں تمھارے ہاتھوں موت لکھی ہے تو بسم اللہ کرو، کوئی تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹا سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو گا! ہمارے گاؤں کا سوہن سنگھ میان سے تلوار نکالتے ہوئے غضب ناک ہو کر آگے بڑھا۔ پیچھے ہٹ جاؤ سوہن سنگھ! نانا ابا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ سوہن سنگھ وہیں رک گیا، جتھے کے ارکان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ باتیں کیں اور خاموشی سے سر جھکائے رخصت ہو گئے ہم سب کے زرد چہروں پر سرخی دوڑ گئی قافلہ پھر سے اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ امی ہم کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے پوچھا۔ پاکستان بیٹا! اس نے ہولے سے جواب دیا۔ پاکستان میں کس کے پاس؟ وہاں کون رہتا ہے ہمارا؟ چپ ہو جاؤ بیٹے چپ ہو جاؤ۔ وہ آہ بھرتے ہوئے بولی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں پھر بولا: ہماری مرغیوں کو دانا کون ڈالے گا امی ہم واپس کب آئینگے؟ اس کے پاس ان معصوم سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو گئی۔ اچانک مجھے کھیتوں میں ایک شخص اوندھا لیٹا دکھائی دیا۔ وہ کون ہے؟ امی! اسے کیا ہوا؟ اسکا جواب میری پھوپھی زاد بہن رضیہ نے دیا جو عمر میں مجھ سے خاصی بڑی تھی۔ یہ لاش ہے۔ لاش کیا؟ مرا ہوا آدمی اسے کسی نے مار ڈالا ہے۔ کیوں! کس نے مارا ہے اسے؟ میں نے سہم کر پوچھا۔ اسکا جواب رضیہ کے پاس بھی نہ تھا۔ اور پھر تو ہر چند قدم پر لاشیں دکھائی دینے لگیں۔ مارے خوف کے میری رگوں میں لہو جمنے لگا۔ آک کے کچے سے کوٹھے کے باہر ایک نوجوان آدمی کی لاش پڑی تھی۔ ساتھ ہی چار پانچ سال کا ایک بچہ مردہ پڑا تھا۔ ان پر چند جانور منڈلا رہے تھے۔ ذرا آگے جانے پر ایک انتہائی ضعیف بڑھیا

کی لاش دکھائی دی۔اس کے پہلو میں اسکی لاٹھی اور مٹی کا پیالہ پڑا تھا۔ہائے !اس بیچاری کو کس ظالم نے مار ڈالا؟ میری خالہ بولی۔اسی طرف سفر طے ہو رہا تھا۔فضا میں متعفن لاشوں کی بدبو رچی ہوئی تھی سورج ڈھلنا شروع ہوا تو ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے وہاں ایک خدائی جمع تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گورداسپور کا سارا ضلع وہیں امنڈ آیا ہے ہم نے بھی ایک طرف ڈیرے ڈال دیے۔نانا ابا نے محافظ سکھوں کا شکریہ ادا کیا اور رخصت دے دی۔انہیں جانے میں تامل تھا لیکن نانا ابا کہنے لگے: جاؤ،اور اپنے بھائیوں کو بے گناہ مخلوق کا خون بہانے سے روکو۔یہ نیکی تمھاری نجات کا باعث بن سکتی ہے۔انکے رخصت ہونے کا منظر بہت رقت انگیز تھا۔بچپن کے دوست جو ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے ،جوان ہوئے تھے ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہونے سے پہلے گلے مل رہے تھے۔ہر شخص کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔پہلے سے پہنچے ہوئے لوگ حیرت سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔انسانی فطرت کا یہ رخ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔انہیں رخصت کرنے کے بعد ہمارے بزرگوں نے دریا کا جائزہ لیا۔کل پانچ یا چھ کشتیاں تھیں اور ان کے ذریعے دریا پار کرنے والے لاکھوں۔ملاح کشتی کنارے کے پاس نہ لاتے۔دس پندرہ گز کنارے سے دور کھڑی کرتے۔خود تیر کر کنارے پر آتے اور لوگوں کو کندھوں پر بیٹھا کر کشتی میں سوار کراتے۔وہ نیکی کا یہ کام بلا معاوضہ نہیں کر رہے تھے،اور معاوضہ بھی اتنا کہ کبھی انکے وہم وگمان میں بھی نہ آیا ہو گا۔کنارے پر کھڑے لوگ ہاتھوں میں نوٹوں کے بنڈل اور زیورات کی تھیلیاں پکڑے انہیں دور سے دکھاتے۔انہیں جدھر زیادہ نوٹ اور زیورات نظر آتے وہ ادھر کا رخ کرتے۔یہ صورت حال دیکھ کر ہمارے نانا نے خاندان کی تمام عورتوں کو حکم دیا کہ تمام زیورات ایک ٹوپی میں باندھ لیں۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اسی نوے تولے سونا اور اس سے کہیں زیادہ چاندی کی پوٹلی اٹھا کر نانا نے ملاحوں کو دیکھائی،ایک کشتی تیزی سے ہماری طرف بڑھی۔نانا کے حکم کے مطابق تمام عورتیں اور بچے کشتی میں سوار کرا دیئے گئے،ملاحوں نے زیورات قابو میں کیے اور ہمیں لے کر چل پڑے کشتی پر اس قدر بوجھ تھا کہ وہ پانی کی سطح سے صرف دو انچ اوپر تھی۔مجھے ابھی تک یاد ہے کہ میں دریا کے

پانی میں ہاتھ ڈال کر چھینٹے اڑانے لگا تو میری والدہ نے مجھے منع کر دیا۔ہماری کشتی دریا کے نصف سے ذرا آگے گئی ہو گی کہ کنارے پر کھڑی مخلوق خدا پر قیامت نازل ہو گئی کئی سو مسلح سکھوں نے یک لخت حملہ کر دیا اور انہیں تلواروں سے کاٹنے اور بلوں میں پرونے لگے۔وحشت اور درندگی کا یہ عالم تھا انہوں نے بوڑھوں کو معاف کیا نہ بچوں کو نہ عورتوں کو۔موت کا فرشتہ انتہائی تیزی سے سر گرم عمل تھا۔زخمی ہونے والوں کی چیخ وپکار کان کے پردے پھاڑ ے دے رہی تھی ۔نوجوان،عورتوں نے بچوں سمیت دریا میں چھلانگ لگا دیں دریا ان دنوں طغیانی پر تھا ہزاروں عورتیں اور بچے دریا کی تیز لہروں میں بہہ گئے بہت سے نوجوان مرد البتہ تیر کر دریا پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ان لوگوں میں ہمارے خاندان کے مرد بھی شامل تھے۔خوش قسمتی سے ہمارے تمام افراد زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے حتی کہ نانا جی بھی معمر ہونے کہ باوجود پاکستان پہنچ گئے۔تھوڑی دیر چلنے کہ بعد ہمارا قافلہ شکر گڑھ کے سول ہسپتال پہنچا۔تیر کر آنے والوں کی زبانی پتہ چلا کہ ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب افراد شہید ہوئے یا ڈوب کے مر گئے۔

انسانی تاریخ کا یہ بہت بڑا سانحہ اپنے پہلو میں عبرت کے ہزار سامان رکھتا ہے پاکستان انگریز کی سازشوں کے بجائے شہیدوں کے خون سے وجود میں آیا تھا اور شہیدوں کا خون ہم سے یقیناً سوال کرتا ہے کہ جن اعلیٰ،اخلاقی اور دینی اقدار کے لیے زمین سرخ ہوئی تھی انکا اس مقدس سرزمین میں حال کیا ہے۔کیا ہم قیامت کے روز شہیدوں کا سامنا کر سکیں گے؟(۱۱)

آزادی کے سائے میں

ڈاکٹر عبادت بریلوی

۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندو کالج کے پروفیسر اور میرے دیرینہ دوست راجندر رشید امجھ سے ملنے اور حال واحوال معلوم کرنے عربک کالج میں آئے اور دیر تک اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتے رہے اور مشورے دیتے رہے، ریڈیو ہر وقت کھلا رہتا تھا پانچ بجے کے قریب ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ دلی کی فضا خراب ہے۔ اس لیے شہر میں ۲۷ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ دلی کی انتظامیہ اس وقت مفلوج ہو چکی تھی۔ حکومت نے صاحبزادہ خورشید احمد خاں کو دلی کا چیف کمشنر بنا رکھا تھا۔ لیکن وہ بہت کمزور آدمی ثابت ہوئے۔ انتظامیہ کی قوت کا سرچشمہ ڈپٹی کمشنر رندھاوا تھا۔ اسکی شہرت پہلے بہت اچھی تھی اور تعصب اس میں نام کو نہ تھا، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ بالکل بدل گیا اور اس نے شر پسندوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ اس کے بعض عزیز مغربی پنجاب کے ہنگاموں میں مارے گئے تھے۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ وہ اسکا بدلہ دلی کے مسلمانوں سے لینے لگا۔ اس تعصب نے دلی کی سرزمین پر خون کے دریا بہا دیئے۔ اب دلی میں مسلمانوں کا باقاعدہ قتل عام شروع ہو گیا تھا حملہ آور ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ کے باوردی سپاہی اور اکالی دل کے جنگ جو سکھ تھے۔ وہ مختلف محلوں میں خوف و ہراس پھیلا کر مسلمانوں کو گھروں سے باہر نکالنے اور انہیں موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ ان لوگوں نے ایک منصوبے کے تحت دلی کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے مقتل بنا دیا گیا تھا جو مسلمان بھی وہاں گیا۔ اسے قتل کر دیا گیا۔ ریل گاڑیوں میں لاشوں کے انبار ہوتے اور خون ہی خون نظر آتا ہندو انتہا پسندوں نے پولیس اور فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے محلوں پر حملوں کا منصوبہ بھی بنایا تھا جن محلوں میں مسلمان کم تھے وہ بے چارے پہلے ہی اپنے گھروں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات کی تلاش میں چلے گئے تھے، لیکن جہاں وہ اکثریت میں تھے۔ وہاں ان پر رات گئے حملے کا سلسلہ جاری رہتا۔ مسلمان اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے۔ ان پر ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ اس طرح نہتے مسلمان قتل

ہوتے رہے۔ صبح اخبار میں معمولی سی خبر شائع ہو جاتی تھی کہ شہر میں صرف ایک واردات ہوئی اور اس کے ذمہ دار مسلمان تھے۔

سب سے پہلے قرول باغ میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری شروع کی۔ یہ علاقہ شہر کے باہر تھا۔ مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی تھی۔ مسلمانوں کے گھروں پر نشان لگا دیئے گئے تھے۔ ان مکانوں پر حملے ہوئے۔ سامان لوٹ لیا گیا اور بے شمار مسلمان یہاں قتل ہوئے۔ قرول باغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم تھا جس کے ساتھ بہت بڑا مکتبہ اور لائبریری تھی۔ جامعہ کے لوگ بیشتر قوم پرست تھے اور کانگریس کا دم بھرتے تھے، لیکن انہیں بھی نہیں بخشا گیا اور لائبریری کو آگ لگا دی گئی۔ ایک اسکول میں امتحان ہو رہا تھا جہاں مسلمان بچوں کو ایک کمرے میں جمع کر کے قتل کر دیا گیا۔ پھر لودھی کالونی کی باری آ گئی مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی اور ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اپنے مکانوں میں اسلحہ جمع کر رکھا ہے۔ اس علاقے میں زیادہ تر سرکاری ملازمین رہتے تھے۔ انکے پاس اسلحہ کہاں سے آتا۔ کسی کے گھر سے ترکاری کاٹنے والی چھری، کھرپا یا پھاوڑا برآمد ہوا تو ان چیزوں کو اسلحہ تصور کیا گیا اور اسی بنا پر پولیس کے سپاہی گولیاں چلا رہے اور سکھ کرپانیں اور تلواریں لے کر آ گئے۔ انہوں نے نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور آبادی کے بیشتر لوگ مقابلے میں ناکام آئے۔ اگلے روز خبر آئی کہ سبزی منڈی میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ یہاں مسلمان اچھے دولت مند تھے اور انکے پاس اسلحہ بھی تھا اسی لیے جب ان پر حملے شروع ہوئے تو انہوں نے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ انہوں نے مورچے بنا لیے اور ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جب انکے مقابل فوج آ گئی تو انکے حوصلے پست ہو گئے وہ پسپا ہو گئے اور اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ یہاں بھی مسلمانوں کا بری طرح قتل عام ہوا اور عورتوں کی زبردست بے حرمتی ہوئی۔ دو تین دنوں کی اس معرکہ آرائی میں اس آبادی میں مسلمانوں کا نام بھی باقی نہ رہا۔ شرنارتھی انکے مکانوں میں داخل ہو گئے مال و اسباب پر قبضہ کیا اور اپنی آبادکاری کی اسکیم پوری کر ڈالی۔

اب پہاڑ گنج کی پہاڑی کی بھاری بھرکم آبادی میں قتل و غارت شروع ہوئی۔ یہاں بھی

خاصے متمول مسلمان رہتے تھے انہوں نے بڑی دلیری اور جی داری سے مقامی ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ کیا لیکن جب یہاں بھی پولیس اور فوج جدید اسلحے کے ساتھ آ گئی تو پہاڑ گنج کی سڑکوں پر بھی مسلمانوں کا خون بہنے لگا۔ بے شمار مسلمان یہاں مارے گئے۔ عورتیں بڑی تعداد میں اغواء ہوگئیں سینکڑوں خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔ ہندو غنڈوں نے گھروں کا سامان لوٹ لیا، بھگدڑ مچ گئی۔ جو گھر سے باہر نکل کر بھاگا وہ راستے میں ہی مارا گیا۔ کسی کے ہاتھ کاٹ کر اسے تڑپتا چھوڑ دیا گیا، کسی کے پاؤں کاٹ دیئے گئے، کسی کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ لاشیں کئی دن تک سڑتی رہیں۔ ہوا کے ساتھ انکی بو اینگلو عربک کالج تک آ رہی تھی اور ہم لوگ یہاں دبکے ہوئے اپنی موت کا انتظار کرتے رہے۔ دلی کے دوسرے محلوں میں بھی کم وبیش یہی حال ہوا۔ کئی دن تک جگہ جگہ حملے ہوتے رہے اور مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا جو تقریباً تین دن تک جاری رہا۔ مسلمانوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے گئے جو چشم فلک نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بلاشبہ انسانی تاریخ میں ایسی سفاکی کا مظاہرہ شاید ہی ہوا ہو۔ دلی تباہ ہوگئی اور اس شہر بے مثال کے اندر اور باہر قلزم خوں موج زن نظر آنے لگا۔ ہمارا کالج ابھی تک ظالموں کی دست برد سے محفوظ تھا لیکن اس کے آس پاس خون کے سمندر موج زن تھے۔ ہر وقت گولیوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں محسوس ہوتا تھا کہ ایک دو دن میں یہ گولیاں ہمارے سینوں پر چلیں گی۔ ان دنوں الوکالج کے اونچے اونچے درختوں پر رات بھر بولا کرتا تھا اور اسکی تیز آواز ہمارے سینوں میں کٹار بن کر اترتی تھی۔

اس پریشان فضا میں کئی دن شدید کرب کے عالم میں گزارے۔ آخر کار ستمبر کو جب کالج کے اردگرد بھی گولیوں کی آوازیں آنے لگیں تو ہم لوگوں نے انخلا کا فیصلہ کر لیا اور پاکستان ہائی کمیشن سے امداد کے لیے رابطہ قائم کیا۔ اس زمانے میں سید زاہد حسین پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ انہوں نے بڑا کرم فرمایا اور تین بڑی گاڑیاں ہمیں ہائی کمیشن لے جانے کے لیے بھجوادیں۔ جبکہ دو گاڑیاں ہمارے پاس پہلے سے ہی موجود تھیں۔ ہم لوگوں نے ایک ایک سوٹ کیس اپنے ساتھ لیا اور باقی چیزیں وہیں چھوڑ دیں۔ خیال تھا کہ چند روز بعد حالات معمول پر

آجائیں گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ دلی میں قیامت برپا تھی اور ہندو فرقہ پرستوں کا منصوبہ تھا کہ وہ کالج پر قبضہ کر لیں گے۔ اسکی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ سامان جلا دیں گے اور کالج شرنارتھیوں کا کیمپ بن جائے گا پھر لاہور کے کسی ہندو کالج کو الاٹ کر دیا جائے گا۔ ہم یہ سوچ کر سخت پریشان تھے کہ مسلمانوں کا تاریخی کالج اب انہیں کبھی واپس نہ مل سکے گا۔ اس کی سنگ سرخ کی خوبصورت مسجد مندر میں تبدیل کر دی جائے گی۔ مسجد کے برابر بانی کالج نواب اعتماد الدولہ کا مقبرہ کھود ڈالا جائے گا۔ وہ کمرے جن میں کبھی حالی، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد رہا کرتے تھے ان میں جٹا دھاری پنڈت بسیرا کر لیں گے۔ کالج میں صرف ہندو اور سکھ طالب علم تعلیم حاصل کریں گے اور مسلمانوں کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔ میں نے کالج میں ہوسٹل کے ہیڈ باورچی استاد سبطی سے کہا کہ تمھارے پاس راشن کا جو بھی سامان تھا وہ بھی گاڑیوں میں رکھ لو۔ خدا جانے کب اور کس حال میں اس کی ضرورت پڑ جائے، چنانچہ سبطی نے کالج کے ملازمین یاسین، حسن اور شیر خان کی مدد سے سارا سامان گندم، چاول اور شکر وغیرہ گاڑیوں میں رکھ لیا جو بعد میں ہمارے بہت کام آیا۔ پاکستان ہائی کمیشن کا راستہ کچھ کم پرخطر نہ تھا۔ جگہ جگہ ہندو اور سکھ شر پسند اور فوجی پوزیشن سنبھالے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے ہماری گاڑیوں پر بھی فائرنگ کی لیکن نشانے ٹھیک نہ لگے اور ہم بخیریت پاکستان ہائی کمیشن پہنچ گئے۔

پاکستان ہائی کمیشن پر قیامت کا سماں تھا۔ لٹے پٹے اور پریشان حال مسلمانوں کا وہ ہجوم کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ایسے میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا: آپ پر کیا گزری؟ آپ تو یو نیورسٹی میں تھے جو بظاہر محفوظ جگہ تھی۔ فرمانے لگے: خیال تو ہمارا بھی یہی تھا کہ یہاں کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا، لیکن علی الصبح ہمارے گھروں پر حملہ ہو گیا۔ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ وہ ہندو اور سکھ لڑکے بھی ان میں شریک تھے جو ہمارے شاگرد تھے۔ لیکن اب وہ ہم لوگوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک لمحہ بھی مہلت نہ دی اور ہم سب اپنے گھروں کو چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئے۔ غنیمت ہے کہ ہماری جانیں بچ

گئیں، ورنہ اس ماحول میں سب کچھ ہوسکتا تھا۔ پاکستان ہائی کمیشن میں ہم صرف چوبیس گھنٹے ٹھہرے اس دوران معلوم ہوا کہ پرانے قلعے میں لٹے پٹے مسلمانوں کے لیے رفیوجی کیمپ کھول دیا گیا۔ پاکستان ہائی کمیشن نواب زادہ لیاقت علی خاں نے کوٹھی ''گل رعنا'' میں قائم کیا تھا۔ نواب زادہ صاحب نے پاکستان جانے سے قبل حکومت ہند سے یہ طے کروایا تھا کہ اس میں ہمیشہ پاکستان ہائی کمیشن کا دفتر قائم رہے گا۔ یہ نواب زادہ صاحب کا ایثار تھا اس عوض انہوں نے پاکستان سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ ہم نے سید زاہد حسین صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ پاکستان ہائی کمیشن کو الوداع کہا اور پرانے قلعے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ قلعے میں ہزاروں لٹے پٹے خاندان آ گئے تھے۔ یہ قلعہ کیا تھا، اچھا خاصا کھنڈر تھا سج کے میلوں پھیلے ہوئے رقبے کو صدیوں پرانے پتھروں کی اونچی اونچی فصیلوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر سوائے ہمایوں کے کتب خانے اور شیر شاہ کی تعمیر کردہ مسجد کے کوئی قابل عمارت نہیں رہ گئی تھی۔ قلعے میں جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں اور ببول کے درخت تھے یا پھر خودرو گھاس تھی۔

نام نہاد آزادی ہند کے بعد جن سکھ کے ہندو شر پسندوں اور اکالی دل کے ظالم سکھوں نے دلی میں ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا، ہزاروں کو زخمی اب لاکھوں بے سروسامان انسانوں کو اس قلعے کے اندر دھکیل دیا تھا جہاں سر چھپانے کے لیے کوئی چھت نہ تھی، نہ بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی اور صورت! سایہ دیوار تک انکے نصیب میں نہیں تھا۔ اینگلو عربک کالج کے پروفیسر، طالب علم اور ملازمین وغیرہ سب ملا کر کوئی پچاس ساٹھ آدمی تھے، ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں پرانے قلعے کا چکر لگانا چاہیے، چنانچہ ہم لوگ اپنے مشن پر نکلے۔ ہم ایک ایک خاندان کے پاس گئے۔ انکی بپتا سنی جسکو سن کر ہمارے سینے شق ہو گئے۔ ہم نے لوگوں سے کہا کہ اب آپ کو کچھ عرصہ یہیں رہنا ہے۔ جب پاکستان اور بھارت کی حکومتیں باہم فیصلہ کریں گی جب آپ لوگ پاکستان جائیں گے۔ اس سے بہتر ہوگا آپ لوگ درختوں کی شاخیں کاٹ لیں اور انہیں زمین میں گاڑ کر چادریں تان لیں تاکہ رات کی شبنم اور دن کی دھوپ سے کچھ تو محفوظ رہیں۔ ہمارے مشورے کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑی دیر میں لوگوں نے درختوں کی شاخیں کاٹ ڈالیں اور انہیں زمین میں

گاڑ کر چادریں یا عورتوں کے دوپٹے سے تان لیے۔ یہاں بڑی سخت بے آرامی تھی، لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب یہاں ہندوؤں اور سکھوں کے ان پر حملے نہیں ہونگے کیونکہ بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوانوں نے کیمپ کی حفاظت کا کام سنبھال لیا تھا۔ بہرحال یہ رات قیامت کی رات تھی۔ لاکھوں آدمی عالم کسمپرسی میں قلعے کے اندر اور باہر پڑے تھے۔ یہاں کھانے کے لیے کوئی چیز تھی نہ پینے کے لیے پانی۔ قلعے کے باہر سڑک کے کنارے صرف ایک نل تھا جس سے لوگ لمبی لمبی قطاروں میں پانی لینے کے لیے کھڑے تھے۔ اس منظر نے کربلا کی یاد زندہ کر دی تھی، کسی کو پانی ملا کسی کو نہ ملا۔ کیمپ میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ بچے بھی موجود تھے۔ یہ بیچارے بھوک اور پیاس کے مارے روتے اور چلاتے تھے، لیکن انکی آہ وزاری کا کوئی علاج نہ تھا، جہاں پانی نہ ملتا ہو وہاں دودھ کہاں۔ غرض قلعے میں حشر کا سا سماں تھا۔ اہل قلعہ پر یہ مصیبتیں تو تھیں ہی کہ رات گئے بارش ہونے لگی اور بارش بھی ایسی موسلا دھار کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ وہ چادریں اور عورتوں کے دوپٹے جو انہوں نے شبنم اور دھوپ سے بچنے کے لیے ٹانگ لیے تھے، وہ سب کے سب بارش کے پانی میں بہہ گئے قلعے کے وسیع وعریض صحن میں پانی جمع ہو گیا یہ بارش آسمانی آفت تھی آخر چند گھنٹوں کے بعد بحکم الٰہی خود ہی بند ہو گئی۔ رات بھر کی بارش کا یہ اثر ہوا کہ بھیگنے سے لوگ نزلہ، زکام اور بخار میں مبتلا ہو گئے۔ اور پھر سانپ نکلنے لگے۔ قسم قسم کے سانپ نہ جانے کہاں سے آ گئے تھے، وہ پانی میں تیر رہے تھے۔ بعض لوگوں کو سانپوں نے ڈس بھی لیا تھا۔ کچھ لوگ ڈر اور خوف سے بھی مرنے لگے۔ صبح ہوئی تو جنازے اٹھتے نظر آئے۔ جو لوگ جاں بحق ہو جاتے انہیں بے سروسامانی کے عالم میں قلعے کی شمالی دیوار کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں کفن کہاں سے آتا، بس لاشوں کو ہاتھوں میں اٹھا کر فصیل کے پاس لے جاتے۔ یا پھر بارش کی بھیگی مٹی ان پر ڈال کر چھپا دیتے تھے۔ بھارتی حکومت کو مسلمانوں کی اس بپتا کا بخوبی علم تھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ راشن کا کوئی انتظام نہ تھا وہ تو یہ چاہتی تھی کہ دلی کے سب مسلمان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں، چنانچہ یہی ہوا کہ خاصی تعداد میں لوگ مر گئے اور جو زندہ رہے انکا حال مرنے والوں سے بدتر تھا۔ دو روز بعد جامعہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب قلعے میں آئے اور

ہم لوگوں سے بھی ملے۔ میں نے انہیں اس دن پہلی مرتبہ پریشان دیکھا ورنہ وہ بڑے حوصلے اور ہمت والے آدمی تھے۔ مجھے انکی آنکھوں میں آنسو بھی نظر آئے۔ ہم نے انہیں کیمپ کی ابتر حالت سے آگاہ کیا۔ انہوں نے ہمدردی اور افسوس کا اظہار کیا لیکن باتوں باتوں میں یہ بھی کہہ گئے کہ حکومت بے بس ہے۔ ایک شخص (پٹیل) کے جذبہ انتقام نے یہ سب کچھ کیا ہے۔

اس عرصے میں بی او اے سی کے جہاز دلی سے کراچی اور کراچی سے دلی آنے جانے لگے۔ کراچی کے لوگوں کو جب اہل قلعہ کی حالت زار کا علم ہوا تو انہوں نے ان جہازوں کو کھانے پینے کی چیزوں سے بھر دیا۔ ان میں خمیری روٹیاں، نان، ڈبل روٹیاں، انڈے کباب اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ یہ جہاز ان چیزوں کو لے کر دلی پہنچتے تھے۔ جیسے ہی ٹرک قلعے کے اندر پہنچتے، لوگ ان پر حملہ کر دیتے اور لوٹ لیتے۔ جس کے جو کچھ ہاتھ آیا لے اڑا۔ کئی کئی دن کے بھوکے لوگ اس معاملے میں باقاعدگی کا اظہار کیسے کر سکتے تھے میرے حصے میں ایک شامی کباب آیا تھا جو کسی نے لوٹ کر مجھے دیا تھا۔ پیٹ تو اس سے کیا بھرتا البتہ اسکا ذائقہ اب تک یاد ہے۔ ایک بات کو دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ لوگ لوٹ کر اس مال کو بیچ بھی رہے تھے۔ میرے کانوں میں کئی بار یہ آواز آئی: دو روپے کی ڈبل روٹی صاحب! مجبوراً لوگ خرید لیتے تھے ہم لوگوں کو انکی اس حرکت پر بھی غصہ آتا تھا کہ موت سروں پر ناچ رہی ہے اور یہ اس ماحول میں بھی منافع خوری پر اتر آئے ہیں، حالانکہ ڈبل روٹی کی قیمت اس زمانے میں دو تین آنے تھی۔ میرا خیال غلط نہیں کہ ایسے لوگوں نے پاکستان کے پاکیزہ ماحول کو خراب کیا ہوگا۔ غرض پانچ چھ دنوں کے اندر قلعے میں لاکھوں مسلمان جمع ہو چکے تھے۔ لوگوں نے یہاں اپنی جانیں بچالی تھیں اور اپنی عزتوں کو محفوظ کر لیا تھا لیکن اپنے مستقبل سے پریشان تھے۔ اب صرف پاکستان کی طرف اسپیشل ٹرینوں کے چلنے کا انتظار تھا پھر بعد از خرابی بسیار وہ مرحلہ آیا اور مہینوں رواں دواں رہا۔ کچھ گاڑیاں بخیریت پہنچ گئیں اور کچھ قتل وغارت کا نشانہ بنیں۔ بہرحال پاکستان کی منزل آخر کار آن پہنچی۔ (۱۲)

پاکستان زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!

مہاجر کیمپ کی بپتا

تحریر ڈاکٹر منظور ممتاز

روایت: میاں فیاض احمد گورا

تقریباً وسط جولائی ۴۷ء کی بات ہے، میں دیال سنگھ کالج سے انٹر کر چکا تھا۔ مشرقی پنجاب میں سکھوں نے مار دھاڑ اور مسلمانوں کو جور وستم کا نشانہ بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ مشرقی پنجاب کے ہندو، سکھ اکثریت علاقوں کا بھارت میں شامل ہونا ایک طرح سے طے شدہ امر تھا۔ اسی لیے وہاں مسلمان خوف و ہراس کی فضا میں اپنے گھر بار چھوڑ کر فیروز پور سے براستہ گنڈا سنگھ والا اور ضلع امرتسر سے براستہ کھیم کرن، قصور وارد ہونا شروع ہو گئے تھے، چنانچہ میں اور میرے نوجوان ساتھیوں نے انکے قیام وطعام کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ قصور میں ہندو، سکھ ابھی مقیم تھے گو ان میں سے بعض خاندانوں نے اپنے بیوی بچوں اور بوڑھوں کو ستلج پار فیروز پور امرتسر بھیجنا شروع کر دیا۔ جولائی میں اسکول موسم گرما کی تعطیلات کے لیے بند تھے۔ سو مشرقی پنجاب سے آنے والے خانماں بردار مسلمانوں کو موری گیٹ پرائمری اسکول قصور میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا اور ایک محدود علاقے میں منادی کرا دی گئی کہ مشرقی پنجاب سے مہاجر آنا شروع ہو گئے ہیں، لہذا ہر صاحب استطاعت گھرانہ دوپہر و رات کے کچھ فالتو کھانے کا انتظام بھی رکھا کرے۔ ہم لوگ مہاجرین کے لیے سالن اور روٹیاں جمع کرتے اور اسکا آغاز میرے اپنے گھر سے ہوتا۔ یوں ہم اشیاء خورد ونوش پناہ گیروں میں تقسیم کرنے لگے۔

روز بروز مہاجرین کی آمد بڑھتی چلی گئی۔ اب ان میں تہی دست اور زخمیوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ مہاجرین کا دوسرا کیمپ حنیفہ اسلامیہ اسکول میں بنایا گیا۔ زخمی گورنمنٹ سول ہسپتال منتقل کر دیئے جاتے۔ اسلامی اخوت کے جزبے سے سرشار شہر کے دوسرے لوگوں نے بھی دست تعاون بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ حافظ غلام جیلانی اور ملک محمد اصغر میرے ساتھ امدادی خدمات انجام دینے میں پیش پیش تھے۔ اگست شروع ہوا تو قصور میں کرفیو کا نفاذ ہونے لگا کیونکہ ہندو مسلم

فساد کا خطرہ تھا۔ان دنوں میرے سکھ دوست نریندر سنگھ نے مجھے اپنے گھر بلا کر کہا: میاں فیاض! سنا ہے تم حنیفہ اسلامیہ اسکول میں پناہ گیروں کی خدمت میں دن رات لگے رہتے ہو۔آج رات وہاں نہ جانا،اس پر سکھ حملہ کرنے والے ہیں اور وہ لالہ بلے شاہ کے سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' یاد رہے کہ بلے شاہ قصور کا ایک ہندو رئیس تاجر تھا جسکا روئی بیلنے کا ذاتی کارخانہ بھی تھا۔اس نے اسٹیشن کے قریب سرائے بنوا رکھی تھی جس میں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی رہائش کا علیحدہ علیحدہ انتظام تھا۔میں نے واپس آ کر تھانہ ستی ایس ایچ او آغا خادم حسین کو اطلاع کر دی۔انھوں نے سرائے پر چھاپہ مار کر مشکوک سکھ ہتھیاروں سمیت گرفتار کر لیے۔جب آغا صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپکو یہ اطلاع کس نے دی تو میں نے معذرت کر لی کہ نام ظاہر نہیں کر سکتا۔اور نریندر سنگھ کے احسان کا بدلہ میں نے یوں چکایا کہ ۱۵ اگست کے بعد اسے اصرار کر کے اسٹیشن لے گیا اور گاڑی پر سوار کرا دیا اگرچہ وہ قصور سے نہیں جانا چاہتا تھا۔

۱۷ اگست کو یہ معلوم ہو گیا کہ قصور پاکستان کا حصہ قرار پایا ہے، ستلج کے اس پار کا علاقہ بھارت کو دیدیا گیا ہے۔اور کھیم کرن، ترن تارن، ولٹوہا، گھریالہ وغیرہ قصور سے الگ کر کے بھارت میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔اس کے بعد قصور کی طرف مہاجرین کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ قصور کے شہری ہندو، سکھ نقدی اور زیورات سمیت بیل گاڑیوں پر ضروری سامان اور بیوی بچوں کو لادے دریائے ستلج کا پل عبور کرنے یا کھیم کرن جانے لگے۔قصور میں کریانے اور تھوک کا کاروبار کرنے والے زیادہ تر ہندو تھے۔وہ گھروں دکانوں اور گوداموں پر تالے ڈال کر چلے گئے تھے۔ادھر مہاجر مسلمان باکثرت آنے لگے تو حکومت نے انکے قیام وخوراک کی ضرورت پوری کیں۔راجہ حامد مختار مجسٹریٹ مہاجر کیمپ کے انچارج مقرر ہوئے۔مہاجرین کو عارضی طور پر آباد کرنے کے لیے ہندوؤں اور سکھوں کی دکانیں اور مکان دیئے جانے لگے۔اگست کے اواخر اور ستمبر میں برسات شروع ہو گئی تو ہیضہ پھوٹ پڑا۔اس نئی افتاد نے مہاجرین ہی کو نہیں، بہت سے اہل شہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔مہاجرین میں سے ہیضے کے مریض شہر سے قدرے باہر لالہ

دینا ناتھ کے مترو کے بیلنے کے کارخانہ میں منتقل کیے جاتے رہے جو بعد میں ستلج رینجرز کا ہیڈ کوارٹر بنا۔قصور سول ہسپتال زخمیوں سے اٹا پڑا تھا۔یہاں مریضوں کی دیکھ بھال اور مطلوبہ ادویات اور خوراک بہم پہنچانے کی اشد ضرورت تھی، مگر اس قدر فنڈ نہیں تھے کہ یہ سب انتظام ہو سکتا، لہذا اب سول ہسپتال میری توجہ کا مرکز بن گیا۔پریڈ گراونڈ میں حالت یہ تھی کی عورتوں کو کھلے آسمان تلے زچگی کے مرحل سے گزرنا پڑ رہا تھا۔اس سلسلے میں قصور کے امریکی وعیسائی مشن سے رابطہ قائم کیا گیا کیونکہ انہوں نے گرجا گھر کے علاوہ رہائش اور دوسری ضروریات کے لیے کئی عمارتیں بنوا رکھی تھیں۔ان دنوں مسٹر لوئیس پادری تھے۔انکی بیگم نے زچگان کے لیے اسٹور خالی کروایا جو دراصل گھوڑوں کا اصطبل تھا۔پھر اس میں سفیدی کروا کے صاف ستھرا بنا دیا اور مجھ سے کہا: ''ویل مسٹر گورا! ضروری سامان آپکو لانا مانگتا۔مشن سے اجازت ملنے پر ہم سامان منگوالے گا! انہوں نے آنے والے بچوں کے لیے لباس مہیا کرنے کو بھی کہا۔میں نے وہ سارا سامان جیب خرچ اور والد صاحب سے رقم لے کر خریدا۔اس میں لالٹینیں بھی تھیں کیونکہ اصطبل میں بجلی نہیں تھی۔نومولود پاکستانی بچوں کے لیے میں نے اپنے رشتے داروں اور عزیزوں کے ہاں سے استعمال شدہ صاف ستھرے کپڑے اکھٹے کیے۔لیڈی ڈاکٹر نذیر جان مرحوم نے امرتسر سے یہاں آئی تھیں یہ کار خیر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اس دوران مسٹر لوئیلسن نے اپنے مشن کے ذریعے بہت سا سامان منگوالیا اور یوں اس نازک مرحلے پر بہت ساتھ دیا۔بعد میں وہ تحفتاً دینے لگے۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے مہاجرین میں مسیحیت کی تبلیغ بھی شروع کر دی جو ان لوگوں میں کیا کامیاب ہوتی جو **لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ﷺ کے نام پر آگ اور خون کا دریا عبور کر کے ساحل مراد پر آ پہنچے تھے۔قصور میں ہیضے کی وبا پھوٹ نکلی تو یہ طے پایا کہ ستلج کے پار سے آنے والے مہاجرین کو گنڈا سنگھ والا ہی میں ہیضے کے ٹیکے لگا دیئے جائیں اور وہیں اندراج کر کے راشن کارڈ بنا دیا جائے تاکہ انہیں پریڈ گراؤنڈ کیمپ میں آتے ہی راشن مل جایا کرے۔چنانچہ وہاں بھی میری ڈیوٹی لگی تو بعض دلچسپ مشاہدات ہوئے۔ایک مہاجر سے نام پوچھا تو اس نے کہا چھتر

خاں ۔اس پر میری ہنسی نکل گئی ۔وہ پریشان ہوا لیکن میں نے بات آگے نہ بڑھائی اور اسی نام سے راشن کارڈ بنا دیا۔اسی طرح ایک لڑکی سے نام پوچھا تو اس نے بتایا:''کانی''۔میں نے اس کی طرف دیکھا،اس کی دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔مزید کریدا تو راز کھلا کہ جب وہ پیدا ہوئی تو بہت دبلی تھی،چنانچہ گھر والوں نے کانی نام رکھ دیا کہ سرکنڈے کو پنجابی میں''کانا'' کہتے ہیں اور کانی اسکی مونث ٹھہری۔اب ہسپتال کے چند زخمیوں کے دردناک واقعات سنئے:

زخمیوں میں ایک جوان لڑکی زینب تھی،اسکا جسم زخموں سے چور تھا مگر اسکی معمولی مرہم پٹی ہو رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر فوری توجہ نہ دی گئی تو اس کے زخم خراب ہو جائیں گے اور وہ بچ نہیں سکے گی۔ڈاکٹر مظہر،جسٹس دین محمد کے داماد تھے،میں نے ان سے بار بار کہا کہ زینب کے زخموں کو ٹانکے لگا دیں مگر وہ کہتے جتنی دیر اسکے زخم صاف کرنے اور سینے میں لگے گی اتنی دیر میں کئی اور زخمیوں کو بچا لونگا۔میں نے کہا:ڈاکٹر صاحب!زندگی اور صحت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔آپ اس زخمی کے لیے ذرا سا وقت ضرور نکالیں!چنانچہ ایک طرح سے زبردستی میں اسے اسٹریچر پر ڈلوا کر آپریشن روم میں لے گیا۔ڈاکٹر مظہر نے زخم اچھی طرح صاف کر کے سی دیئے۔دوسرے زخمیوں کے ساتھ ساتھ زینب کے لیے دودھ،دلیے وغیرہ کا مناسب انتظام کر دیا گیا اور اسکے زخم چند روز میں بھر گئے تو اس نے بتایا کہ اسکا خاوند بدر راستے میں سکھوں کے حملے میں شہید ہو گیا تھا۔اب کہاں جاؤں؟آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں میں کام کاج کر دیا کرونگی۔میں نے کہا ابھی تم چند روز ہسپتال میں رہو۔جب پوری طرح صحت یاب ہو جاؤ گی تو دیکھیں گے کہ تمھارے لیے کیا بندوبست مناسب رہے گا۔

ان ہی دنوں ایک نوجوان شخص زینب کو تلاش کرتا آیا۔وہ لنگڑا رہا تھا۔عورتوں کے وارڈ میں غیر مردوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔اس نے مجھ سے زینب کا پوچھا۔میں نے اس بنا پر نفی میں جواب دیا کہ زینب نے کہا تھا کہ اس کا خاوند راستے میں شہید کر دیا گیا ہے۔وہ مایوس ہو کر لوٹا ہی تھا کہ مجھے یاد آیا یہ جوان اپنا نام بدر بتا رہا تھا اور زینب نے بھی اپنے خاوند کا نام بدر بتایا

تھا۔میں نے ایک آدمی کو دوڑایا اور وہ اسے واپس لے آیا۔میں نے بدر کو ہسپتال کے برآمدے کے باہر اپنے پاس بٹھایا۔کچھ دیر بعد میں اٹھا اور زنانہ وارڈ میں جا کر زینب کو بلایا اور برآمدے کی جالی سے باہر دیکھنے کو کہا۔اس نے بدر کو دیکھا تو دہاڑیں مار کر رونے لگی۔اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسکا خاوند واقعی زندہ ہے۔میں زینب کو دلاسا دے کر واپس زنانہ وارڈ میں لے گیا۔میں یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ بدر بھی زینب کو پہچانتا ہے یا نہیں۔

جب وارڈ میں دوپہر کا کھانا دینے کا وقت آیا تو میں نے سالن کی بالٹی بدر کے ہاتھ پکڑوا دی اور ساتھ ہو لیا۔جب وہ زینب کو سالن دینے لگا تو اسکا ہاتھ گویا وہیں تھم سا گیا اور وہ لپک کر اسکی طرف بڑھا۔بدر نے بتایا کہ سکھوں کے حملے میں یہ تو زخم کھا کر بھاگ اٹھی تھی اور میں ٹانگ میں گولی لگنے سے گر پڑا تھا۔میرے اوپر اور زخمی آن گرے تھے۔کچھ دیر بعد زخمیوں اور مرنے والوں کے نیچے سے نکلا اور کسی نہ کسی طرح قصور آن پہنچا۔یہاں میرے گاؤں والوں میں سے ایک نے بتایا کہ زینب انکے ساتھ بھاگی تھی،اسی لیے ضرور ہسپتال میں ہوگی،چنانچہ یہاں میں اسکی تلاش میں چلا آیا۔ہم نے انہیں کچھ کھلایا،پلایا اور زادراہ بھی دیا۔وہ بورے والا چلے جہاں انکے رشتے دار تھے۔چند برس تک وہ مجھ سے ملنے قصور آتے رہے۔

ایک اور واقعہ تقریباً دس برس کی لڑکی کا ہے جو والدین سے بچھڑ گئی تھی۔اسکا رنگ سیاہ تھا مگر عادات واطوار ایسے تھے جیسے وہ مالدار گھرانے کی ہو۔وہ اسہال میں مبتلا تھی اور اسے موری گیٹ پرائمری اسکول میں رکھا گیا تھا۔پریڈ گراؤنڈ کا مہاجر کیمپ کھل جانے کے بعد یہ جگہ والدین سے بچھڑے بچوں کے لیے مخصوص کر دی تھی اسکا علاج ہونے لگا وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ ہمارے گھر میں رہنے پر ضد کرنے لگی اور مجبوراً میں اسے گھر لے آیا۔گھر میں والدہ اور بچیوں نے اسے محبت سے نہلایا دھلایا اور کپڑے وغیرہ پہنائے۔جب اماں نے من پسند کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا:بٹیر کھاؤں گی۔فسادات اور افراتفری کے ان دنوں بٹیر کہاں سے آتے۔اماں نے اسکے لیے مرغی کا سالن بنایا۔پھر چند روز اس نے جو تقاضا کیا،اسکے لیے پکوایا گیا۔ایک دن

اسکا والد تلاش کرتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ہم نے ضروری تصدیق کی۔پھر لڑکی نے بھی اپنے والد کو پہچان لیا۔معلوم ہوا کہ لڑکی کا والد نہر کا پٹواری ہے۔اس لیے اسکی بیٹی کی فرمائش سیب کے مربے اور بٹیر سے کم نہیں ہوتی تھی۔

تیسرا واقعہ بھائی بہن کا ہے۔لڑکی تقریباً سات برس کی تھی اور لڑکا ڈیڑھ دو برس کا۔کسی شقی القلب سکھ نے لڑکے کا بازو کہنی سے کاٹ دیا تھا۔اسکی مرہم پٹی ہوتی رہی۔مگر وہ ایسا ہراساں اور ضدی ہو گیا تھا کہ بہن کی گود سے اترتا ہی نہ تھا، وہ بیچاری سارا سارا دن اسے گود میں اٹھائے رہتی۔اس کم عمر لڑکی کا نام سکینہ تھا۔ بھائی کے لیے اسکا ایثار قابل تعریف تھا،مگر اس کم عمری میں اس کی یہ مشقت دیکھی نہ جاتی تھی۔میں سکینہ کو سمجھا بجھا کر اپنے گھر لے آیا۔گھر والوں نے لڑکے کو کھلونے دیئے اور اس طرح اسکا دل بہلایا تو وہ بہل گیا۔سکینہ کے بقول اسکی ماں نے بتایا تھا کہ اسکے نانا نانی قصور کے آس پاس کسی گاؤں میں رہتے ہیں۔مگر اسکا نام اسے یاد نہیں رہا تھا۔دو چار دن بعد اسکا نانا خود ہی انہیں تلاش کرتا آن پہنچا۔نانا سے نواسی کی شناخت پوچھی گئی تو اس نے ٹھیک بتا دی۔لڑکی نے بھی نانا کو پہچان لیا۔وہ قصور سے دو ڈھائی میل دور موضع کھارا کا رہنے والا تھا۔دونوں بہن بھائی خوبصورت تھے۔افسوس بچا ایک بازو سے محروم ہو چکا تھا۔(۱۳)

پٹیالہ کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت صغریٰ

محمد افضال شریف

پٹیالہ مشرقی پنجاب کی سب سے بڑی ریاست تھی۔موتی محل، نیلا بھون، بارہ دری، ٹھنڈی سڑک نے شہر پٹیالہ کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ہر جگہ سبزہ پھولوں کی مہک تھی۔امن وامان مثالی تھی۔لوگ دروازے کھول کر سوتے تھے۔مسلمان، ہندو اور سکھ مل جل کر رہتے آرہے تھے۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔حکیم نثار لکھنو سے سیر کرتے کرتے ایک دن پٹیالہ میں اتر گئے۔انہیں ریاست اور اسکے لوگ اتنے پسند آئے کہ پھر واپس اپنے وطن نہیں گئے۔پاکستان بننے کے بعد وہیں سے کراچی آ گئے۔۱۹۴۵ء میں ریاست پٹیالہ میں بھی پاکستان کے نعرے لگنے لگے۔مسلمان قائداعظم کے بیج لگا کر ''قائداعظم زندہ باد'' ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے لگاتے، جلوس نکالتے لیکن ریاست کی مجموعی فضا پرامن تھی۔رستم ہند امام بخش اور رستم زماں گاماں پہلوانی میں پٹیالہ کا نام روشن کر رہے تھے۔ابا جی محمد شریف مرحوم کہنہ مشق آرٹسٹ تھے۔مالوہ ٹاکیز پٹیالہ کے مالک سیٹھ چرن داس انکے بھائی بنے ہوئے تھے۔چوہدری عید محمد اور سیٹھ چرن داس نے مل کر ایک اور سینما بنایا تھا جس کی پینٹنگ ابا جی کروا رہے تھے۔غالباً جون ۴۷ء کا مہینہ تھا۔ابا جی ہر پینٹر کو بتاتے جاتے کہ کہاں کہاں کس قسم کی کلر سکیم ہو گی۔ایک پینٹر کو سمجھانے کے لیے لکڑی کی سیڑھی پر چڑھ رہے تھے کہ ایک ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ابا جی اور اسسٹنٹ پینٹر دونوں نیچے گر گئے۔ابا جی کی کن پٹی ڈرم سے ٹکرائی اور دماغ کو شدید چوٹ لگی۔وہ بے ہوش ہو گئے۔انہیں فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔سیٹھ چرن داس کے سسر سر جن رنگوناتھ نے بہت کوشش کی کہ والد صاحب کی زندگی بچ جائے۔پٹیالہ کا قانون تھا کہ جو شخص ہسپتال میں وفات پا جاتا، اسے شہر نہیں لانے دیتے تھے۔وہیں سے سیدھا قبرستان لے جایا جاتا۔کیونکہ سر جن رگوناتھ صاحب سے گھر والا معاملہ تھا انہوں نے میرے تایا غوث محمد مرحوم کو ہسپتال بلا لیا اور کہا کہ شریف صاحب کو گھر لے جایئے ورنہ آپکو مشکل ہو گی کیونکہ انکی زندگی چند گھنٹوں کی ہے،

چنانچہ والد صاحب کو گھر لایا گیا۔ جہاں تھوڑی دیر بعد وہ انتقال کر گئے۔ یوں ہم چھوٹے چھوٹے تین بھائی ایک شیر خوار بہن یتیم ہو گئے اور والدہ عین جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔

ان دنوں پورے پنجاب کے حالات دگرگوں تھے۔ میری خالہ انبالے میں تھیں۔ وہ یہ سوچ کر پٹیالہ واپس آ رہی تھیں کہ اب حالات کا مقابلہ والدین کے ساتھ مل کر کریں گے۔ جب انکی ٹرین پٹیالہ سے تھوڑا قریب پہنچی تو ایک سکھ نے میرے خالہ زاد بھائی واحد کا ختنہ دیکھ لیا۔ اس نے شور مچا دیا کہ ہمارے ڈبے میں مسلے سفر کر رہے ہیں، انہیں ختم کر دو۔ انہوں نے تلواریں نکال کر میری خالہ کو شہید کر ڈالا اور چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ پھر واحد کے ساتھ وہی کچھ کیا۔ اسکے بعد بہن وحیدہ، سعیدہ اور بھائی اختر کو ایک ایک کر کے شہید کر دیا اور انہیں بھی گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ خالو نے جان بچانے کے لیے گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ ایک صاحب جو ہمارے خاندان کو جانتے تھے۔، اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے، انہوں نے گھر آ کر اطلاع دی، تو صف ماتم بچھ گئی۔ اس طرح پٹیالہ میں سکھوں کے ہاتھوں شہادت ہمارے گھر سے شروع ہوئی۔ میرے نانا محلے کے چند نوجوانوں کے ہمراہ پتہ کرنے گئے۔ خالہ وحیدہ اور واحد کی لاشیں مل گئیں۔ چھوٹی بچی سعیدہ کی میت نہ مل سکی، شاید کوئی جانور لے گیا تھا۔ اختر زخمی حالت میں مل گیا اور ماشاءاللہ آج بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ بعد میں خالو بھی آ ملے تھے۔ صادق آباد میں کوئی پندرہ سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ ہمیں یہ پتا چل گیا کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں شامل نہ ہوگا۔ مسلمانوں نے گھروں کی چھتوں پر کالے جھنڈے لہرا دیئے تھے۔ وہ سکھ جو پاکستان کے علاقے سے آ کر پٹیالے میں پناہ گزیں ہوئے تھے، چھوٹی موٹی چیزیں گلی میں بیچتے نظر آئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسلمان گھروں کی جاسوسی کر رہے ہوں۔ رمضان کے روزے شروع ہوئے تو حالات اور خراب ہو گئے۔ پٹیالہ ریلوے اسٹیشن کے قریب دو تین مسلمان نوجوان شہید کر دیئے گئے۔ مہاراجے کے حکم پر مسلمان گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور کوئی ہتھیار یا چاقو تک ضبط کر لیے گئے۔ بعد میں ہتھیار ہندوؤں اور سکھوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔

میں ان دنوں سٹی ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ حالات بگڑے تو تایا جی نے مسلم ہائی اسکول میں داخل کروا دیا۔ رمضان ختم ہوا جا رہا تھا۔ خبر ملی کہ چاند نظر آ چکا ہے۔ کئی لوگوں نے دن کی روشنی میں بارہ بجے دیکھا تھا۔ میرے تایا نے ایک تسلے میں پانی ڈال کر اس میں چاند دیکھنا شروع کیا تو وہ نظر آ گیا، مگر الٹا تھا۔ میں نے خود بھی دیکھا تھا۔ بزرگوں نے کسی آنے والی مصیبت کی نشانی بتایا تھا۔ غرض دوسرے دن عید خیریت سے گزری۔ عید کے پانچ چھ دن بعد پٹیالہ میں اچانک کرفیو لگا دیا گیا۔ ہم سب اپنے گھروں کو مقفل کر کے یہ سوچ کر اپنے رشتے داروں کے پاس چلے گئے تھے کہ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے، ہم گھر واپس آ جائیں گے، مگر پھر گھر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کسی نے گھر سے ایک تنکا بھی نہ اٹھایا تھا۔ جس محلے میں ہم گئے تھے، وہاں تیسرے چوتھے دن سکھوں نے شور مچا دیا۔ مسلمانو! تمھاری مسجد کو آگ لگا دی گئی ہے۔ کچھ نوجوان جن میں میرے پھوپھی زاد بھائی زاہد بھی تھے، مسجد کی آگ بجھانے بھاگے، مگر یہ سکھوں کی چال تھی تاکہ انہیں گھیر کر ختم کر دیا جائے۔ میرے تایا مرحوم رو رو کر دعائیں مانگ رہے تھے کہ اے اللہ! صادق کو بچا کر لے آنا۔ بھائی صادق انکا بھانجا ہونے کے ساتھ ان کا داماد بھی تھا۔ اللہ نے ان سب نوجوانوں کو محفوظ رکھا اور وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر واپس آ گئے۔ ہم بہت خوش ہوئے دوسرے محلے میں اپنی نانی کے مکان میں اتر گئے۔ وہاں اور لوگ بھی جمع ہو گئے، مگر تھے سب خالی ہاتھ۔ پانچ چھ دن بعد وہاں بھی خطرے نے گھیرا تو کچھ فاصلے پر اپنے عزیز کے ہاں ٹھہرے۔ وہاں پہنچے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ ہم پر فائرنگ شروع ہو گئی جسکے نتیجے میں میری بڑی خالہ، خالو، انکا جوان بیٹا، جسے ہم بھائی تیانا کہتے تھے، بھابی اور انکے تین چھوٹے بچے شہید ہو گئے۔ ہم اپنے جانیں بچاتے آگے کی طرف بھاگے اور ہادی حسین صاحب کے گھر پناہ لی۔ سب نے یہ جان لیا تھا کہ چند روز کے مہمان ہیں، آج نہیں تو کل قتل کر دیئے جائیں گے، لہذا ہر کوئی اپنا گھر کھول دیتا کہ جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو۔ ہادی حسین صاحب کے گھر کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہاں بھی ''بھاگو بھاگو'' کا شور برپا ہوا' چنانچہ وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ اب ہم چھتوں پر سے

کودتے، بھاگتے، کئی دن کے بھوکے پیاسے، ایک محلے میں سے دوسرے محلے میں جانیں بچاتے پھرتے تھے۔ ہم ہی نہیں ہزاروں تعداد میں بوڑھے، جوان لڑکے، لڑکیاں بے بسی کی حالت میں گھر سے بے گھر چھپتے پھرتے تھے۔ جوان لڑکیوں کے منہ پر کالک مل دی تھی تاکہ بدصورت نظر آئیں اور سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں اغوا ہونے سے بچ سکیں۔ سب ہی بے بس تھے۔ کوئی کسی کے لیے کچھ نہ کرسکتا تھا۔ ہم بھاگتے بھاگتے انگوروں والی مسجد پہنچے جہاں ہماری رشتے کی خالہ حمیدہ کا گھر تھا۔ وہاں دوسو سے زیادہ افراد پہلے سے موجود تھے۔ وہاں ہم نے آخری پناہ لی تھی۔ وہ پورا محلّہ اس لیے محفوظ تھا، کہ انگوروں والی مسجد کی چھت پر حکیم صاحب ایک بندوق لیے اور ہزاروں کارتوس کا تھیلا گلے میں لٹکائے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کریم صاحب تھے۔ شیراں والا دروازہ اور توکلی مسجد کے پاس انکی ڈسپینسری تھی۔ سارے لوگ وہاں سے علاج کرواتے تھے اور دونوں بھائیوں کو ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے۔ ڈاکٹر حکیم صاحب الحمدللہ بقید حیات ہیں اور بہاولپور میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر حکیم کے چھوٹے بھائی بھائی کریم کو ہندو سکھ پولیس والے اغواء کر کے لے گئے تھے اور انہیں شاہی قلعہ پٹیالہ کے سامنے واقع جیل میں شہید کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر حکیم نے اپنی تمام خواتین کو خود ہی ہلاک کر دیا تھا، یہ سوچ کے کہ ہم سب کا انجام جب موت ہے تو میری بیوی بچیاں سکھوں کے ہاتھ کیوں لگیں۔

پٹیالے میں سکھوں اور مسلمانوں میں کچھ عرصہ اتحاد رہا تھا۔ یہ اتحاد اس وقت ٹوٹا جب ۱۵ اگست کو چاہی قلعے پر ترنگا جھنڈا لہرا دیا گیا تھا۔ کیونکہ کانگریس نے تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سکھوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا، سکھ کانگرسی جھنڈا دیکھ کر ہزاروں کی تعداد میں قلعے کے آگے جمع ہو گئے اور ہندو اور پٹیل کے خلاف نعرے لگانے لگے۔ اس پر دلی سے کانگرسی رہنما راتوں رات پٹیالے پہنچے۔ انھوں نے قلعے کے سامنے سکھوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ جھنڈے کی کوئی بات نہیں ہم اسے ابھی اتر وا دیتے ہیں، اور تمھارا پیلا خالصہ جھنڈا لہرا دیتے ہیں، چنانچہ ایسا فوراً کر دیا گیا۔ اس موقع پر ہندو لیڈروں نے اشتعال انگیز تقریریں کیں کہ سکھ ہو یا ہندو ہم ایک ہی

ہیں۔ پٹیالہ تمھارا ہے۔ کشمیر تک سارا پنجاب تمھارا ہے، مگر ہمارے تمھارے اصل دشمن تو مسلمان ہیں جن سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی کئی جنگیں لڑیں۔ ان مسلمانوں کو ختم کرو تاکہ رنجیت سنگھ کی آتما کو سکون ملے۔ اس پر سکھوں کے دماغ گھوم گئے۔ ایک نوجوان مسلمان عورت وہاں سے گزر رہی تھی، اسے شہید کر دیا گیا۔ اور اسکی برہنہ لاش بازار میں دس فٹ کی اونچائی پر لٹکا دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی بینر باندھ دیا جس پر لکھا تھا ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اس طرح سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام کا آغاز کر دیا۔ جب ہم انگوراں والی مسجد میں اپنی خالہ کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھے، کھانے کو اور کچھ نہ تھا، گندم کی ایک بوری ان کے گھر پڑی تھی، وہی ابال کر تھوڑے تھوڑے دانے سب کھاتے رہے۔ دوسرے دن میرے تایا زاد بھائی عبداللطیف اکیلے آئے انکے ہاتھوں میں کچھ روٹیاں اور اچار تھا۔ وہ یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ شام کو مزید راشن دے جاؤنگا۔ وہ اسی محلے میں کچھ فاصلے پر رہتے تھے۔ ہم نے انکی آخری بار شکل دیکھی۔ وہ بہت ہی پیارے بھائی تھے۔ میری چھوٹی ممانی کچھ دن پہلے بمبئی سے پٹیالہ آئیں تھیں۔ وہ سر پر کپڑے کا ڈھاٹا باندھے ہاتھ میں ڈنڈا لیے بے چین پھر رہی تھیں کہ کوئی ہندو، سکھ ملے تو اسے ختم کر دیں۔

ڈاکٹر حکیم دن میں ایک مرتبہ فائر کر دیا کرتے تھے تاکہ ہندوؤں اور سکھوں کو خوف رہے کہ یہاں جو لوگ ہیں انکے پاس بہت اسلحہ ہے۔ یہ صرف ان بزدلوں کے لیے ڈراوا تھا۔ میں ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کے پاس چلا گیا اور سلام کیا۔ کچھ دیر بعد پڑوس کی چھت پر جھانکا تو ایک شخص بڑے نوٹوں کی گڈی جلا رہا تھا۔ وہ رو بھی رہا تھا کہ ساری عمر کی کمائی راکھ ہو رہی ہے۔ ساتھ ہنس بھی پڑتا کہ یہ کافروں کے ہاتھ تو نہ آئیں گے۔ تین دن بعد ایک سکھ سفید جھنڈا لہراتے ہوئے آگے بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اکیلا ہے۔ امن کا جھنڈا بھی ہاتھ میں ہے آنے دو دیکھا جائے گا۔ قریب آکر سکھ نے جو ایک فوجی تھا بلند آواز سے کہا: ''ہم شانتی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ آج تک جو ہوا مہاراجہ پٹیالہ کو اس پر بہت افسوس ہے۔ وہ شیراں والا گیٹ پر تقریر کریں گے۔ اور آپ لوگوں سے معافی مانگیں گے۔ اس کے بعد آپ سب اپنے گھروں کو واپس چلے جانا۔ ڈاکٹر

صاحب، ہم سب پناہ گزین اور اہل محلّہ دھوکے میں آ گئے۔ قافلے کی صورت میں شیراں والا گیٹ کی طرف چل دیئے۔ یہ قافلہ تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ راستہ بلکل صاف تھا مگر، جوں ہی مین روڈ پر آئے شیراں والا گیٹ سے ہم پر فائرنگ ہونے لگی۔ اس پر بھگدڑ مچ گئی، ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ایک گولی میرے کندھے کو چھوتی گزر ی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان بیساکھیوں سے بھاگا آ رہا تھا۔ وہ گولی اسکے سینے میں لگی، وہ گر پڑا اسے خون کی الٹی آئی اور وہ شہید ہو گیا۔ میری چھوٹی ممانی کو سکھوں نے پکڑ لیا اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلو، ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ بہت خوبصورت اور جوان تھیں۔ انہوں نے کلمہ شہادت پڑھ کر سکھوں کے منہ پر تھوک دیا اور کہا کہ تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ایک ظالم سکھ نے تلوار کے ایک ہی جھٹکے سے ممانی کی گردن تن سے جدا کر دی۔ میں اس جوان شہادت کے بعد بھاگ اٹھا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ ایک دکان میں گھسا۔ یہ نہایت نیک دل رمضان صاحب کی کریانے کی دکان تھی۔ وہ شہید کر دیئے گئے تھے۔ انکی دکان خالی تھی۔ دکان کے تھڑے پر ایک عورت خون میں لت پت آخری سانس لے رہی تھی اسکی چھاتیوں سے کوئی چھ ماہ کا بچا لپٹا دودھ پی رہا تھا۔ پتہ نہیں اس بچے کا حشر کیا ہوا ہوگا۔ آج بھی پچھتاوا ہوتا ہے۔ کاش! میں نے اس بچے کو اٹھا لیا ہوتا۔ وہ زندہ رہتا۔ دکان میں داخل ہوا تو سامنے والدہ بہن کو گود میں لیے سکتے کے عالم میں کھڑیں تھیں دوسرے بھائی نہیں تھے۔ میں نے پوچھا اقبال اور اشفاق کہاں ہیں تو والدہ نے کہا مجھے پتہ نہیں۔ باہر گولیاں چل رہی تھیں فائرنگ میں وقفہ ہوا تو میں اور والدہ صاحبہ واپس انگوراں والی مسجد کی طرف بھاگے۔ سڑک شہیدوں اور زخمیوں سے پٹی پڑی تھی۔ ہر طرف پانی پانی کی آوازیں آ رہی تھیں مگر وہاں پانی تھا کہاں جو زخمیوں کے منہ میں ڈالتے۔ دو روز شہیدوں کی لاشوں کے درمیان گزرے۔ پھر فوجی ہمیں گھیر کر دوبارہ شیراں والا دروازے کی طرف لے گئے۔ راستے میں کئی کئی فٹ لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اس روز موسلا دار بارش ہوئی۔ ہم کھلے آسماں تلے بھیگتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ پاک نے ہزاروں شہیدوں کو غسل دیا ہو۔ دوسرے دن دھوپ نکل آئی۔ پھر ہمیں حکم دیا گیا

کہ ایک ایک کر کے شیراں والے دروازے سے ہو کر سٹی اسکول کے قریب جمع ہو جائیں۔ اس بہانے تلاشی میں انہوں نے بہت کچھ ہتھیا لیا۔ ناچار سب لوگ دروازے کے اس پار بارہ دری کی جانب میدان میں جمع ہو گئے۔ وہاں کچھ بچھڑے ہوئے کئی دن بعد ملے۔ ان میں میرے تایا غوث محمد بھی تھے۔ ان سے پتہ چلا کہ انکے تین بیٹے بھائی لطیف، بھائی حمید اور بھائی شوکت شہید ہو گئے۔ یہ تینوں جوان تھے بھائی حمید کی شادی نہیں ہوئی تھی، وہ اللہ والے تھے۔ بھائی شوکت ہمیشہ لاہور رہتے تھے۔ شادی انہیں پٹیالہ لے آئی جو اتنی لمبی ہو گئی۔ ہونے والے سسرال تاریخیں بڑھا رہے تھے ورنہ وہ تو پٹیالہ میں زیادہ رکتے نہ تھے۔ شہادت انکی قسمت میں تھی۔ میرے پھوپھی زاد بھائی مسجد کے قتل عام سے بچ گئے تھے، انکا میری تایا زاد بہن نے برسوں بلکہ مرتے دم تک انتظار کیا کہ شاید انکا سرتاج اچانک آ جائے۔ انکا پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں شہید ہوئے۔ بہن نے انکی اکلوتی اولاد نسیم کو پالا جو آج اپنے گھر والی ہے۔

ہم جو زندہ بچ گئے، شیراں والا دروازے کے پاس اکھٹے ہو گئے تھے۔ وہاں ایک سکھ بزرگ زار زار رو رہے تھے اور کہے رہے تھے: ''میری قوم نے چنگائیں کیتا۔ ظلم کمایا ای''۔ جب تک ہم دوسری منزل کی طرف رواں دواں نہ ہوئے وہ بزرگ کبھی ادھر جاتے کبھی ادھر اور اپنی قوم کو ملامت کرتے جاتے۔ ریاستی حکام اب ہم سب کو قافلے کی صورت میں پٹیالے سے کئی میل دور ایک پرانے قلعے کی طرف لے گئے جو بہادر گڑھ کا قلعہ کہلاتا تھا۔ چھوٹے بڑے زخمی غم زدہ غلاموں کی طرح رواں دواں تھے راستے میں شہیدوں کی لاشیں بھی تھیں کسی کو کتے بھنبھوڑ رہے تھے کوئی نہر میں تیر رہی تھی اور کسی کو گدھ نوچ رہے تھے۔ عصر کے وقت ہم قلعے کے باہر جمع ہو گئے۔ کچھ بچوں کو پیاس لگ رہی تھی، وہ بری طرح تڑپ رہے تھے۔ وہاں ایک نالہ بہہ رہا تھا جس میں کائی جمع تھی اور بدبو آ رہی تھی۔ ایک پرانا زنگ آلود ڈبا پڑا ملا۔ ایک دن دو آدمیوں نے اپنے ازار بند نکالے اور اسی ڈبے سے باندھ کر گندا پانی نکالا، وہی بچوں کو پلایا۔ شام کو قلعہ کا دروازہ کھولا تو جسے جہاں جگہ ملی، وہیں بیٹھ گیا۔ سب دل شکست اور زخمی تھے۔ کسی کی گردن کٹی ہوئی، کسی

کا باز و نہیں تھا، کسی کی ٹانگ اور کسی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ یہ مہاجر کیمپ کیا تھا تین ماہ سے زائد کی ایک جیل تھی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ مر رہے تھے۔ زخمیوں اور بیماروں کا علاج میسر تھا نہ کوئی اور مدد ملی۔ روزانہ ایک ٹرک آتا اور لاشیں بھر کے لے جاتا۔ شروع میں ایک بڑھا گڑھا کھودتے اور لاشیں اس میں ڈال کر مٹی بھر دیتے۔ بعد میں انہیں جلانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں ایک ایک روٹی ملنے لگی۔ آدھی صبح اور آدھی شام کو کھا لیتے۔ پھر راشن دینا شروع کیا تو اس میں شیشہ پیس کر ملا دیتے جس سے ہلاکتوں میں اضافہ ہو گیا۔ ابا جی کے ماموں کا انتقال ہو گیا۔ ہماری پھوپھی روتی ہوئی آئیں کہ کچھ کرو، لیکن کیا کر سکتے تھے ایک پرانی چادر میں انکو لپیٹ کر، نماز پڑھ کر ٹرک والوں کے حوالے کر دیا۔ تایا زاد بھائی بشیر صاحب کا لڑکا فوت ہو گیا تو اسے بھی اسی طرح ٹرک والوں کے سپرد کر یا۔ لوگوں نے ایک رضا کار تنظیم بنالی تھی۔ جن کے پاس کچھ فالتو ہوتا، وہ سب اکٹھا کر کے ضرورت مند کو دے آتے۔ رفع حاجت کے لیے ۲۰ فٹ ایک لمبی کھائی کھود لی جس کا ایک حصہ خواتین اور ایک حصہ مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ جب ایک کھائی بھر جاتی تو اسے بند کر کے دوسری کھود لیتے۔ وہاں کالے گڑ کی ایک دکان بند تھی۔ گرمی اور بارش سے گڑ پگھل کر باہر آیا تو میٹھے کو ترسے ہوئے لوگ اسے فرش سے اٹھا کر چاٹ لیتے تھے۔

جب ہم لوگوں کو دھوکے سے شیراں والے دروازے بلایا گیا تھا، میرے خالہ زاد بھائی ممتاز جو بمشکل بارہ سال کے تھے۔ ماموں زاد بہن امراضیاء، ماموں زاد بھائی ضیاء، ماموں زاد بھائی بجل ٹیٹو، میری بھتیجی خورشید، بھتیجا اسلم اور سلیم یہ سب اس وقت بچے تھے اور ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ ہندوؤں اور سکھوں سے بچتے بچاتے نکلے مگر ایک سکھ کے ہاتھ لگ گئے وہ انکی جان لینے کی غرض سے انہیں گوردوارے لے گیا اور وہاں ایک سکھ سے کہا کہ انہیں بھاگنے مت دینا۔ میں اوپر سے تلوار لے کر آتا ہوں۔ ظالم سکھ اوپر گیا نیچے والے کو ترس آ گیا اور کہنے لگا: پترو! جاؤ نس جاؤ۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ ممتاز بھائی ان سب کو لے بھاگے بھوکے پیاسے تھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے اور ہمارے بزرگ کہاں ہیں خیر جب یہ ڈرے سہمے ایک سڑک پر پہنچے تو ایک

تانگے والا مل گیا اس نے پوچھا بچو! کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے ہیں پھر وہ رونے لگے۔ تانگے والا شریف آدمی تھا کہنے لگا: اب امن ہو گیا ہے تم تانگے میں بیٹھ جاؤ مسلمانوں کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔ راستے میں کچھ لوگ ملے جو قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے، ان کے ہمراہ سارے بچے بہادر گڑھ قلعہ آ پہنچے۔ جو لوگ بہادر گڑھ میں پناہ گزین تھے انکے عزیز و اقارب بچھڑ گئے تھے۔ کسی کی بیٹی نہیں تھی، کسی کی ماں غائب تھی اور کسی کا باپ نہیں تھا۔ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اغواء ہوئے یا شہید۔ خورشید، اسلم اور سلیم بیٹوں کی والدہ یعنی میری بھابھی غائب تھیں۔ پھر اعلانات ہونے لگے جو بچھڑے ہوئے ہوتے، انکے رشتے داروں کے نام پکارے جاتے۔ اس طرح بہت سوں کے بچھڑے ہوئے ملتے تو خوش ہو جاتے۔ کچھ دن بعد میری بھابی کے متعلق اعلان ہوا تو وہ ہم سے آ ملیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب شہیدوں کی لاشیں اکٹھی کی جا رہی تھیں تو وہ میرے تایا زاد بھائی لطیف شہید بھائی کی لاش کے نیچے تھیں۔ انکی ایک آنکھ میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک کیا تو ان میں جان تھی۔ لہذا انہیں ہسپتال داخل کر لیا گیا۔ جب طبیعت سنبھلی تو وہاں موجود سرجن دگوناتھ نے پوچھا: ''بیٹی تمھارا کوئی رشتے دار ہو تو نام بتاؤ، ہم تمھیں بہادر گڑھ پہنچا دیں۔ انھوں نے ابا جی مرحوم کا نام لیا تو سرجن صاحب پہچان گئے انھوں نے بھابھی کو بہادر گڑھ پہنچا دیا۔ والد صاحب کی فرمائش پر ایک نیک بزرگ ہمارے گھر قرآن پڑھا کرتے تھے، انکے دو بیٹے یعقوب اور ایوب بہادر گڑھ پہنچ گئے۔ انکی زبانی پتہ چلا کہ بلوائیوں نے انکے بڑے بھائی، چھوٹی بہن، والدہ اور والد کو شہید کر کے گھر کو آگ لگا دی تھی۔ وہ دونوں گھر پر نہیں تھے، اسی لیے بچ گئے۔ ابا جی کے ایک ہندو شاگرد ناتھ ہم سے ملنے قلعہ آئے تھے۔

جس محلے میں ہم نے پہلی دفعہ پناہ لی تھی، وہاں ایک بہت ہی نیک خدا ترس انسان مقبول صاحب رہتے تھے۔ وہ ہمارے رشتے کے ایک چچا اور پھلوں کے تاجر برکت اللہ بچ بچا کر بارہ دری ایک انگریز دوست کے پاس پناہ لینے پہنچے، مگر اسکی کوٹھی خالی تھی۔ وہاں ہندوؤں نے گھیر کر ان تینوں کو شہید کر دیا۔ کپڑے کے ایک تاجر انگوراں والی مسجد کے قریب رہتے تھے۔ وہ اپنے

جوان بیٹے کے ہمراہ بہادر گڑھ پہنچ گئے تھے۔انکے پاس خاصی رقم تھی جس سے انھوں نے لوگوں کے سونا چاندی کے زیورات سستے داموں خریدنے شروع کر دیئے۔انکے بال بچے فساد سے پہلے ملتان آئے ہوئے تھے۔انھوں نے ایک سکھ سے سودا طے کرلیا کہ ہمیں بہادر گڑھ سے دور لے چلو، پھر آگے ہم کوشش کر کے پاکستان پہنچ جائیں گے سکھ نے وعدہ کرلیا جب وہ قلعہ سے باہر نکلے تو اس وعدہ خلاف ظالم سکھ نے دونوں کو گولی مار کر شہید کر دیا اور رقم اور زیورات لے کر فرار ہو گیا۔پاکستان آ کر ہم نے ان کے بال بچوں کو بتایا کہ انھیں ہمارے سامنے شہید کر دیا تھا، مگر وہ یقین ہی نہیں کرتے تھے۔

دو ماہ بعد بہادر گڑھ کیمپ میں اعلان کیا گیا کہ جو کوئی ہنر جانتا ہے وہ کل دروازے پر آجائے۔مہاراجہ کو فارم کے لیے ضرورت ہے۔اس طرح میرے نانا تایا صاحبان اور کئی سو کے قریب لوگ جنگی قیدیوں کی طرح مسلح فوجیوں کے پہرے پر کام پر جانے لگے۔وہ کوئی دس بجے کیمپ سے نکلتے اور مہاراجہ کے فارم پر مختلف کام سرانجام دینے کے بعد شام پانچ بجے کے بعد لوٹتے۔راستے میں ایک دکان پڑتی تھی۔کوئی چیز خریدتے تو دکاندار قرآن مجید کے اوراق میں سودا لپیٹ کر دیتا۔اس پر دل کڑھتا تھا، مگر کچھ کہہ نہیں سکتے تھے واپس آ کر انہیں کسی محفوظ جگہ دبا دیتے۔تین ماہ بعد اعلان کیا گیا کہ مہاجرین تین ریل گاڑیوں کے ذریعے پاکستان پہنچائے جائیں گے۔ہم لوگ آخری ٹرین میں آئے۔بلوچ رجمنٹ ہماری حفاظت کے لیے ہمراہ تھی۔مردوں کو چھت پر بیٹھنے کا حکم تھا اور عورتوں بچوں کو بوگی میں۔گاڑی اس طرح چلائی گئی کہ زیادہ خطرناک علاقے رات کو گزر جائیں تاکہ نقصان کا احتمال کم از کم ہو۔ٹرین کہیں ہلکی کہیں تیزی سے پاکستان کی طرف رواں رہی۔کہیں ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں شہیدوں کی لاشیں یا ڈھانچے نہ پڑے ہوں۔کئی لوگ ریل کی چھت سے گر کر شہید ہو گئے۔گاڑی انکے لیے رک نہیں سکتی تھی دو دن بعد رات کے دو تین بجے ٹرین پاکستانی سرحدی ریلوے اسٹیشن ہربنس پورہ پہنچ گئی۔وہاں میرے تایا صاحبان کو پتہ نہیں کیا ہوا کہنے لگے: ہم آگے کسی کے ذمہ دار نہیں، سب اپنی اپنی

فکر کرو، چنانچہ والدہ صاحبہ، نانی جان، نانا جی ہم چار بہن بھائیوں کو لے کر ٹرین سے نیچے اتر آئے۔اندھیری رات تھی۔ہم بھائی بہنوں کے بنیان اور کچھ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔والدہ، نانی اور نانا جان بھی پھٹے کپڑوں میں تھے۔ہم لوگ فکرمند تھے کہ اب ہم لوگ کہاں جائیں۔اتنے میں کچھ آدمی ''جمیلہ جمیلہ'' کی آوازیں دیتے ہوئے ٹرین کے ساتھ آگے بڑھے۔میری نانی صاحبہ کہنے لگیں مجھے لگتا ہے میرا بیٹا حنیف ہے۔انکا کہنا ٹھیک نکلا۔وہ قریب پہنچے تو ماموں ہی تھے۔انکے ساتھ میرے عزیز خالو عبدالنبی تھے جو اپنی بھابھی کو ڈھونڈتے پھرتے تھے جن کا نام جمیلہ تھا۔اس لیے تینوں جمیلہ جمیلہ پکارتے ہم تک پہنچے تھے۔ماموں بمبئی سے کراچی پوسٹنگ کروا کر آ گئے تھے۔وہ کئی دن سے روزانہ بنس پورہ آ کر ہمارے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔خالو اور انکے بچے دہلی سے اور میرے پھوپھی زاد بھائی صدیق صاحب فیروز پور سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ان سے ملاقات ہوئی۔ہمارے ماموں ہمیں سیدھا کراچی لے آئے۔میرے ایک تایا دو تین سال بعد کراچی ملنے آئے۔دوسرے تایا نے حکومت سے زمین لینے کی لالچ میں ہمارے بھائی بہنوں اور والدہ کو کروڑ لال عیسن بلا لیا جہاں ہمارے قافلے والوں کو بسایا گیا تھا مگر جب زمین مل گئی تو انھوں نے والدہ اور بہن بھائیوں کو گھر سے نکال دیا۔اس برے وقت میں تایا مہر محمد صاحب کام آئے انہوں نے الگ مکان دلوا دیا۔گھر کے لیے ہر ضرورت کی چیز پہلے سے لا دیتے۔میں کراچی ماموں کے پاس رہا۔

سیٹھ چرن داس نے کئی دفعہ پیغام بھیجا کہ شریف صاحب کے بچے مجھ سے ملنے آئیں مگر پٹیالہ جانے کو جی نہیں چاہا۔۱۹۴۹ء میں پاک بھارت معاہدے کے تحت کچھ لوگ اغواء شدہ عورتوں اور بچوں کی تلاش میں پٹیالہ گئے تھے۔میرے ماموں اپنی بیٹی کو تلاش کرنے گئے تھے۔خالو عبدالنبی مرحوم ہمارے پڑوسیوں کی نواسی حنیفہ کو لانے میں کامیاب ہو گئے۔جب وہ اپنے والدین کے گھر سے نانا نانی کے گھر آ رہی تھی۔تو ایک سکھ نے اسے اغواء کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ایک بچہ بھی ہوا تھا۔حنفیہ پاکستان آ تو گئی، لیکن پٹیالہ واپس جانے کو دوڑتی تھی کیونکہ ممتا

اسے مجبور کر رہی تھی، مگر سرحد پر سخت پہرے نے اسے جانے نہ دیا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہے۔ اس کے نانا ضعیف تھے۔ ان پر برا وقت آیا، بیچارے بھیک مانگ کر گزر بسر کرتے رہے۔

کاش! جن لوگوں کو پاکستان کاٹتا ہے، وہ مشرقی پنجاب کی قربانیوں سے سبق سیکھیں۔ ہم نے بے شمار لوگوں کو اپنے سامنے شہید ہوتے دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ کسی کا بیٹا نہ رہا کسی کا شوہر نہ رہا۔ ہزاروں بہو۔ بیٹیاں اغواء ہوگئیں۔ سینکڑوں جوان لڑکیاں اور عورتیں اپنے معصوم بچوں سمیت کنوؤں میں کود گئیں۔ اردو بولنے والے ایک دوست نے مجھے ایک صاحب سے ملوایا کہ یہ پنجابی ہیں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ پتہ چلا وہ پٹیالہ کے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میرے گھر والے سب شہید کر دیئے گئے تھے۔ میرا نوجوان بھائی بی اے تھا وہ بھی شہادت پا گیا۔ میں دو سال کا تھا مجھے کسی نے اٹھا لیا۔ وہی میرے ماں باپ ہیں۔ سٹی ہائی اسکول میں ہمارے ایک نیک دل جوان استاد تھے، وہ گھاس منڈی میں شہید کر دیئے گئے۔ انکی ماں بھی شہید ہوئی۔ انکی چھوٹی بہن اور باپ پاکستان آ گئے، لیکن والد بیچارے اب تک دیوانے ہیں، اپنے جوان بیٹے کو نہ بھول سکے۔

۱۹۶۸ء کے لگ بھگ میری ماموں زاد بہن سلمٰی پٹیالے گئیں۔ رات بھر انہیں آوازیں سنائی دیتی تھیں: ''پانی پانی'' جیسا کہ ۱۹۴۷ء میں ہزاروں شہید پانی مانگتے مانگتے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان شہیدوں میں پانچ سال سے لے کر آٹھ برس کے بچے بھی تھے۔ شہیدوں کی آوازیں انہیں اتنے سال بعد بھی سونے نہ دیتی تھیں۔ اس لیے وہ تین چار دن بعد ہی واپس اپنے وطن پاک پہنچ گئیں۔ (۱۴)

میرا سفر آزادی

حاجی محمد خلیل شیخ

میرا نام حاجی محمد خلیل ہے۔ میرا تعلق فاضلکا ضلع فیروز پور سے ہے۔ میرے ساتھ فاضلکا کے مشہور ایڈووکیٹ خان رب نواز خان بھی تھے۔ ہم نے فاضلکا میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تھی اور ضلع فیروز پور کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع کیا تھا۔ ہم نے فاضلکا اور فیروز پور کے علاوہ ہانسی، روہتک، حصار اور گڑگانواہ میں بھی جا کر پاکستان کے حق میں تقریریں کرتے۔ فاضلکا شہر میں ہمارا مقابلہ ہندو کانگریسی لیڈروں سے تھا۔ ہم مسلم لیگ کے جلسے ابوہری گیٹ کے باہر کرتے جب کہ کانگریس ہندو چوک بازار میں پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف زہر اگلتے۔ یہ اسی دور کی بات ہے!

جب پاکستان کے قیام کی تحریک عروج پر تھی لاہور کے بریڈلا ہال میں ہندو مہاسبھا کا خفیہ اجلاس ہونے والا تھا۔ پاکستان کی نئی نسل کے لئے شاید بریڈلا ہال اور ہندو مہاسبھا کے نام اجنبی ہوں۔ اصل میں ہندو مہاسبھا، ہندوستان کے متعصب ہندوؤں کی جماعت تھی۔ جس کا واحد نصب العین یہ تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد پورے ہندوستان پر ہندو راج قائم کر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنا لیا جائے۔ لیکن مسلمان بھی بیدار ہو چکے تھے۔ قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت نے ان کے سینوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ولولہ انگیز قیادت نے ان کے سینوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مکمل اتحاد اور یگانگت کے ساتھ اپنی منزل پاکستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پاکستان ان کی آرزوؤں کا مرکز تھا جہاں وہ مکمل خودمختاری اور آزادی کے ساتھ دین اسلام کے شعائر پر کاربند رہتے ہوئے زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ کانگریس کسی قیمت پر تیار نہیں تھی کہ مسلمان ایک علیحدہ مملکت کا قیام عمل میں لائیں اور آزادی سے زندگی بسر کریں۔

ہندو مہاسبھائیوں میں بھی ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ہندو سامراج نے پاکستان کے قیام کے خلاف

اپنی ریشہ دوانیوں اور ناپاک سازشوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اسی سلسلے میں لاہور کے بریڈلا ہال میں ان کی ایک خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی۔ ہر مسلمان مسلم لیگ میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں مسلم لیگ کا پرچم ہوا کرتا۔ میں بھی پنجاب مسلم لیگ کا ایک کارکن تھا۔ مجھے ہدایت کی گئی کہ میں بریڈلا ہال میں کسی طرح ہندو مہاسبھائیوں کی خفیہ میٹنگ میں جا کر مسلمانوں کے خلاف ان کے ناپاک عزائم کا سراغ لگاؤں۔ ہندو مہاسبھائیوں کی خفیہ میٹنگ میں کوئی مسلمان نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر میں اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھا۔ آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی کہ میں ہندو بن کر مہاسبھائیوں کی خفیہ میٹنگ میں جانے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں نے ہندوؤں جیسا حلیہ بنایا، کھدر کا کرتا پاجامہ پہنا، سر پر کھدر کی گاندھی کیپ اوڑھی، ماتھے پر لال رنگ کا تلک لگایا اور بریڈلا ہال کی طرف چل پڑا۔ اس زمانے میں بریڈلا ہال ایک ڈھلوان چھت والی انگریزی وضع کی اونچی عمارت تھی جو لاہور کے موری دروازے کے باہر دورویہ سڑکوں کے عین درمیان میں واقع تھی۔ یہاں مشاعرے اور جلسے وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ اس کی ایک جانب پنجاب پولیس کے کچھ کوارٹر بھی تھے۔ آج تو اس بریڈلا ہال کا نشان بھی باقی نہیں۔ آج اس جگہ ایک کشادہ سڑک ہے جس پر روزانہ ہزاروں گاڑیاں گذرتی ہیں۔ شاید ہی کسی کو خیال آتا ہو کہ کبھی یہاں تحریک پاکستان کے ایک جیالے سپاہی اور پنجاب مسلم لیگ کے پرجوش کارکن نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی ایک گھناؤنی سازش کو ناکام بنایا تھا۔ اس وقت اگر ان ہندو مہاسبھائیوں کو علم ہو جاتا کہ میں ہندو نہیں بلکہ مسلمان ہوں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ میری تکہ بوٹی کر دیتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی لیکن میرے دل میں ایمان کی شمع روشن تھی، خدا اور اس کے رسول ﷺ کا سایہ میرے اوپر تھا۔ میں نے اسلام اور پاکستان کی خاطر اپنی جان کو داؤ پر لگایا تھا۔ کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہ ہوا۔ ایک والنٹیئر نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو میں نے اپنا نام بھگوان داس بتایا اور کہا کہ میں رام نگر کا رہنے والا ہوں اور وہاں کی مہاسبھائی کمیٹی کا ممبر ہوں۔ یہ بات میں نے اتنے اعتماد سے کہی کہ انھیں یقین

آ گیا۔ اس طرح میں ہندو کے بھیس میں بریڈلا ہال میں داخل ہو گیا۔

وہاں پنجاب بھر کے مسلمان دشمن اور کٹر ہندو مہاسبھائی جمع تھے۔ پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف بڑی دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ قائد اعظمؒ نے اپنی بے مثال بصیرت سے کس قدر بروقت ہندو ذہنیت کو پہچان لیا تھا۔ ایک ہندو مہاسبھائی کہہ رہا تھا: ''ہم بھارت ماتا کے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔ مسلمان ملیچھ ہیں۔ ہم انہیں پاکستان نہیں بنانے دیں گے۔ ہم انہیں شودروں سے بھی زیادہ نیچ سمجھتے ہیں۔ ہم نے غلطی کی جو شدھی سنگھٹن پر پہلے دھیان نہ دیا۔ ہم ان مسلمانوں کی شدھی کر کے انہیں ہندو بنا دیتے تو آج یہ پاکستان کا مطالبہ نہ کرتے''۔ دوسرے ہندو مہاسبھائی نے بھڑک کر کہا: ''مسلمان اچھوتوں سے بھی بدتر ہیں۔ ہم ان کی شدھی نہیں کریں گے۔ ہم انہیں ایک ایک کر کے ختم کر دیں گے''۔

ایک اور ہندو مہاسبھائی بولا: ''مصیبت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر، مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہو چکے ہیں اور اتہاس (تاریخ) ہمیں بتاتی ہے کہ جب مسلمانوں میں اتفاق ہو جاتا ہے، جس کو دنیا کی بڑی سے بڑی آندھی اور طوفان بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے''۔ اس پر جالندھر سے آئے ہوئے ایک ہندو مہاسبھائی نے غصیلی آواز میں کہا: ''تو کیا ہم مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ کیا ہم انہیں بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کی اجازت دے دیں''۔ ایک موٹی توند والے ہندو مہاسبھائی نے ہاتھ فضا میں لہراتے ہوئے کہا: ''ہمارے پاس دولت ہے، پیسہ ہے۔ کانگریس ہماری مدد کر رہی ہے۔ ہم اسلحہ کے گودام بھر لیں گے۔ ہم شاہ عالمی کو ہندو اسلحہ کی چھاؤنی بنا دیں گے اور یہاں کے ایک بھی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، اور مہاراج! جب مسلمان ہی باقی نہیں رہیں گے تو پاکستان کہاں بنے گا''۔ اس پر ہندو مہاسبھائیوں نے بندے ماترم کے نعرے بلند کئے۔ میں خاموش ان کے درمیان ایک طرف دبک کر بیٹھا ان کی زہر بھری اسلام دشمن باتیں سن رہا تھا۔ شاہ عالمی کے ایک مہاسبھائی نے کہا: ''سب سے پہلے ہمیں اس آدیش کا پالن کرنا ہے جس کی وجہ سے ہم یہاں اکھٹے ہوئے

ہیں''۔ میں یہ سن کر چونک اٹھا۔ مجھ پر اب اس خفیہ میٹنگ کا راز کھلا۔ یہ مہا سبھائی لاہور کے ایک خاص علاقے کی مسجدوں کو مرحلہ وار شہید کرنے کا ناپاک منصوبہ تیار کرنے کے لئے وہاں جمع ہوئے تھے۔ اس ناپاک سازش کی پوری تفصیل مجھ پر واضح ہوگئی۔ میں پانی پینے کے بہانے وہاں سے کھسک آیا۔ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا۔ وہاں سے سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہندوؤں کا لباس اتار کر میں نے مسلمانوں والے کپڑے پہنے اور مسلم لیگ کے دفتر جا کر ہائی کمان کو بریڈ لا ہال والی مہا سبھائی خفیہ میٹنگ کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اسی وقت مسلم لیگ نے اس خاص علاقے کی مساجد کے گرد اپنے رضا کاروں کا پہرہ لگا دیا۔ یوں ہندو مہا سبھائیوں کی ''ایک اور اسلام دشمن'' سازش ناکام بنا دی گئی۔

پاکستان کے لئے ہزاروں گمنام شہیدوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دی ہیں۔ مسلم لیگ کے پرچم تلے، قائداعظمؒ کی بے لوث قیادت میں ہم نے جو کچھ بھی کیا وہ صرف اسلام اور پاکستان کی خاطر کیا۔ نام ونمود کے لئے نہیں۔ انہی دنوں میں ہم نے فاضلکا میں اکابرین مسلم لیگ کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی جس میں نواب افتخار الدین ممدوٹ، ملک برکت علی، راجہ غضنفر علی خان اور مولانا ظفر علی خان، ایڈیٹر ''زمیندار'' نے بھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کا اہتمام فاضلکا سٹی مسلم لیگ کی طرف سے کیا گیا تھا۔ مسلم لیگی زعما کی تقریروں نے مسلمانوں میں ایک نیا جوش اور نیا جذبہ پیدا کیا۔ کانگریس کی ہندو قیات منہ دیکھتی رہ گئی۔ جلسہ گاہ ''اللہ اکبر'' مسلم لیگ زندہ باد'' قائداعظمؒ زندہ باد'' اور ''پاکستان زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد فاضلکا پولیس نے مجھے حراست میں لے لیا۔ ہندو ایس آئی کے حکم پر مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ٹھیک گیارہ بجے رات تھانے کے ارد گرد کی فضاؤں میں قائداعظمؒ زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔ فاضلکا کے مسلمان جلوس کی صورت میں تھانے پہنچ گئے تھے۔ وہاں کے بااثر ہندو کانگریسیوں نے بہت کوشش کی کہ مجھے کسی صورت رہا نہ کیا جائے لیکن جب مسلمان جلوس کی شکل میں وہاں پہنچنے لگے تو ہندو ایس آئی مجھے رہا کرنے پر مجبور ہوگیا۔

قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز اور بے لوث قیادت میں تحریک پاکستان اپنی منزل کی جانب برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب انگریز نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور قیام پاکستان کا اعلان کر دیا گیا۔ اس روز ہماری خوشیوں کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ ہندو سامراج کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔ آخر انہوں نے نہتے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ سکھ بھی ہندوؤں کے بہکاوے میں آ کر ان کے ساتھ اس قتل عام میں شامل ہوگئے۔ اس زمانے کی تلخ یادیں آج بھی میرے حافظے کی لوح پر زندہ ہیں اور ہر سال چودہ اگست کو مجھے یاد دلاتی ہیں کہ کس طرح ہم آگ اور خون کا سمندر عبور کر کے پاکستان پہنچے تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے تو پاکستانی پرچم لہراتا دیکھ کر ان کے چہرے وفور عقیدت سے چمک اٹھتے۔ آج مجھے وہ بوڑھی خاتون یاد آ رہی ہے جسے اس کے بچوں نے چارپائی پر اٹھایا ہوا تھا۔ جوان بیٹوں کے جسم سکھوں اور ہندوؤں کے برچھوں سے زخمی تھے۔ بوڑھی خاتون بھی شدید زخمی تھی۔ پاکستان کی پاک سرحد پر قدم رکھتے ہی مسلم لیگ کے رضا کار آگے بڑھے۔ بوڑھی خاتون نے اپنی بند ہوتی پلکیں کھول کر اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا اور کمزور آواز میں پوچھا: پتر پاکستان آ گیا اے؟'' بیٹوں نے کہا ہاں ماں! ہم پاکستان میں ہیں''۔ بوڑھی خاتون نے کہا: مجھے پاکستان کا جھنڈا دکھاؤ۔ مسلم لیگ رضا کار اور ڈاکٹر اس خاتون کو طبی امداد کے لئے کیمپ میں لے جانا چاہتے تھے مگر بوڑھی خاتون سب سے پہلے پاکستانی پرچم دیکھنا چاہتی تھی۔ بالآخر جب اسے ایک جگہ لہراتا ہوا پاکستانی پرچم دکھایا گیا تو اس نے کانپتے جھری والے ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور کہا۔ ''میرے پترو! پاکستان کی حفاظت کرنا!'' اور یہ کہہ کر اس نیک دل زخمی خاتون نے اپنی جان، جان آفرین کے حوالے کر دی۔ اور کس کس کا ذکر کروں۔ ہماری بوڑھی نسل کے سینوں پر ہندو سامراج کے لگائے ہوئے گہرے زخموں کے نشان آج بھی باقی ہیں اور یہ نشان ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم نے ایک عیار، ظالم اور اسلام دشمن طاقت کو شکست دی تھی۔ اب ہماری نئی نسل کا فرض ہے کہ وہ اس قیمتی ورثے کی حفاظت کرے اور اس کی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ میں نے

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو کر تحریک پاکستان کے ساتھ اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا اور خدا کے فضل و کرم سے آج بھی جب میں عالم پیری میں ہوں، مسلم لیگ سے ہی وابستہ ہوں۔ میرے سات بیٹے ہیں جو سب کے سب مسلم لیگ کے کارکن ہیں۔

اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ بار بار ابھر رہا ہے۔ یہ چہرہ میری اہلیہ کے حقیقی ماموں محمد شریف کا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں، ہمشیرہ اور دیگر اہل خانہ کے ہمراہ مغلپورہ، تحصیل ہانسی ضلع حصار میں مقیم تھے۔ ان کے کنبے کے افراد کی تعداد چودہ تھی۔ ان سب کو ہندو غنڈوں نے شہید کر دیا۔ صرف دو سال کا ایک بچہ کسی طرح زندہ سلامت رہا جسے ایک بزرگ کھیتوں میں سے اٹھا کر اپنے ساتھ پاکستان لے آئے۔ آخر ان کی ملاقات بچے کے حقیقی پھوپھا سے ہوگئی اور بچہ ان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس بچے کا نام نور محمد ہے۔ اب وہ خود بچوں والا ہے۔ آج شیخ نور محمد ولد محمد شریف ہانسی والے کے نام سے جان محمد کالونی ملتان میں آباد ہے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس کے بچے پاکستان اور اسلام کی بابرکت فضاؤں میں پرورش پا رہے ہیں۔ جس بزرگ نے اس بچے کو اس کے پھوپھا کے حوالے کیا تھا انہوں نے بتایا کہ اس بچے کے خاندان کے سبھی افراد شہید کر دیئے گئے تھے۔ یہ سارا اندوہناک واقعہ انہیں مہاجر کیمپ میں اس شخص نے سنایا جس نے انہیں بچے کے پھوپھا سے ملایا تھا۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ جب محمد شریف کے گھر پر ہندو اور سکھ غنڈوں نے حملہ کیا تو وہ اس مکان کی چھت پر موجود تھا۔ ہندو غنڈے ''ہر ہر مہادیو'' کے نعرے لگاتے، چھریاں لے کر محمد شریف کے مکان پر ٹوٹ پڑے۔ یہ آدمی اپنی جان بچانے کے لئے چھت کے ایک گوشے میں بنے ہوئے کبوتروں کے بڑے ڈربے میں گھس کر بیٹھ گیا۔ وہاں سے اس نے نیچے صحن میں دیکھا کہ محمد شریف اپنے سب سے چھوٹے بچے کو گود میں لئے تخت پر بیٹھے تھے کہ ہندو غنڈوں نے ان پر برچھیوں سے حملہ کر دیا۔ بچہ ان کی گود سے نیچے لڑھک گیا۔ خوش قسمتی سے یہ بچہ تخت کے نیچے ہو گیا تھا۔ محمد شریف وہیں شہید ہو گئے۔ ان کی بیوی انہیں بچانے کے لئے آگے بڑھیں تو ایک ہندو نے ہر ہر مہادیو کا نعرہ لگایا اور برچھی خاتون

کے سینے میں اتار دی۔ محمد شریف کی ہمشیرہ کوٹھڑی سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگ رہی تھی کہ ہندو غنڈوں نے انہیں وہیں دبوچ لیا اور ان کی گردن تن سے جدا کر دی۔ اس کے بعد محمد شریف کے دوسرے بچوں کو انہوں نے قہقہے لگاتے ہوئے ہوا میں اچھال اچھال کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

جب ہندو غنڈے مکان کو آگ لگانے کے بعد وہاں سے چلے گئے تو یہ شخص ڈربے میں سے نکلا اور ڈرتے کانپتے صحن میں پہنچا۔ اس کے ہوش و حواس قابو میں نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود اسے یہ معلوم تھا کہ محمد شریف کا چھوٹا بچہ تخت کے نیچے گھس گیا تھا۔ اب جو اس نے تخت کے نیچے دیکھا تو بچہ وہاں نہیں تھا۔ یہ بچہ قتل عام کے وقت خدا جانے کب اور کس طرح وہاں سے نکل کر مکان کے باہر کھیتوں میں چھپ گیا تھا۔ وہ شخص بھی اپنی جان بچا کر باہر کو دوڑا۔ یہ شخص صحن کا زینہ چڑھ کر چھت پر آ گیا اور اس نے دوسری طرف کماد کے کھیتوں میں چھلانگ لگا دی۔ گاؤں میں جتنے مسلمانوں کے گھر تھے ان سب میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ شخص کماد کے کھیتوں میں چھپا رہا۔ اس کا اپنا کنبہ حصار میں بڑے بھائی کے ہاں مقیم تھا جس کے صرف تین افراد بڑی مشکل سے اپنی جانیں بچا کر ایک قافلے کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کی حفاظت میں پاکستان پہنچے۔

سارا دن یہ نوجوان کماد کے کھیتوں میں چھپا رہا۔ جب سورج غروب ہونے لگا اور ہندوؤں کے نعروں کی آوازیں بتدریج معدوم ہوتی چلی گئیں تو یہ رینگتے ہوئے کماد کے کھیتوں سے باہر نکلا۔ گاؤں پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے کھیتوں سے نکل کر ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ کھیتوں اور میدانوں میں مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ اس سارے علاقے سے واقف تھا۔ وہاں سے اس نے حصار کا رخ کیا۔ یہ ایک طویل اور خطرناک سفر تھا مگر وہ کرتا بھی کیا۔ اسے ہر حال میں اپنے بال بچوں کی فکر تھی۔ وہ ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ رات کے اندھیروں میں کھیتوں اور خشک میدانوں سے گذرتا، اور دن کے وقت کسی درخت یا ٹیلے ٹبے کی کھوہ میں چھپا رہتا۔ حصار میں بھی مسلمانوں کے گھر جلائے جا رہے تھے۔ وہاں کرفیو لگا ہوا تھا۔ آخر وہ

گرتا پڑتا، بھوکا پیاسا ایک مہاجر کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں سے اپنے محلے کے کچھ لوگ ملے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اس کے گھر کے صرف تین افراد زندہ بچے تھے جو کل ہی ایک قافلے کے ساتھ پاکستان چل دیئے۔ یہ شخص نیم جان سا ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ پھر کچھ دیر ستانے کے بعد وہاں سے ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس زمانے میں قافلے میں شامل ہوجانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ ضرور پاکستان پہنچ جائیں گے۔ راستے میں کئی جگہوں پر دائیں بائیں، بچے جوان، اور بوڑھے راستے میں شہید ہوجاتے۔ ان کے قافلے پر بھی منڈی ڈبوالی سے کچھ آگے جا کر حملہ ہوگیا۔ بس کیا تھا قافلے میں ایک افراتفری سی مچ گئی۔ چیخ وپکار سے آسمان گونج اٹھا۔ مسلمان نہتے تھے۔ وہ رائفلوں، برچھیوں اور کرپانوں کا کہاں تک مقابلہ کرتے۔ ہندو ''بجرنگ بلی کی جے'' کا نعرہ لگاتے نہتے مسلمانوں کو کاٹ رہے تھے۔ یہ شخص بھی ایک طرف کو بھاگ اٹھا۔ غیر شعوری طور پر اس نے اپنا رخ دریائے ستلج کی طرف کرلیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دریا پار پاکستان کی سرزمین شروع ہوجاتی ہے۔ مگر ستلج وہاں سے بہت دور تھا۔ وہ ابوہر اور فاضلکا کی طرف بھی نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ ادھر ہی سے وہ جان بچا کر نکلا تھا۔ اس کی جانب گنگانگر کا علاقہ تھا۔ وہ ابوہر اور گنگانگر کے درمیان سے ہوتا ہوا ستلج عبور کرنے کا خواہشمند تھا۔ کھیت ختم ہوگئے تھے۔ اب رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اندھیرے میں وہ شخص ہندوؤں کی نظروں سے چھپ کر سفر کرسکتا تھا۔ بھوک اور پیاس سے اس کا برا حال ہو رہا تھا لیکن دل میں ایمان کی شمع روشن تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ ہر حالت میں پاکستان ضرور پہنچے گا۔ وہ اپنی دھن میں چلتا رہا۔ مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد راستے میں ایک کنواں آ گیا۔ وہاں ایک ٹیوب ویل بھی لگا تھا۔ اگرچہ ٹیوب ویل ویران تھا مگر اس کے چاروں طرف پانی کھڑا دکھائی دیا۔ اس شخص نے پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا اور آگے روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے چھولئے کا ایک کھیت نظر آیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور چھولیا توڑ توڑ کر کھانے لگا۔

وہ ساری رات چلتا رہا۔ صبح ہوئی تو وہ ایک بنجر میدان میں پہنچ گیا۔ دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ

ایک سیم نالے کے پل کے نیچے تمام دن چھپا رہا۔ رات ہوئی تو اس نے دوبارہ سفر شروع کیا تین راتوں کے سفر کے بعد آخر دریا کے کنارے کے درخت نظر آئے۔ اس کے جسم میں چلنے کی طاقت نہیں رہی تھی لیکن دریا کنارے والے درختوں کو دیکھ کر اس کے اندر نیا جوش پیدا ہوگیا۔ پاکستان کا سبز ہلالی پرچم اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔ دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتا ہوا ابھی وہ دریا کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک طرف سے سکھوں کا جتھا کرپانیں لہراتا اس کی طرف بڑھا۔ وہ دریا کی طرف بھاگا۔ تین سکھ اس کے پیچھے تلواریں لہراتے دوڑے۔ وہ دریا کی طرف بے تکان دوڑنے لگا۔ موت اس کے تعاقب میں تھی اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے تصور میں صرف اور صرف ہلالی پرچم تھا۔ اب ایک سمت سے چند ہندو غنڈے ''ہر ہر مہادیو'' کے نعرے لگاتے اس کے پیچھے لپکے۔ وہ سب لوگ اسے پاکستان پہنچنے سے پہلے قتل کردینا چاہتے تھے۔ لیکن یہ مرد مجاہد دریا کی طرف طوفان کی طرح بڑھ رہا تھا اور پھر دریا اس کے سامنے آ گیا۔ دریا کا کنارہ اونچا تھا۔ دشمن اسلام اس کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ بلم اور برچھیاں اس کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور بپھرے ہوئے دریا میں چھلانگ لگادی۔ دریا چڑھاؤ پر تھا اور اس کے پانی میں بھنور پڑ رہے تھے۔ جلد ہی وہ تند و تیز موجوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر جیسے تیسے تیر کر وہ دریا پار کر گیا۔ اب وہ پاکستان کی سرزمین پر تھا جہاں اس کی زندگی، اس کی عزت و حرمت محفوظ تھی۔ جہاں وہ دین اسلام کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرسکتا تھا اور اپنے بچوں کو پروان چڑھا سکتا تھا۔ یہ محض ایک نوجوان کی کہانی نہیں ہے۔ ایسے ہزاروں نوجوان آج بھی وطن عزیز میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو آگ اور خون کے دریا عبور کر کے ساحل مراد پر پہنچے تھے۔ (۱۵)

گوشہ عافیت

ڈاکٹر صلاح الدین خواجہ

میری پیدائش ۶ دسمبر ۱۹۲۲ء کو امرتسر میں ہوئی۔ ڈاکٹر حمید اللہ خواجہ جو میرے والد کے قریبی عزیز تھے، انہوں نے اڑھائی سال کی عمر میں مجھے گود لے لیا۔ میرے والد شیخ پیر سراج الدین خواجہ جوتوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ خواجہ درویش مزاج انسان تھے۔ انہوں نے انگریز راج کی سختیاں اور غیر مسلموں کی عیاری کو جانتے ہوئے میری تعلیم کی طرف بہت توجہ دی۔ ان کی تربیت نے مجھے عزم وحوصلہ عطا کیا اور حق گوئی وبے باکی جیسی خصوصیات کو اپنانے کی صلاحیت پیدا کی۔ میں نے ابتدائی تعلیم ایم اے او اسکول امرتسر سے حاصل کی اور بعد میں ایم اے او کالج امرتسر میں زیر تعلیم رہا۔ ڈاکٹری کی تعلیم بھی امرتسر ہی میں حاصل کی۔ ڈاکٹر حمید اللہ جو چوک بجلی والا نزد ہال بازار میں پریکٹس کرتے تھے ان کی وفات کے بعد ۱۹۴۴ء میں وہ ڈسپنسری میں نے سنبھال لی۔ ڈاکٹر صاحب کی تعلیم وتربیت کا اثر تھا کہ بچپن سے ہی قومیت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی امرتسر جیسے معرکہ آراء شہر میں سیاسی جلسے ہوتے دیکھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی مذہبی لگاؤ کے ساتھ ساتھ سیاسی بصیرت بیدار ہوئی۔ پھر جب سیاسی لیڈروں کی رفاقت نصیب ہوئی تو یہ بات کھلی کہ ہندو سکھ مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان کی پرزور مخالفت کرتے ہیں۔ شروع ہی سے محرم الحرام پر ہر سال ہندو مسلم فساد ہوئے اور یہ ایک معمول بن چکا تھا۔ اب مجھ میں ان سے مقابلہ کی جرأت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ جوں جوں جوان ہوتا گیا صلاح الدین ایوبی کا کردار ذہن میں انگڑائیاں لینے لگا اور میں اس وقت کا انتظار کرنے لگا کہ جب حکم جہاد ہو اور ۱۹۴۷ء کے فسادات نے یہ موقع فراہم کر دیا جو میرے اندر کا مسلمان چاہتا تھا۔ میں تو کیا ہر ذی ہوش مسلمان پاکستان کا خواب دیکھتا تھا۔ جہاں مسلمان آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں جو واقعات مجھے اور میرے رفقاء کو پیش آئے انہیں یاد کر کے

دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں چند بہت ہی مختصر واقعات تحریر کر رہا ہوں تا کہ نئی نسل کو اندازہ ہو کہ یہ گوشہ عافیت، جسے ہم پاکستان، ''وطن عزیز'' کہتے ہیں مسلمانوں نے کتنی قربانیوں اور کتنی کاوشوں سے حاصل کیا۔ نظریہ پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کتنی جانیں شہید ہوئیں، کتنی ماؤں بہنوں، بیٹیوں نے اپنی عصمتیں لٹائیں، کتنی معصوم جانوں نے جام اجل پیا۔ ماضی کی یہ داستانیں، نئی نسل کو اس لئے سنا رہا ہوں کہ اسے معلوم ہو سکے قوموں کی زندگی میں آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی۔ میں اپنے والدین کے ہمراہ کٹڑہ مہر سنگھ کوچہ بدروالا نزد گلی مسجد والی میں رہائش پذیر تھا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی تھی۔ مذکورہ علاقہ میں، تقریباً تین سو کنبے مسلمانوں کے آباد تھے۔ یہ آبادی چاروں طرف سے ہندوؤں سکھوں سے گھری ہوئی تھی۔ اکالیوں والا باغ، گورو بازار، کاٹھیانوالا بازار، چورستی اٹاری، بازار بتی ہٹاں ہمارے چاروں طرف موجود تھے۔ میری پیدائش سے کچھ سال پہلے، جلیانوالہ باغ کا سنگین واقعہ ہو چکا تھا جہاں سے میرے حقیقی والد اور چچا بمشکل اپنی جانیں بچا کر گھر پہنچے تھے۔ میری عمر دس برس کی ہوگی جب ایک دن میرے چچا معراج الدین اپنی دکان بند کر کے شام کو گھر لوٹ رہے تھے کہ راستے میں ایک سکھ نے انہیں قتل کر دیا۔ دوسرے روز اس واقعہ پر مسلمانوں نے ہڑتال کی۔ چند روز گرما گرمی رہی، کچھ پکڑ دھکڑ ہوئی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس سے ہندو سکھ اور بھی دلیر ہو گئے۔ اور انہوں نے ان مسلمانوں کو بھی تنگ کرنا شروع کیا جو مسلمان کٹڑہ جیمبل سنگھ سے گرو بازار کے ذریعے گھروں کو آتے جاتے تھے۔ اکا دکا انہیں بھی قتل کرنا شروع کر دیا گیا۔ ہندو سکھ نقدی چھین لیتے اور پولیس کچھ کاروائی نہ کرتی۔ اب مسلمان جتھوں کی شکل میں آنے لگے تا کہ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

میں سکول میں پڑھتا تھا کہ ایک اشتہار آریہ سماج والوں کی طرف سے شہر کی دیواروں پر چسپاں نظر آیا۔ عنوان تھا ''اسلامی مساوات کی دھجیاں فضائے آسمانی پر'' اس اشتہار میں مذہب اسلام اور نبی کریم ﷺ کی ذات پر بڑے رکیک حملے کئے گئے تھے۔ میں اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر ظہور اور شیخ محمد اسحاق نے آریہ سماج والوں کے اس اشتہار کے جواب میں ''ہندو مذہب کے

ڈھول کا پول'' کے عنوان سے اشتہار شائع کرایا۔ اس میں ذات پات شودروں، اچھوتوں سے ان کا ناروا سلوک ان کی اپنی کتابوں کے حوالے سے بیان کیا۔ جس پر ہندو بہت جز بز ہوئے۔ میں اس ایم اے او اسکول امرتسر میں مڈل کا طالب علم تھا اور ڈاکٹر ظہور اور شیخ اسحاق مسلم ہائی اسکول امرتسر میں میٹرک کے طالب علم تھے۔ پولیس نے ہمیں ہمارے اسکولوں سے گرفتار کیا اور سٹی تھانے میں بند کر دیا۔ ہماری گرفتاری کی خبر سن کر انجمن اسلامیہ کے تینوں اسکول ایم اے او اسکول، مسلم ہائی اسکول حسین پورہ، اسلامیہ ہائی اسکول کٹڑہ خزانے کے تمام طالب علموں نے اپنے مسلمان استادوں کی سرکردگی میں شہر میں جلوس نکالا۔ شیخ صادق حسین، شیخ محمد صادق، غازی عبدالرحمٰن، شیخ حسام الدین جیسے لیڈر ہمیں کوتوالی میں ملنے آتے۔ کچھ لیڈر کانگریسی ذہن رکھتے تھے۔ ہمیں سرزنش کی اور ہمارے والدین کو سختی سے نگرانی کرنے کو کہا گیا۔ مگر شیخ صادق حسین اور شیخ محمد صادق جیسے مسلمان بھائیوں نے ہمیں حوصلہ دیا اور ضمانت پر رہا کرایا۔ ان کی مدد سے ہمارے حوصلے بلند ہو گئے۔

اب ہمیں سیاسی لیڈر، جو مسلم لیگی ذہن رکھتے تھے اپنے جلسوں اور میٹنگوں میں بلانے لگے۔ ادھر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس وقت کی ٹیم عسکری تنظیم خاکسار تحریک میں حصہ لیں تاکہ خاکسار رضا کار جو راتوں کو پریڈ کرتے، کبھی کبھی ہمارے محلے کی طرف آنکلتے ان کے پریڈ سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہندوؤں سکھوں کو یہ اندازہ ہونا شروع ہو گیا کہ شہر کے دوسرے علاقوں کے مسلمان بیدار ہیں اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کو امداد فراہم کریں گے۔ مجھے محلے کا سالار بنا دیا گیا۔ ہم پچیس نوجوان رات کو محلے کا پہرہ دیتے اور ہر روز ایک گھنٹہ پریڈ کرتے۔ ہفتہ میں ایک روز شہر کے تمام رضا کار ہمارے محلے میں اکھٹے ہوتے اور تبادلہ خیال کرتے۔ اس تنظیم سے ہندو سکھ ہمیں تنگ کرنے سے قدرے رک گئے۔ خدا کے فضل سے اب تک قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں تحریک پاکستان مضبوط ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور پاس ہوئی اور پاکستان حاصل کرنے کا عزم پختہ ہو گیا۔ یہ عزم ہر مسلمان کے دل کی آواز بن گیا۔ اس سے ایک سال بعد

قائداعظمؒ امرتسر تشریف لائے۔ انہوں نے نہایت موثر تقریر کی اور علیحدہ وطن کا تصور واضح کرتے ہوئے اس کو پانے کے لئے ہر قسم کی قربانیوں کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا۔ وہ وطن جس کی بنیاد لا الہ الا اللہ ہو گی جہاں اغیار کا ظلم نہ ہو گا، جو امن و آشتی کا گہوارہ ہو گا۔ ایسے جذبات سے سرشار ہو کر میں مسلم لیگی نیشنل گارڈ میں بطور رضا کار شامل ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ روزانہ جلسوں میں شامل ہونا میرا معمول بن گیا۔ کئی بار پولیس نے پکڑا پھر چھوڑ دیا اور اسی سول نافرمانی میں جیل یاترا بھی کرنا پڑی۔ شیخ صادق حسن، شیخ محمد صادق، ملک غلام نبی ایم اے، محمد حسین ٹین ساز شہر کے چیدہ چیدہ سیاسی، سماجی اور دینی لیڈر جن کا تعلق مسلم لیگ سے تھا ان دنوں جیل میں تھے۔

پانچ مارچ ۱۹۴۷ء کو دن کے تقریباً دس بجے بجلی والا چوک میں تانگوں اور سائیکلوں پر سوار آٹھ سکھ ڈھول بجاتے ہوئے آئے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ ان میں سے ایک نے مسلمان سلاطین، قائداعظمؒ اور دیگر مسلمان رہنماؤں کے خلاف تقریر کی اور ساتھ اعلان کیا کہ اسی رات دس بجے گیانی کرتار سنگھ گوردوارہ دربار صاحب میں تقریر کریں گے۔ تمام سکھوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہاں جمع ہو جائیں۔ اس کے بعد اس نے نعرہ لگایا ''جو مانگے گا پاکستان اس کو بھیجو قبرستان'' یہ ہمارے لیڈر تارا سنگھ کا حکم ہے۔ ست سری اکال کا نعرہ لگا کر یہ تانگہ چوک گول ہٹی کی طرف مڑ گیا۔ بجلی والا چوک کے کچھ نوجوان پہلے ہی مشتعل تھے اس تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ ان کے پیچھے لپکے میں بھی ان کے ہمراہ چل پڑا۔ چوک گول ہٹی پہنچ کر تارا سنگھ کے ان چیلوں نے مسلمانوں اور قائداعظمؒ اور پاکستان کے خلاف نعرے لگائے۔ تارا سنگھ کی تقریر کے لئے اعلان بھی تانگہ والے سکھ کر ہی رہے تھے کہ گول ہٹی کی اوپر کی منزل سے ایک سکھ نے بڑا سا گٹھا پھینکا جس میں لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور کرپانیں تھیں اور ساتھ ہی پھینکنے والے سکھ نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ یہ چیزیں لو اور مسلمانوں پر حملہ کر دو۔ اس وقت میرے پاس بجلی والے چوک کے چند نوجوانوں کے علاوہ بھی پہلوان اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ سکھوں کی بجائے ہم لوگوں نے گٹھے پر قبضہ

کرتے ہی ان پر حملہ کر دیا۔ چند منٹوں میں فیصلہ ہو گیا۔ دو سکھ مارے گئے جو اعلان سننے کے لئے جمع ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ دکاندار دکانیں بند کرنے لگے۔ ہم لوگ بھی بجلی والا چوک واپس آ گئے۔ اس حادثہ کی خبر تمام شہر میں پھیل گئی۔ شہر میں خوف وہراس پھیل گیا اور لوگ کاروبار بند کر کے گھروں میں پناہ لینے لگے۔

ایک بجے کے قریب شیخ محمد عاشق سب انسپکٹر انٹی کرپشن بازار سے گزرتے ہوئے میری ڈسپنسری میں آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ امرتسر میں آئندہ دو دنوں میں جو ہندو مسلم فساد ہوگا اس میں انتظامیہ بالکل دخل نہیں دے گی۔ بڑا خون خرابہ ہوگا اپنی جان و مال کی حفاظت خود کرنا ہوگی۔ تم لوگ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ اپنے گھروں کو جاؤ اور اپنی حفاظت کا انتظام کرو۔ میرے ایک دوست عبدالرحمٰن کابلی جو افغانستان سے قالینوں کا کاروبار کرتے تھے وہ اپنے علاج کے لئے میرے پاس آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنا ریوالور اور پچاس گولیاں دیں اور کہا کہ اسلام کی سربلندی کے لئے کفر و باطل کے خلاف جس جنگ کا آغاز ہو چکا ہے اس میں تمہاری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے یہ ایک حقیر تحفہ پیش کرتا ہوں امید ہے کہ اس سے نہ صرف تم اپنی حفاظت کرو گے بلکہ آج پانچ مارچ ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے لئے جو جنگ شروع ہو چکی ہے اس میں عملی طور پر حصہ لو گے۔ میں ان دنوں شریف پورہ گول مسجد کے پاس رہتا تھا ہر سال محرم پر ہندو مسلم فساد ہونا ضروری امر تھا اور مسلمان کم تربیت یافتہ اور منظّم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر نقصان اٹھاتے تھے۔ ہم چند دوستوں نے گول مسجد کے پاس ایک پارسی کی کوٹھی کرایہ پر لے کر وہاں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا دفتر بھی بنایا ہوا تھا اور وہ ہمارے نوجوانوں کے لئے ایک نیشنل تربیتی کیمپ تھا۔ ہمارے پاس اس وقت شریف پورہ، حسین پورہ، گوکل پورہ، کوٹ دونی چند کے تقریباً ڈیڑھ سو رضا کار موجود تھے۔ میں نے چند سرکردہ دوستوں کو جمع کیا۔ ان کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ رات نو بجے سے اپنی آبادیوں میں پہرہ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شریف پورہ کے باہر گراؤنڈ ٹرنک روڈ (جرنیلی روڈ) پر موجود تھا کہ ایک تانگہ شہر کی طرف سے سرپٹ بھاگتا ہوا آیا تانگے میں

بیٹھا ہوا ایک جوان چیخ چیخ کر مسلمانوں کو پکار رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔ ''مسلمانو! اٹھو وقت شہادت آیا ہے۔ اس شہر میں سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر رکھا ہے اور وہ شریف پورہ پہنچنے والے ہیں''۔ ہم نے بھاگتے ہوئے تانگے کو بمشکل روکا۔ گھوڑا اور کوچوان بری طرح زخمی تھے عبدالرشید نامی کوچوان محلّہ گوٹھ گوکل پورہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سکھوں نے کلائیوں تک کاٹ دیئے تھے۔ رشید کوچوان ہمیں اتنا بتا سکا کہ اس کے ہمسایہ میں رہنے والی ایک سکھ عورت نے اسے شہر میں چھوڑ آنے کو کہا جب یہ سکھوں کے محلے میں پہنچا تو سکھوں نے اسے زخمی کر کے ہاتھ کاٹ دیئے اور تانگے میں بٹھا دیا دو آدمی خود اس کے ساتھ بیٹھے تھے لیکن گھوڑے کو انہوں نے شریف پورہ کی طرف مار مار کر بھگا دیا اور مجھے یہ پیغام دے گئے کہ جاؤ مسلمان آبادیوں میں اعلان کر دو کہ سکھ بہادر جلد ہی انہیں قتل کر کے پاکستان پہنچانے آ رہے ہیں۔ عبدالرشید کے جسم کا تما خون بہہ چکا تھا جس کی وجہ سے وہ جام شہادت پی گیا۔ ہم نے دولڑ کے اس کے پاس چھوڑے اور خود شریف پورہ، حسین پورہ، گول پورہ، اور ملحقہ مسلمان آبادیوں کی طرف بھاگے۔ ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور انہیں خطرات سے آگاہ کیا۔ آناً فاناً مسلمان بچے بوڑھے جوان جو کچھ بھی ان کے ہاتھ لگا لے کر مقابلے کے لئے آ گئے۔ شریف پورہ رانی بازار میں اس اجتماع کو مفتی محمد حسین صاحب نے خطاب کیا۔ تمام جوان بوڑھے اپنی آبادی کی حفاظت کے لئے سر پر کفن باندھے تیار کھڑے تھے۔ تقریباً دو سو جوان شہر کے مسلمانوں کی امداد کے لئے آگے نکل آئے جن میں میں بھی شریک تھا ان کو پندرہ پندرہ کی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور یہ مسلمان محلوں کی حفاظت اور مدد کے لئے چل پڑے چلنے سے پہلے متفقہ طور پر یہ طے کیا گیا کہ جہاں جہاں پہنچیں سب سے پہلے نعرہ تکبیر بلند کریں اور پھر کہیں کہ مسلمانو! فکر نہ کرو شریف پورہ کے جوان تمہاری مدد کو حاضر ہیں۔ آؤ باطل کے خلاف مل کر لڑو۔ میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب کٹڑہ گلیاں سے ہوتا ہوا بجلی والے چوک پہنچا تو پتہ چلا کہ جیمبل سنگھ کٹڑے کی بوٹوں کی مارکیٹ سکھ لوٹ رہے ہیں۔ سکھوں کا ایک دستہ بجلی والے چوک کے مسلمانوں سے برسرپیکار تھا تو

دوسرا ہراول دستہ کی شکل میں پشم والے بازار سے ہوتا ہوا چوک فرید کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو چکا تھا ہم لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ بجلی والا چوک کے مسلمانوں کے ساتھ کٹڑہ گلیاں کے مسلمان بھی شامل ہیں ان کا پلہ بھاری ہے۔ چوک فرید کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر سکھوں کے ہراول دستے کو ختم کیا جائے۔ ہم لوگ بھاگم بھاگ چوک فرید پہنچے اور وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر پشم والے بازار کی طرف آنے والے سکھوں پر پل پڑے۔ کنک منڈی کی طرف سے بازار خاکروباں اور دائم گنج کے مسلمان، سکھوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اچانک کٹڑہ جیمبل سنگھ کی طرف سے ایک مہیب دھواں اٹھا پتہ چلا کہ سکھوں نے پنجاب کی سب سے بڑی مارکیٹ کو لوٹ کر آگ لگا دی تھی اور اب یہاں آگ ان کو جہنم رسید کر رہی تھی کیونکہ ان کے ہر بھاگنے والے راستے پر مسلمانوں نے گھیرا باندھ رکھا تھا۔ سکھوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن اس آگ نے ان کو زندہ جلا ڈالا۔ اب میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایم اے او کالج کی طرف نکل گیا۔ ایم اے او کالج کے ہوسٹل کے لوگوں سے ملا۔ رائل سینما اور ڈالمیاں پیپرز ملز کو آگ لگائی۔ وہاں بازار سے لوٹتے ہوئے گول ہٹی کو آگ لگائی۔ واپس شریف پورہ پہنچے۔ صبح دس بجے کے قریب ملک محمد مست سب انسپکٹر پولیس لاہور گیٹ نے مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ اس نے کٹڑہ مہر سنگھ کے مسلمانوں کو زندہ بچا کر کٹڑہ حکیماں پہنچا دیا ہے۔ وہاں سے تم اپنے والدین کو لے لو۔ میں اپنے چند ساتھیوں کو لے کٹڑہ حکیماں پہنچا اور اپنے والدین کو لے کر شریف پورہ آ گیا۔

رات بھر ہم لوگ اسی طرح ٹولیوں کی شکل میں مسلمان محلوں میں ان کی ہمت بلند کرنے کے لئے گئے۔ کٹڑہ آبھلووالا میں ڈاکٹر حمید ہومیو پیتھک کی دکان کے سامنے ہمارا مقابلہ ایک ہندو سکھ جتھے سے ہوا۔ ان کے تقریباً چھ آدمی مارے گئے۔ وہ اپنے بہت سے زخمی چھوڑ کر بھاگ گئے اور اپنا کافی اسلحہ بھی چھوڑ گئے جو بعد میں ہمارے کام آیا۔ جب ہم واپس شریف پورہ کی طرف آ رہے تھے تو پتہ چلا کہ پھولا سنگھ کے برج والے سکھوں نے کٹڑہ مہان سنگھ کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ خوب مقابلہ ہوا۔ آہلووالا کٹڑہ

سے جو اسلحہ ہمارے ہاتھ لگا تھا اس کے استعمال کا خوب موقع میسر آیا۔ پھولا سنگھ برج کے نہنگ سکھ جب ان پر تحصیل پورہ اور شریف پورہ کی طرف سے حملہ آور ہوئے تو بیس پچیس لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو زخم آئے مجھے بھی ایک زخم آیا جو مجھے آج بھی اس خونریز جنگ کی یاد دلاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ یہ زخم میں نے راہ خدا میں اپنی پیشانی پر کھایا۔ دوسرے روز کرفیو لگ گیا۔ پولیس اور فوج گشت کرنے لگی۔ پولیس آفیسروں سے امرتسر کے مسلمان محلوں کی بربادی اور مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں سنیں۔ چوک پراگ داس کا واقعہ نہایت الم ناک تھا۔ جمعۃ المبارک قریب تھا فیصلہ کیا گیا کہ جمعہ کی نماز چوک پراگ داس کی مسجد میں ادا کی جائے۔ کرفیو کھلنے پر میں اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اپنے پرانے محلے کٹڑہ سنگھ کے حالات معلوم کرنے گیا جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ مکان لوٹے جا چکے تھے موت کا سا سماں تھا۔ در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی پرانے گھر میں داخل ہوا تو ویرانی دیکھ کر دل تڑپ اٹھا۔ ابھی حالات کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ گلی کے باہر شور سنائی دیا۔ ہندو سکھ جمع تھے انہوں نے ہمارے لئے واپسی کے راستے میں جو مکان تھے ان کو آگ لگا دی تھی۔ ہم لوگ مکانوں کی چھتوں کو پھلانگتے ہوئے بازار خواجگان پہنچے وہاں بھی مقابلہ کرنے کے لئے بہت سے ہندو اور سکھ موجود تھے۔ کرفیو کی وجہ سے کسی قسم کا اسلحہ ہم ساتھ نہ لا سکے۔ البتہ عبدالرحمٰن کابلی کاریوالور میں نے چھپایا ہوا تھا۔ جب فائرنگ کی تو ہجوم بکھرنے لگا۔ بازار خواجگان سے باہر نکلے تو گرو بازار میں مکانوں سے ہندو سکھوں نے خشت باری کی۔ ہم لوگ دکانوں کے چھجوں کی اوٹ سے بچتے بچاتے ڈڑیوں والے بازار سے ہوتے ہوئے بازار خاکروباں پہنچے چونکہ ہمارے کچھ ساتھی زخمی تھے اس لئے شفیع کانگرو نے ہمیں دو تانگوں میں بھر کر شریف پورہ پہنچایا جہاں میں نے ان زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔

جمعۃ المبارک کے دن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چوک پراگ داس روانہ ہوا۔ راستے میں جب کمہاروں کے محلے سے گزر ہوا تو کمہاروں نے مٹی کے لوٹے پانی سے بھر کر ہمیں دیئے اور کہا کہ مسجد کا پانی سکھوں نے بند کر دیا ہے۔ جب چوک پراگ داس پہنچے تو ہندو اور سکھ

پہلے ہی تیار کھڑے تھے ان کی طرف سے نعرہ بلند ہوا ست سری اکال اور مسلمانوں کی طرف سے اللہ اکبر نعرہ تکبیر فضا میں گونجا۔ سکھوں نے حملہ میں پہل کی ہم لوگوں نے اللہ کا نعرہ لگا کر پانی کے بھرے ہوئے لوٹے ان پر دے مارے۔ پانی سے بھرا ہوا لوٹا جس جس پر ٹوٹا اس کی ہڈیاں بھی توڑتا چلا گیا۔ سکھ لوٹوں کے ساتھ اپنے آدمیوں کو زخمی ہوتے دیکھ کر لوٹا بم لوٹا بم چیختے ہوئے بھاگے۔ مسلمانوں میں بھی خاصے زخمی ہوئے بالآخر اپنے ٹھکانوں کو لوٹ آئے۔ راستے میں دو ایک جگہ مقابلہ بھی ہوا مارا بھی اور مار بھی کھائی۔ اس سے اگلے روز پولیس نے تلاشی کا سلسلہ شروع کیا مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ یہ فساد اب مشرقی پنجاب کے بہت سے شہروں میں پھیل چکا تھا۔ مسلمان زخمی حالت میں امرتسر پہنچ رہے تھے۔ کچھ زخمیوں کی گاڑیاں جب شریف پورہ ریلوے لائن پر گزرتی ہوئی آئیں تو ہم لوگ گاڑیوں کو دیکھنے کے لئے گئے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی بربادی اور ہندو سکھوں کی درندگی کے مناظر دیکھ کر روح کانپ اٹھی۔ عہد کیا گیا اب لاہور سے آنے والی ہندو سکھ بھگوڑوں کی کوئی بھی گاڑی یہاں سے سلامت نہ جا سکے گی۔ ہم اپنے معصوم بھائیوں کا انتقام ضرور لیں گے۔ اور ہم سب نے اپنے عہد کو پورا کیا۔ ایک دن پتہ چلا کہ ایک ہندو پریتم داس ہیرالال کا ایک گودام جرنیلی سڑک پر تحصیل پورہ کے پاس بند پڑا ہے چونکہ بلڈنگ بہت بڑی تھی اسے مہاجر کیمپ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب اسے کھولا تو اس میں سے سینکڑوں بوری اناج ایک پورا کمرہ ادویات سے بھرا ہوا ملا اور کچھ آتشیں اسلحہ بھی ہمیں ملا۔ پتہ نہیں کب سے یہ لوگ ذخیرہ کر رہے تھے مسلمانوں کی تباہی کے لئے جمع کیا جانے والا یہ تمام سامان ہم نے مہاجرین، پناہ گزینوں کے لئے وقف کر دیا۔

سٹی تھانے کا افسر جو سب انسپکٹر انچارج سٹی تھانہ امرتسر تھا میرا جانی دشمن بن گیا ۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو مجھے پتہ چلا کہ سب انسپکٹر مہتہ مجھے گرفتار کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں ہے۔ میرے دوستوں میں سے، بابو عبدالغنی ٹی ٹی نے، جو ریلوے اسٹیشن امرتسر پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ ایک انجن ڈرائیور حمید سے رابطہ قائم کیا۔ وہ لاہور سے امرتسر ٹرین لاتا اور لے جاتا تھا۔ اس طرح

۲۶ جولائی ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچا۔ لاہور چھاؤنی میں اس وقت دسویں ڈویژن فوج مقیم تھی۔ جس کے کرنل کمانڈر موسیٰ تھے، جو بلوچستان کے گورنر بھی ہیں۔ چودھری بشیراں ان دنوں کرنل صاحب کے اسٹینوگرافر تھے۔ یہ میرے ہم جماعت رہ چکے تھے اور فسادات کے ان طویل مہینوں میں، جو ۵ مارچ ۱۹۴۷ء سے جولائی ۱۹۴۷ء تک پھیلے ہوئے تھے ہماری اسلحہ سے کافی مدد کر چکے تھے۔ میں ان کے پاس چھاؤنی جا پہنچا۔ انہوں نے مجھے ایک بھوپالی دوست حوالدار محمد عثمان کے پاس ٹھہرایا اور میری بیوی اور بچی کو تیسرے ہی روز لا کر میرے پاس پہنچا دیا۔

میں لاہور سے کوئٹہ کرنل موسیٰ کے چھوٹے بھائی، سردار محمد اسحاق خان کے پاس جا پہنچا۔ سردار اسحاق نے اسلم آباد کوئٹہ (موجودہ قائد آباد) میں ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا اور کہا کہ پاکستان بننے تک، تم یہاں مقیم رہو۔ بعد میں تمہارے متعلق فیصلہ کریں گے۔ ۱۴ اگست کو جب کفر نے حق کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لی تو میں اس وقت کوئٹہ میں تھا۔ اس اعلان کے بعد کوئٹہ میں بھی ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ چند روز یہاں حالات بہت سنگین رہے میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضا کاروں کے ساتھ مل کر بطور رضا کار کام کرتا رہا۔ جب حالات سدھرے تو سردار محمد اسحاق کے بڑے بھائی سردار محمد عیسیٰ خان نے، صدر سٹی مسلم لیگ کوئٹہ سیٹھ محمد اعظم بلوچ سے سفارش کر کے مجھے سٹی مسلم کی ورکنگ کمیٹی میں شامل کر لیا۔ مسلم لیگ کی ہی وساطت سے مجھے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا مکان اور عارضی طور پر ایک چھوٹی سی دکان پریکٹس کے لئے مل گئی۔ مسلم لیگ کی ایک ذیلی کمیٹی انجمن مہاجرین کا مجھے صدر چنا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں صوبائی مسلم لیگ بلوچستان نے، جان محمد خان کانسی کی جگہ سالار صوبہ بلوچستان مسلم لیگ نیشنل گارڈ مقرر کیا۔ میں نے بلوچستان میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی تنظیم کے لئے تمام صوبے کا دورہ کیا جگہ جگہ مسلم لیگ بلوچستان کے محبِّ وطن افراد کی مدد کے ساتھ نیشنل گارڈ کے دفاتر قائم کئے۔

صوبائی مسلم لیگ بلوچستان کی طرف سے موبائل فری ڈسپنسری قائم کی جو ہفتہ وار مختلف گاؤں جا کر وہاں کے لوگوں کو مفت طبی امداد دیتی رہی۔ مہاجرین اور مقامی لوگوں میں بھائی

چارہ کی فضا قائم کرنے میں بھرپور کام کیا۔ مہاجرین کی آبادکاری کی ذمہ داری میرے سپرد تھی، جس کو میں نے صوبائی سطح پر بلوچستان حکومت کے مکمل تعاون سے پورا کیا۔ سٹی مسلم لیڈیز ونگ کی صدر مسز صلاح الدین کو چنا گیا وہ ۱۹۶۴ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک اس کام کو انجام دیتی رہیں۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار اعلیٰ آل پاکستان سید عباس علی شاہ نے مجھے بلوچستان کی طرف سے اپنا نائب مقرر کیا اور میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی تنظیم کے ساتھ ابھی تک وابستہ ہوں۔ اس کے بعد مجلس کارکنان تحریک پاکستان نے سردار محمد عثمان خان جوگزئی کو بلوچستان کی طرف سے نائب صدر اور مجھے ورکنگ کمیٹی کا ممبر منظور کیا۔ ۱۹۸۰ء میں اپنی بیوی کے علاج کے لئے لاہور آیا اور اس کی وفات کے بعد لاہور ہی میں رہائش اختیار کر لی۔ آج ہم اپنے وطن کے مالک ہیں، خودمختار ہیں اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں اس ملک اور قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیں اور ان تلخ حالات و واقعات کو ہمیشہ مدنظر رکھیں جو حصول وطن کی راہ میں اس قوم کو پیش آئے۔ خدا اس ملک کو ہمیشہ آباد اور خوشحال رکھے۔ آمین (۱۶)

میں زندہ رہا

صابر علی چودھری

میرا تعلق مشرقی پنجاب کی ایک سابقہ ریاست فرید کوٹ کے ایک راجپوت خاندان سے ہے اس ریاست کا حکمران ایک سکھ راجہ تھا۔ ہمارا گاؤں کوٹ کپورا شہر سے تقریباً چھ سات میل کے فاصلہ پر تھا جس کا نام ''ہری نو'' تھا (پنجابی میں اسے ہریکے کہتے تھے) بڑے ہریکے یعنی ہریکے کلاں ہم سے چار میل کے فاصلہ پر تھا اسی گاؤں کے لوگوں نے اس نئے گاؤں کو آکر بسایا تھا اس کی آبادی تقریباً چھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی اس کا ایک تہائی حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا اور دو تہائی سکھوں کی آبادی تھی۔ ہمارے گاؤں میں ایک ہی مسجد تھی جس میں تمام مسلمان نماز ادا کرتے تھے۔ مسلمانوں میں مکمل اتحاد اور اتفاق تھا میرے دادا جان کے سات بھائی مگر قیام پاکستان تک صرف تین بھائی زندہ تھے باقی سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ میرے دادا کا نام میاں جلال محمد تھا ان کے بڑے بھائی کا نام سردار محمد اور ان کے چھوٹے بھائی کا نام نہال محمد تھا ان تینوں کی اولاد بھی تھی۔ خاندان کے نرینہ افراد کی تعداد تیرہ تھی اور ہم سب ایک ہی بہت بڑے مکان میں رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کانگریس کا بہت زور تھا اور آئے دن اس کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ مگر یہاں پر مسلم لیگ بھی اپنے پورے شباب پر تھی میرے والد کے چچازاد بھائی غلام محمد مسلم لیگ کے صدر تھے اور میرے والد اس کے سرگرم اور فعال رکن تھے ہر قسم کے چندہ کا حساب کتاب میرے والد صاحب کے پاس تھا وہ ڈپو ہولڈر بھی تھے۔ ہمارا خاندان مسلمانوں کا چوٹی کا خاندان تھا اور تمام سکھوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ مسلم لیگ کے تمام پروگرام کے نفاذ کا بندوبست ہمارے گھر سے ہوتا تھا۔ ان ایام میں گو میں بچہ تھا اور میری عمر نو سال سے کچھ زیادہ تھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کافی ذہین تھا اور تمام باتوں کا پتہ چلتا رہتا تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء ماہ رمضان کی ستائیس تاریخ تھی اور جمعہ کا روز تھا۔ قیام پاکستان کا اعلان ہوا تھا مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن اچانک ہی ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ

پڑے۔ ہمارا خاندان خاص طور پر اس کا نشانہ بنا۔ تمام مسلمانوں نے عید الفطر عید گاہ کی بجائے مسجدوں اور مکمل پہرے میں پڑھی آدھے مسلمانوں نے پہلے نماز پڑھی اور دوسرا حصہ پہرہ دیتا تھا باقی آدھے مسلمانوں نے بعد میں نماز پڑھی اور پہلے نماز پڑھنے والوں نے باقاعدہ پہرہ دیا۔عید کے بعد چھ دن سخت تکلیف اور مصائب میں گذارے تمام کے تمام مسلمان کسی ایک گھر میں جمع ہوجاتے تھے اور اس گھر کا پہرہ دیا جاتا۔ اگلی رات کو وہ گھر تبدیل کر دیا جاتا۔ قیامت کا سماں تھا سکھ بار بار یہی الفاظ دہراتے تھے ''باقی مسلمان تو جا سکتے ہیں مگر ہمارا گھر یعنی مسلم لیگ کا گڑھ اس کو کسی صورت معاف نہیں کیا جائے گا، اس سے قیام پاکستان کا بدلہ لیا جائے گا۔ ہماری جائیداد، ہمارے جانور، ہماری جمع شدہ پونجی ہمارے سامنے لوٹ کر لے گئے۔ چھ روز بعد ریاستی پولیس آئی اور تمام مسلمانوں کو ان کے گھروں سے باہر نکال لیا ان کی مکمل تلاشی لی گئی ہر قسم کے ہتھیار یعنی چاقو، چھری تک اور ضعیفوں کی لاٹھیاں تک واپس لے لی گئیں۔ ہمیں بے سروسامانی کے عالم میں گھروں سے باہر نکال دیا لوگوں کے پاس جو کچھ نقد رقم تھی وہی ساتھ لے جا سکے۔ تمام گاؤں والوں کو آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک اور گاؤں میں لے گئے اس گاؤں کا نام وانور جٹانہ تھا۔ یہ ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر کے آٹھ میل مشرق کی جانب برلب سڑک تھا چار دن تک وہاں کیمپ لگایا گیا یہ قافلہ تقریباً چار میل لمبا تھا اور سڑک کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب درختوں پر سکھ گھات لگائے بیٹھے تھے وہ گاہے گاہے قافلے کے کبھی عقب پر اور کبھی درمیان میں اور کبھی اگلے حصہ پر حملہ کرتے اور مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر غائب ہو جاتے۔ پولیس کا رویہ انتہائی بے رحم تھا۔ وہ ان درندوں کو کچھ بھی نہ کہتی۔ آخر جب قافلہ کا درمیانہ حصہ مکتسر پہنچا تو اس وقت دن کے تقریباً دو بجے تھے تمام پولیس غائب ہوگئی اچانک ہزاروں کی تعداد میں مسلح سکھوں نے حملہ کر دیا اور نہتے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا فضا میں ہر طرف تلواروں کی چمک تھی یا پھر نہتے مسلمانوں کی چیخ و پکار خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے مجھے گیارہ مسلمانوں کی صف میں کھڑا کر لیا گیا۔ میرا ساتواں نمبر تھا وہ ہر ایک کو باری باری بلاتے اور شہید کر دیتے۔ میں خوف سے

لرزنے لگا اور دہشت کے مارے زمین پر جا گرا سب کو شہید کرنے کے بعد وہ میری طرف بھی بڑھے میرے سر پر ایک تلوار ماری اور ایک میری ٹانگ پر ماری مگر نامعلوم اللہ تعالیٰ نے مجھے کیسے زندہ رکھ لیا اللہ کی بھی امداد تھی ضرب مہلک ثابت نہ ہوئی مارنے والے سے بچانے والا زیادہ قادر ہے بقول حضرت علی کرم اللہ وجہ، موت انسان کی خود حفاظت کرتی ہے جب تک وہ خود نہیں آتی، جب وہ خود آتی ہے تو تمام حفاظتی اقدام کو ختم کر دیتی ہے۔ شام پانچ بجے تک میں ان لاشوں میں بے ہوشی کے عالم میں پڑا رہا پھر اٹھا تو عجیب ہو کا عالم تھا ہر طرف وحشت اور بربریت تھی خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں لاشوں کے پشتے کے پشتے لگے ہوئے تھے کوئی زندہ اور سلامت نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف دہشت اور خوف مسلط تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پیاس سخت لگی ہوئی تھی خون بہنے کی وجہ سے کچھ کمزوری بھی ہوگئی تھی میرا ہاتھ میرے چچا چودھری غلام محمد (صدر مسلم لیگ) کے ہاتھ میں تھا وہ شہید کر دیئے گئے تھے میری عمر نو سال کے لگ بھگ تھی بچہ ہی تھا۔ اتنے بڑے المیے کے بعد سوچ مفلوج ہو چکی تھی اتنے میں دو سکھ اور آ گئے ایک مجھے مارنے لگا تو دوسرا بولا چھوڑ و یار یہ خود ہی مر جائے گا۔ یہ کونسا پاکستان پہنچ سکے گا اور پاکستان کو آباد کرے گا اور وہ آگے چلے گئے۔ گرتے پڑے میں اٹھا اور مغرب کی جانب بے شعوری کے عالم میں چل پڑا وہاں پر کیا دیکھتا ہوں کہ میری والدہ محترمہ جن کا نام شریفاں بی بی ہے زخموں سے چور خون میں لت پت بیٹھی ہیں ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی دونوں کندھے تلواروں کے پے در پے وار کی وجہ سے مجروح تھے۔ بایاں بازو بھی تلوار کی کاٹ کی وجہ سے سخت زخمی تھا خون بے تحاشا بہہ رہا تھا۔ ابھی میں انکے پاس پہنچا ہی تھا کہ پھر سکھوں کا ایک جتھہ آ پہنچا ساتھ میں جوار کا کھیت تھا میں اس میں گھس گیا مگر وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے میرے پاس پہنچے اور کہنے لگے تم بھاگ کیوں آئے میں نے انہیں کہا کہ میں تو رفع حاجت کے لئے آیا تھا ایک نے کہا کہ اس کا کام تمام کر دو مگر امداد غیبی پھر حاصل ہوئی دوسرے نے کہا چھوڑ و یہ خود ہی تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ ان کے جانے کے بعد پھر واپس اپنی والدہ کے پاس آ گیا وہاں اردگرد کے گاؤں کی بہت سی عورتیں زخمی اور بے سروسامانی کے عالم میں

بیٹھی تھیں میں نے اپنی والدہ سے اپنے والد اور اپنے چھوٹے بھائی جس کی عمر تین سال تھی کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ سب میری نظروں کے سامنے شہید کر دیئے گئے ہیں اور تمہارے بھائی کو ظالموں نے دولخت کر دیا میری صرف جان ہی نہیں نکلی باقی کیفیت تو تم بھی دیکھ رہے ہو یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان رواں ہو گیا اگرچہ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی مگر ماں کے ناطے سے انہوں نے میرا دل بندھایا تسلی دی اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کی اب اندھیرا چھانا شروع ہو گیا تھا میں اور میری والدہ مغرب کی جانب سڑک کے ساتھ ساتھ چل دیئے کچھ اور بھی زخمی لوگ ہمارے ہمراہ تھے۔ شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ایک تالاب آیا (جسے روراں والا چھپڑ کہتے تھے) اس کے نزدیک بڑ کے درخت تھے چنانچہ دیگر زخمیوں کے ہمراہ ہم بھی وہاں ٹھہر گئے سڑک کے دونوں جانب لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے چیخ پکار کر رہے تھے مگر وہ بچاری تو اپنے خالق حقیقی کے پاس جا چکی تھی وہ بھی عجیب قیامت کا سماں تھا۔ کسی ظالم سے ظالم فاتح نے بھی یہ مظالم نہ ڈھائے ہوں گے۔ والدہ زخمی تھیں انہوں نے پانی مانگا پینے کے لئے کوئی بھی چیز نہ تھی۔ میں برتن ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر برتن وہاں کہاں ایک ٹھیکرا ملا اس سے تالاب سے پانی لا کر دیا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے جس حالت میں بھی تو رکھے تیرا کرم ہے۔ کیا عجیب سماں تھا جو ورطہ تحریر سے باہر ہے۔ یہاں پر زخمیوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہو گئی۔ یہ فیصلہ ہوا کہ یہاں سے چلا جائے ورنہ صبح ہوتے ہی سکھوں کے جتھے آ جائیں گے اور سب کو تہ تیغ کر دیں گے یہ بھی پتہ چلا کہ وہاں سے پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں شیرے والا چک ہے وہاں کے سکھ سرداروں نے قسم کھائی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو خود پاکستان چھوڑ کر آئیں گے چنانچہ رات کے دو بجے چاند کی چاندنی میں یہ قافلہ شیرے والے چک کی جانب روانہ ہوا سب لوگ زخمی تھے آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر چل رہے تھے اسی دوران میری دادی کرم بی بی بھی مل گئیں چلتے چلتے دن نکل آیا سکھ کھیتوں سے بھاگ بھاگ کر آئے تاکہ ہمیں ختم کر دیا جائے مگر سب کی حالت دیکھ کر رک جاتے یہاں تک کہ

راستے میں ایک گاؤں کے سکھوں پر اتنا اثر ہوا کہ وہ ان سب زخمیوں کے لئے کھانا بھی لے آئے۔ یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ قافلہ آج شام کے چار بجے روانہ ہو گا چنانچہ اس دن کی دوپہر ہم نے اسی گاؤں کے درختوں کے نیچے گذاری تین بجے یہ قافلہ شیرے والا چک کی جانب روانہ ہوا وہاں پہنچے تو تمام مسلمان اپنے اہل وعیال اور باربرداری کے جانوروں کے ساتھ باہر آ چکے تھے وہاں کے سکھ سردار گھوڑوں پر سوار تھے۔ اتنی دیر میں تاراسنگھ کی جماعت کا جتھا بھی وہاں پر آ گیا اور مذکورہ بالا گاؤں کے سکھ سرداروں کے ساتھ تکرار کرنے لگا کہ ان سب مسلمانوں کو ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم انہیں ختم کر دیں مگر وہ سردار اپنے قول کے پکے تھے انہوں نے کہا ہم ایسا نہیں کر سکتے ہم نے گرنتھ پر قسم اٹھائی ہے۔ ہاں تم فاضلکا بنگلہ پہنچ جاؤ وہاں ہم انہیں چھوڑ آئیں گے اور پھر جو تمہارا دل چاہے کر لینا۔ چنانچہ سکھوں کا یہ جتھا مطمئن ہو گیا اور انہوں نے فاضلکا بنگلہ کا رخ کر لیا۔ اس گاؤں میں میری والدہ کے چند رشتے دار تھے ان سے رابطہ قائم کیا مگر انہوں نے بھی نفسانفسی کا مظاہرہ کیا اور کوئی پرواہ نہیں کی۔ شام کے وقت جب کچھ اندھیرا شروع ہو گیا تو ہمارا قافلہ ان سرداروں کی ہمراہی میں روانہ ہوا انہوں نے فاضلکا بنگلہ کا راستہ بدل کر ریاست بیکانیر کا راستہ اپنایا جب یہ قافلہ پکی نہر بیکانیر کے نزدیک پہنچا تو یہ رات کے دو بجے کا وقت ہو گا اس نہر کے تمام پلوں کی سکھوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی چنانچہ کچھ سکھ سرداروں کو آگے بھیجا گیا وہ وہاں پر مقرر سکھوں کو چکمہ دے کر اپنے ساتھ لے گئے اور اس قافلے کو جلد از جلد اس نہر کو عبور کرایا۔ جب یہ قافلہ نہر عبور کر چکا تو کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ میں نڈھال ہو چکا تھا میری حالت دیکھ کر ایک سردار نے مجھے ایک گھوڑی پر سوار کرا دیا اسی دوران والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ دادی جان بھی وہاں پر ہی رک گئیں اسی دوران قافلہ آگے روانہ ہو گیا والدہ کو جب ہوش آیا تو قافلہ کافی فاصلہ پر جا چکا تھا ہمارا قافلہ ریاست بہاولپور کے راستے منڈی صادق گنج کے نزدیک پاکستان میں پہنچ گیا مگر میں اس قافلہ میں تنہا تھا والدہ اور دادی جان راستے بھول چکی تھیں اور آٹھ دن تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا رات کو سفر کرتی تھیں اور دن کے وقت فصلوں میں اپنے

آپ کو چھپا لیتی تھیں ان خواتین نے قیامت کا یہ سفر آٹھ دن میں طے کیا اور آخر اپنے زخموں سے رِستے ہوئے لہو اور جسموں پر پڑی دھول اور مٹی کو لے کر ستمبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتہ میں فاضلکا بنگلہ کے راستے ہیڈ سلیمانکی پہنچیں اور پاکستان میں داخل ہوئیں۔ یہاں مہاجر کیمپ میں انہیں ٹھہرایا گیا جو چیز انہیں کھانے کے لئے دی جاتی وہ قے ہو جاتی آخر معدہ کی اصلاح کے لئے انہیں دوائیں دی گئیں تب جا کر معدہ نے کوئی غذا برداشت کرنی شروع کی۔ اسی دوران والدہ کے زخموں میں کیڑے پڑ گئے اور زخم کھل گئے جن کا بعد میں بڑی مشکل سے علاج کیا گیا اور انہیں ساہیوال ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جب ان کے زخم بہتر ہوئے تو والدہ اور دادی جان کو ضلع ساہیوال کے نزدیک اس قافلہ کے ہمراہ بھیج دیا گیا میں اپنے قافلہ کے ہمراہ تنہا میاں چنوں سے آٹھ میل کے فاصلہ پر چک نمبر ۹۲ میں چلا گیا۔ مجھے کچھ خدا ترس لوگوں نے اپنے ہمراہ رکھ لیا اسی دوران مجھے والدہ کے دور کے چچازاد بھائی مل گئے میں ان کے ہاں رہائش پذیر ہو گیا۔ میرے ماموں جو کہ ہمارے خاندان کی تلاش میں سرگرداں تھے ان کو پتہ چلا کہ ہماری بہن کا تمام خاندان شہید کر دیا گیا اور صرف ہماری بہن بچی ہے تو بہت پریشان ہوئے میرے منجھلے ماموں ناظر علی جو کہ ہندوستان سے آ کر دیپالپور ضلع اوکاڑہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے ہماری تلاش میں سب سے پہلے انہوں نے میری والدہ اور دادی جان کو ڈھونڈا اور انہیں اپنے ساتھ دیپالپور لے گئے۔ اسی دوران میرے رشتہ کے ماموں جن کا نام فتح دین ہے وہ اپنے رشتہ داروں سے ملنے چک نمبر 92-141 تحصیل وضلع ساہیوال آئے تو انہوں نے میرے کوائف کے بارے میں مختلف رشتہ داروں سے تذکرہ کیا یہاں پر میری والدہ کے ماموں کو لے کر میرے پاس چک نمبر 92 میاں چنوں پہنچے اور مجھے دیپالپور لے گئے اس طرح میں تقریباً پانچ چھ ماہ کے بعد اپنی والدہ اور دادی سے ملا اسی دوران میری ہمشیرہ کسی قافلہ کے ہمراہ تنہا میلسی اور پھر میری پھوپھی کے پاس چشتیاں پہنچ گئیں ان کو بھی میرے ماموں دیپالپور لے آئے یوں یہ خاندان اپنا سب کچھ قربان کرنے کے بعد پاکستان پہنچا تقریباً چھ ماہ تک پاکستان میں آنے کے بعد میری کیفیت یہ

رہی کہ رات کو میں گھر سے باہر نکل جاتا اور نیند میں یہی کہتا رہتا تھا کہ سکھ آ گئے اور مسلمانوں کو مار رہے ہیں گھر والے گرمیاں ہوں یا سردیاں مجھے بند کمرے میں سلایا کرتے۔ میرے خاندان کے جن افراد کا قطعی طور پر پتہ چل گیا ہے کہ وہ شہید ہو گئے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ میرے دادا کے بھائی یعنی میرے والد کے تایا جان میاں سردار محمد ۲۔ میرے دادا جان میاں جلال محمد ۳۔ دادا کے چھوٹے بھائی نہال محمد ۴۔ والد محترم چودھری شیر محمد ۵۔ میرے چچا جان چودھری غلام محمد ۶۔ میرا بھائی محمد خالد ۷۔ تایازاد بھائی محمد ابراہیم ۸۔ میرا ایک اور تایازاد بھائی علی محمد تیرہ (13) نرینہ افراد خانہ میں سے میں اکیلا پاکستان پہنچا باقی سب یا تو شہید کر دیئے گئے یا پھر تاحال ان کے بارے میں قطعاً کچھ پتہ نہیں بلکہ وہ بھی پاکستان پر قربان ہو گئے۔ حالات معمول پر آئے تو والدہ نے مجھے سکول داخل کرا دیا کیونکہ وہاں ہندوستان میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا والدہ نے بڑی تگ و دو کی سلائی کڑھائی میں بہت محنت کی اور میری پرورش کی اللہ تعالیٰ کی مجھ پر خاص عنایت تھی ذہن بہت اچھا تھا میں ہر جماعت میں اول آیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مختلف جگہ ملازمت کی اور 1968ء میں انسپکٹر پوسٹل لائف انشورنس کے مقابلہ میں امتحان میں شمولیت کی۔ کامیاب و کامران ہوا اسی محکمہ یعنی ڈاکخانہ جات میں ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ڈائریکٹر پوسٹل لائف انشورنس بن گیا۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے اور میرے خاندان نے پاکستان کو اپنے خون سے سینچا ہے اور مادر وطن کے تحفظ کے لئے جب بھی ضرورت پڑی ہمارا خون اس پاک سرزمین کے لئے حاضر ہے۔ قائداعظم زندہ باد! پاکستان پائندہ باد (۱۷)

منزل

ایس ایم سرور

میں شملہ کانفرنس کے انعقاد کے وقت شملہ میں ملازم تھا اس کانفرنس میں مسلم لیگ نے شمولیت تو کی مگر اپنے اکابرین کے اخراجات خود برداشت کئے اور قائداعظم کے فیصلہ کے مطابق حکومتِ ہند سے کوئی مالی معاونت قبول نہ کی اس ضمن میں حکومت ہند نے صرف رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ قائداعظم کے لئے جس رہائش گاہ کا بندوبست کیا گیا تھا اسے قائداعظم نے ناپسند فرمایا۔ لہذا وہ رات انہوں نے سیسل ہوٹل میں بسر کی۔ اگلے روز قائداعظم کے لئے دوسری کوٹھی میں ٹھہرنے کے انتظامات کئے گئے۔ مسلم لیگی اکابرین کی آمدورفت کے لئے رکشاؤں کے لئے تجربہ کار اور صحت مند آدمی چنے گئے جنہیں بہترین مسلم لیگی وردیاں پہنائی گئیں جب ہم اسٹریچل لاج کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے راہنماؤں کے رکشاؤں پر گل پاشی کرتے اور مسلم لیگ کے نعرے بلند کرتے تو منظر قابل دید ہوتا ایسا جوش، ولولہ، تڑپ اور لگن نہ پہلے کبھی دیکھی اور نہ بعد میں کبھی دیکھنے کا موقعہ میسر آیا۔ جب شملہ کانفرنس میں ڈیڈ لاک آیا تو ہم صدر مسلم لیگ جناب مولوی ذکاءاللہ کی سربراہی میں فخرِ ملّت جناب عبدالرب نشتر سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ وہ نماز عشاء کے بعد جامع مسجد میں خطاب فرمائیں۔ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست قبول کی جلسے کا انتظام کیا گیا لوگوں نے اتنی بھاری تعداد میں شرکت کی کہ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی انہوں نے تقریباً پون گھنٹہ بڑی مدلل اور موثر تقریر کی آخر میں حاضرین نے بے حد اصرار کیا کہ وہ کانفرنس میں ڈیڈ لاک پیدا ہونے کی وجوہات پر اظہار رائے کریں لیکن انہوں نے فرمایا کہ ''باتیں افشا کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ایک شعر پڑھتا ہوں اس سے مطلب نکال لیں۔ اور علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں ۔۔۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

اس کے بعد نشتر صاحب ایک خاص اجلاس میں شرکت کے لئے چلے گئے۔ ڈیڈ لاک کے دوران

مہاتما گاندھی قائداعظم سے ملاقات کے لئے آئے تو قائداعظم اوپر کی منزل سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے اور مہاتما گاندھی سے کچھ دیر گفتگو کے بعد انہیں نیچے چھوڑنے کے لئے تشریف لائے۔ قائداعظم نے ٹھیک پانچ بجے اسلامیہ ہائی اسکول شملہ میں خطاب کرنا تھا۔ سوا چار بجے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ سارا انتظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ بڑی فکر لاحق ہوئی لیکن چار بج کر پچاس منٹ پر بارش تھم گئی قائداعظم کی آمد کا شدت سے انتظار تھا مال روڈ پر آ کر دیکھا قائداعظم رکشا میں سوار ٹھیک پانچ بجے تشریف لائے ان کی آمد پر کافی لوگوں نے اپنی گھڑیوں کا وقت ملایا۔

شملہ کانفرنس کے دوران مسلمانوں نے اصرار کیا کہ جہاں مسلم لیگی اکابرین ٹھہرے ہوئے تھے ان عمارتوں پر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا جائے اس بات پر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے مگر ہندو ایس ڈی او بلڈنگ انت رام جھنڈا لگانے کے خلاف تھا اس پر کافی شور برپا ہوا اس شور کی آواز سن کر قائداعظم بالکونی میں تشریف لائے۔ حالات وواقعات دریافت فرمائے۔ اس وقت مجمع پر سکوت طاری تھا۔ آپ نے اس وقت فرمایا: ''بھائیو! السلام علیکم۔ جھنڈے کا مطلب ہے جہاں ایک مرتبہ لگ جائے اترنا نہیں چاہئے''۔ یہ کہہ کر آپ دوبارہ کمرے میں تشریف لے گئے۔

مجھے قائداعظم اور پوپ جان پال کی شملہ میں اتفاقیہ ملاقات کا منظر بھی یاد ہے۔ قائداعظم کا رکشہ گرجا میدان مال روڈ پر جا رہا تھا سامنے سے پوپ جان پال بھی اپنے رکشہ میں آ رہے تھے۔ دونوں حضرات کی نگاہیں ملیں تو رکشہ رکوالئے۔ قائداعظم رکشہ سے باہر آئے، پوپ جان پال بھی رکشہ سے اتر کر قائداعظم کی طرف بڑھے دونوں بغل گیر ہوئے۔ پوپ جان پال نے قائداعظم کو اگلے روز آنے کی دعوت دی جسے قائداعظم نے قبول فرمایا اور پھر دونوں حضرات اپنی اپنی منزل کو روانہ ہوئے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان بن گیا شملہ میں تعینات مسلمان ملازمین کا تبادلہ لاہور ہو گیا کیونکہ ہم نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ متعدد ملازمین کا خیال تھا کہ ان کی تعیناتی کراچی ہو لہذا میں دہلی گیا اور ایف ایم شیفتہ صاحب سے مل کر ملازمین کا تبادلہ کراچی کروا دیا۔ بھاری سامان ریلوے سے بک کروانے کے بعد ضروری سامان بچوں کے حوالے کیا اور انہیں گاڑی کے ذریعے کا لکا روانہ کر دیا میں اور میرے

چھوٹے ماموں جان بذریعہ کار بڑے ماموں جان سے ملنے کے لئے روانہ ہوئے جو اسٹیشن ماسٹر تھے۔انہوں نے فرمایا کہ ان کی تبدیلی منٹگمری (ساہیوال) ہوچکی ہے اور وہ چند دنوں تک وہاں پہنچ جائیں گے لیکن یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ بعد میں انہیں اور ان کے نو بچوں کو شہید کر دیا گیا۔تین بچے اور ان کی والدہ پیدل چل کر شملہ پہنچے وہاں ابھی کچھ رشتہ دار مقیم تھے ان کے ساتھ چل کر وہ پاکستان آ گئے۔

میں اور ماموں جان کالکا پہنچے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ جناب مولوی ذکاءاللہ صاحب کی بیگم کو کیمپ سے اغوا کر لیا گیا ہے کالکا آ کر معلوم ہوا جان پہچان کے لوگ بھی آنکھیں پھیر چکے ہیں۔راستہ میں تمام بڑے اسٹیشنوں پر اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔مسلمان خوانچہ فروش نظر نہیں آ رہے تھے ہماری گاڑی لدھیانہ پہنچی تو چاروں طرف ہندو اور سکھ نظر آئے میرا بڑا بھائی جو شملہ سے ہمارے ساتھ یہاں تک آیا تھا، علیحدہ ہوا اسے دوسری گاڑی پکڑنا تھی کیونکہ اسے والدین کے پاس جانا تھا لہذا کچھ سامان اور دعاؤں کے ساتھ اسے روانہ کیا ہم یہاں سے جالندھر پہنچے وہ جالندھر شہر جو ہمیں خاص طور پر پسند تھا، پلیٹ فارم پر اتر کر بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔گاڑی کے اندر ہی سے باہر جھانک کر دیکھا تو ہر طرف آگ اور دھواں نظر آیا۔ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے۔ خدا خدا کر کے ہماری گاڑی روانہ ہوئی اور ہم امرتسر پہنچے یہاں بچوں نے بھوک سے رونا شروع کر دیا کیونکہ جو خورد و نوش شملہ سے لے کر چلے تھے ختم ہو چکا تھا راستہ میں کوئی چیز بھی دستیاب نہ ہو سکی۔امرتسر ریلوے اسٹیشن پر بچوں کے کھانے کے لئے کچھ لینے اترا تو صرف دو ڈبے بسکٹ مل سکے وہ بھی بلوچ رجمنٹ کے ایک سپاہی کے ذریعے سے بسکٹ اور پانی لے کر واپس ڈبے تک پہنچا تو وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا تمام کمپارٹمنٹ زخمیوں سے بھرا ہوا تھا۔امرتسر سے بہت زیادہ تعداد میں زخمیوں کو گاڑی میں پہنچایا گیا ڈبے میں داخل ہونا بھی میرے لئے بہت مشکل تھا۔بہرحال کسی طرح ڈبے میں سوار ہوا یہ گاڑی یہاں چار گھنٹے تک رکی رہی مطالبہ یہ تھا کہ لاہور سے گاڑی آئے گی تب یہ گاڑی جانے کی اجازت دی جائے گی۔خوف و ہراس کی اس فضا میں ہم لاہور سے آنے والی گاڑی کے منتظر رہے۔آخر وہ گاڑی آ گئی تو بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کی مدد سے ہماری گاڑی

لاہور کے لئے روانہ ہوئی۔لاہور پہنچ کر جو دیکھا وہ بیان نہیں ہو سکتا۔جن زخمیوں کو گاڑی سے اتارا گیا ان کی حالت بہت خراب تھی کسی کی ٹانگ نہیں، کسی کی ناک نہیں، کسی کا بازو کٹا ہوا ریلوے اسٹیشن پر چیخ و پکار کا عالم تھا۔لیکن یہاں پر رضا کاروں نے تمام زخمیوں اور لٹے پٹے مہاجروں کو سہارا دیا۔ایک ایک کو سنبھالا، تسلی و تشفی دی، طبی امداد فراہم کی اور کھانا کھلایا۔

یہاں میرے ساتھ ایک عجیب اتفاق ہوا میری جیب میں سگریٹ کا ڈبہ تھا میں جونہی ٹکٹ لے کر گیٹ سے نکلا تو بلوچ رجمنٹ کا ایک سپاہی پکارا ''ہینڈز اپ'' میری تلاشی لی گئی اور میری جیب سے سگریٹ کا ڈبہ نکال لیا پھر انہوں نے فرمایا کہ صاحب اسے جیب سے باہر رکھیں ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بم جیب میں چھپا رکھا ہے ان کے اطمینان کے بعد مجھے جانے کی اجازت ملی یہاں بھی ریلوے اسٹیشن کے آس پاس آگ لگی ہوئی تھی اور دھویں کے بادل آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔یہاں یہ بھی پتہ چلا کہ مسلمانوں نے امرتسر والے زخمی آدمیوں کی گاڑی کا بدلہ بادامی باغ ریلوے اسٹیشن پر لے لیا ہے۔شام کو ہم کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔حکومت خداداد پاکستان کی اپیل پر کہ ملازمین ابھی بچوں کو ہمراہ نہ لائیں میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ بچوں کو اوکاڑہ چھوڑ کر خود کراچی چلا جاؤں گا لہذا میں اپنے ماموں کے ہمراہ کراچی آ گیا۔اور ملازمت کے فرائض ادا کرنے لگا۔قیام پاکستان کے بعد ہم لوگ شملہ سے کراچی پہنچ چکے تھے لیکن والدین کی فکر ہر لمحہ دامن گیر رہتی خاص طور پر اس بڑے بھائی کے بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی جو ہم سے لدھیانہ اسٹیشن پر الگ ہوا تھا۔خیال آتا کہ وہ صحیح سلامت گھر پہنچا ہوگا یا نہیں۔ایک روز ہمارے آبائی شہر کا آدمی کراچی میں ملا اس نے بتایا کہ تمہارے گھر پر سکھوں نے بم گرائے تھے ان دنوں محلّہ کے تمام مسلمان ہمارے ہی گھر اٹھ آئے تھے یہ سن کر طبیعت بہت خراب ہو گئی لیکن ماموں نے تسلی دی کہ اللہ کو منظور ہوا تو میرے والدین ضرور پہنچ جائیں گے اللہ نے مدد کی اور والدین فسادات میں محفوظ رہے اور جالندھر چھاؤنی کیمپ پہنچا دیئے گئے وہاں سے وہ ایک دو بچوں کو کانوائے میں سوار کر کے اوکاڑہ بھیجتے رہے اور آخر کار خود بھی آ گئے۔الحمدللہ! یہ قافلہ بخیر و عافیت فسادات کی آگ سے بچ کر اپنی منزل پاکستان پہنچ گیا۔(۱۸)

موت کا رقص

عبدالکریم قریشی

میرا نام عبدالکریم قریشی ولد حبیب اللہ قریشی ہے۔ میرا تعلق قصبہ کھرکھودہ ضلع روہتک سے ہے میری پیدائش ۱۹۳۰ء میں اسی قصبہ میں ہوئی تھی چونکہ کم عمر تھا اس وجہ سے میرا ووٹ نہیں تھا۔ طالب علمی کا دور تھا اور ہم لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ ووٹ مسلم لیگ کا دیں پھر ان شاء اللہ آپ کے ووٹوں سے ایک ملک بنے گا جس کا نام پاکستان ہوگا اور وہاں پر اسلام کا بول بالا ہوگا اس ملک میں آپ کی عزتیں محفوظ ہوں گی اور ہر آدمی خوشحال ہوگا۔ میرے والد محترم کا چمڑے اور اون کا کاروبار تھا انہیں دین سے بے حد لگاؤ تھا اور تہجد گذار بھی تھے غریبوں کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے اس وجہ سے شہر میں ان کا اچھا مقام تھا ان کے پاس مسلم لیگی لیڈر صاحبان آئے میرے والد صاحب سے لیڈروں نے فرمایا کہ آپ کے اور آپ کی پوری برادری کے تمام ووٹ مسلم لیگ میں پڑنے چاہئیں اور مسلم لیگ کے لئے مالی امداد بھی چاہئے میرے والد نے تمام لیڈروں سے وعدہ کیا ان شاء اللہ میرے اور میری پوری برادری کے ووٹ مسلم لیگ میں جائیں گے۔ اس کے بعد تمام لیڈر کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر دوسری جگہ چلے گئے مجھے اتنا یاد ہے کہ جب ووٹ ڈالے گئے تو ہم نوجوان لڑکے بیماروں اور ضعیفوں کو جو چل نہیں سکتے تھے اپنی اپنی کمر پر بٹھا کر ووٹ ڈلوا کر واپس ان کے گھروں تک چھوڑ کر آتے تھے چونکہ ہمارے قصبے کی آبادی دس بارہ ہزار تھی جس میں نصف کے قریب مسلمان، زمیندارہ تمام مسلمانوں کا تھا بلکہ وہاں کے دو رئیس تھے ایک تو سید مہربان علی دوسرے سید مہر شاکر علی چونکہ ہمارے قصبہ کے اطراف میں تمام ہندوؤں کے گاؤں تھے ہمارا اور ان کا تقریباً ہر سال جھگڑا ہوتا تھا ہندو گاؤں سے جمع ہو کر ہزاروں کی تعداد میں ڈھول بجا کر قصبہ پر حملہ کرتے تھے مگر خدا کے فضل و کرم سے کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ ہمارے قصبہ کا مسلمان بچہ بچہ اسلحہ کا تربیت یافتہ تھا اور ہر گھر میں اسلحہ رکھا جاتا تھا، ہر محلّہ میں چھوٹی بڑی توپیں بھی ہوتی تھیں۔ جھگڑا صرف اس بات کا تھا کہ ہندو کہتے تھے کہ گائے ذبح کرنی بند کرو

تم ہمارے بھائی ہم تمہارے بھائی۔ ہمارے بڑے یہ کہتے تھے کہ آج ہم تمہارے کہنے سے گائے ذبح کرنی بند کر دیں گے کل کو آپ کہیں گے کہ ''مسجدوں میں اذان دینی بند کر دو ہمارے بچے ڈرتے ہیں''۔ ہم گائے ذبح کرنی نہیں بند کریں گے۔ یہ تھی جھگڑے کی بنیاد جو کہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہی بلکہ انگریز حکومت نے اسلحہ کی وجہ سے ہمارے قصبہ پر بارہا چھاپے مارے مگر کبھی کامیابی نہ ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو ہندو ہماری جان کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے ایسی منصوبہ بندی کی کہ اس قصبہ کے مسلمانوں کو نیست نابود کر دیا جائے لہذا ہم نے بھی اپنے دفاع کے لئے پوری تیاری کر لی۔ ہمارے قصبہ کے تمام راستے بند کر دیئے گئے تھے جو سڑکیں قصبوں کی طرف آتی تھیں ان پر پورے کے پورے درخت کاٹ کر سڑکیں بلاک کر دی گئیں اس لئے ہمارے پاس کوئی کمک نہیں پہنچ سکتی تھی اور پھر ایک دن ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں نے ہمارے قصبہ پر چڑھائی کر دی۔ باقاعدہ مورچے بنا لئے اور قصبہ کے چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ چونکہ ہم نے بھی مورچہ بندی کی ہوئی تھی تمام دن مقابلہ ہوتا رہا کافی تعداد میں ہندو مارے گئے اور ان کے مورچے وغیرہ بھی ہم نے چھین لئے۔ ہمارے جو آدمی اگلے مورچوں پر لڑتے تھے دو چار گھنٹہ بعد پیچھے کے مورچوں پر بھیج دیئے جاتے تاکہ کچھ کھا پی لیں۔ اس دن کی لڑائی میں صرف ایک مسلمان شہید ہوا جو کہ دیہات سے آیا ہوا تھا۔ میرے برابر میں شانے سے شانہ ملا کر کھڑا تھا کہ سامنے سے تھری ناٹ تھری کی گولی آئی جو اس کی چھاتی میں لگی وہ فوراً ہی گرا اور شہید ہو گیا پروگرام یہ تھا کہ جو بھی شہید ہوا سے مسجد کے صحن میں لایا جائے تاکہ اسے دفن کر سکیں میں نے اس کو فوراً اٹھایا اور کمر پر ڈال کر مسجد کے صحن میں رکھ دیا اور پھر اپنے مورچے پر چلا گیا دوسرے روز اس سے بھی زیادہ شدت سے حملہ ہوا خدا کے فضل و کرم سے دوسرے دن کے حملہ میں ہم مسلمان کامیاب ہوئے اور شہر سے باہر نکل کر کافی تعداد میں ہندو ختم کئے بلکہ اسی دوران جب میں نے ایک ہندو کو مارا تو اس کا وزن تقریباً تین چار من ہوگا اس کی قمیص میں دو جیبیں تھیں ایک جیب میں بھنے ہوئے چنے اور دوسری جیب میں گڑ تھا یعنی وہ منظّم طریقہ

سے لڑ رہے تھے تیسرے روز انہوں نے سادہ کپڑوں میں ہندوملٹری لگادی۔ ملٹری اور پبلک کا مقابلہ شروع ہوا ملٹری والے تمام دن ٹومی گن، برین گنوں اورتھری ناٹ تھری کی گولیاں برساتے رہے مگر پورادن قصبہ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوئی چونکہ ملٹری والوں کا مورچہ ہماری طرف تھااوران کے سامنے ہمارامکان جودومنزلہ تھااوپر چونے کا پلستر کیاہواتھااس دوران ہمارے کمروں کی دیواروں پر گولیاں ایسے آ کرلگ رہی تھیں جیسے بھاڑ میں دانے بھن رہے ہوں۔ ہم چار پانچ لڑکوں نے اپنے بڑوں کے سامنے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اوراجازت مانگی کہ ہم چھوٹی توپ اپنی کمر پر باندھ کر پیٹ کے بل رینگتے رینگتے ان کے مورچوں کے قریب جائیں گے یاتو ہم ملٹری کا مورچہ توڑ کر آئیں گے یا پھر شہید ہوجائیں گے۔ ہمارے بڑوں نے اجازت دیدی ہم نے اپنے پروگرام کے تحت اپنی کمر سے چھوٹی توپ باندھ لی باقی نے اپنی اپنی کمر پر بندوقیں باندھ لیں اورہم پیٹ کے بل رینگتے رینگتے ملٹری کے مورچے کے قریب پہنچ گئے ملٹری کے مورچے کے قریب ایک بزرگ کالے خان کا مزارتھا ہم اس مزار میں داخل ہوگئے۔مزارشریف کی چاردیواری میں اینٹوں کے درمیان خالی جگہ ہوا کے لئے چھوڑی ہوئی تھی ہم نے خدا کے بھروسے پرتوپ کی نالی کو جالی میں پھنسادیااورتوپ کا فائر کیا۔مورچے پر جتنے بھی ملٹری والے تھے وہ سب ختم ہوگئے ہم خداوندکریم کا شکرادا کرتے ہوئے اپنے مورچوں پرواپس آ گئے تو ہمارے بزرگوں نے بھی خدا کا شکرادا کیا پھر کسی نے آ کر بتایا کہ اب ملٹری والوں کا یہ پروگرام بنا ہے کہ کل اس قصبہ کو بمباری کر کے ختم کردیا جائے اس بمباری کے خوف سے تمام قصبے والوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ رات کی تاریکی میں تمام مسلمان اوردیہات سے آئے ہوئے دوسرے لوگ دہلی روانہ ہوجائیں۔ راستہ میں پنجاب کھوڑ پڑتا تھا جو کہ ہمارے قصبہ سے صرف پانچ میل کے فاصلہ پرتھایہ راستہ پر پیدل چلنے والوں کے لئے شارٹ کٹ تھادہلی ادھر سے تقریبا ۲۵ میل دورتھی اور یہ سفر سڑک کے راستہ سے زیادہ تھا پروگرام کے تحت رات کو وہاں سے نکل گئے شہر میں کوئی مسلمان نہ رہا قافلہ کے چاروں طرف ہم نوجوان گھوڑوں پر سوار مسلح ہوکر

ساتھ ساتھ چلتے رہے راستہ میں ایک بڑی نہر کا پل تھا جس کو گوپال پور کا پل کہتے تھے وہاں پہرہ پر ۵۰ یا ۶۰ ہندوموجود تھے اس لئے کہ اس پیدل کے راستے کوئی مسلمان نہ گذر جائے انہوں نے قافلہ کوروکا اس پر ہم نے مہربان علی صاحب سے کہا کہ تھوڑے سے آدمی ہیں ہم ان کوختم کردیتے ہیں پھر راستہ صاف ہوجائے گا مگر مہر صاحب نہ مانے اور کہنے لگے کہ اگر تم نے ان کو ماردیا تو بات خراب ہوجائے گی پھر جو ہندو پہرہ دے رہے تھے انہوں نے کہا اگر آپ اس راستہ سے گئے تو ہماری بدنامی ہوگی آپ نہر کی پٹڑی پہ چلے جائیں آگے جا کر اسی راستہ پر پڑ جانا لہذا ایسا ہی ہوا تمام قافلہ نہر کی پٹڑی پر چل پڑا اتنے میں انہی لوگوں نے جو پل پر پہرہ دے رہے تھے دیہات میں گھوڑیاں دوڑادیں تقریبا دوچار سو ہندو قافلہ کے پاس آ گئے اور مہر صاحب سے کہا کہ ہم تو آپ کے مزارعہ اورعقیدت مند ہیں آپ کو ہم دہلی نہیں جانے دیں گے صبح آپ کو واپس قصبے میں لے کر چلیں گے اور پورے شہر کی دیکھ بھال ہم خود کریں اورآپ لوگ اپنے گھروں میں آباد رہیں گے۔مہر صاحب ان کی چال میں آ گئے ان کو دوچار گھنٹہ کا ٹائم مل گیا اتنے میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو جمع ہوگئے اور قافلہ پر حملہ کردیا ایک طرف نہر تھی تین طرف کے راستے انہوں نے روک دیئے۔ ہم ہندوؤں پر برابر فائرنگ کرتے رہے ان کو قافلہ کے قریب نہیں آنے دیا اس کے بعد زبردست بارش شروع ہوگئی بارش سے بھیگ کر ہمارا تمام اسلحہ بیکار ہوگیا اور بارود بھی بھیگ گیا ان لوگوں کے پاس تھری ناٹ تھری کی رائفلیں وغیرہ تھیں یعنی ہر قسم کا ہتھیار ان کے پاس تھا اس کے بعد ہندوؤں نے پوری شدت کے ساتھ حملہ کردیا اورلوگوں کا قتل عام شروع کردیا چونکہ اندھیری رات تھی نہ ہی کوئی دوسرے کی امداد کرسکا بلکہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ماں کو اولاد کا پتہ نہ تھا اولاد کو ماں کا علم نہ تھا باپ سے بیٹے جدا ہوگئے۔ قیامت کا سماں تھا۔ ہرطرف چیخ وپکار کی آوازیں آ رہی تھیں نوجوان لڑکیوں نے اپنی عصمتیں بچانے کے لئے نہر میں کودکودکر اپنی جانیں ختم کرلیں جن لڑکیوں کو نہر تک جانے کا موقعہ نہیں ملا وہ ان درندہ صفت انسانوں کے ہاتھ لگ گئیں جن کو وہ اپنے ساتھ لے گئے باقی تمام قافلے کو شہید کردیا گیا۔ دوچار آدمی بچے جو زخمی تھے

جن کو وہ مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے اگلے روز ملٹری آ کر ان کو اٹھا کر لے گئی۔ جب قتل عام شروع ہوا تھا اس وقت ہم نے اپنے کارتوس جو کہ بارش سے بھیگ گئے تھے منہ سے اوپر کا گتہ چھیل کر نال میں ڈالے اور وہ چل پڑے اس کے بعد ہم نے یہی ترکیب کی اور فائر کرتے ہوئے وہاں سے جان بچا کر نکل گئے۔ ہم پندرہ بیس آدمی ہوں گے اور ہمارے پاس آٹھ بندوقیں تھیں ان کے ساتھ میں بدنصیب بھی تھا چونکہ دن نکل چکا تھا ہم گنے کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گئے رات کو وہاں سے نکلے اور پنجاب کھوڑ کا رخ کیا مگر اندھیری رات تھی اور ہوش وحواس کھو چکے تھے راستہ بھٹک گئے دن نکلنے پر ہم پھر کسی گنے یا جوار کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ جاتے اس طرح ہمیں تین دن ہو گئے بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکے تھے اب ہم نے یہ پروگرام بنایا کہ دن میں سفر کریں گے۔

کھوڑ کی عیدگاہ نظر آ گئی تب جان میں جان آئی اور اس کو وعدہ کے مطابق چھوڑ دیا۔ پنجاب کھوڑ میں ۷۵ فیصد آبادی آرائیں قوم کی تھی اور ۲۵ فیصد آبادی ہماری برادری کی تھی رشتہ میں میرے ماموں چودھری محمد غنی یہاں رہتے تھے ان کے گھر چلا گیا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور خوب خاطر مدارات کی وہاں جا کر تین دن کے بعد کھانا کھایا باقی لوگ مختلف جگہوں پر ٹھہر گئے۔ کئی برادریوں کے لوگوں نے ہمیں طعنے وغیرہ دیئے کہ تم شہر کو ختم کرا کر آئے ہو تم بزدل ہو یہاں دیکھنا ہم ہندوؤں کو مزا چکھا دیں گے ان کو صرف ایک توپ پر ناز تھا جو کہ ٹیلیفون کے کھمبے کی بنائی ہوئی تھی صبح وہاں سے بھی حملہ شروع ہو گیا توپ کا فائر کرنے والا خود جل کر کباب ہو گیا اور ہونا بھی تھا۔ آخر انہوں نے ہمیں اپنی مدد کے لئے بلا لیا اور ہم سب نے مل کر ہندوؤں کو گاؤں کے اندر داخل نہیں ہونے دیا آخر شام کو ہندو واپس لوٹ گئے اور اگلے روز کا منصوبہ بنایا کہ کل شدت سے حملہ کیا جائے ہمارے پاس تھوڑے بہت کارتوس بچے تھے لیکن اتنے نہیں تھے کہ کل مقابلہ جاری رکھا جا سکے ہم سب نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری یہ آخری رات ہے پوری رات سوئے نہیں اللہ اللہ کرتے رہے۔ خداوند کریم کی شان دیکھیں صبح ہی صبح گاؤں کے پاس ملٹری آ گئی اور کمان کرنے والا انگریز تھا ملٹری والوں نے کہا کہ ہم تمہاری حفاظت کے لئے آئے ہیں بے فکر رہیں چونکہ اس روز بڑا حملہ

ہونے والا تھا کافی ہندو ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے حدِّ نگاہ تک حملہ آور تھے اور ملٹری والوں نے ہوائی فائرنگ کر کے سب کو منتشر کر دیا اس کے بعد ملٹری والے ہمیں اور تمام گاؤں والوں کو بہادر گڑھ لے گئے وہاں سکول کے برابر میں کیمپ بنا دیا پھر وہ ملٹری چلی گئی گورکھے آ گئے تھے ایک دو روز تو کیمپ میں روٹی ملی جو کہ اپنے ساتھ گاؤں سے لائے تھے اس کے بعد فاقے شروع ہو گئے لوگ بے دلی سے درخت کے پتے اینٹوں سے پیس کر کھاتے رہے پندرہ دن اسی طرح ہو گئے کیمپ میں ہیضہ کی بیماری پھیل گئی دس بیس آدمی روز مرنے شروع ہو گئے ہم کاندھوں پر چارپائی رکھ کر انہیں ایک گڑھے میں ڈال آتے تھے کیونکہ کفن دفن کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ دو ہفتے بعد انڈیا گورنمنٹ نے ایک چھٹانک چنے فی کس ایک ہفتہ کا راشن دیا لوگ ان کچے چنوں کو گن گن کر کھاتے تھے ہم بھی ایسا ہی کرتے رہے اس کے بعد انڈیا گورنمنٹ نے ایک پاؤ آٹا فی کس ایک ہفتہ کا دیا جو آٹا لے کر آئے تھے وہ ایک ہندو تحصیل دار تھے انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا برخوردار تم کس کے لڑکے ہو میں نے ان کو بتانے سے اس لئے گریز کیا کہ کیمپ میں یہ بات سنی تھی کہ اس خاندان کا ایک لڑکا بچا ہے بہادر گڑھ کیمپ میں ہے اس کو بھی کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے اس ڈر سے میں نے تحصیلدار کو نہیں بتایا آخر اس نے مجھے بہت مجبور کیا تب میں نے بتا دیا کہ میں حبیب اللہ کا لڑکا ہوں۔ اتنا سن کر تحصیلدار صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے کہا جاؤ میری کار میں بیٹھ جاؤ میں تمہیں کسی محفوظ مقام پر چھوڑ آؤں گا۔ آخر میں نے ان کو انکار کر دیا پھر انہوں نے مجھے قسمیں کھا کر یقین دلایا میں ان کی کار میں جا کر بیٹھ گیا اس وقت میرے پاس ایک پستول تھا اور ۶ عدد گولیاں تھیں۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ اپنے وعدہ سے منحرف ہو گیا تو میں پہلے اس کو ختم کر دوں گا۔ تحصیلدار مختلف کیمپوں کا معائنہ کر کے رات دس بجے دہلی لے گئے اس وقت سبزی منڈی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا عمارتوں کو آگ لگ رہی تھی۔ مجھے تحصیلدار نے رات گیارہ بجے شاہی مسجد کے قریب لے جا کر کہا کہ بیٹا تم اتر کر اپنی تسلی کر لو یہ سب مسلمان ہیں پھر میں نے ان سے معلوم کیا آپ نے میرے ساتھ اتنی مہربانی کیوں کی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ

آپ کے والد میرے بہت گہرے دوست تھے اور انہی کی بدولت میں تحصیلدار بنا اور میں بھالوٹ کا رہنے والا ہوں۔ میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہر چیز کھانے کی فروخت ہو رہی تھی میرے ضمیر نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ میں ہاتھ پھیلاؤں صبر کر کے مسجد کی سیڑھی پر لیٹ گیا۔ صبح اٹھ کر بارہ ٹوٹی صدر گیا وہاں کچھ رشتہ دار چمڑے کے آڑھتی تھے وہاں جب پہنچا تو انہوں نے میری خیریت تک نہیں پوچھی جب میں واپس لوٹنے لگا تب انہوں نے کہا کہ برخوردار میں نے آپ کو پہچانا نہیں تم کون ہو میں نے تعارف کرایا تو پھر وہ اٹھے اور مجھے چھاتی سے لگایا میرے کپڑے تقریباً پھٹ چکے تھے اسی وقت ایک کپڑوں کا جوڑا اوپر سے منگوایا اور مجھے کہا جاؤ غسل خانہ میں نہالو پھر میں نے نہا کر کپڑے بدلے اتنے میں روٹی آ گئی چونکہ کافی دن گذرنے کے بعد پہلی دفعہ روٹی کی شکل دیکھی تھی میں دیوانوں کی طرح کھاتا رہا اور وہ مجھے دیکھ کر روتے رہے اس کے بعد انہوں نے کہا کہ تمہارے والد کی کچھ رقم ہماری طرف باقی ہے وہ لے لو میں نے کہا کہ مجھے صرف پانچ سو روپے دیدو اگر میں بچ کر پاکستان چلا گیا تو وہاں سے آپ کو خط لکھوں گا تب آپ پورا حساب کر کے جو میرے والد کی رقم ہو بھیج دینا۔ انہوں نے پانچ سو روپیہ دے دیا اس کے بعد میں نے سوچا کہ دھیال ختم ہو چکا ہے ننھیال باقی ہے لہذا سونی پت روانہ ہوا بہرحال سونی پت میں کیسے پہنچا یہ بھی ایک دردناک داستان ہے جو کہ فی الحال تحریر نہیں کر سکتا۔

میں سونی پت پہنچ گیا وہاں میری پھوپھی اور میرے بھائی کی بیوی (بھائی تو شہید ہو چکا تھا) اور اس کا دو سال کا بچہ وہاں تھے۔ تقریباً ایک ماہ سونی پت رہا اس کے بعد بذریعہ ٹرین پاکستان آ گیا ہماری ٹرین خانیوال آئی تھی جب سے یہاں آباد ہوں چونکہ میرے والد صاحب خوشحال تھے اس لئے ان کا ساہوکارہ، روہتک، سونی پت، حسن گڑھ، بمبئی، کلکتہ، وغیرہ میں چلتا تھا مگر انقلاب اسی کا نام ہے کہ میں چالیس سال سے دوسروں سے رقم لے کر منافع پر کام کر رہا ہوں۔ خداوند کریم کا شکر ہے وہ جس حال میں رکھے بہتر ہے۔ چونکہ پاکستان میں آنے کے بعد میرے اپنے کوئی اولاد نہیں تھی مگر اولاد پیدا ہونے سے پیشتر مجھے اولاد عطا فرما دی۔ وہ اس

طرح کہ سب سے بڑے بھائی جو شہید ہوئے تھے ان کی دو لڑکیوں کی شادی روہتک میں ہوئی تھی ایک دفعہ اپنے والد کے پاس آ کر دوبارہ جو گئیں پھر ان کو ماں باپ، بھائی بہنوں کو دیکھنا نصیب نہ ہوا ایک بہن کی لڑکی جو کہ شہید ہونے والے قافلہ میں سے ایک ہندو جاٹ اپنے گھر لے گیا اس کے اولاد نہیں تھی اس نے اس بچی کو اولاد کی طرح کئی ماہ اپنے پاس رکھا مگر یہ بچی بہت روتی تھی آخر وہ مجبور ہو کر سونی پت کیمپ میں چھوڑ گیا اس کے تمام خاندان میں سے کوئی نہیں بچا اس کی بھانجی کی تمام رسوم و رواج کی ذمہ داری ۱۹۴۷ء سے آج تک میرے کاندھوں پر ہے دو تایا زاد بہنیں بچیں جو کہ سونی پت میں اپنے سسرال میں تھیں ان کی بھی آج تک تمام ذمہ داری میرے اوپر ہے میں انہیں اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اولاد سے پہلے مجھے صاحب اولاد کر دیا۔ خداوند کریم کی مہربانی سے ان کو آج تک محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا کوئی نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء میں میرے خاندان کے شہید ہونے والے افراد میں میری والدہ جن کا نام نصیبن تھا، میرے بڑے بھائی محمد یعقوب، فخر الدین، بڑے بھائی کے دو لڑکے عبدالخالق، عبدالحمید اور ایک لڑکی اکبری اور ان کی بیوی، چچازاد بھائی شبیر حسین اور ان کی دونوں بیویاں، ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں، چچا کرم الٰہی ان کی بیوی ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھے۔ تقریباً ۲۲ افراد شہید ہوئے خداوند کریم ان سب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

اتنی قربانیوں کے بعد ہم لوگ اس خطہ ارض تک پہنچ پائے جو ہمارا ملک ہے۔ ہمارا گھر ہے اور ہماری منزل ہے اور ہماری دعا ہے یہ سرسبز و شاداب وطن ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ آمین (۱۹)

چودہ اگست اور ٹمٹماتے چراغ

گوہر ملسیانی

آج بھی جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں ہوتو کئی معصوم سی آوازیں ابھرتی ہیں اور کئی خوش نما چہرے مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہیں جن سے خون رس رہا ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں، ان کے نرم و نازک سرخ سرخ ہونٹوں پر کچھ سوال مچلتے نظر آتے ہیں جن میں گزشتہ چھپن سالہ پاکستانی تاریخ کے نشیب و فراز کا حوالہ ہے۔ مگر ان میں ۱۹۴۷ء کے اندوہناک اور کرب انگیز واقعات اور ظلم و ستم سے لبریز حالات کے شام و سحر کی شفق زیادہ نمایاں ہے۔ ان صداقت و محبت کے پیکروں کی ضیابار آنکھیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ میرے سامنے اس دور کا ایک ابر آلود اور دھواں دھواں منظر پھیل جاتا۔ جس میں ایک ہلچل اور دوڑ دھوپ ہے، خوف و ہراس ہے۔ میں سٹپٹا کر گھبرا جاتا ہوں اور لہو رنگ یادوں میں کھو جاتا ہوں۔

ملسیان، تحصیل نکودر، ضلع جالندھر، مشرقی پنجاب کا ایک بڑا قصبہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہاں سات محلے تھے۔ چار خالصتا مسلمانوں کے ایک سکھوں کا اور باقی دو میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔ صدیوں سے آباد یہ قصبہ امن و سکون کا مرقع اور تہذیب و ثقافت، تجارت و زراعت اور علم و ادب کا مرکز تھا۔ بابائے اردو ہند لبھو رام جوش ملسیانی اور ان کا بیٹا نعت گو شاعر لالہ بالمکند عرش ملسیانی کا تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ محبت، اخوت، مسرت و انبساط اور رواداری کے زمزمے یہاں مٹھاس گھولتے۔ چوپال آباد تھے۔ وارث شاہ کی ہیر اور مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا، سریلی اور خوش الحان آوازوں میں یہاں پڑھی جاتی۔ ہاں کبھی کبھی امن و سکون کے تالاب میں کوئی پتھر گر جاتا، کچھ ارتعاش ہوتا لہریں کناروں تک پہنچ جاتیں لیکن جلد ہی خاموشی چھا جاتی۔

قصبے سے دس کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں ننگل میں ایک ہائی اسکول تھا جسے ایک مسلمان تنظیم چلا رہی تھی اس کے منتظمین میں ایک شخصیت چوہدری محمد علی تھی جو بعد میں وزیر اعظم پاکستان بنے۔ مسلمان طلبہ کی تعداد زیادہ اسی اسکول جاتی جب کہ ایک سرکاری ہائی اسکول تحصیل

مقام نکودر میں تھا۔ اس علاقے میں صرف یہی دو ہائی اسکول تھے۔ البتہ ملسیان میں ایک مڈل ماڈل ورینکلر اسکول تھا۔ ننگل انبیاء کی تعلیمی درسگاہ اپنے تعلیمی معیار اور نتائج کے اعتبار سے بلند مقام رکھتی تھی۔ لہذا یہاں طلبہ کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اس علاقے میں تحریک پاکستان کا مرکز بھی یہی گاؤں تھا۔ یہاں سے مسلم لیگ اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور پھر حصول پاکستان کی دعوت اردگرد کے مسلمان دیہاتوں میں پھیل گئی۔ ملیسان چونکہ علاقے کا ایک بڑا قصبہ تھا اور مسلمانوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اس لئے یہاں بھی مسلم لیگ کے کارکن آتے اور پاکستان کا تذکرہ ہوتا رہتا تاہم زیادہ تر خاموشی رہتی البتہ تخلیق پاکستان سے چند ماہ قبل ملسیان اس علاقے کے مسلمانوں کا مرکز ضرور بن گیا۔

میں ان دنوں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، عمر تقریبا بارہ تیرہ سال تھی اور تحریک پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ جب کامیابی کے آثار نمایاں ہونے لگے تو ظلم و جور کی آندھیاں زور و شور سے چلنے لگیں، استبداد کے بگولے ناچنے لگے اور نفرت کے سیاہ بادل چھا گئے۔ امن و سکون کی دیوی منہ چھپانے لگی اور ایک جگہ مقیم ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لئے شکوک و شبہات کے پیکر بن گئے۔ دن اجتماعات میں کٹتے اور راتیں جاگتے ہوئے گزرنے لگیں۔ مسلمانوں کے چھوٹے دیہات اجڑنے لگے اور پناہ کے لیے ملیسان کا قصبہ مرکز بن گیا۔ ملسیان کے اردگرد بہت سے چھوٹے چھوٹے دیہات مسلمانوں کے تھے جو سرخ آندھی کی زد میں آئے اور وہ لوگ پناہ کے لئے ملسیان پہنچے یوں اس قصبہ میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جلد ہی مسلمان یہاں سے بھی جانے لگے البتہ اسکول کا محلّہ الگ تھلگ اور قلعہ نما تھا لہذا وہاں لوگ اپنے گھروں میں رہے۔ فسادات کے باعث تعلیمی نظام درہم برہم ہو گیا۔ طلبہ اپنے اپنے گھر آ بیٹھے اور بزرگوں سے جدوجہد پاکستان اور تقسیم ہند کی باتیں غور سے سنتے۔ مسلمانوں کے قتل اور آتش زدگی کے واقعات سراسیمگی پھیلا جاتے۔ منہ اندھیرے کھیتوں کو جانے والے اور رات کی تاریکی میں واپس آنے والے بھی اپنا معمول بدل کر دن کے اجالے میں اپنے امور

نپٹانے لگے۔ایک مرتبہ میں بھی المیہ کردار بنتے بنتے بچا۔

شام ڈھل رہی تھی۔سورج افق مغرب میں غروب ہونے والا تھا جب میں اپنے گھر سے تین چار میل دور اپنی زمینوں سے مویشی لئے آرہا تھا ۔ راستہ سنسان تھا ۔سب لوگ اپنا اپنا کاروبار سمیٹ کر قصبے میں پہنچ چکے تھے۔ میں بھی کشاں کشاں آرہا تھا۔ابھی نصف فاصلہ طے کیا تھا کیا دیکھتا ہوں ایک سردار جی مٹی کے بڑے ڈھیر کے دوسری جانب جھاڑیوں پر اپنی پگڑی پھیلائے راستے پر کھڑے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کسی شکار کے انتظار میں ہیں۔ جونہی میں قریب پہنچا ، کہنے لگے ''برخوردار! ذرا یہ پگڑی تو اکٹھی کروادو''۔ میرے ذہن میں بزرگوں کی نصیحت جاگ اٹھی کہ دیکھنا کسی سکھ کی گرفت میں نہ آجانا۔اس کی بات سنی ان سنی کر کے میں مویشیوں پر ڈنڈے برسانے اوران کے پیچھے بھاگنے لگا۔ میں زور زور سے ایک دوست کا نام لے کہ آوازیں بھی دینے لگا جیسے وہ پیچھے آرہا ہو یا قریب ہی کہیں موجود ہو۔خوف نے مجھے دوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کچھ دور جا کر پیچھے دیکھا تو سردار جی بھی رفو چکر ہو چکا تھا۔

اس زمانے میں ہر صبح ایک نئی امید لے کر آتی مگر شام مایوسی کے سائے پھیلا کر رخصت ہو جاتی۔تقسیم ہند کا اعلان کیا ہوا آگ اور خون کا طوفان امڈ آیا۔مشرقی پنجاب تو خاص طور پر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔فتنہ وفساد کی آگ ہمارے چاروں طرف پھیل گئی۔ ہر روز نیا حادثہ رونما ہوتا لیکن ملسیان ابھی تک تعصب کے شعلوں سے محفوظ تھا۔ پھر ایک دن اس خبر نے ملسیان اور گردنواح سے آئے ہوئے مسلمانوں کو پریشان کر دیا کہ سکھ ہندوستانی فوجیوں کو لیے یہاں کے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے آرہے ہیں۔اب ذمے داروں نے سر جوڑے۔آخر فیصلہ ہوا کہ آستین کے سانپوں کو پہلے کچل دیا جائے۔اس طرح وہ گھر کے بھیدیوں کی مخبری سے بچ جائیں گے۔رات اپنی زلفیں پھیلانے کی تیاری کر رہی تھی کہ مسلمانوں نے سکھوں کے محلے پر حملہ کر دیا۔ محلے کی گلیاں اور راستے پہلے ہی بند کر دیئے گئے تھے۔سکھوں نے چھتوں پر مورچے بنائے ہوئے تھے۔لہذا بڑا سخت مقابلہ ہوا۔مسلمانوں نے جرأت سے کام لیا اوران کے مکانوں

کو آگ لگا دی۔شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔کچھ سکھ اور ان کے اہل وعیال قتل ہوئے جب کہ زیادہ تر بھاگ گئے۔لوگ اس یلغار سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اطلاع پہنچی کہ سکھ فوج کے ہمراہ قریبی مسلمانو ں کے گاؤں ، کانگنہ، پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ سارے گاؤں کا محاصرہ ہو چکا ہے۔اور لوگوں کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ملسیان کے مسلمانوں کی وہاں رشتہ داریاں تھیں۔لہذا کئی لوگ اپنے گھر جانے کے بجائے اس گاؤں کی جانب بھاگ کھڑے ہوئے میرے چچا جان اور دوسرے رشتے دار بھی ادھر گئے۔ان لوگوں نے حملہ آوروں کا مغربی جانب سے مقابلہ کیا۔گاؤں کے کچھ لوگ بچ نکلے باقی شہادت کا جام نوش کر گئے۔ملسیان کے لوگوں کو علم تھا کہ اصل ہدف ان کا قصبہ ہے۔لہذا وہ واپس آئے اور اعلان کر دیا کہ کہیں اور نکل چلو۔ قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔لوگ اپنے اہل وعیال لے کر نکلے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔کہاں جانا ہے کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔میرے چچا جان واپس پہنچے تو ہم گھر چھوڑ کر اندرون شہر آ چکے تھے۔اب ہم سب فوج کی آمد کے خوف سے شہر سے باہر بھاگنے لگے۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کرتے کہ شور اٹھتا سامنے سے سکھ آرہے ہیں لہذا رخ دوسری جانب ہو جاتا۔تھوڑی دیر بعد پھر شور اٹھتا اور ہم پھر رخ بدل لیتے ایک کہرام تھا، چیخ وپکار تھی۔سب لوگ بے خبر چیختے چلاتے بھاگ رہے تھے۔ والدہ دل کی مریضہ اور زیادہ تکلیف میں تھیں۔انہیں پیاس محسوس ہوئی مگر پانی کہاں تھا ریلوے لائن کے قریب ایک گڑھے میں بدبودار پانی تھا، مجبوراً اس سے دو گھونٹ پیئے اور پھر وہی دوڑ دھوپ اور افراتفری۔ جب اجالا مشرق سے نمودار ہوا تو ہم رات بھر میں صرف دو میل کا فاصلہ طے کر سکے تھے۔ نہ منزل کی خبر نہ مقام کا پتہ، بس سب چل رہے تھے۔آخر معلوم ہوا کہ تین میل اور آگے ایک گاؤں میاں والی مولویاں ہے وہاں ایک مسلمان میجر میاں اسلم رہتا ہے جس کے ہاں کیمپ لگ رہا ہے۔ وہاں پہنچے تو میدان حشر کا سماں تھا۔نفسانفسی کا عالم ،شوروغوغا ،بکھرے ہوئے خاندان، ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرداں۔

میاں اسلم ایک پرعزم اور باہمت ریزرو فوجی افسر تھا۔اس نے چند ذمہ داروں کو بلایا

اورآئندہ کالائحہ عمل مرتب کیا۔ فیصلہ ہوا کہ پہلے گاؤں کے پولیس افسر سے رابطہ کیا جائے جومسلمان تھا اور اسلم سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ اگلے دن میاں اسلم اس سے ملنے گیا مگر وہ پولیس اسٹیشن سے باہر گیا ہوا تھا۔ اگلی صبح پھر میاں اسلم تھانے پہنچا تو فضا بدل چکی تھی ،مسلمان تھانیدار کی جگہ ایک سکھ نے لے لی۔ میاں اسلم اپنے گھوڑے پر سوار تھا۔ ایک سکھ سپاہی نے گھوڑے کی باگ تھام لی۔ اسلم خطرہ محسوس کر کے گھوڑے سے کودا اور پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ مگر ایک سنسناتی گولی آئی اور میاں اسلم جام شہادت نوش کر گیا۔ اس کا خون شفق کے ساتھ چمکنے لگا۔ کیمپ اجڑ گیا اور پھر وہی آہ وفغاں اور بھاگ دوڑ وہی موت کے سائے تعاقب میں آنے لگے۔ یہاں سے پھر روانہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ نکودر میں مسلمانوں کا کیمپ قائم ہو گیا ہے اور وہاں سے پاکستان کے لئے قافلے روانہ ہوں گے۔ لیکن ابھی تو کئی خون کے دریا عبور کرنے تھے۔ ہم تو بے سروسامان تھے۔ اور کیمپ میں قیام کے دوران کئی چیزوں کی ضرورت تھی مثلاً خیمے کے لئے چادر اوڑھنے کے لئے کپڑے، برتن وغیرہ۔ راستے میں رشتے داروں کے دیہات تھے مگر وہ لوگ ہمارے پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ آخر ایک جگہ کچھ سامان ملا اور ہم بھی کیمپ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی مقامات پر بے گوروکفن لاشیں پڑی تھیں۔ ظاہر ہے مسلمانوں کی ہوں گی جو حصول پاکستان پر اپنی جان قربان کر گئے تھے۔

مہاجرین کا کیمپ نکودر اسٹیشن سے جنوب کی طرف ایک میل کے فاصلے پر قائم کیا گیا تھا اور اب تقریباً دس مربع میل میں پھیل چکا تھا۔ ہم نے بھی ایک جگہ خیمہ لگایا اور قیام کیا۔ اب مسئلہ خوراک کا تھا۔ کیمپ سے باہر جانا اور اناج لانا خطرے سے خالی نہ تھا' مگر مرتا کیا نہ کرتا' کے مصداق یہ کام بھی انجام دیا۔ لوگ جاتے اور کئی سکھوں کی گرفت میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ یہ چار ماہ کیسے گزرے بیان کا یارا نہیں۔ اللہ ہی ان مصائب سے بچانے والا تھا۔ درختوں کے پتے کھائے، کیا کچھ نہ کیا۔ اس کیمپ کی نگرانی ہندوستان کی ڈوگرہ رجمنٹ کے پاس تھی جو بے حد ظالم بلکہ بے غیرت تھی۔ اس کی دست برد سے اپنے آپ کو اور اپنی عزت کو بچانا

ایک مسئلہ تھا۔ یہ بھی ایک دردناک داستان ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے بیل گاڑیوں پر آئے تھے ان کے لیے اپنے جانوروں کے چارے کا حصول بھی موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔ کئی افراد کیمپ سے باہر سکھوں کے ہاتھوں لقمہ اجل بنے۔ اس کیمپ کے ایک نگران انگریز افسر کا تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنے اعلیٰ کردار اور فرائض کو حسن تدبر سے ادا کر کے مسلمانوں کے دل موہ لیے۔ وہ ہمدرد مونس موسم گرما اور برسات میں صرف ایک نیکر پہنے کیمپ کے اردگرد چکر لگاتا رہتا تکالیف کا تدارک کرتا، کسی غیر مسلم کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ کیمپ میں بری نیت سے داخل ہو سکے بلکہ بعض اوقات وہ دیہات سے اناج لانے اور دیگر ضروریات کے حصول میں بھی معاون بنتا۔ اس نے مسلمانوں کو سہولتیں پہنچائیں تو سکھ اس کے دشمن ہو گئے۔ ایک دن وہ نکودر سے جالندھر کی جانب جیپ کے ذریعے جا رہا تھا کہ ایک سکھ سڑک کے کنارے درخت پر تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے فائر کیا لیکن وہ بال بال بچا، صرف بائیں ہاتھ کی چھنگلی زخمی ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے سردار جی اس کا ہدف تھا وہ گدھ کی طرح زمین پر آ رہا۔ اسے اس کیمپ سے تبدیل بھی کیا گیا لیکن وہ پھر واپس آ گیا اور دو ماہ کے قریب اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔

جب نکودر کیمپ سے بیل گاڑیوں کے قافلے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے، کئی دریا کی طغیانی میں بہہ گئے اور کئی مظالم کا مقابلہ کرتے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ آخر نکودر کیمپ کے مہاجرین کو بھی پیدل جالندھر ریلوے اسٹیشن کے قریب کیمپ میں پہنچنے کا حکم ہوا۔ قافلے روانہ ہوئے ، راستہ کئی مقامات پر دشوار گزار تھا، بارشوں نے اسے مزید مشکل بنا دیا۔ پھر ہندوستانی گورکھا فوج نے بہت ظلم ڈھائے، وہ لوگوں کو جانوروں کی طرح ہانک رہی تھی۔ راستے میں قیام ہوتا تو بدطینت سپاہی کیمپ میں پھیل جاتے۔ کوئی قیمتی چیز ملتی یا نوجوان لڑکی دیکھتے تو اٹھا لے جاتے۔ کتنی عصمتیں برباد ہوئیں۔ کتنی مسلمان لڑکیاں ہندوؤں کے نرغے میں آئیں یہ ایک دلدوز داستان ہے۔ لوگ اپنی بیٹیوں کو بستروں میں لپیٹ کر چھپاتے۔ جالندھر تک کا فاصلہ پہلے سے بھی زیادہ ہمت شکن اور عبرت انگیز بلکہ خون کا دریا عبور کرنے کے مترادف تھا۔ وہاں بھی کیمپ میں

ایک ہفتہ بھوکے پیاسے گزارنا پڑا۔ بچے بلکتے ،عورتیں تڑپتیں ،بوڑھے گھبرا اٹھتے ،کئی یہاں بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ پاکستان سے کچھ لوگ اپنے عزیزوں کے لئے ٹرک لے کر آئے اور خوش قسمت ان کے ذریعے تمناؤں کی سرزمین جا پہنچے۔ آخر ریل گاڑی چلنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دن کے وقفے کے بعد ریل آتی اور مہاجرین کو لے کر روانہ ہو جاتی۔ اس وقت عجیب گھمسان کا رن پڑتا۔ دھکم پیل ہوتی اور خاندان بکھر جاتے ۔ کچھ ڈبوں میں سوار ہوتے ، کچھ چھت پر چڑھ جاتے اور گاڑی انہیں لے کر روانہ ہو جاتی۔

ایک دن ہماری باری بھی آ گئی۔ ہمیں ڈبے میں داخل ہونے میں کامیابی نصیب ہوئی مگر اہل خانہ دو ڈبوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر ریل کے ساتھ چار پاکستانی فوجی بھی آتے جو بے حد جرأت منداور ذمہ دار تھے۔ جب تک ریل کسی جگہ رکی رہتی یہ چاروں گاڑی کے دونوں جانب آگے پیچھے بھاگتے رہتے۔ لوگوں کو شور مچانے سے منع کرتے۔ انہیں حوصلہ دلاتے اور ڈھارس بندھاتے۔ اللہ اللہ! کیسا منظر تھا۔ ہم مسلمان مجاہدین کو دیکھ کر خوش تھے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے کیونکہ وہ سرزمین پاکستان کے محافظ تھے۔ آزادی کے چراغ روشن کرنے والے اور امت کا غم کھانے والے! جب رات کی تاریکی نے اپنا دامن پھیلایا تو سگنل ڈاؤن ہوا، انجن نے سیٹی بجائی اور گاڑی روانہ ہوئی۔ اس وقت ہر زبان پر دعائیں مچلنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور تمنائیں دامن پھیلانے لگیں اور امن وسکون سے منزل مقصود پانے کی التجائیں ہونے لگیں۔ گاڑی جالندھر اسٹیشن پر نہیں رکی بلکہ رفتار تیز رہی۔ ہم نے جالندھر اسٹیشن پر الوداعی نظر ڈالی تو وہ عمارت بھی ساتھ ساتھ بھاگتی ہوئی محسوس ہوتی۔ صدیوں کا ملاپ مفارقت میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اب یہ علاقہ ہمیشہ کے لئے غیروں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ گاڑی رواں دواں رہی۔ رات کا اندھیرا ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔ کوئی اسٹیشن آتا تو انجن کی سیٹی کی آواز بیدار کر دیتی کسی اسٹیشن پر کسی سردار جی کے درشن ہو جاتے۔ گاڑی فراٹے بھرتی رہی مگر ایک جگہ آ کر رک گئی۔ ٹارچ کی روشنی آگے پیچھے بھاگنے لگی۔ معلوم ہوا آگے امرتسر اسٹیشن ہے اور راستہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دل

دھڑکنے لگے۔ خاموش رہنے کی ہدایات ملنے لگیں۔ کسی نے جرأت کر کے پوچھ لیا ''کیا معاملہ ہے؟'' خبر ملی کہ اس ریل سے دو دن پہلے جانے والی ریل امرتسر اسٹیشن پر روک لی گئی اور سب مسلمان قتل کر دیئے گئے تھے۔ اب اسٹیشن کو صاف کیا گیا۔ یہی تو ہجرت تھی، یہی تو آگ اور خون کا کھیل مشرقی پنجاب میں ہر جگہ کھیلا گیا۔ آج بھی اس رات کا تصور آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا ،گاڑی کے اندر بھی اور باہر بھی اور اس میں موت کے بھوت ناچتے محسوس ہوتے۔ کبھی کبھی ٹارچ کی منحنی سی روشنی امید کی کرن بن کر چمکتی تو خوف کے سائے سمٹ جاتے۔ اس کے باوجود زندگی کا سفر ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ آیات قرآنی لبوں پر تڑپنے لگیں۔ محافظ بھی خالق کائنات کے حضور دعاؤں کے لئے کہتے۔ عجیب ہو کا عالم تھا۔ دل دھڑک رہے تھے۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

آخر دعائیں مستجاب ہوئیں۔ سگنل ڈاؤن ہوا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ امرتسر اسٹیشن آ گیا۔ ہر دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ہر زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد تھا۔ آہستہ آہستہ صدائیں آ رہی تھیں۔ اسٹیشن پر روشنی تھی لیکن پلیٹ فارم صاف تھا۔ انتظار گاہ میں کچھ لوگ موجود تھے۔ ''معلوم نہیں کون تھے؟'' آخر گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ اور خیالات اس سے بھی زیادہ تیز۔۔۔۔ یہ اللہ کا کرم تھا کہ ہماری ٹرین کو راستہ مل گیا۔ اور وہ امرتسر نہیں رکی۔ منزل مقصود کو پانے کی تمنا میں قلب مضطرب کی کیفیت بیان کرنا آسان نہیں۔ قسم قسم کے تصورات ابھرتے اور نئی نئی آرزوئیں جنم لیتیں۔ آخر وہ دل ونگاہ کو شاداب کرنے والی دھرتی آ گئی اور ریل پاکستانی حدود میں داخل ہوئی۔ بند ٹوٹ گیا، طوفانی لہریں اٹھنے لگیں اور امن کے ترانے گونجنے لگے۔ پاکستان زندہ باد سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ پیشانیاں مسرت سے دمکنے لگیں۔ سر سجدہ ریز ہو گئے مسرت اور شادمانی کا دل افروز منظر تھا مگر رخساروں پر شبنمی قطرے بھی رقص کناں تھے۔ آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔۔۔۔ آزادی کے چراغ۔

آج چھپن سال بعد میرے سامنے وہی جاں گداز یادیں، وہی خوں آلود چہرے تڑپ

رہے ہیں۔نظریہ پاکستان فضامیں تحلیل ہو چکا ہے۔ زخموں سے پھر خون رسنے لگااور شہیدوں کالہو پکار رہا ہے کہ وہ امیدیں جن میں اسلامی انقلاب کا رنگ جھلکتا تھاوہ قربانیاں جوتحریک پاکستان کی جدوجہد کی روشنی تھیں،کہاں ہیں؟ان کے ثمرات کہاں ہیں؟اس نظریاتی حسن کوکس نے چرالیا؟ یہ حرص وہوس کی آندھیاں کیوں چلنے لگیں،ایثارومحبت،خلوص،پیاراور جذبہ حب الوطنی کہاں غائب ہوگئے۔ چودہ اگست آتا ہے تو یہ ٹمٹماتے چراغ بھڑک اٹھتے ہیں جیسے آخری ہچکی لے رہے ہیں۔دونسلیں اپنا عہد رنگین کر گئیں اوراس خاک وخوں سے لبریز عہد کی دونشانیاں باقی ہیں۔وہ پریشان اوراپنی تمناؤں کی سرزمین کی تلاش میں ہیں۔مگر چاروں طرف کہیں بھی نور دکھائی نہیں دیتا۔ طالع آزماؤں نے سارا نقشہ بدل دیا ہے۔نجانے کب کب ابر کرم برسے گا۔سبزہ اگے گا،شادابی ہوگی۔اورنظام مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پھول کھلیں گے۔(۲۰)

کیا کھویا کیا پایا

مشتاق احمد خاں

۱۹۴۷ء کا سال کیا آیا کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ انسانی خون پانی کی طرح بہنے لگا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے المناک واقعات کی یادیں ابھی تاریخ کے صفحات میں گم ہونے نہیں پائی تھیں کہ ۹۰ برس کے بعد تاریخ نے پھران المناک واقعات کو دہرادیا۔۱۸۵۷ء میں جس ظلم وتشدد سے مسلمان ہندکوگزرنا پڑا وہ باہر سے آئے ہوئے غاصبوں کی طرف سے تھا۔ وہ ڈاکوؤں کا فعل تھالیکن ۱۹۴۷ء میں ہرطرح کے مظالم ہم وطنوں کی طرف سے ڈھائے گئے۔ یہ کتنا افسوس ناک المیہ ہے کہ جس آزادی کا خواب برصغیر کے باشندے برسوں سے دیکھتے آئے تھےاس کی تعبیر درندگی،غیرانسانی رویےاورانسانی زندگی کی ذلت اوررسوائی کے بھیانک مظاہروں کی شکل میں نظر آئی کہ چشم زدن میں بستیوں کی بستیاں اجڑ گئیں۔صدیوں سے ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے اورکرپانوں اورخنجروں کی نوکوں اور بندوقوں کی نالیوں کے خوف سے مجبورہوکر بےبسی اورکسمپرسی کے عالم میں اپنے گھربارچھوڑکرہجرت کرنے پرمجبورہوگئے۔

میرے خاندان کاتعلق مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر کے مضافات میں ایک گاؤں سے تھا جہاں میرے آباؤ اجداد پشتوں سے آباد تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں میرے والدمحترم حیدرآباددکن چلے گئے۔اس طرح ہم لوگ ایک طویل قیام کے لئے وہیں کے ہورہے۔۱۹۴۷ء کے شروع ہی سے اخباروں اورریڈیو سے مشرقی پنجاب میں قتل وغارت کی وحشت ناک خبریں آنے لگیں۔ جالندھر کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ اسے پاکستان میں شامل ہونا ہے یا بھارت میں ۔ روزمرہ کی خبروں اوربےیقینی کے تناظر میں ہمیں بجاطور پراپنے عزیزوں کے بارے میں بہت تشویش تھی۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈرتھا۔ ہمارے سب عزیزاورگاؤں والے اپنی اس قدیم بستی سے ذلت اوررسوائی سے نکال دیئے گئے۔ حیدرآباد میں بیٹھ کراتنی دور سے اس سانحے کےمضمرات اورنتائج کا اندازہ لگانامشکل تھا۔موقع پرپہنچ کر یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ

کس حال میں ہیں۔ چنانچہ میں دس دن کی چھٹی لے کر ان کے احوال معلوم کرنے کے لئے لاہور پہنچ گیا۔ لاہور اس وقت مہاجروں کا شہر تھا۔ جہاں جگہ ملتی تھی وہ اپنے ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ میری قیام گاہ سے قریب ٹمپل روڈ پر وہ شامیانوں میں بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میں دن میں کئی بار وہاں گھوم آتا تھا۔ کچھ ان سے ہمدردی کا اظہار مقصود تھا، کچھ یہ بھی خیال تھا کہ شاید ان سے یا ان کے واسطے سے کسی جاننے والے، کسی عزیز یا کسی گاؤں والے کا اتا پتا معلوم کروں۔

میرے لاہور پہنچنے کے دو روز بعد اعلان ہوا کہ اگلے دن مہاجروں کی ایک اسپیشل ٹرین واہگہ سے آئے گی۔ اس دن سینکڑوں لوگ دلوں میں امید کے چراغ جلائے ہوئے اپنے عزیزوں اور دوستوں کی تلاش میں پھولوں کے گجرے اور ہار لئے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ پلیٹ فارم پر تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ اس اجتماع میں ہر شخص کے چہرے پر کچھ ہراس اور کچھ امید کی پرچھائیں نظر آتی تھی۔ سب دھڑکتے دلوں اور امیدوں کا سہارا لئے بے چینی سے ریل گاڑی کے منتظر تھے۔ جب ان کا انجن نظر آیا تو اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور کلمہ طیبہ کا ورد ہونے لگا۔ گاڑی پلیٹ فارم کے قریب پہنچی تو اس کی رفتار دھیمی پڑ گئی مگر لوگوں کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔ جب گاڑی مکمل طور پر ساکن ہو گئی تو لوگوں کی نظریں دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑیں جو بالکل بند تھے۔ سب حیران تھے کہ منزل مراد پر پہنچنے والے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے کیوں بیٹھے ہیں۔ انہیں تو گاڑی ہی میں سے کود کر وطن عزیز کی مٹی کو چومنا چاہئے۔ جس کی خاطر انہوں نے یہ سب کٹھن منزلیں طے کیں ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا ماجرا کیا ہے۔

اس فضا کو دیکھ کر لوگ دروازے کھولنے کے لئے ہچکچا رہے تھے۔ چند لمحات انتظار کرنے کے بعد مضبوط اعصاب والے نوجوانوں نے سامنے والی بوگی کے دو دروازے کھولے۔ میں بھی سامنے ہی کھڑا تھا۔ میری گنہگار آنکھوں نے جو بھیانک منظر دیکھا اس کا اظہار زبان سے ہو سکتا ہے نہ قلم سے۔ اس پوری بوگی میں کوئی زندہ انسان نہیں تھا۔ مرد، عورتیں،

چھوٹے بڑے سب شہید ہو چکے تھے۔ کسی کا سر کٹا پڑا تھا کسی کی انتڑیاں پیٹ سے باہر خون میں لتھڑی پڑی تھیں۔ کسی کا ناک، کان آنکھیں، بازو، ٹانگیں اور دوسرے اعضا کٹے پڑے تھے اور دروازوں میں سے بہتا ہوا شہیدوں کا خون پلیٹ فارم پر سے ہوتا ہوا وطن کی مٹی کو سیراب کر رہا تھا۔ عورتوں کی نیم عریاں لاشیں تشدد اور ظلم کی خاموش داستان سنا رہی تھیں۔ ننھے پھول سے بچوں کو ہندو سکھ ظالموں نے زمین پر پٹخ کر مار دیا تھا کیونکہ ان کی کھوپڑیاں چٹخی اور پچکی ہوئی تھیں۔

یہی حالت اسپیشل ٹرین کے سب ڈبوں کی تھی۔ ان میں کوئی انسان زندہ نہیں تھا۔ گویا ہمارے دشمنوں نے ہمارے لوگوں کے خون سے بھر کر یہ تحفہ ہمیں بھیجا تھا۔ یہ حرکت ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کی گئی تھی۔ یہ شیطانی تحفہ ہماری قوت برداشت کا بھی امتحان تھا مگر برداشت کی قوت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عظیم سوگوار اجتماع میں بیشتر لوگوں کی قوت برداشت نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان میں بہت سے نیم بے ہوشی کے عالم میں پلیٹ فارم پر بے سدھ ہو کر گر پڑے۔ چاروں طرف چیخ و پکار اور بین سنائی دینے لگے اور بہتوں نے سینہ کوبی شروع کر دی۔ اپنے عزیزوں اور پیاروں کے لئے لائے گئے پھول اور گجرے زمین پر روندے گئے اور ان کے پھول اور پتیاں لانے والوں کی امیدوں کی طرح مسلی جانے لگیں۔ میں نے خود چند لمحات تو ان گھناؤنے مناظر کو برداشت کیا اور سکتے کے عالم میں انہیں دیکھتا رہا مگر کب تک؟ میرا سر گھومنے لگا، چکر آنے لگے اور میں لڑکھڑاتے ہوئے دھڑام سے پلیٹ فارم پر گر پڑا۔ سخت سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ متلی ہونے لگی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قے ہو جائے گی۔ میرے قریب کھڑے چند نوجوانوں نے مجھے سہارا دیا۔ وہ سمجھے کہ مجھے دل کا عارضہ ہو گیا ہے اور مجھے اسپتال بھجوانے کے بارے میں مشورہ کرنے لگے۔ میں نے نحیف آواز میں ان سے کہا کہ وہ مجھے بس دو گھونٹ پانی پلا دیں اور اس ہجوم میں سے اٹھا کر پلیٹ فارم کے کسی کونے میں چھوڑ آئیں۔ چنانچہ دو نوجوان مجھے اٹھا کر پلیٹ فارم کی دیوار کے پاس چھوڑ آئے۔ میں وہاں

ڈیڑھ گھنٹے لیٹا بے چینی میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اس وقت یہ احساس نہیں کیا کہ میں ایک نہایت ہی میلی جگہ پر لیٹا ہوا ہوں اور میرا لباس پانی اور کیچڑ سے بالکل گندا ہو چکا ہے۔ پھر جب ذرا اس قابل ہوا کہ کھڑا ہو سکوں میں ہانپتے کانپتے اسٹیشن سے باہر چلا آیا، ایک تانگہ کرائے پر لیا اور اپنی رہائش گاہ پہنچ گیا۔ پھر دو دن آرام کرنے کے بعد میں اس قابل ہوا کہ چل پھر سکوں۔ پانچویں دن جب میری واپسی میں دو دن باقی تھے، ایک بوڑھا آدمی ہانپتے کانپتے مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے چہرے مہرے اور تلفظ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اگر میرے گاؤں کا نہیں تو ساتھ والے گاؤں کا ضرور رہنے والا ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم تھا نہ میں اس کی شکل وصورت سے واقف تھا۔ جب میں نے اس سے زحمت فرمانے کی وجہ دریافت کی، تو اس کے جواب نے مجھے انتہائی حیرت میں ڈال دیا بلکہ میرے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس نے کہا آپ کی ایک رشتہ دار خاتون مہاجروں کے قافلے میں اس کے ساتھ آئی تھیں، راستے میں ان کو ہیضہ ہو گیا اور وہ وفات پا گئیں۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں دریائے بیاس کے کنارے ابھری ہوئی جگہ میں دفن کر دیا تھا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے وصیت کی تھی کہ ایک ڈبیا جسے وہ ہر وقت اپنی چادر میں چھپائے رکھتی تھیں، ان کے مرنے کے بعد آپ کو پہنچا دی جائے۔ آپ حیدر آباد میں تھے۔ اس وصیت پر ان حالات میں کیسے عمل ہو سکتا تھا۔ لاہور آنے کے بعد میری حیرت کی انتہا نہیں تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اللہ نے اس امانت کو پہنچانے کے لئے یہاں بھیج دیا ہے۔ اب یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں میں نے اپنے اہل وعیال کی دیکھ بھال کے کام پر اس وصیت کے پورا کرنے کو ترجیح دی ہے۔ آج الحمدللہ یہ فریضہ پورا ہو رہا ہے۔

میں نے وہ ڈبیا بڑے احترام سے وصول کی اور لانے والے کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ اس چھوٹی سی ڈبیا میں حضور سرور کائناتﷺ کے موئے مبارک تھے جو کئی پشتوں سے ہمارے خاندان کی تحویل میں تھے جس کی ہم نے برسوں زیارت کی سعادت حاصل کی۔ جب میں نے انہیں اس بارے میں بتایا تو وہ وفورِ جذبات سے رونے لگا اور کہا: ''بھائی

جی! مجھ جیسا خوش قسمت انسان کون ہوگا جس نے مرنے والی کی وصیت پوری کرنے کے ساتھ اس مقدس زیارت کی حفاظت کی سعادت بھی حاصل کی''۔ اس کے بعد وہ آنسو بہاتے ہوئے چلے گئے۔ مجھے ٹھیک سے اپنا اتا پتا بھی نہیں بتایا تا کہ میں ان کی خدمت کر سکوں۔ میرے آباؤ اجداد کی یہ زیارت ہمارے اجڑے ہوئے گاؤں سے خون کے دریا پار کر کے میرے پاس ایک ایسے شخص کے واسطے سے کیسے پہنچ گئی جنہیں میں جانتا بھی نہیں تھا اور پھر میں خود اس کی پذیرائی کے لئے وقت پر لاہور کیسے پہنچ گیا۔ یہ معجزہ در معجزہ تھا۔

یہ مقدس تحفہ لانے والے بزرگ کے جانے کے بعد میں اٹھ بیٹھا۔ خوشی اور مسرت میرے چہرے پر چھلکنے لگی اور میں اپنے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگا۔ میں سوچتا تھا کہ اسٹیشن پر میں نے شہیدوں کا خون بہتے دیکھا تھا جس سے طبیعت افسردہ ہو گئی تھی۔ مایوسی اور بے بسی کا اندھیرا میرے چاروں طرف گھرا ہوا تھا۔ اس مقدس تحفے میں جو مجھے اس المناک واقعے کے دو دن بعد ملا، میرے لئے ایک غیبی اشارہ تھا کہ شہیدوں کا خون آخر رنگ لایا۔ اب روشنی کی کرنیں نظر آ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''تم ہراساں نہ ہو۔ تم ہی کامیاب ہو گے اگر تم اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے''۔ میرے کمزور ایمان کو ایک سہارے کی ضرورت ہے وہ بحمداللہ مجھے مل گیا ہے۔ میں اسے اس نظر سے دیکھتا ہوں اور جب اس واقعہ کی یاد آتی ہے ہے تو علامہ اقبال کا یہ شعر گنگنانے لگتا ہوں۔ (۲۱)

کی محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کالا آم کا خونی معرکہ

احمد علی درد

تقسیم برصغیر سے پہلے کے متحدہ پنجاب کے انتہائی مشرق میں ضلع انبالہ ہے جو آج کل ہریانہ اور بھارتی پنجاب میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اسی ضلع انبالہ میں ایک مشہور و معروف قصبہ ہے ساڈھورہ جو کبھی سندورہ کہلاتا تھا۔ گولڑہ شریف میں پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم و مغفور رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر حضرت شاہ قمیص سندوری کا ذکر بھی ہے۔ حضرت شاہ قمیص پیر مہر علی شاہ مرحوم و مغفور کے رشتے میں دادا ہیں جن کی اولاد مغلوں اور سکھوں کی باہمی لڑائی کے نتیجہ میں ساڈھورہ سے ہجرت کر کے گولڑہ شریف میں آ کر آباد ہو گئی تھی۔ یہ گیلانی سیدوں کا خانوادہ ہے اور عمر بھر امت مسلمہ کی روحانی تربیت کرتا رہا ہے۔

اسی قصبہ ساڈھورہ کے شمال میں آٹھ نو کوس کے فاصلے پر کوہ شوالک ہے جس کے دامن میں مارکنڈہ نامی ایک ندی جاری ہے اور ہر موسم میں اس میں اتنا پانی ہوتا ہے کہ اسے عبور کرنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ سنا ہے اب بھارتی حکومت نے اس پر پل باندھ دیا ہے۔ یہ ندی عبور کر و تو پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی سی بستی تھی جو کالا آم کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں اس وقت کی ہندو ریاست سرمور (ناہن) کے راجہ نے ایک پولیس چوکی قائم کی تھی۔ آس پاس کوئی اور آبادی نہ تھی۔ کالا آم پہنچنے کے لئے ساڈھورہ سے مارکنڈہ تک ایک پختہ سڑک تھی جو زیادہ تر مہاراجہ سرمور کی گاڑیوں کے کام آتی تھی اور ریاست سرمور کے دارالحکومت ناھن آنے جانے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ آج کل یہ ریاست ہماچل پردیش میں شامل ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے جو قرارداد لاہور منظور کی تھی اور جسے ہندو پریس نے قرارداد پاکستان کہہ کر بہت اچھالا تھا اس کے مطابق اس وقت کا متحدہ پنجاب پاکستان میں شامل ہونا تھا، اس لئے ساڈھورہ اور اس کے گردونواح میں رہنے والے مسلمان یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک نہ ایک دن ہم آزاد مسلم ریاست پاکستان کے آزاد اور باوقار شہری ہوں گے اور یوں

ہندو سامراج کے ظلم و ستم سے محفوظ ہوں گے۔ غیر مسلم بھی یہی خیال کرتے تھے۔ ان دنوں مسلمانوں کے مقابلے میں تمام غیر مسلم دبے دبے رہتے تھے۔ وہ اگر کسی مسلمان کے ساتھ ہم کلام ہوتے تو نہایت ادب کے ساتھ اور خیال رکھتے تھے کہیں ان کی کسی بات سے مسلمان خفا نہ ہو جائے اور انہیں اس کی سزا بھگتنے میں جسمانی یا ذہنی اذیت ہو۔ ویسے بھی چونکہ ہندوستان میں مسلمان کئی صدیوں سے حکمرانی کرتے چلے آئے تھے اس لئے غیر مسلم شعوری یا لاشعوری طور پر اس وقت کے مسلمانوں کو برتر و بالا ہی سمجھتے تھے۔ تحریک پاکستان کے شباب کا آغاز تھا کہ ایک دن میں اپنے اسکول جا رہا تھا، ان دنوں میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ میں نے دیکھا کہ شہر کا ایک رئیس زادہ جو شوقیہ پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل تھا، بازار میں دکان کے تھڑے پر کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ سامعین بڑے شوق سے اور ہمہ تن گوش ہو کر اس کا پیغام سن رہے تھے۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے وہاں رکا تو مقرر نے علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھا۔

گو لفظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن

ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

میں نے اور میرے ایسے بہت سے نوجوانوں نے اس شعر میں پنہاں پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی اور حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو کمزور کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس نے کچھ مشہور علماء کرام اور بہت سی مسلمان مذہبی جماعتوں کو اپنے ساتھ ملا کر متحدہ ہندوستان کی تحریک شروع کر رکھی تھی جو آزادی کے بعد ہندوؤں کی عددی کثرت کی وجہ سے پورے برصغیر پر ہندو سامراج کی مکمل گرفت کا دوسرا نام تھا لیکن کچھ مسلمان جو کانگریس میں شامل تھے، وہ شاید ہندو ذہنیت کا ادراک نہیں کر پائے کہ ہندو کبھی مسلمانوں کو اپنا ہم پلہ نہیں ہونے دے گا بلکہ وہ ہندوستان پر تقریباً سات آٹھ سو سالہ حکومت کا بدلہ چکانے کا خفیہ منصوبہ رکھتا ہے، انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ بلاشرکت غیر یہاں کا حکمران ہوگا اور ہو سکتا ہے جو کچھ ہسپانیہ میں ہوا وہی کچھ وہ ہندوستان میں دہرائے۔ یہی وجہ تھی کہ تحریک حصول

پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے ہندو ذہن نے طرح طرح کی چالیں چلیں۔ وہ کبھی کہتا ہندو مسلم بھائی بھائی، اور کبھی دعویٰ کرتا کہ مسلمان جس خالق و مالک کو اللہ کے نام سے پکارتے ہیں ہندو رام کہتے ہیں۔ میں نے ہندوؤں کی ایک شاخ آریہ سماج کا ایک جلسہ بھی سنا جس میں وہ (نعوذ باللہ) حضرت محمد ﷺ کو بھی اپنے ایک اوتار کی دوسری تصویر بتاتے تھے اور اس طرح وہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہی باور کرانا چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہندوستان میں آباد زیادہ تر مسلمانوں کے آباؤ اجداد کبھی ہندو ہی تو تھے جنہیں مسلمان حکمرانوں نے بہ زور شمشیر مسلمان کر لیا تھا، لہذا مسلمانوں اور ہندوؤں کی رگوں میں ایک خون دوڑ رہا ہے۔ لیکن ہندو ذہن کی چال بازیوں اور وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی عیاریوں کے نتیجے میں آزادی کے ساتھ ہی متحدہ پنجاب اور متحدہ بنگال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ پنجاب دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مغربی پنجاب پاکستان کو دے دیا گیا اور مشرقی پنجاب بھارت کے حصے میں آیا اور پھر یہی نہیں کہ تقسیم پنجاب کے بعد ان کا منصوبہ پورا ہو گیا بلکہ مشرقی پنجاب میں آباد مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔

خون کی اس ہولی میں اعلیٰ ذات کے ہندو پس پردہ رہے۔ وہ مسلمانوں کو دلاسہ دیتے رہے لیکن ان کی عیاری اور مکاری سے چھوٹی ذات کے ہندو، چوڑھے، چمار اور سکھ سورما بن گئے اور مسلمانوں کی بستیوں اور محلوں پر چڑھ دوڑے۔ اس وقت پورے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے لئے کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لٹے پٹے، زخمی، بھوکے پیاسے مسلمان قافلوں کی صورت میں گاؤں کے گاؤں اور اپنی بستیاں خالی کر کے ساڈھورہ کی جانب رواں دواں تھے جہاں پہنچ کر انہیں پناہ نصیب ہوتی تھی۔ ساڈھورہ کے امیر و غریب مسلمان ان بے آسرا مسلمان بھائیوں پر اپنا سب کچھ قربان کر رہے تھے۔ جب تک مسلمانوں نے وہاں سے نقل مکانی نہیں کی تب تک تمام مسلمان جانی نقصان سے محفوظ رہے۔ اسی قصبے کے نواح میں ایک بڑا گاؤں تھا جس کی آبادی راجپوتوں پر مشتمل تھی۔ ان میں نصف ہندو راجپوت تھے اور نصف مسلمان

راجپوت۔ یہ مسلمان نماز، روزے کے پابند تھے اور برائی کی طرف کم مائل تھے اگرچہ عام زندگی میں خوشی و غمی کے مواقع پر ہندوانہ رسم و رواج سے متاثر تھے۔ گاؤں کے ہندو راجپوتوں نے فیصلہ کیا کہ مقامی مسلمانوں کو ہندو بننے پر مجبور کریں گے اور اگر وہ تیار نہ ہوئے تو انہیں تہہ تیغ کر کے ان کی نوجوان بچیوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیں گے اور بچوں کو تلوار کے ذریعے ہندو بنا لیں گے۔ ہندوؤں نے پہلے نرمی سے مسلمانوں کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ انہیں جابر و ظالم مسلمان حکمرانوں نے مسلمان بنا لیا تھا اور اب وقت آ گیا ہے کہ وہ پھر سے اپنے بھائی بندوں میں شامل ہوں اور ہندو بن کر آزاد بھارت کے شہری بن جائیں، لیکن غیرت مند مسلمانوں نے یہ گوارا نہ کیا اور یوں راجپوتوں کے دونوں گروہوں میں قتل و غارت گری کی نوبت آ گئی۔

جب ہندو راجپوتوں کا ظلم بڑھا، مسلمانوں کے بچے، بوڑھے قتل ہونا شروع ہوئے۔ نوجوان مسلمان لڑکیوں کا اغوا عام ہو گیا اور ان کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی تو مسلمانوں نے خاموشی سے ایک فیصلہ کیا جو بہت ہی بھیانک اور دلدوز تھا۔ انہوں نے ایک رات اپنی تمام عورتوں اور بچوں کو جمع کیا اور خود انہیں ذبح کر کے ایک کنویں میں ڈال دیا اور تلواریں، بھالے اور برچھیاں لے کر ہندوؤں کو للکارا اور لڑتے لڑتے سب شہید ہو گئے۔ ہندوؤں کو بھی کچھ نہ ملا، ان کی اکثر عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ جوان مارے گئے لیکن بوڑھے ہندو راجپوت ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس دلدوز واقعے سے دوسرے دیہات کے مسلمانوں کی بھی کمر ہمت ٹوٹ گئی۔ جب یہ خبر عام ہوئی کہ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کی ہندو اور مسلم آبادی کا تبادلہ ہو گا تو رہا سہا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ ادھر مغربی پنجاب سے آنے والے ہندو و شرنارتھیوں نے اور بھی آگ بھڑکا دی۔ اس طرح مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر پاکستان جانے کے لئے قصبہ ساڈھورہ کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئے۔ کیونکہ یہاں حالات کچھ بہتر تھے۔ جب امن و امان کا مسئلہ سول انتظامیہ کے ہاتھ سے نکل گیا تو بھارتی حکومت نے قافلوں کی حفاظت کے لئے فوج کو بلایا مگر وہ رہے ہندو ذہن، فوج قافلوں کو حفاظت کے لئے بلائی گئی تھی مگر وہ بھی مسلمان قافلوں

کو اپنی مشین گنوں سے بھوننے لگی۔ ہندو بلوائیوں کا مقابلہ تو نہتے مسلمانوں نے کچھ نہ کچھ کیا لیکن توپوں اور مشین گنوں کے سامنے کون ٹھہرتا۔ مسلمانوں کا آن کی آن میں صفایا ہو جاتا اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مسلمان مہاجروں کا ایک لمبا قافلہ کئی دیہات کی آبادی پر مشتمل تھا، ان میں بہت سے پیدل تھے، عورتیں بچے اور بوڑھے بیل گاڑیوں میں تھے ان کی حفاظت کے لئے ہندو راجپوت رجمنٹ بلائی گئی جو قافلے کو گھیر کر آگے بڑھ رہی تھی۔ بظاہر فوج نے قافلے کے گرد ایک حصار بنا لیا تھا کہ کوئی دشمن یا بلوائیوں کا گروہ انہیں گزند نہ پہنچا سکے لیکن فوج کا منصوبہ کچھ اور تھا جو اس وقت ظاہر ہوا جب یہ بے آسرا اور بے حال مسلمان کالا آم کے نزدیک ماکنڈہ ندی پر پہنچے۔ قافلے کی پشت پر کوہ شوالک کا پہاڑ اور مارکنڈہ ندی تھے۔ فرار کے تمام راستے مسدود کر دیئے گے۔ تو اچانک فوجیوں نے ایک منصوبے کے تحت فائر کرنا شروع کر دیا۔ توپوں اور مشین گنوں کی بوچھاڑ اور سامنے خالی ہاتھ مظلوم عورتیں، بچے اور بوڑھے۔ نوجوان مسلمان جو قافلے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے ایک ایک کر کے ڈھیر ہونا شروع ہو گئے۔ آہ و بکا اور چیخ و پکار اس قدر تھی کہ آٹھ نو کوس پر ساڈھورہ میں سنی گئی لیکن یہ معلوم کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی کہ یہ قیامت کہاں برپا ہے۔

ہندو فوجیوں کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ساڈھورہ کی طرف آنے والی سڑک کی مرمت کے لئے پتھر کوٹ کر سڑک کے دونوں کناروں پر ڈالے گئے تھے۔ یہی پتھر ہندو فوجیوں کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوئے۔ قافلے میں شامل چند نوجوان سابق فوجی بھی تھے جو جنگ عظیم دوم ختم ہونے پر حال ہی میں اپنے گھروں کو لوٹ آئے تھے، انہوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اپنے ساتھی قافلے والوں کو پکارا کہ کہ وہ ان پتھروں کو لے کر ہندو فوجیوں کو نشانہ بنائیں۔ اللہ کو بھی یہ منظور تھا۔ مسلمانوں کی سنگ باری سے فوجیوں کے حوصلے پست ہونا شروع ہوئے۔ ان گنت مسلمان شہید ہو گئے تھے لیکن اب اسلحہ ہندو فوجیوں کے کام نہ آیا۔ مسلمانوں کے پھینکے ہوئے پتھروں نے وہ کام جو بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ مسلمانوں نے ایک دو مشین گنیں بھی چھین لیں جس سے بچے کھچے

ہندو فوجیوں کو ختم کر دیا۔ آخر کار یہ معرکہ ٹھنڈا پڑا اور کچھ زخمی مسلمان کسی نہ کسی طرح ساڈھورہ پہنچ گئے جہاں سے کچھ لوگ قافلے والوں کی مدد کو پہنچے اور سول اور فوجی اعلیٰ حکام کو بھی اس واقعہ کی اطلاع دیدی گئی۔ کالا آم کا یہ معرکہ ایک دلگداز منظر پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور مارکنڈہ ندی کا پانی بھی سرخ ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے حال زار کی داستان اتنی المناک تھی کہ ہر کسی کی آنکھ میں آنسو تھے، آسمان بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ بارش تھی کہ کم ہوتے ہوئے کئی روز بیت گئے۔ لاشوں کو اسی جگہ ٹھکانے لگا دیا گیا اور زخمی اور لٹا پٹا قافلہ ساڈھورہ پہنچا تو اسے شاہ قمیص کے مزار کے سائے میں جگہ ملی جہاں چند ہفتے قیام کے بعد وہ پاکستان کی طرف روانہ ہوئے۔ (۲۲)

آزادی کی راہ میں

چودھری محمد شفیع، ریٹائرڈ صوبیدار

آرمی سروس کے دوران ۸ جون ۱۹۴۷ء کو میں رڑکی چھاؤنی سے رانچی چھاؤنی ایک نئی مسلمان یونٹ میں پوسٹ ہوا۔ اس یونٹ کے آفیسر کمانڈنگ میجر عبدالعزیز ضلع لدھیانہ اور کچھ فیصل آباد میں مقیم تھے۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کو میجر صاحب نے بتایا کہ ان کا چھوٹا بھائی عنایت اللہ، جو سروے آف انڈیا ڈیرہ دون میں ملازم ہے، رانچی آیا ہے اور اس کے بقول مشرقی پنجاب میں ہندوؤں سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا ہوا ہے۔ اور نقل آبادی پاکستان کی طرف شروع ہو چکی ہے۔ میجر صاحب کو معلوم تھا کہ میرا تعلق بھی مشرقی پنجاب سے ہے۔ اس یونٹ کو راولپنڈی جانے کے لئے آرڈر موصول ہو چکے تھے اس لئے میجر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں ایسے جوانوں کی فہرست بناؤں جو مشرقی پنجاب کے باشندے ہیں وہ جوان میجر کی سربراہی میں راولپنڈی کے لیے یونٹ ایڈوانس پارٹی کے طور پر روانہ ہوں گے۔ اسی شام رانچی سے توپ خانہ کی ایک مسلمان یونٹ خصوصی ریل گاڑی سے کراچی جا رہی تھی۔ میجر صاحب نے بتایا کہ ہم بھی اسی میں سوار ہوں گے۔ عازم سفر ہونے والے جوان اپنا ذاتی سامان یونٹ کوارٹر ماسٹر کے پاس جمع کرا دیں جو یونٹ کے ساتھ راولپنڈی لے آئے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ جوان اپنے ساتھ ایک ایک کمبل، سرکاری کپڑوں کا ایک ایک جوڑا اور اپنے اپنے ذاتی ہتھیار، دو مشین گنیں، دو سٹین گنیں اور کچھ دستی بم ساتھ لے لیں۔

۲۹ اگست کو میجر عبدالعزیز صاحب کی کمان میں ہم دس جوان ملٹری اسپیشل کے ذریعے رانچی سے روانہ ہوئے۔ دو دن اور دو رات کے متواتر سفر کے بعد گاڑی فجر کے وقت انبالہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹھہر گئی۔ فوجی خصوصی گاڑی راستے میں انجن کے لئے تیل پانی لینے یا جوانوں کے لئے چائے کھانا تیار کرنے کے سوا کسی جگہ نہیں ٹھہرا۔ انبالہ میں بھی گاڑی جوانوں کے لئے ناشتہ تیار کرنے کے لئے رکی تھی۔ انبالہ اسٹیشن مکمل طور پر ویران پڑا تھا۔ ہماری ٹرین کے

ساتھ دوسری لائن پر ایک خالی گاڑی کھڑی تھی جس کے ڈبوں میں لاشیں پڑی تھیں اور وہ خون سے رنگین تھے۔ ہمیں اس ٹرین کو دیکھ کر احساس ہو گیا کہ حالات سنگین ہیں۔ انبالہ ریلوے اسٹیشن پر ہم نے گاڑی کے گارڈ کو بتا دیا کہ ہماری پارٹی لدھیانہ میں ٹرین سے اتر جائے گی، لیکن گاڑی لدھیانہ سے پہلے ہی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی اور گارڈ نے ہم سے کہا کہ لدھیانہ اسٹیشن پر اترنے والی پارٹی اس جگہ اتر جائے کیونکہ گاڑی لدھیانہ سے رن تھرو یعنی رکے بغیر جائے گی اس پارٹی کو لدھیانہ پہنچانے کے لئے وہاں سے ایک بوگی آ رہی ہے۔

ہم نے اس اسٹیشن پر ٹرین کو چھوڑا اور پلیٹ فارم پر لدھیانہ سے آنے والی بوگی کا انتظار کرنے لگے۔ اس جگہ ریلوے لائن کے متوازی جی ٹی روڈ جا رہی تھی۔ میں اور میجر صاحب ٹہلتے ٹہلتے سڑک پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں لدھیانہ سائڈ سے ایک فوجی ٹرک آتا دکھائی دیا۔ میجر صاحب نے ہاتھ ہلا کر ٹرک کو رکنے کا اشارہ کیا تو وہ ہمارے قریب آ کر رک گیا۔ یہ فوجی ٹرک ہمارا ایک انجینئر یونٹ کا تھا جو جالندھر میں تعینات تھی۔ اس میں ایک سکھ اور ہتھیار بند سپاہی سوار تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ عام گشت پر ہیں۔ میجر صاحب نے سکھ کپتان سے کہا ان کا گاؤں وہاں سے تیس میل پر ہے اور وہ جلد سے جلد اپنے گھر جانا چاہتے ہیں، لہذا کپتان صاحب ان کے ساتھ چلیں۔ میجر صاحب نے مجھ سے کہا میں اپنی پارٹی کو لے کر لدھیانہ چلوں اور وہاں اسٹیشن ہی پر ان کا انتظار کروں۔ میجر صاحب اس ٹرک میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اتنے میں ایک انجن ریلوے بوگی لے کر آ گیا جس میں سوار ہو کر ہم لدھیانہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ لدھیانہ شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی ہے اور لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اسپیشل ٹرین جس میں ہم مسلمان فوجی سوار تھے، لدھیانہ سے رن تھرو گزار دی گئی تھی مبادا مسلمان سپاہی وہاں کے حالات دیکھ کر کوئی گڑبڑ کریں۔ ریلوے اسٹیشن کا مسافر خانہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے مسافر خانے کا ایک گوشہ خالی کرایا اور وہاں جوانوں نے اپنی رائفلیں رکھ دیں۔ اور کوئی سامان تو تھا نہیں، صرف

دو مشین گنیں اور اسٹین گنیں، ایک بکس ایمونیشن اور چند ہینڈ گرنیڈز تھے۔ شہر کی طرف سے خلقت سیلاب کی طرح آ رہی تھی۔ بعض مستورات ننگے پاؤں بچوں کو لئے اور چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں اور گٹھڑیاں سر پر اٹھائے اپنے گھر چھوڑ کر اس امید میں ریلوے اسٹیشن کی طرف آ رہی تھیں کہ بس فوری طور پر ٹرین میں سوار ہو کر پاکستان کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ میں اور نائیک محمد دین دونوں ٹہلتے ٹہلتے پلیٹ فارم سے شہر کی طرف چنگی تک چلے گئے۔ وہاں دو سکھ لوگوں کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ وہ زبردستی لوگوں کی گٹھڑیاں لے کر نقدی اور زیور نکال لیتے اور دھکے دے کر انہیں پریشان کر رہے تھے۔ میں یہ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اپنی بیلٹ سے ریوالور نکال کر ان سکھوں کو دھمکایا کہ تم یہ کس کی اجازت سے تلاشی لے رہے ہو۔ دونوں سکھ ریوالور دیکھ کر بھاگ گئے۔ میں نے نائیک محمد دین سے کہا وہ جا کر اپنے دو ساتھیوں کو لے آئے جو اس جگہ ڈیوٹی دیں تا کہ دشمن مصیبت زدہ مسلمانوں کو تنگ نہ کریں۔

ہم لدھیانہ دن کے تقریباً بارہ بجے پہنچے تھے اب سورج غروب ہونے کو تھا لیکن میجر صاحب واپس نہ آئے تھے۔ جوانوں نے مجھ سے کہا کہ ہمیں کھانا کھانے کے علاوہ رات بھی بسر کرنی ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم یہاں کسی فوجی یونٹ چلیں جہاں ہمیں یہ سہولت مل جائے گی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پرانی کچہری کے پاس فوجی کیمپ ہے۔ ہم پیدل ہی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں ایک یونٹ پھولداریوں میں مقیم تھی۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں ان کا دفتر تھا۔ دفتر میں ایک کپتان صاحب سے ملاقات ہوئی میں نے انہیں بتایا کہ ہم لوگ رانچی سے آئے ہیں اور ہمیں رات کے لئے رہائش اور کھانے کی ضرورت ہے۔ کپتان صاحب نے دفتر اردلی کو بھیجا کہ وہ یونٹ کے حوالدار میجر کو بلا کر لائے تا کہ اسے انتظام کے لئے کہا جائے۔ میں کپتان صاحب سے بات چیت کر کے باہر اپنے جوانوں کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ ڈوگرہ ہندو یونٹ ہے، لہذا ہم رات ان کے پاس نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ تو ہمیں مار کر ساتھ والے بہتے دریا میں پھینک دیں گے۔ ہم کسی جگہ کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کر لیں گے۔ اتنے میں وہاں ایک اور کپتان صاحب چلے

آئے وہ ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے میرے پاس آ کر پوچھا: ''کیا آپ کا نام محمد شفیع ہے؟'' میں نے کہا: ''نام تو میرا یہی ہے لیکن معاف کرنا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' انہوں نے بتایا کہ میرا نام محمد شریف ہے میرے والد آپ کے گاؤں میں پٹواری تھے اور آپ میرے گاؤں کے قریب ہائی اسکول موروثی پور کے طالب علم تھے۔ پھر میں نے ان کو پہچان لیا اور ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے ساتھ یہ فوجی جوان ہیں اور ہم ان کے خاندانوں کے افراد کی بازیابی کے لئے آئے ہیں۔ اب مسئلہ کھانے اور رات گزارنے کا ہے۔ کیپٹن شریف صاحب نے ایک طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ جو سامنے ٹینٹ لگے ہوئے وہ میری یونٹ بلوچ رجمنٹ کے ہیں، آپ وہاں چلیں، آپ کو ہر قسم کی سہولت ملے گی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری فوری پریشانی ختم ہو گئی۔

ہم لوگ بلوچ رجمنٹ کے کیمپ میں آ گئے ہمیں وہاں خوش آمدید کہا گیا۔ میں نے کیپٹن شریف سے کہا اب ہمارا مسئلہ ٹرانسپورٹ کا ہے۔ ہمیں دو عدد تھری ٹن فوجی گاڑیاں درکار ہیں تا کہ صبح دیہات میں جا کر میرے ساتھی فوجی جوانوں کے اہل خانہ کو لایا جا سکے۔ کیپٹن محمد شریف نے کہا کہ وہ اس بارے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے کیونکہ کل ہی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے انہیں حکم ملا ہے کہ ان کی گاڑیاں شہری حدود سے باہر نہیں جائیں گی۔ افسران کو شک ہے کہ ہم باہر جا کر ہندوؤں اور سکھوں کو جان سے ماریں گے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ڈوگرہ رجمنٹ کا افسر کمانڈنگ ایک انگریز کرنل ہے۔ آپ اس سے درخواست کریں، شاید کچھ بندوبست ہو جائے۔ اس دوران سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں ڈوگرہ رجمنٹ کے کیمپ میں گیا۔ وہاں ایک چبوترے پر کرسی پر سویلین کپڑوں میں ایک انگریز بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کرنل صاحب کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ میں ہی کرنل ہوں۔ کیا کام ہے؟ میں نے عرض کی کہ ہم دس فوجی جوان اپنے میجر صاحب کی زیر کمان رانچی چھاؤنی سے یونٹ ایڈوانس پارٹی کے طور پر راولپنڈی جا رہے ہیں۔ وہاں ہماری یونٹ کی ٹرانسفر ہو چکی ہے۔ میجر صاحب اپنے گاؤں اپنی فیملی لانے کے لئے جا چکے

ہیں ۔ میرے ساتھ چار جوان ضلع لدھیانہ کے رہنے والے ہیں ۔ہمیں اپنے گھر کے افراد کو لانا ہے،ہتھیاروں سمیت حفاظتی گارڈ ہمارے پاس ہیں، آپ صرف کل کے لئے دوفوجی گاڑیاں دے دیں۔کرنل صاحب نے جواب دیا کہ ہماری یونٹ کی تمام گاڑیاں شہر کی آبادی نکالنے میں مصروف ہیں۔آپ کو تین دن کے بعد گاڑی مل سکیں گی۔ میں نے کہا تین دن میں تو ہمارے خاندان والے سب قتل ہو جائیں گے۔اگر ہمیں گاڑیاں نہیں ملتیں تو ہم لوگ صبح پیدل روانہ ہو جائیں گے۔اس پر انہوں نے اپنے ایک افسر کے نام آرڈر لکھ دیا کہ صبح انہیں دو گاڑیاں دے دی جائیں۔ہم نے بلوچ رجمنٹ میں شام کا کھانا کھایا اور رات کو آرام کیا۔صبح ناشتے کے بعد ہم ڈوگرہ رجمنٹ میں آ گئے کہ گاڑیاں لے کر اپنے مشن پر روانہ ہوں۔

ڈوگرہ رجمنٹ کا ٹرانسپورٹ افسر ایک سکھ تھا۔اس نے لیت ولعل میں بارہ بجا دیئے اور پھر ہم گاڑیاں لے کر لدھیانہ سے جگراؤں کی طرف روانہ ہوئے۔شہر کی حدود سے نکلے تو معلوم ہوا کہ دوفوجی کیمپ ایک لدھیانہ میں اور دوسرا جگراؤں میں مقرر ہوئے ہیں اور علاقے کے مسلمان اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ان کیمپوں کا رخ کر رہے ہیں۔لدھیانہ سے جگراؤں جانے والی ریلوے لائن کے متوازی پکی سڑک ہے۔اس ریلوے لائن کے شمال کی طرف قریباً دس بارہ میل پر دریائے ستلج متوازی بہتا ہے۔ ریلوے لائن اور دریائے ستلج کے درمیانی علاقے میں ۹۰ فیصد مسلمان آبادی تھی اور ریلوے لائن کے پار جنوبی طرف ۹۰ فیصدی سکھ آبادی تھی۔لدھیانہ سے جگراؤں تک تقریباً تیس میل کا فاصلہ ہے۔اس علاقے کے مسلمان اس روز اپنے اپنے گھروں سے کیمپ جانے کے لئے رواں دواں تھے۔کچھ لوگ بیل گاڑیوں پر تھے اور کچھ پیدل۔خستہ حال بے سروسامان بوڑھے، بچے،عورتیں عذاب میں تھے۔اس پر مزید یہ کہ ریلوے لائن کے پار سے سکھ جتھوں کی شکل میں ان پر حملے کر رہے تھے پورے علاقے میں اور سڑک پر مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔میں نے یہ حالات دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان حالت میں ہم ان ہجرت کرنے والوں کی جانیں خطرے میں چھوڑ کے آگے نہیں جائیں گے۔آپ اپنے اہل خانہ کو

فی الحال خدا کے سپرد کریں اور ان لوگوں کو کیمپ میں بحفاظت پہنچانے کا کام کریں۔ایک جگہ ہم نے سکھوں کی یلغار روکنے کے لئے مشین گنوں سے فائر کھول دیئے۔سکھوں نے خیال کیا کہ بلوچ رجمنٹ آ گئی ہے لہذا وہ بھاگ گئے۔

ہم نے ترک وطن کرنے والے مسلمانوں کی مدد جاری رکھی اور شام تک تقریباً دو لاکھ کی آبادی لدھیانہ رفیوجی کیمپ اور جگراؤں پہنچ گئی۔خطرات میں گھرے مسلمانوں کی جانیں بچاتے ہوئے ہم جگراؤں کیمپ پہنچ گئے۔کیمپ میں گورنمنٹ ہائی اسکول جگراؤں میں تھا۔وہاں ہمیں اپنے ساتھیوں کے کنبے کے لوگ مل گئے۔ہم نے انہیں تسلی دی کہ اب ہم جگراؤں سے سدھواں بیٹ جا رہے ہیں۔واپسی پر آپ لوگوں کو ساتھ لیں گے۔جگراؤں سے سدھواں بیٹ نو میل کے فاصلے پر ہے۔ہم جب سدھواں پہنچے تو اس وقت آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور اندھیرا اس قدر تھا کہ کہ قریب کا آدمی بھی نظر نہیں آتا تھا۔سدھواں بیٹ کی آبادی سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی۔اس جگہ پولیس تھانہ بھی تھا۔اچھا خاصا قصبہ تھا۔اس کے نواح میں سلیم پور مسلمانوں کا گاؤں تھا جس میں میرے ماموں کا گھر تھا۔اس جگہ سے دو میل کے فاصلے پر دریائے ستلج تھا اور دریا کے پار میرا گاؤں۔ دریائے ستلج کے دو میل کے فاصلے پر اس کی ایک شاخ بڈھا دریا بہتا تھا۔ یہاں ایک قسم کا جزیرہ نما تھا۔اس جزیرہ نما میں تقریباً پچیس چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے جو سب مسلمانوں پر مشتمل تھے۔ہم لوگ ماموں جان کے گھر پہنچے تو ان سے معلوم ہوا کہ اسی دن سلیم پور میں سرکاری طور پر مہاجر کیمپ قائم ہوا ہے اردگرد کی مسلمان آبادی خاصی تعداد میں کیمپ میں آ گئی ہے اور آپ کے گھروں کی کوئی اطلاع نہیں کیونکہ دس پندرہ دن سے اس طرف سے آمدورفت بند ہے۔سلیم پور سے میرے گاؤں کی طرف گاڑیاں نہیں جا سکتی تھیں۔ کیونکہ وہاں سے دریائی علاقہ شروع ہو جاتا تھا اور سدھواں بیٹ اور میرے گاؤں کے درمیان بڈھا دریا حائل تھا۔اس لئے میں نائک محمد دین کو ساتھ لے کر آگے پیدل روانہ ہوا۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔بجلی کی چمک سے راستے کی نشاندہی ہو رہی تھی۔

راستہ بھی کیا تھا صرف پگڈنڈی تھی۔

ہم اندھیرے میں دریا پر پہنچے تو دیکھا وہ طغیانی پر ہے خوش قسمتی سے ایک کشتی ہمارے کنارے پر بندھی ہوئی تھی۔ ہم اللہ کا نام لے کر کشتی میں بیٹھے اور رسی کھول کر اسے منجدھار میں ڈال دیا۔ کشتی دوسرے کنارے لگی تو وہاں سے پیدل اپنے گاؤں خورشید پور بیٹ روانہ ہوئے جو ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ راستہ سرکنڈوں اور فراش کے درختوں میں سے جاتا تھا۔ ابھی ہم گاؤں سے باہر ہی تھے کہ وہاں کے مکین ہمارے بوٹوں کی چاپ سن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ پٹیالہ کی ملٹری آ گئی ہے۔ میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو وہاں علاقے کے مردوں کا ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ جزیرہ نما کے تمام دیہات کی مسلمان آبادی کو دریا عبور نہیں کرنے دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں میں کوئی عورت یا بچہ نہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سب عورت اور بچے ایک ٹاپو میں پہنچا دیئے ہیں جو بڑے دریا میں دو تین مربع میل کا ٹکڑا ہے جس کے چاروں طرف گہرا پانی ہے۔ ٹاپو پر وہ محفوظ ہیں۔ لیکن وہاں کوئی درخت ہے نہ پینے کے لئے صاف پانی۔

میں نے نائک محمد دین کے ساتھ دو آدمی واپس سدھواں بیٹ روانہ کئے کہ وہ صبح ہونے پر فوجی گاڑیاں جس جگہ تک آ سکیں لے آئیں اور اوپر مشین گن نصب کر کے فائر کھول دیں تا کہ سکھوں کو پتہ چل جائے کہ فوج آ گئی ہے۔ پھر میں نے مقامی لوگوں سے کہا فوراً ملاح بلائیں جو عورتوں اور بچوں کو واپس لائیں۔ صبح تک عورتیں اور بچے بھی گاؤں میں واپس آ گئے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا دریا عبور کرنے کی تیاری کریں، آپ لوگ سدھواں بیٹ کیمپ میں جائیں گے کیونکہ دوسری طرف ستلج تھا جو اس وقت سیلاب کی وجہ سے دس بارہ میل پھیلا ہوا تھا۔ میں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیل گاڑیاں ساتھ لے لیں اور ان پر راستے کا راشن، بستر اور کھانا پکانے کے برتن رکھ لیں۔ اتنے میں سورج طلوع ہو گیا۔ خورشید پور بیٹ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں چالیس پچاس گھر تھے۔ وہ لوگ اکٹھے ہو کر آئے اور کہا کہ آپ ہمیں کیمپ میں پہنچا رہے ہیں، معلوم نہیں وہاں کتنے دن رہیں گے۔ سارا گاؤں ایک ہی برادری کے لوگوں کا ہے۔ یہ اکٹھے

ایک ہی جگہ پاکستان جائیں گے۔ جو غالباً تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ہوگی۔ ہم لوگوں کے پاس نقدی اور زیورات ہیں وہ امانت کے طور پر آپ ساتھ لے جائیں۔ اگر ہم بخیریت پاکستان آ گئے تو لے لیں گے ورنہ انہیں خیرات کر دینا یا اپنے پاس ہی رکھ لینا۔ اس وقت فہرست بنانے کا وقت نہ تھا۔ ان لوگوں نے اپنے زیورات اور نقدی پوٹلیوں میں باندھ کر نشانی لگا کر ایک ٹرنک بھر دیا۔ اس کے بعد انخلا شروع ہوا۔ بڈھے دریا میں دو کشتیاں مہاجرین کو پار لگانے لگیں۔ دریا پار نزدیک ہی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں جن پر مشین گنیں نصب تھیں۔ ان سے فائر ہوئے تو سکھ نزدیک نہ آئے اور تمام لوگ دریا پار کر کے سدھواں بیٹ کیمپ بخیریت منتقل ہو گئے۔

میرے ساتھی فوجی جوانوں کے دو کنبے بھی کیمپ میں آ ملے۔ اس دوران ہماری فوجی لاریوں کے ہندو ڈرائیوروں میں سے ایک کا ڈرائیور چپکے سے اپنی گاڑی واپس لے گیا۔ اور اب ہمارے پاس فقط ایک لاری رہ گئی تھی۔ ہم دس جوان اور کچھ ہمارے اہل خانہ اس لاری میں واپس روانہ ہوئے تو دو مسلمان آدمی چھپتے چھپاتے میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا ہم دونوں اشتہاری ملزم قرار دیئے گئے ہیں اور ہماری گرفتاری یا جان سے مارے جانے کا خدشہ ہے۔ ہمیں خدا کے واسطے اپنے ہمراہ چھپا کر لے چلیں۔ میں نے ان کو بھی ساتھ لے لیا۔ جگراؤں کیمپ سے فوجی جوانوں کے اہل خانہ کو ساتھ لے کر ہم لدھیانہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت رات کے دس بج گئے تھے۔ میں نے لاری ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہمیں لدھیانہ کے بجائے جالندھر پہنچا دے تو اس کی مہربانی ہوگی۔ جالندھر میں ہماری ایک انجینئر یونٹ ہے اور ہم لوگ وہاں سے آسانی سے لاہور پہنچ جائیں گے۔ وہ ہندو ڈرائیور شریف آدمی تھا، اس لئے جالندھر کی طرف چل پڑا۔ لدھیانہ پار کر کے دریا کے پل پر فوجی ناکہ باندی تھی۔ فوجی گارڈ کا انچارج ایک سکھ حوالدار تھا۔ اس نے ہماری گاڑی کی تلاشی لینے کے لئے کہا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم انڈین آرمی کے جوان ہیں اور ہمارے ساتھ ہمارے لواحقین ہیں وہ تلاشی نہیں لے سکتا۔ اس کے پاس تین فوجیوں کی نفری تھی اور ہم دس فوجی تھے۔ اس نے تھوڑی سی بحث کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دیدی اور ہم جالندھر

۴ فیلڈ انجینئر کمپنی بخیریت پہنچ گئے۔ ہمارے میجر عبدالعزیز صاحب اپنی پارٹی سے الگ ہو کر گشت پارٹی کے ساتھ اپنے گاؤں ھلواڑہ چلے گئے تھے۔ وہ ہم سے پہلے جالندھر پہنچ گئے تھے۔ اصل میں جب وہ اپنے گھر پہنچے تو ان کے خاندان کے سب افراد عورتوں اور بچوں سمیت پٹیالہ آرمی کے ہاتھوں شہید ہو چکے تھے۔ ان کے گھر کا کوئی شخص بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ھلواڑہ میں ان کے چچا ذیلدار تھے۔ ان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ گاؤں کی زیادہ آبادی مسلمان راجپوتوں کی تھی۔ لوگ اس حویلی میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ جب مقامی سکھ جتھوں کو کامیابی نہ ہوئی تو پٹیالہ آرمی نے آ کر حویلی پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور پناہ گزیں تمام مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ جب میجر عبدالعزیز نے وہاں پہنچ کر حالات دیکھے تو وہ ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ فوجی پارٹی جو ان کے ساتھ گئی تھی بڑی مشکل سے ان کو سنبھال کر جالندھر لے آئی۔ جب ہم جالندھر اس یونٹ میں پہنچے اس وقت بھی وہ اپنے آپے میں نہیں تھے۔ انہیں متواتر بے ہوشی کے انجیکشن دیئے جا رہے تھے۔ انجینئر کمپنی کے افسر کمانڈنگ میجر رشید احمد بنگالی تھے جنہوں نے ہمیں ایک بیرک دے دی اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔ ہم لوگ وہاں ایک ہفتہ ٹھہرے۔ وہیں میجر رشید احمد نے بتایا کہ آرمی جنرل ہیڈ کوارٹر سے ہم لوگوں کے فوج سے ہتھیاروں سمیت فرار کی خبر آئی ہے بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ جلد پاکستان میں داخل ہو جائیں ورنہ یہیں آپ کو گرفتار کر کے کورٹ مارشل کر دیا جائے گا۔ ہم فوراً تیار ہو گئے اور میجر رشید احمد نے اپنی یونٹ کی گاڑیوں پر ہمیں لاہور پہنچا دیا۔

ہم لاہور کی ریلوے روڈ پر ایک بڑے ہندو کی خالی کوٹھی پر قبضہ کر کے اس میں فروکش ہو گئے۔ پھر جن نوجوانوں کے ساتھ ان کے افراد خانہ تھے وہ انہیں لے کر اپنے اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلے گئے۔ ان جوانوں سے کہہ دیا گیا وہ راولپنڈی مدراس انجینئر یونٹ میں حاضر ہو جائیں۔ میں تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اپنے گھر چلا گیا اور وہاں سے راولپنڈی حاضری دے کر واپس لاہور آ گیا۔ چار پانچ دن کی تگ ودو کے بعد مجھے چار فوجی گاڑیاں مل گئیں کہ میں اہل قافلہ کی مدد کر سکوں۔ اس وقت وہ قافلہ جس میں ہمارے لوگ تھے قصور آ چکا تھا۔ وہاں سے یہ

لوگ بھی تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ آ گئے جہاں انہیں زمین الاٹ ہو گئی۔ میں نے ان کی امانت نقدی اور زیورات ان کے حوالے کر دیئے اور واپس راولپنڈی چلا گیا۔ راولپنڈی آرمی اسٹیشنری ڈپو تھا۔ جو راولپنڈی پشاور زون کی آرمی یونٹوں کو ٹائپ رائٹر، کاغذ اور دوسری اسٹیشنری سپلائی کرتا تھا۔ مجھے رپورٹ ملی کہ ایک اسپیشل ٹرین جس میں اسٹیشنری کا سامان لوڈ ہے، بھارت جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر تیار کھڑی ہے۔ میں نے فوراً بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں ایک مسلمان میجر سے رابطہ کیا اور اپنی پارٹی لے کر ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ ہم نے آرمی اسپیشل ٹرین پر قبضہ کر لیا، اس کا تمام سامان واپس لایا گیا اور یوں ہندوؤں کا منصوبہ ناکام رہا۔ (۲۳)

لہو کی پہلی بارش

روایت: محمد خان رند، تحریر: آباد شاہ پوری

گوڑگانوہ سے جنوب کی ایک طرف ایک چھوٹی سی بستی نورنگ پور آباد ہے۔ جس زمانے کی یہ داستان ہے ان دنوں اس کی آبادی کوئی ڈیڑھ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ نورنگ پور سے مغرب کی سمت تقریباً آٹھ کوس کے فاصلے پر فرخ نگر کا مشہور قصبہ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ قصبہ ضلع بھر کے مجاہدین آزادی کا مرکز رہا تھا۔ نواب احمد علی خان ان مجاہدین کے سردار تھے۔ نواب کے پرچم تلے علاقے کے سرفروشوں نے پروانہ وار جانیں دیں۔ جنگ آزادی ناکامی سے دوچار ہوئی تو نواب اور ان کے ساتھی پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے۔ نورنگ پور کے بہادر بھی ان پروانوں کی صف میں شامل تھے۔ اس علاقے میں بلوچوں کی بھاری تعداد آباد تھی۔ فرخ نگر، نورنگ پور، مہنہ اور بادشاہ پور تو انہی کی بستیاں تھیں جن میں فرخ نگر کے بعد نورنگ پور کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ان بلوچ بستیوں کے گردونواح میں اکثریت ہندوؤں کی تھی جو زیادہ تر بڑھ گوجر اور جاٹ تھے۔ ان کے ساتھ نورنگ پور اور فرخ نگر والوں کی بہت ٹھنتی تھی۔ ہر وقت کشمکش جاری رہتی۔ تصادم اور ٹکراؤ آئے دن رہتا۔ ذرا سی کوئی بات ہوتی طبل جنگ بجنے لگا، برچھیاں اور تلواریں نکل آتیں۔

انگریزوں نے ملک پر قبضہ کیا، تو یہ بڑے پیمانے پر معرکہ آرائیاں تو ختم ہوگئیں تاہم دونوں قوموں کے درمیان چپقلش پھر بھی جاری رہی اور مقامی سطح پر لڑائی جھگڑے ہوتے رہے۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کی تحریکوں نے ہندوؤں میں زندگی کی نئی رو دوڑا دی۔ اب ان کا رویہ زیادہ جارحانہ ہوگیا۔ ادھر مسلم لیگ نے مسلمانوں کو تحریک پاکستان کے پرچم تلے منظّم کیا۔ اس طرح دونوں قومیں پورے سیاسی شعور اور قوت کے ساتھ آمنے سامنے آ کھڑی ہوئیں.....اور پھر ایک روز ایک چنگاری بھڑک اٹھی۔

یہ ستمبر ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں تحریک پاکستان زوروں پر تھیں۔ فرخ نگر کی ایک

ہندو خاتون نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کا نکاح منّا نامی ایک مسلمان کے ساتھ ہوگیا۔ پھر کیا تھا غیظ وغضب کی لہر پوری ہندو آبادی میں دوڑ گئی۔ ہندو آبادیوں میں قاصد شب و روز دوڑنے لگے۔ سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہونے لگیں۔ قلعہ فوجدار خاں میں ہندو پنچایت ہوئی جس میں فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کا سوشل بائیکاٹ کیا جائے۔ تجارت ساری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ دیہات میں چھوٹی بڑی دکانیں اور ساہوکارے انہی کے تھے۔ بائیکاٹ کا مطلب تھا کہ انہیں ضروریات زندگی سے محروم کردیا جائے۔ ہندو کوئی چیز مسلمانوں کے ہاتھ فروخت نہ کرتا۔ ادھر داد تھی نہ فریاد۔ گوڑگانوہ کا ڈپٹی کمشنر کپور سنگھ سخت متعصب اور مسلم دشمن تھا۔ فرخ نگر کا ایس ایچ او عبدالوہاب مسلمان تھا۔ تھا تو انچارج لیکن تھانے کے محرر مول چند کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس نے کسی قسم کی کاروائی نہ کی۔ پولیس کے اس طرز عمل سے ہندوؤں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ تین دن کے بعد وہ نومسلم خاتون اپنے شوہر کے ساتھ دہلی جارہی تھی کہ ہندوؤں نے اسے راستے ہی میں اغوا کرلیا۔ کامیابی کے نشے نے انہیں سرکش بنا دیا اور وہ فساد پر آمادہ ہوگئے۔ قصبے کی فضا روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ تھانے میں نفری کم تھی اور مُول چند کے ہاتھوں میں مسلمانوں نے تھانیدار سے کمک منگوانے کو بار بار کہا، لیکن مول چند نے ساری کوششیں ناکام بنادیں۔ عبدالوہاب اس کے اشارہ ابرو پر رقص کررہا تھا۔ فرخ نگر پر فسادات کے گھٹاٹوپ بادل چھاگئے۔ آخر خونریز تصادم ہوا۔ چھ مسلمان شہید ہوگئے۔ مسلمانوں کے خون کی یہ پہلی قسط تھی جو اس سرزمین نے وصول کی۔ لیکن یہ تو ابتداء تھی۔ خون کا سیلاب تو ابھی امڈنے کی تیاری کررہا تھا۔

(۲)

اور پھر جیسے بادل پھٹ پڑے۔ گنگا کے کنارے گڑھ مکتیشر میں ہزاروں ہندو، ملک کے گوشے گوشے سے یاترا اور اشنان کے لئے آئے ہوئے تھے۔ صدیوں کے رواج کے مطابق مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد میلہ دیکھنے آئی تھی۔ میلے میں مسلمانوں نے دکانیں بھی لگا رکھی تھیں۔ سازش تو پہلے ہی کی جاچکی تھی۔ میلے ہی میں فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ہندو مسلمان دکانداروں

اور تماشائیوں پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے صفایا کر دیا اور ان کی دکانیں لوٹ لیں۔ اب گڑھ مکتیشر کے مسلمانوں کی باری آئی۔ مرد، عورت، بچے اور بوڑھے کا امتیاز کیے بغیر وہ مظالم ڈھائے کہ جن کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر مارے گئے اور جو زندہ بچے وہ زخموں سے چور اور مُردوں سے بدتر۔ اس خونیں سانحے کی خبر پھیلی، تو ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے مسلمان لرز اٹھے۔ ہندو ہر جگہ تیاری کر رہے تھے۔ جہاں وہ بہت زیادہ اکثریت میں تھے وہاں کھلم کھلا اور جہاں مسلمانوں کی بھی خاصی تعداد تھی وہاں چھپ چھپا کر منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ وہ ۲۸ مارچ ۱۹۴۷ء کی خاموش رات تھی۔ دنیا خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔ دفعتہ طبل جنگ کی گرج سے نورنگ پور جاگ اٹھا اور خطرے کا الارم بجنے لگا۔ مسلمان، جو حالات کے پیش نظر پہلے ہی مدافعانہ جنگ کی منصوبہ بندی کر چکے تھے چشم زدن میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنے اپنے محاذ پر پہنچ گئے۔ لیکن رات بھر کوئی واقعہ رونما نہ ہوا۔ صبح گردوپیش کے میدانی دیہات میں آدمی دوڑائے پتہ چلا ہندو لاؤ لشکر جمع کر رہے ہیں جو کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتا ہے۔ ادھر سے بھی خاطر خواہ استقبال کی تیاری کر لی گئی۔ گاؤں کی حفاظت کے لئے نوجوانوں کے مختلف گروپ بنا دیئے گئے اور ہر گروپ کا ایک سردار مقرر کر دیا گیا۔ اسلحہ اور بارود ہمارے پاس وافر مقدار میں تھا۔ ہندو موقع کے منتظر ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں دال نہ گلتی دیکھ کر انہوں نے حملے کا ہدف بدل دیا۔ نورنگ پور کے بجائے میواتیوں کے گاؤں سکت پور پر چڑھ دوڑے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مختصر سی میو آبادی ٹڈی دل خونخواروں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ میواتی جان پر کھیل گئے اور ایک ایک کر کے شہید ہو گئے اور دوپہر تک سکت پور فضا میں دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ زندہ جلنے والی عورتوں اور بچوں کی چیخیں آہستہ آہستہ دم توڑ گئیں۔ اب صرف فضا میں چراند باقی رہ گئی تھی۔

اس عظیم فتح پر ہندوؤں نے زبردست جشن منایا اور پھر چار بجے کے قریب نورنگ پور کے شمالی جانب پڑاؤ ڈال دیا۔ جنگی نقارے کی ہیبت ناک آواز سے دل دہل رہے تھے،

مگر ہندو مہابیر آگے قدم اٹھانے سے گریز کر رہے تھے۔ شاید وہ مزید کمک کے منتظر تھے۔ ان کا ایک سوار برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر گاؤں کی مغربی سمت میں گیا جہاں ایک بڑا ہجوم لاٹھیاں، بندوقیں اور برچھے لئے کھڑا تھا۔ ان سے کچھ کہا اور واپس آ گیا۔ راستے میں لہلاتی فصل کو آگ لگا دی۔ نورنگ پور کے مسلمانوں نے میدان جنگ کا نقشہ پوری مہارت سے بنایا۔ دائیں بازو پر سرکنڈے اور جھاڑیاں تھیں جہاں سے گھات لگائی جا سکتی تھی۔ دشمن کی ساری توجہ سامنے کی طرف مرکوز تھی۔ چند جانباز بندوقیں لئے جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے دبے پاؤں آگے بڑھے اور اس کے سر پر پہنچ گئے اور یکدم باڑھ ماری۔ اس بلائے ناگہانی سے دشمن سٹپٹا گیا۔ اس کا دایاں بازو کئی لاشیں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر مسلمانوں کا قلب بگولے کی طرح دشمن پر جھپٹا۔ اس دہری مار سے ہندو حواس باختہ ہو گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

شمالی محاذ پر حملہ تو پسپا ہو گیا تھا.....مغرب کی طرف سے ابھی خطرہ باقی تھا.... جہاں ایک ہندو کمک لینے گیا تھا۔ ایک دو آدمی اس طرف بھیجے گئے۔ پھر فائر کی آواز گونجی اور تمام گاؤں اس طرف دوڑ پڑا۔ نوجوان مانیسر تک پہنچ گئے، مگر ہندوؤں کے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جوشیلے نوجوانوں نے مانیسر کو آگ لگانے کا ارادہ کیا، مگر بڑے بوڑھوں نے انہیں باز رکھا اور واپس آ گئے۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے گشتی پولیس کا ایک مسلح دستہ بھی نورنگ پور پہنچ گیا مگر یہ محض رسمی روند تھی۔ دستہ تھوڑی دیر وہاں ٹھہرا اور رخصت ہو گیا۔ ۱۸ مارچ کو میواتیوں اور ہندوؤں کے درمیان صلح نامہ طے ہو گیا تھا۔ لیکن ہندوؤں نے جلد ہی اسے بالائے طاق رکھ دیا اور گنگانی کے پھول خاں نامی ایک میو کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح حالات اور کشیدہ ہو گئے۔ مسلمانوں میں غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہندوؤں کو سب سے زیادہ خوف نورنگ پور سے تھا، چنانچہ وہ پنچایت لے کر بار بار آ رہے تھے۔ امن و سلامتی اور بھائی چارے کی زندگی بسر کرنے کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر در پردہ قصبے پر کڑی نظر رکھتے۔ ۲ مئی کی صبح نمودار ہوئی تو فضا میں خطرے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ خبر ملی تھی کہ ہندو نورنگ پور پر حملہ آور ہونے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ قصبے کو انہوں نے

پہلے ہی ضلعی صدر مقام گوڑگانوہ سے کاٹ رکھا تھا کھانے پینے کی چیزیں تک نایاب ہورہی تھیں۔ دوآدمی جان پر کھیل کر گوڑگانوہ پہنچے اور انگریزی ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی۔ لیکن وہ علاقے کی ہندو اکثریت کے آگے بے بس تھا۔ چنانچہ بے نیل مرام واپس آئے۔ کھانڈسہ کے ہندوان کے منتظر بیٹھے تھے، مگر وہ راستہ بدل کر نورنگ پور پہنچ گئے۔

اس کے بعد حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔ ہندوؤں کے غول کے غول برچھوں، تلواروں اور بندوقوں سے مسلح نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی پشت پر ہندو راجا اور افسر تھے۔ پولیس اور فوج کے ہندو نوجوان بھی ان کے حامی تھے۔ ۴ مئی کو پولیس نے رنگ پور پر چھاپہ مارا، بچوں اور مردوں کو باہر کھیت میں جمع کرلیا اور اونٹ سوار فوجیوں نے گاؤں کو محاصرے میں لے لیا۔ گاؤں بھر کی تلاشی شروع ہوگئی اور غروب آفتاب تک رہی، مگر بندوق وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا برچھی تک نہ ملی۔ گوڑگانوہ کے تھانیدار کرپال سنگھ کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اس کا خیال تھا نورنگ پور میں بڑا اسلحہ ہاتھ آئے گا۔ اور وہ پوری آبادی پر ہاتھ ڈال سکے گا۔ دراصل پہرے پر متعین نوجوانوں نے فوج اور پولیس کو آتا دیکھ کر گاؤں میں خبر کردی تھی اور ہم نے سارے ہتھیار چھپا دیئے تھے۔ صرف ایک بندوق اور بارود ایک نوجوان کے پاس سے ملا۔ تھانیدار نے لائسنس دار بندوقیں سب قبضے میں کرلیں۔ صرف ایک بندوق کسی طرح بچ گئی۔ وقت آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔ علاقے میں خاموشی سی طاری تھی۔ جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ ہندو درحقیقت کسی لمبے اور ہمہ پہلو منصوبے پر کام کررہے تھے۔ مسلمان ساری رات دور دور تک گشت کرتے رہے اور دشمن کی نقل وحرکت پر نظر رکھتے۔ ہندو تیاری مکمل کرچکے تو وہ مسلمانوں کے پاس آئے۔ دونوں قوموں کی پنچایت بیٹھی اور طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے۔ پنچایت برخاست ہونے سے پہلے فریقین نے حلف اٹھایا۔ ایسی ہی پنچایتیں دوسرے دیہات میں ہوئیں۔ مسلمان ہر جگہ مطمئن ہوگئے اور گاؤں کا پہرہ اور گشت وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ ہندو اپنی چال میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ۲۴ اور ۲۵ مئی کی شب انہوں نے اپنے

منصوبے کو آخری شکل دی اور رات تین بجے حملہ کردیا۔ نورنگ پور اس وقت رات کی تاریکی میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اتفاق سے ایک نوجوان اپنے گم شدہ اونٹ کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا انسانوں کا متلاطم سمندر بڑھا چلا آتا ہے۔ دور ہی سے للکارا۔ پچھلی رات کی گھمبیر خاموشی ٹوٹ گئی۔ ہندو گڑبڑا سے گئے اور ایک سورما نے اسی گھبراہٹ میں فائر کردیا۔ فائر کا ہونا تھا کہ لوگ جاگ اٹھے اور کھلبلی سی مچ گئی۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں نے ایک قلعہ نما حویلی میں پناہ لی۔ پناہ گاہ پر بندوق بردار محافظ متعین کردیئے باقی نوجوان اپنی پہلے سے طے شدہ چوکیوں اور محاذوں پر پہنچ گئے۔

ہندوؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کو گھیر لیا۔ طبل اور دمامے زور وشور سے گرج رہے تھے۔ فضا بڑی ہی ہیبت ناک ہوگئی تھی۔ خونریز تصادم شروع ہوگیا۔ دیسی ساخت کی توپیں آگ اگلنے لگیں۔ بندوقوں سے گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ہندوؤں کے جے کاروں کی صدا گونج رہی تھی جس پر مسلمانوں کی صدائے اللہ اکبر غالب آئے جاتی تھی.... دست بدست لڑائی جاری تھی کہ شمالی محاذ پر دشمن آگے بڑھ آیا اور چند مکانوں کو آگ لگادی۔ ادھر مشرقی اور جنوبی محاذ میں بھی شگاف پڑ گئے۔ ان محاذوں پر چھ آدمی شہید ہوچکے تھے۔ البتہ مغربی محاذ پر مسلمان پوری قوت سے ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ زخم پر زخم کھا رہے تھے۔ ایک کے دائیں ہاتھ کی کلائی اڑ گئی تھی۔ کچھ جوان دشمن کے گھیرے میں آگئے جسے انہوں نے تابڑتوڑ حملے کرکے توڑ ڈالا۔ دشمن کے کئی آدمی کھیت ہوچکے تھے اور پھر اس کے قدم اکھڑ گئے۔ مسلمان اپنی لاشوں کی طرف متوجہ ہوئے تو اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یہ گولیاں اسٹین گن اور ۳۰۳ رائفل سے برسائی جارہی تھیں۔ مسلمان گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے پناہ گاہ کی طرف بڑھے اچانک نورنگ پور سے دھوئیں کے مرغولے اٹھنے لگے اور پھر شعلوں کی زبانیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ مسلمان پیچھے ہٹتے ہوئے گولیوں کا شکار ہورہے تھے۔ آخر وہ ایک حویلی میں پناہ لینے میں کامیاب ہوگئے۔ گاؤں کے اردگرد کے چاروں محاذ ٹوٹ چکے تھے۔ مسلمان دو حویلیوں میں محصور تھے۔ ایک میں جوان تھے

اور دوسری میں عورتیں اور بچے..... ہندوؤں نے اول الذکر حویلی پر یلغار کردی۔ مسلمانوں نے بڑے گیٹ کے سامنے آگ جلا کر انہیں دو گھنٹے تک روکے رکھا مگر پھر وہ دیوار میں شگاف کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مسلمانوں نے انہیں جانیں دے دے کر اندر داخل ہونے سے روکا۔ دیسی ساخت کی توپ بہت کام آئی اور مسلمان نوجوان موقع پا کر حویلی میں سے نکل آئے اور اس حویلی سے دوسری حویلی میں پہنچ گئے۔ یہ حویلی گاؤں کے وسط میں تھی۔ تمام گاؤں بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں تھا اس لئے دشمن یہاں تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ مسلمان نوجوان بڑی دقت سے جھلستے جھلساتے ہوئے پہنچے تھے۔ ان لوگوں کے آنے سے محصورین کی ہمت بندھ گئی۔ دشمن نے ایک پختہ مکان کی چھت پر مورچے بنا لیے اور فائرنگ شروع کردی۔ مسلمانوں نے حویلی کے مورچوں سے جواب دیا اور اتنے زور سے گولیاں برسائیں کہ دشمن اپنے مورچے خالی کر کے چلے گئے۔ اب مسلمان زخمیوں اور شہیدوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کا بھاری نقصان ہوا تھا۔ اٹھارہ آدمی شہید ہو چکے تھے۔ اور بیسیوں زخمی تھے۔ پولیس کو رپورٹ کرنے دو آدمی گوڑگانوہ گئے لیکن یہ محض رسمی کاروائی تھی۔ پولیس گارد نورنگ پور پہنچی، تو گاؤں کو خاکستر اور اجڑا پایا گیا۔ گارد میں ایک تہائی مسلمان سپاہی تھے۔ وہ سخت مشتعل ہوگئے گارد کے انچارج نے انہیں بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔ جو بہت زخمی تھے انہیں گوڑگانوہ ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ نورنگ پور دم توڑ چکا تھا۔ جو لوگ بچ گئے تھے انہیں دہلی کے کیمپوں میں پناہ لینی پڑی۔ دہلی والوں نے دل کھول کر مدد کی۔ یہ سلسلہ جون سے ستمبر تک رہا۔ یہاں تک کہ خود دہلی پر قیامت ٹوٹ پڑی اور پھر وہ خونریزی ہوئی الامان الحفیظ۔ دہلی کی مسلمان آبادیاں چند ایک چھوڑ کر تباہ ہوگئیں وہ مسلمان ہندو آبادیوں میں گھرے ہوئے تھے وہ تو بہت کم زندہ بچ سکے۔ نورنگ پور تباہی کے اس سمندر میں محض ایک نقطہ بن گیا تھا۔ (۲۴)

ہم پر کیا گزری

فردوس نعیم۔ لاہور

کرنل صاحب ان دنوں اپنی فوج سے لمبی رخصت پر اپنے گھر ''کپورتھلہ'' میں آئے ہوئے تھے۔ مہاراجہ ''کپورتھلہ'' کی فرمائش پر ان نے سبحان پور کے ہسپتال کا اعزازی طور پر عارضی چارج لے لیا۔ جہاں ایک اسسٹنٹ ہندو ڈاکٹر حکومت رائے اس کے علاوہ دو کمپاؤڈر، ایک نرس، دو آیا، دو چوکیدار، دو چپڑاسی، دو خانساماں، دو مالی اور چار جمعداروں پر مشتمل یہ سارا عملہ بھی ہسپتال کی چار دیواری کے اندر مقیم تھا۔ ہماری رہائش گاہ بھی چار دیواری کے اندر تھی۔ جس کی پشت پر ایک وسیع گراؤنڈ تھا جو کھیل کا میدان کم اور ٹریننگ سینٹر زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ وہاں ہر قسم کا سامان حرب اور بھوسے سے بھرے ہوئے انسانی پتلے اور بہت ساری ڈمیاں رکھی ہوئی تھی۔ جہاں ہٹے کٹے موٹے تازے ''سکھ اور گورکھے'' قتل وغارت، مار دھاڑ کی مشق کیا کرتے تھے۔ وہ ان بھوسہ بھرے پتلوں کو مارتے گھسیٹتے اور قتل کرتے پھر یہاں کی تربیت یافتہ لوگوں کو بلوائیوں کے گروہوں میں شامل کیا جاتا تھا۔

اس ہسپتال میں ایک حصہ زیر تعمیر تھا۔ جس کی وجہ سے اس علاقے میں اینٹ گارا، لکڑی، لوہا بکھرا رہتا تھا۔ جوں جوں تقسیم ہند اور تعمیر پاکستان کے دن قریب آرہے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی اور نفرت بڑھ رہی تھی۔ دیہاتوں میں کچھ دنوں سے مار دھاڑ کی وارداتیں شروع ہو چکی تھیں۔ ۱۴، اگست کو تعمیر پاکستان کا اعلان ہوتے ہی ان ہنگاموں میں اضافہ ہوگیا۔ ہسپتال کا ایک ہندو خانساماں ''رام لال'' ہر روز مجھے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی ہولناک خبریں سنایا کرتا تھا۔ میں جب کرنل صاحب سے ذکر کرتی تو وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ اور ہمیشہ یہی کہتے ''ہم تو فوجی اور خاص مہاراجہ کے آدمی ہیں ہمیں کوئی خطرہ نہیں''۔

۲۲ اگست کی صبح کو ہمیں علم ہوا کہ جالندھر تباہ ہوگیا ہے۔ ہمارے عزیزوں کے گھرانے نذر آتش ہو چکے ہیں اور مکینوں کا کوئی علم نہیں ہے اور کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سارا شہر آگ اور خون اگل

رہا ہے۔کرنل صاحب اسی دن کیپٹن نظام الدین کو ہمراہ لے کر اہل جالندھر کی خیریت معلوم کرنے چلے مگر کپورتھلہ کے ریلوے اسٹیشن پر انہیں نہتے دیکھ کر بلوائیوں نے گھیر لیا۔کیپٹن نظام الدین کے پاس تھری ناٹ تھری کی بندوق تھی وہ صرف ایک ماہ کی رخصت پر گھر آیا ہوا تھا۔بہت سارے نہنگ سکھ ننگی تلواریں لئے کرنل صاحب کی طرف لپکے تو کرنل صاحب جھٹ پٹ بھاگ کر شہر کی جانب جانے والے ایک تیز رفتار تانگے پر سوار ہو کر واپس کپورتھلہ اپنے گھر آ گئے۔لیکن کیپٹن نظام الدین جالندھر پہنچ گئے۔چوتھے دن اس نے وہاں سے واپس آ کر بتایا کہ سارا شہر تباہ ہو چکا ہے۔میرے والد محترم ڈاکٹر چودھری مشرف الدین کی وسیع عمارت جل کر راکھ ہو چکی ہے۔تمام مسلمانوں کے گھر اور دکانیں ایک بھی سلامت نہیں باوجود کوشش کے کیپٹن نظام الدین اپنے اور ہمارے عزیزوں کی بابت زیادہ معلومات حاصل نہ کر سکے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ میرے منجھلے بہنوئی ٹیچر اے آر چودھری ''ایم بی ای'' جان پر کھیل کر بروقت بہت سے عزیزوں کو چھاؤنی میں لے گئے ہیں۔مگر باجی شمیم وقبلہ ابا جان کے متعلق عجیب وغریب افواہیں پھیلی ہوئی ہیں''۔یہ باتیں سن کر میرا دل ڈوبنے لگا۔میرا سکون قلب تو پہلے ہی کئی دنوں سے غارت ہو چکا تھا۔مگر تو مجھے کسی پہلو قرار نہیں۔کیپٹن نظام الدین کی بیگم بھی ہمارے ہاں پہنچی ہوئی تھی۔وہ تو کیپٹن کے ہمراہ چلی گئیں۔مگر مارے پریشانی کے برا حال تھا کیونکہ سبحان پور کے گردونواح میں بھی بلوائیوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔مرنے مارنے والوں کا شور وغل لحہ بہ لحہ قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ہم نے ان دنوں کوٹھی کا نچلہ حصہ چھوڑ کر بالائی منزل پر رہائش اختیار کر لی تھی۔

سبحان پور میں سارے کے سارے مسلمان اور خال خال ہندو سکھ آباد تھے اس لئے سبحان پور کا شہر ابھی تک محفوظ تھا۔مگر چھ یا سات ستمبر کو یکا یک دوپہر کے وقت چاروں طرف سے اتنا شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔میں نے رام لال سے پوچھا تو کہنے لگا آج بلوائیوں نے سبحان پور شہر پر بھی چاروں طرف سے حملہ کر دیا ہے۔یہ سن کر میں نے جلدی سے کھڑکی کھول کر دیکھا تو ٹڈی دل کی طرح سکھوں کا ایک جتھہ جس میں ریاست چنبہ، ریاست

نابھہ کی باقاعدہ فوجیں۔ان کے علاوہ جن سنگھی اکالی دل، نہنگ، بال، بیکھے گھوڑوں پر سوار اور پیدل ڈھول بجاتے اور غل مچاتے تیزی سے سبحان پور کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔انہوں نے ''ست سری اکال جو بولے مونہال'' کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے بلوائیوں کا یہ گروہ مسلمانوں کی چھوٹی سی آبادی پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔مار دھاڑ، چیخ وپکار کی آوازوں سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔اس وقت کرنل صاحب بھی گھر پر موجود تھے۔وہ بھی کھڑکی کی طرف آئے جونہی انہوں نے باہر کی طرف سر نکال کر جھانکا۔کئی سکھوں کی بیک وقت آواز آئی ''اوئے دیکھو یہ ڈاکٹر بھی مُسلا ہے اسے بھی ٹھکانے لگا دو''۔

یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب نے کھڑکی بند کر دی اور کہا ''بچی کو لے کر نکل چلو۔وہ لوگ بہت قریب آ گئے ہیں۔ہم بھرے گھر سے کچھ اٹھائے بغیر بچی کو لے کر فوراً نیچے اترے اور جہاں ہمیں ہماری رہائش گاہ پوری طرح دکھائی دے رہی تھی۔ذرا سی دیر میں ہماری نگاہوں کے سامنے رہائش گاہ کی دیواریں فائرنگ سے چھلنی ہو گئی۔کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔پھر بلوائی دیوار پھاند کر اندر گئے اور ہمیں نہ پا کر مغلظات بکنے لگے پھر انہوں نے سارے ہسپتال کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ہم سب سہمے ہوئے بدستور زیر تعمیر عمارت کے کھنڈر میں چھپے رہے۔شام ہوتی جا رہی تھی مگر بلوائی پاگل کتوں کی طرح دردر جھانکتے اور ہمیں تلاش کرتے رہے۔دوسری طرف کشت وخون کا بازار گرم تھا۔مظلوموں کے رونے چلانے کے شور اور انسانی جسموں کے آگ میں جلنے کی بدبو سے دم گھٹنے لگا۔میری بچی ''لبنیٰ'' اس وقت صرف ایک سال کی تھی جو ڈری سہمی میرے سینے سے چمٹ کر سمٹی جا رہی تھی۔بشیر احمد چھوٹا، نذیر احمد ذاتی خانساماں اور رام لال (راموں) سرکاری خانساماں بھی ہمارے ساتھ تھا۔ہم سب کے سب دم سادھے اس پناہ گاہ میں دبکے رہے۔رات بھر گولیاں چلنے، گھوڑوں کے ادھر ادھر بھاگنے اور لوگوں کے رونے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔صبح پو پھٹنے سے پہلے ہم لوگ اس کھنڈر سے نکل کر ہسپتال کے جمعداروں کے کوارٹروں میں پہنچ گئے۔انہوں نے فوراً ہمیں اپنی بے انتہا اور بدبودار گدڑیوں میں چھپا لیا۔میری بچی ''لبنیٰ''

بار باران کی گندی گدڑیوں سے بھاگ نکلنا چاہتی تھی۔مگر میں نے پوری قوت سے اسے پکڑے رکھا۔سخت مجبوری کے عالم میں ہم نے ان کے گندے برتنوں میں پانی بھی پی لیا۔جمعداروں کے اس احسان کے بدلے ہم نے انہیں اپنی رہائش گاہ کی چابیاں دے دی اور کہا کہ وہ جو چاہیں وہاں سے اٹھالائیں۔غرض وہ رات وہیں گزاردی اور علی الصبح وہاں ہسپتال کی ''آیا'' فاطمہ بیگم کے کوارٹر میں چلے گئے۔اس کے پاس دو کمرے تھے۔اس نے ایک کمرہ ہمیں دے دیا۔اور جلدی جلدی کھانا تیار کر کے کھلایا۔آج تیسرے دن کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور پیاس بجھائی۔ایک رات یہاں گزار کر صبح موذن کی اذان سے پہلے ہم ڈسپنسر رشید کے شکستہ کوارٹر منتقل ہو گئے۔اس کوارٹر کی چھت گری ہوئی تھی۔اور دیواروں میں دراڑیں آئی ہوئی تھیں۔ڈسپنسر رشید نے یہاں کھجوروں کے پتوں کا انبار لگا رکھا تھا۔جس سے گرمیوں میں دستی پنکھے بنوایا کرتا تھا۔ہم ان خشک پتوں کے ڈھیر کے نیچے دب گئے۔مگر اچانک اس دن بارش شروع ہوگئی۔پتوں کے اوپر سے ٹپکنے والا پانی ہمیں پریشان کر رہا تھا۔میری بچی سارا دن سسک سسک کر روتی رہی کیونکہ میں اسے آواز نہیں نکالنے دیتی تھی۔رات بھر فاقے سے گزر گئی۔صبح ہونے سے پہلے میں نے موقع دیکھ کر بشیر اور نذیر دونوں کو اپنی رہائش گاہ میں بھیج کر وہاں سے ایک تھیلہ کچے چنے اور آٹے کی بوری میں میرے زیورات کی پوٹلی رکھی ہوئی تھی وہ منگوالی اور پھر صبح کاذب سے پہلے ہم سب چنوں کے تھیلے اور زیورات لے کر ہسپتال کی نرس سکینہ بیگم کے کوارٹر میں چلے گئے۔اس کا کوارٹر خاصا کھلا تھا۔اس کی تین لڑکیاں اور سب سے چھوٹا تین سال کا ایک لڑکا تھا۔اور اس کا خاوند ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ایک رات تو وہاں اطمینان سے گزر گئی مگر دوسرے دن صبح دس بجے ہوں گے کہ ہسپتال کے ہندو ڈاکٹر نے نرس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔دو سپاہی اور ہسپتال کا بچا کھچا عملہ ساتھ لے کر آ گیا۔نرس کا چھوٹا بچہ کھیل رہا تھا۔اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ہم لوگ ابھی چھپنے بھی نہ پائے تھے۔کہ وہ سب کے سب اندر آ گئے۔ہمیں دیکھ کر ڈاکٹر حکومت رائے بڑی حیرانی سے کہنے لگا۔''آپ کے متعلق تو افواہ تھی کہ آپ تو سبحان پور سے جا چکے ہیں۔خیر خود ہی کہنے لگا خیر اب آپ کوئی فکر نہ

کریں۔ہم بہت جلد آپ کے لئے انتظام کر دیں گے''۔یہ کہہ کر وہ ہسپتال کے باقی عملے کو ہمراہ لے کر دوسرے کوارٹروں کی طرف چلا گیا۔دراصل وہ لوگ یہ دیکھنے آئے تھے کہ ہسپتال کے عملے کے ابھی کتنے مسلمان باقی ہیں۔بہرکیف دن تو کسی ہنگامے کے بغیر گزر گیا مگر آدھی رات کے وقت بلوائیوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔وہ لوگ صحن کی دیوار پھاند کر اندر آئے اور پھر سکینہ نرس کا دروازہ زور زور سے پیٹتے ہوئے چلانے لگے۔''اوئے ڈاکٹر دروازہ کھول دے ورنہ ہم توڑ دیں گے۔''

کرنل صاحب نے فوراً ڈھائی من گندم کی بوری اٹھا کر دروازے کے سامنے لگا دی تاکہ بلوائی دروازہ نہ کھول سکیں۔ہم لوگ پھر پریشان ہو کر پشت والے گراؤنڈ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف بھاگے تاکہ وہاں کود کر باہر نکل جائیں۔مگر دیکھا تو اس گراؤنڈ میں بے شمار نہنگ اور سکھ تلواریں لئے موجود تھے۔وہاں سے الٹے پاؤں ہم پھر اپنے گھر کے اندر کی طرف بھاگے مگر اس وقت تک دروازہ توڑ کر اندر آ چکے تھے۔میں بچی کو گود میں لئے دوڑ کر باہر کی طرف جانا چاہتی تھی مگر کرنل صاحب کی وجہ سے میرے قدم جم گئے۔کیونکہ وہ ابھی تک کمرے کے اندر تھے۔بلوائی انہیں باہر لانے کے لئے بڑی اونچی آواز میں پکارے جا رہے تھے۔یہ دیکھ کر میں کرنل صاحب کو اندر سے بلا لائی۔خود ان کے آگے آگے چلتی ہوئی سامنے آ کر بلوائیوں سے مخاطب ہو کر کہا ''لو آ گئے ہیں ڈاکٹر صاحب! کہو تم نے ان سے کیا کہنا ہے؟'' صبح والے دو سپاہی بھی ان کے ساتھ تھے اور تھانیدار سالگرام بھی۔اس نے جواب دیا۔''ہمیں پتہ چلا ہے کہ تم لوگوں کے پاس بہت سا آتشیں اسلحہ ہے۔فوراً وہ ہمارے حوالے کر دو''۔کرنل صاحب تو خاموش رہے مگر میں نے جواب دیا ''کاش ہمارے پاس اسلحہ ہوتا تو ہم یوں چھپ کر نہ بیٹھتے''۔یہ سن کر وہ کہنے لگا تو اچھا تم لوگ مسلم لیگی ہو اور جناح کے پیروکار ہو''۔اب پکارو جس نے پاکستان بنالیا ہے اور ہمارے سامنے گالیاں دو۔ورنہ یہ سنگین دیکھ رہے ہو نا۔ہمیں ان سے کام لینا آتا ہے''۔مگر ہم نے ان کی بکواس کا کوئی جواب نہ دیا تو ذرا ٹھہر کر تھانے دار پھر بولا ''تمھارے گھر کا تمام قیمتی سامان کہاں۔چاندی کے واٹر اور ٹی سیٹ،ایرانی قالین،ریشمی پردے وغیرہ میں نے جواب دیا:

بلوائی لے گئے ہوں گے۔ یا پھر یہاں کے جمعداروں کو پتہ ہوگا ہمیں کچھ علم نہیں۔ پھر کہنے لگا بینکوں کی چیک بکیں تو تمہارے پاس ہوں گی۔ ان پر دستخط کر کے میرے حوالے کر دو اور زیورات بھی۔ یہ سنتے ہی ایک سپاہی میری جانب بڑھا تو میں نے جلدی جلدی طلائی چوڑیاں، انگوٹھیاں، کانوں کی بالیاں اور گلے کا لاکٹ اتار کر ان کی طرف پھینک دیا۔ آخر کار پوٹلی میں چھپا ہوا زیور بھی مجھ سے چھین لیا۔ شور وغل کی آواز سن کر سکینہ کا معذور شوہر ہماری مدد کو آیا مگر ایک سپاہی نے بندوق کا بٹ مار کر نیچے گرا دایا۔ اور وہ بے چارہ تو پہلے ہی ایک ٹانگ کا مالک تھا۔ گرتے ہی لہولہان ہوگیا۔ پھر تھانے دار اور دو سپاہی سکینہ کے مکان کی تلاشی لینے کے لئے اس کے کمروں میں گھس گئے۔ وہاں سے بھی تمام قیمتی سامان اور اس کے سارے زیورات لے کر باہر آ گئے۔ یہ تھانے دار سالگرام کرنل صاحب کا بچپن کا دوست تھا۔ اس پر کرنل صاحب نے انگنت نوازشات کر رکھی تھیں۔ یہاں اس نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا ''چلو میں تمہیں گھر تک پہنچا آؤں کرنل خود بخود آ جائے گا''۔

میں نے سخت انداز میں انکار کر دیا تو خاموش ہوگیا۔ پھر ہندوؤں نے گھروں سے سارا قیمتی سامان نکلوالیا اور اسے ایک چھکڑے پر لاد کر لے جانے سے پہلے ایک بار پھر تھانیدار نے کرنل صاحب سے مخاطب ہو کر کہا؛ ''اوئے کرنل تم میرے دوست ہو اس لئے میں نے تمہاری اور تمہارے بیوی بچوں کی جان بخش دی ہے۔ میرے اس احسان کو نہ بھولنا، یاد رکھنا''۔ رات کے بقایا گھنٹے ہم نے دم سادھ کر خاموشی سے گزار دیئے۔ صبح ہوتے ہی ہسپتال کا چھوٹا ڈاکٹر حکومت رائے روپ چند سے آ گیا۔ اس نے آتے ہی ''راموں'' کو پیغام دے کر کپورتھلہ روانہ کر دیا۔ تاکہ وہاں سے کوئی مدد آ سکے۔ راموں کو بھیجنے کے تھوڑی سی دیر بعد ڈاکٹر حکومت رائے، روپ چند اور سالگرام پھر آ گئے اور کہنے لگے۔ یہاں خطرہ بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ چلو ہم تم لوگوں کو بڑے پیر صاحب کے ہاں پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں کیمپ بن چکا ہے۔ اب دیر نہ کرو''۔ کرنل صاحب نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور بچی کو گود میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کرنل صاحب کے ساتھ ان لوگوں کے عقب میں چل پڑے۔ وہ ویران راہوں سے ہوتے ہوئے کھیتوں میں سے

ہمیں پیدل کئی میلوں تک چلاتے رہے۔ قدم قدم پر میری ٹانگیں جواب دے رہی تھیں۔ میں بمشکل کرنل صاحب کا سہارا لئے گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔ شدید پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ خوف اور دہشت نے رہی سہی ہمت پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ آخر کار چراغ جلے ہم لوگ گرتے پڑتے پیر صاحب کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ وہاں تو پہلے سے بے شمار لوگ جمع تھے۔ پیر صاحب بڑے تپاک سے ملے اور کرنل صاحب سے گلہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ناحق اتنی تکلیف اٹھائی۔ مجھے پہلے پیغام بھیج دیا ہوتا تو میں خود جا کر سواری پر تم لوگوں کو لے آتا کرنل صاحب''۔ پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ''کوئی فکر نہ کرو بیٹی! اب ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اب تم اندر خواتین کے پاس چلی جاؤ''۔ میں نے اندر جا کر دیکھا بڑے پیر صاحب کے ہاں پولیس کے علاوہ ملٹری کے سپاہی بھی انتظام میں مصروف تھے۔ بے شمار عورتیں زمین پر دریاں بچھائے بیٹھی تھیں مگر گھر والیوں نے میرے لئے خاص طور پر پلنگ بچھوا کر اس پر صاف ستھرا بستر بچھوا دیا۔ اور پھر اپنے ساتھ مجھے کھانا کھلایا اور مجھے ہر طرح تسلی دی۔ مگر مجھے کسی بھی پہلو قرار نہیں تھا۔ مجھے فکر تھی کہ کہیں سالگرام تھانیدار کرنل صاحب کو دھوکا دے کر باہر نہ لے جائے۔ کیمپ میں ساری رات شور مچا رہا۔ کوئی بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔ اور کوئی رو کر یونہی نڈھال ہوتا رہا۔ میں بھی رات بھر نہ سو سکی۔ میری بچی آنکھیں کھولے کبھی مجھے اور کبھی بے شمار لوگوں کو دیکھتی رہی۔ لیکن روئی نہیں۔ صبح کی نماز کے بعد میں تلاوت کرنے لگ گئی۔ ابھی ایک پارہ ہی پڑھا تھا کہ بھائی غلام محمد صاحب، محمد شریف ایک فرسٹ کلاس اہل کار بھگھیر سنگھ اور چار سپاہی ایک سبز سی سرکاری وین میں آ پہنچے۔ ہمیں اس خستہ حالت میں دیکھ کر ان سب کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ میں تو بے اختیار رو دی۔ بھائی غلام صاحب نے مجھے حوصلہ دیا۔ اور کہا؛ ''شکر ہے اللہ کا خدا نے آپ کو اپنی رحمت سے زندہ سلامت رکھا''۔

پھر بڑے پیر صاحب کا شکریہ ادا کر کے ہم نے ان سے رخصت لی اور ''وین'' میں آ بیٹھے۔ وہاں سے نکل کر پہلے ہسپتال اور پھر اپنی رہائش گاہ تک پہنچے جس کے دروازے کھڑکیاں سب ٹوٹے پڑے تھے۔ دیواریں گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھیں۔ کرنل صاحب نے وہاں پہنچ کر

راموں کو ایک الماری کے اندر سے کاغذات و فائل لانے کو کہا۔ وہ سب کچھ اٹھالایا۔ اس فائل میں کرنل صاحب کے جملہ سرٹیفکیٹ، بینکوں کی پاس بکیں، چیک بکیں اور ضروری کاغذات بھی تھے۔ اس فائل کو بیکار سمجھ کر بلوائیوں نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ہم نے باقی گھر کا بچا کھچا تمام اثاثہ راموں کو دے دیا اور ہم لوگ کپورتھلہ کی طرف چل پڑے۔ جگہ جگہ مار دھاڑ کا سلسلہ جاری تھا اور بے گور و کفن لاشیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ ابھی ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ تھانیدار سالگرام رگھبیر سنگھ سے کہنے لگا۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہے ہیں انہیں ہمارے حوالے کر دیجئے ہم خود ہی ان کو پہنچا دیں گے''۔ رگھبیر نے تلخ انداز میں جواب دیا۔ بیکار باتیں نہ کرو اور تم چلے جاؤ۔ آج مجھے رگھبیر نہیں بلکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کہو کیونکہ میں اس وقت انہیں کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ یہ سن کر سالگرام خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد لوگ جلد ہی کپورتھلہ پہنچ گئے۔۔۔۔ وہ پہلے ہی کیمپ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ یہ لوگ تین ماہ تک وہیں پھنسے بیٹھے رہے۔۔۔۔ جتنے مہاجروں نے ہجرت کی ان کی ٹرین اور پیدل چلنے والے سب کے سب تہ تیغ کر دیئے گئے تھے۔ آخر ہم نے اپنے مخصوص انتظام سے خاندان کے تھوڑے تھوڑے افراد کو جالندھر میں بھیجنا شروع کیا۔ جب ہمارا مکمل خاندان جالندھر کیمپ پہنچ گیا تو پہلے ہمارے لیے روانگی کی ۱۷ نومبر ۱۹۴۷ء تاریخ مقرر ہوئی۔ مگر پھر اچانک ہمیں ۱۴ نومبر ۴۷ء کو ایک مخصوص ٹرک میں سوار کر کے جالندھر کیمپ میں پہنچایا گیا۔ جالندھر کیمپ سے ۱۶ نومبر ۴۷ء کو جب ہم لوگ پاکستان کے لئے ٹرین میں سوار ہونے لگے تو لاہور سے شمیم آپا کا پیغام لے کر حوالدار حیدر گل پہنچ گیا۔ اس نے ہمارے لئے نہایت عمدہ قسم کی جیپ کا انتظام کیا۔ چائے پلائی اور ہمارے یہاں بلوچ رجمنٹ کے پاس ہمارے قیام کا انتظام کروایا۔ ہم نے رات کا کھانا بھی وہی کھایا اور رات بھی اطمینان سے گزاری۔ دوسرے دن ۱۸ نومبر ۴۷ کو حیدر گل کے ساتھیوں نے ہمیں زندہ سلامت پاکستان کی پاک سرزمین پر پہنچا دیا۔ (۲۵)

یادِ پارینہ

ثمینہ ظفر۔ لاہور

میرا آبائی وطن لدھیانہ اور میرے والد محترم سید محمد شاہ بہت بڑے زمیندار اور میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ شہر میں ان کا بڑا دبدبہ اور بہت عزت تھی۔ میرے بھائی اور ہم چھ بہنیں تھیں۔ ہمارا گھرانا کھاتا پیتا، دنیا کے تفکرات سے آزاد تھا۔ میری خالہ رابعہ اسماعیل صاحبہ مسلم لیگ کی بہترین کارکن اور جنرل سیکرٹری تھی۔ میری عمر اس وقت اندازاً نو سال کی ہوگی۔ چونکہ خالہ رابعہ مجھے اکثر مسلم لیگ کے زنانہ جلسوں میں لے جا کر وہاں مجھ سے قومی نظمیں پڑھوایا کرتی تھیں۔ اس لئے بچپن کے باوجود ''تحریک پاکستان' کے متعلق بہت سی باتیں میرے تحت الشعور میں موجود ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں بزرگوں کی دیکھا دیکھی ہم بچے بھی سارا دن ''مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم زندہ باد'' ''بن کے رہے گا پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان''، سینے پر گولی کھائیں گے پاکستان بنائیں گے'' کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

پھر سچ مچ ایک دن ہندوستان تقسیم ہو کر پاکستان معرض وجود میں آ گیا ہماری خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ مگر ۱۴ اگست کی شام کو اعلان یوم آزادی کے ساتھ ہی گولیاں چلنے، بم پھٹنے اور انسانی چیخ و پکار کی کرب ناک آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ زوردار دھماکوں کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تو یہ دیکھ کر ہم سب کے دل سہم گئے۔ لدھیانہ کے پاکستان میں شامل نہ ہونے کے باعث اس وقت سب مسلمان حواس باختہ ہوگئے۔ لدھیانہ شہر کے گرد نواح میں تو کئی دنوں سے ہنگامے ہو رہے تھے۔ مگر اب تو سارے شہر میں بھگدڑ مچ گئی۔ بلوائیوں کی ٹولیاں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارے جا رہی تھیں پھر پشت ہا پشت سے گھروں میں جمے جمائے لوگوں نے اپنا تمام مال و متاع سکنی اور غیر سکنی جائیدادیں چھوڑ چھوڑ کر ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ ۱۹ اگست کی رات بڑی ہولناک رات تھی تمام رات بلوائیوں کے بڑے بڑے گروہ مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا کر لوٹتے اور مسلمانوں کو قتل کرتے رہے۔ ایک قیامت

صغریٰ برپا تھی۔ چاروں طرف نفسانفسی کا عالم تھا۔ جولوگ گھروں کو چھوڑ کر پاکستان جانے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں جمع ہو گئے تھے۔ سکھوں، اکالی دلوں اور سیوا سنگوں نے ان کو بھی نہ چھوڑا۔ غرض یہ کہ مسلمانوں کو اس وقت کہیں بھی پناہ نہ ملتی تھی۔ آمدورفت کی تمام راہیں بند اور پیغام رسانی کا بھی کوئی ذریعہ نہ رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے بھی اپنے بچاؤ کے لئے بہت کچھ کیا مگر حکومت کی پوری طاقت اور کہاں نہتے مسلمان؟

میرے والد محترم نے اپنی بساط سے بڑھ کر مسلمان بھائیوں کی مدد کی اور انہوں نے بیشمار مسلمانوں کو ہندو اور سکھ کے بے پناہ ظلم سے بچائے رکھا۔ انجام کار میرے والد محترم کی کوششوں سے لدھیانہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ہرے بھرے کھیتوں میں ایک ریلیف کیمپ بن گیا۔ لدھیانہ اور اس کے گردونواح کے تمام مسلمان اس کیمپ میں جمع ہونے لگے۔ یہ کیمپ کافی نشیبی جگہ میں واقع تھا۔ جس کے قریب ہی ریلوے لائن کی پٹڑی اونچی جگہ پر تھی۔ اس کیمپ میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی مگر مسلمانوں کی آمد کا تانتا بدستور بندھا ہوا تھا۔ ہمیں اس کیمپ میں پناہ گزین ہوئے چوتھا دن تھا کہ پاکستان جانے والی ایک ٹرین کی آمد کی اطلاع ملی۔ بیشمار لوگ اونچی ڈھلوان بمشکل طے کر کے ریلوے لائن کے قریب پہنچ گئے۔ جن کے پاس سامان زیست تھا وہ بھی انہوں نے چڑھا لیا۔ وہ ریلوے لائن پہاڑی ڈھلوان کی طرح اونچی تھی۔ یہاں سے ہر لحہ پھسل پڑنے کا خطرہ درپیش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ اس ریلوے لائن کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں بیٹھ گئے تا کہ انہیں سوار ہونے میں آسانی رہے۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہونے والی تھی مگر گاڑی کی آمد کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ دھوپ کی تمازت اور پیاس کی شدت کے مارے لوگ بے دم ہوئے جاتے تھے۔ شدید انتظار کے بعد گاڑی کی آمد کا شور سنائی دیا۔ وہ آئی تو سہی وہاں رکی نہیں۔ اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اس نے گزرتے گزرتے سب کچھ سمیٹ لیا۔ بیشمار انسانوں کے سر، گردن اور جسم کے کئی حصے کٹ گئے۔ جو بھی گاڑی کی لپیٹ میں آیا وہ زندہ نہ رہا۔ جب ریل گاڑی گزر گئی تو ریلوے لائن انسانی لاشوں کے ٹکڑوں اور خون سے لت پت

تھی۔ بے شمار زخمی انسان ادھر ادھر سسک رہے تھے۔ ایک بچہ آدھا کٹا پڑا تھا۔ لوگوں کا سامان زیست توریل کی آمد کی دھمک کے ساتھ پہلے ہی لڑھک گیا تھا۔ مگر یہ اندوہناک حادثہ کے بعد باقی ماندہ لوگ پھر مایوسی کے عالم میں اسی کیمپ کے نشیبی علاقے میں جا اترے جہاں لوگوں کی بہتات کے باعث چاروں طرف غلاظت پھیل چکی تھی۔ حتی کہ پینے کے پانی کے کنوئیں بھی گندگی سے بھر گئے اور تعفن کے مارے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ اس کیمپ کے قریب تمام سرسبز کھیت غلاظت سے بھر گئے۔ کہیں پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں رہی تھی۔ بدبو کے مارے اس طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکوں سے دماغ پھٹنے لگتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کیمپ میں ہمیں آٹھ دن گزر گئے۔ دن کاٹے نہیں کٹتے تھے۔ آٹھویں دن پھر ایک اور اسپیشل ٹرین آئی جو آ کر کیمپ کے قریب ٹھہری۔ لوگ بھاگم بھاگ اس میں سوار ہونے لگے۔ ہمیں بھی اس ٹرین میں بڑی مشکل سے جگہ مل گئی۔ غرض یہ کہ سب ٹھسا ٹھس کر بیٹھ گئے۔ جن مردوں کے پاس اسلحہ تھا وہ کچھ توریل کی چھت پر چڑھ گئے اور کچھ گاڑی کے باہر پائیدانوں پر کھڑے ہو گئے تا کہ ہم سب کی حفاظت کر سکیں۔ ٹرین میں ایک خاتون نے بچے کو جنم دیا۔ اسی گاڑی کی ایک عورت نے دایہ کے فرائض سرانجام دیئے۔ گاڑی بڑی ہلکی رفتار سے چل رہی تھی۔ بلوائیوں کی کئی ٹولیوں نے متعدد بار حملہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہمارے اسلحہ بردار جیالے مردوں نے ان کو ٹرین کے قریب تک نہ آنے دیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی امرتسر پہنچی۔ اسٹیشن پر بلوائیوں اور سکھوں کا ہجوم دیکھ کر ایک بار پھر ہمیں ان سے بچ نکلنے کی امید نہ رہی۔ مگر خدا کا شکر ہے پلیٹ فارم پر تھوڑے سے بلوچی سپاہی موجود تھے جنہوں نے ہماری ٹرین کی نگرانی شروع کر دی جو گروہ گاڑی کی طرف لپکا اسے باڑ پر رکھ لیتے اس کے باوجود بلوائی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ انہوں نے ریلوے کے پل پر چڑھ کے گاڑی کے مسافروں پر کھولتا ہوا پانی اور تیزاب پھینکا جس سے بہت سے لوگ جھلس گئے۔ انتہائی پیاس کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ ہم نے پانی مانگا تو ہمارے ایک عزیز کہیں سے ایک بڑی صراحی میں پانی بھر لائے۔

راہ میں تین چار پیاسے لوگوں نے پانی مانگا۔انہوں نے دیا تو وہ پانی جس نے پیا وہ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔یہ دیکھ کر ہمارے عزیز نے وہ سارا پانی بمعہ صراحی کے وہیں پھینک دیا کیونکہ ہر جگہ مسلمانوں کے لئے پینے کے پانی کے ذخیروں میں زہر ملایا گیا تھا۔اس کی شدت کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔اس کے بعد ہم نے امرتسر سے لاہور تک بغیر پانی پئے بڑی اذیت سے وقت گزارا۔لدھیانہ سے لاہور تک ہی اسپیشل ٹرین پورے چھتیس گھنٹوں میں پہنچی تھی۔لاہور پہنچتے ہی ہمیں والٹن کیمپ میں بھیج دیا گیا۔جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔میرے والد محترم نے ہم سب کو ایک چھکڑے پر بٹھائے رکھا اور والٹن کیمپ کے قریب ہی ساری رات اسی چھکڑے پر گزار دی۔دسرے دن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہم وہاں سے اسی چھکڑے پر چل پڑے اور ''دلروز'' والوں کے ہاں فیروز پور روڈ پر پہنچے اور پھر اسی دن ہم سب بکھر کر پاکستان کے مختلف شہروں میں چلے گئے۔(۲۶)

تقسیم ہند

اختر قریشی۔لاہور

ہندوستان کے دل شہر دہلی بائیس خواجوں کی چوکھٹ جس کی اینٹ اینٹ سے عظمت اسلام برستی ہے۔وہ بھی ظلم وتشدد کے واقعات سے خالی نہ رہا۔یہ بھی دیگر شہروں کی طرح شہیدوں کے خون سے رنگین ہو گیا۔مغلوں کے دور کا دلی جس کی معاشرت کا رنگ دوسری قوموں پر غالب تھا۔اس کے گلی کوچوں میں بھی ہمارے شہیدوں کے خون کی سرخی بکھر گئی۔دہلی اور اپنے وطن کی یہ تابناک یاد میرے دل کے ہر گوشہ میں زندہ وتابندہ ہے جو مجھے یہ احساس دلاتی ہے کہ ہمیں کتنی عظیم قربانیوں کے بعد یہ مملکت خداداد پاکستان حاصل ہوئی ہے جو ہماری ثقافت ،معاشرت اور عظمت اسلام کا امین ہے۔مسلمانوں کے جان ومال کی قربانی نے تو اس تحریک کو جلا دی تھی۔اور ہم نے اپنی منزل پالی ۔ایک خدا،ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن جو ہمارا مقصود تھا حاصل کر لیا۔لیکن ہم اپنے ان شہیدوں اور غازیوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔جنہوں نے پاکستان کے لئے اپنا مقدس خون بہا دیا۔ان کی یاد ہمیشہ زندہ رہے گی۔

دوسرے شہروں اور پنجاب سے ہندو سکھ بھاگ کر دہلی آئے۔ان کو حکومت کی طرف سے پوری طرح چھوٹ ملی ہوئی تھی۔وہ آزادی سے کرپانیں اور ہتھیار لئے لئے گھومتے پھرتے تھے اور جگہ جگہ جتھوں کی شکل میں جمع ہو کر مسلم محلوں اور مسلم اکثریت کے دیہاتوں پر اچانک حملہ کرتے۔دلّی جو کئی مرتبہ اجڑی۔آج پھر اپنی تاریخ دہرا رہی تھی۔۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں قتل عام شروع ہوا۔ریلوے اسٹیشن پر بیشمار مسلمان قلی اور مزدور شہید کر دیئے گئے۔مسلمانوں کے علاقہ قرول باغ سبزی منڈی جہاں ہزاروں مسلمان سبزی فروش رہتے تھے نذر آتش کر دیئے گئے۔جن سنگھی مسلمانوں کو چن چن کر شہید کر رہے تھے۔قرول باغ میں جامعہ ملیہ کے کتب خانہ کو آگ لگا دی گئی۔مسلمانوں کے اس ادارے میں قیمتی کتابوں کا ذخیرہ تھا جو جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔اس ہی علاقے کا ایک واقعہ ہے۔ایک گھر پر ہندو سکھوں نے مل کر حملہ کیا۔گھر کے باقی افراد کسی محفوظ جگہ

چلے گئے تھے۔صرف میاں بیوی رہ گئے تھے۔سکھوں نے شوہر کو چھت کے پنکھے سے باندھ کر لٹکا دیا اور نیچے گھر کا ٹوٹا پھوٹا۔سامان جمع کر کے آگ لگا دی اور بھاگتی ہوئی خاتون خانہ کو گولی کا نشانہ بنا دیا اور سب سامان لوٹ کر فرار ہو گئے۔مسلم کش فسادات اور خون مسلم کی ارزانی جب انتہا سے زیادہ ہو گئی تو حکومت نے پرانے قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے عرب سرائے میں کیمپ قائم کر دیئے جہاں ہزاروں مسلمانوں نے پناہ لی اور بے سروسامانی کی حالت میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں بلوچ رجمنٹ کی زیر نگرانی چین کا سانس لیا۔یہ قلعہ وہ ہے جس نے مسلمانوں کا صدیوں تک دور حکومت دیکھا ہے۔جس کے در و دیوار پر جہانگیر اور نگ زیب جیسے پرشکوہ مسلمان حکمرانوں کے جاہ وجلال کی داستانیں رقم ہیں۔اس کی چار دیواری میں مسلمان کسمپرسی کی حالت میں پناہ گزین تھے اور پاکستان جانے والی گاڑیوں کے منتظر۔

ہمیں معلوم ہوا کہ سکھ عنقریب زینت محل پر حملہ کرنے والے ہیں کیونکہ یہ عمارت اب پٹیالہ ہاؤس کہلاتی ہے جو کبھی ملکہ زینت بیگم بہادر شاہ ظفر کا محل تھا۔انگریزوں نے بطور انعام مہاراجہ پٹیالہ کو بخش دیا تھا۔ہم کئی رات سے جاگ رہے تھے۔ابھی ذرا سی آنکھ لگی تھی کہ بچوں نے شور مچا دیا کہ اللہ اکبر کی آواز آ رہی ہے۔ ہندو آ گئے ہائے ہندو آ گئے۔ سب یک لخت بیدار ہو گئے۔سارے زینت محل میں ہلچل مچ گئی۔واقعی ہندو،سکھوں نے مل کر فراش خانہ کی طرف سے حملہ کیا تھا جو ہمارے جانباز مسلمانوں نے ناکام بنا دیا۔حملہ آور بھاگ گئے۔صبح ہوتے ہی ہم سب نے پرانے قلعہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔گھر چھوٹ رہا تھا۔ہم معصوم بچوں کو لئے خانماں برباد ہوئے۔آخری حسرت بھری نگاہ اپنے گھر پر ڈالی۔اپنے خوب صورت پودوں پر چنبیلی کی کلیاں کھل چکی تھیں۔جیسے ہمیں رخصت کر رہی ہوں۔پام اپنے شاندار پتے ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہا تھا۔غرض ہم سب پرانے قلعہ چلے گئے۔وہاں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا،نہ کوئی کمرہ نہ دالان اور نہ ہی چھت تھی۔ہم اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا خیمہ لے گئے،وہی نصب کر لیا۔ہمارے قریب ہی کچھ شہزادے زمین پر بیٹھے تھے۔حضرت داغ کی صاحبزادی نواب

سائل کی بیگم وغیرہ سب کے سب خاک نشین تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

شام کو بچوں نے رونا چلانا شروع کر دیا۔ایک ہی رٹ تھی کہ گھر چلئے۔ہم نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ اب ہمارا گھر ہمارا پاکستان ہے۔ میں بچوں کو ایک طرف بہلانے لے گئی۔شام ہو رہی تھی۔کچھ لوگ چھ سات ماہ کی بچی کو جو مسلسل رو رہی تھی بہلا رہے تھے۔رضا کار دودھ اور دودھ کی شیشی لائے مگر بچی نے ہرگز دودھ کو منہ نہ لگایا برابر روتی رہی تڑپتی رہی۔میں نے پوچھا اس بچی کی ماں کہاں ہے۔لوگوں نے بتایا کہ قلعہ سے باہر کچھ لینے گئی تھی ابھی تک واپس نہیں آئی۔خدا جانے ہندو غنڈے اٹھا کر لے گئے یا مار دیا مجھے تمام رات اس بچی کا خیال آتا رہا۔صبح ہوتے ہی میں نے جا کر معلوم کیا کہ بچی کا کیا حال ہے میں نے پوچھا بچی خاموش ہو گئی؟ایک آدمی نے آہ بھر کر کہا ہاں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔یہ سن کر میری روح لرز گئی.....وہیں ایک گڑھا کھود کر اس معصوم کو لوگوں نے دفن کر دیا۔

یہ مصیبت کا زمانہ عیش کی تمہید ہے
راہ پاکستان میں مٹنا ہماری عید ہے

ہم ۲۰۔۲۵ دن پرانے قلعہ میں رہنے کے بعد واپس گھر آ گئے۔کیونکہ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گاڑیوں پر حملے ہو رہے ہیں اور انیس کی اسپیشل گاڑی پر جو حملہ ہوا ہے۔وہ گاڑی تقریباً ختم کر دی گئی اس لئے گاڑیاں کچھ عرصہ کے لئے بالکل بند کر دی گئیں۔واپسی ہوئی مگر کس مصیبت سے کہ پریشان تھے کہ ایک گاڑی لپٹن چائے والوں کی جس میں چائے کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں اس کا ڈرائیور مسلمان تھا۔میں نے اس سے کہا بھئی میرے شوہر بیمار ہو گئے ہیں ہم شہر واپس جانا چاہتے ہیں لیکن دریا گنج میں ہندو سکھ چھپے کھڑے رہتے ہیں اور مسلمان سواری پر اچانک حملہ کر دیتے ہیں۔ہمیں ان سے ڈر ہے۔اس نے مہربانی کی ہم سب کو معہ بچوں کے چائے کی

پیٹیوں کے درمیان چھپا دیا اور گاڑی لے کر تیزی سے دریا گنج سے گزر گیا اور جامع مسجد کے علاقہ میں جا کر اتار دیا۔ یہاں ماحول میں کچھ ٹھہراؤ تھا کیوں کہ مسلمان وہ سب ہندو علاقے جہاں ہندو اکثریت تھی خالی کر کے یہاں جمع ہو گئے تھے لیکن ہمارے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ لہذا پھر وہاں سے لال کنواں جانے کا انتظام ایک تانگہ میں کیا لیکن راستے میں چاوڑی بازار اور نمک کا پھاٹک پڑتا جہاں ہندو چھپ کر مسلمانوں اور مسلمان سواری پر اچانک حملہ کرتے تھے جو انتہائی بھیانک قسم کا ہوتا تھا۔ بمشکل کوئی مسلمان اس طرف سے زندہ واپس آتا تھا۔ ایک تانگہ والے سے ہم نے ڈرتے ڈرتے اس کا ذکر کیا۔ وہ بولا گھبراؤ نہیں میں بھی مسلمان ہوں۔ میرے پاس بھی تیاری ہے۔ ہم خدا کا نام لے کر اس تانگے میں بیٹھ گئے۔ جب نمک کا پھاٹک قریب آیا تانگہ والے نے گھوڑے کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر آہستہ سے کہا بیٹا خطرہ ہے۔ یہ سن کر گھوڑا ایسا سرپٹ دوڑا کہ قاضی کے حوض پر جا کر دم لیا۔ وہ کتنا خوفناک منظر تھا جہاں کے بازار اور گلیاں کبھی چاہتوں اور محبتوں کے گہوارے تھے اب ان کے در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اب وہ بازار اور کوچے ہمارے لئے تنگ ہو گئے تھے۔ وہ وطن جو ہمارے آباؤ اجداد کا مولد و مسکن تھا اب اسی ہی وطن کے لوگ ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے۔ ہر طرف دہشت و بربریت کا عالم طاری تھا۔ ہندو سکھوں کی اکڑی ہوئی گردنیں دیکھ کر خوف و دہشت پیدا ہو گئی لیکن دل کو سکون تھا کہ ہم نے اپنی منزل پالی ہے۔ لے کے رہیں گے پاکستان کا نعرہ پورا ہو چکا تھا۔ اب خدا ہمارا محافظ ہے۔ ابھی ہمیں آئے ہوئے دو ہی دن گزرے تھے کہ پھر فتح پوری کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے عین سجدے کی حالت میں نمازیوں پر ایک پاس کی ہندو عمارت سے بم مارا۔ کتنے ہی مسلمان شہید ہو گئے۔ کچھ لوگ ایک دس بارہ سال کے بچے کی لاش ہاتھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے کہ یہ کس کا بچہ یہ کس کا لخت جگر ہے۔ آج بھی اس کے تصور سے میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بچہ خوب صورت تھا اس کے جسم سے بہنے والے خون نے اس کے سفید لباس کو رنگین کر دیا تھا۔ ماں منتظر ہو گی ابھی آ جائے گا۔

خوف کے مارے مسلمانوں کا برا حال تھا۔ چند دن مشکل سے وہاں رہ کر پھر رختِ سفر باندھ لیا۔ اب کے ہماری پناہ گاہ میں ہمایوں کا مقبرہ تھی۔ کیونکہ وہاں جنگل اسپیشل ٹھہرانے کا حکومت نے انتظام کیا تھا۔ وہاں بھی کربناک مناظر تھے۔ بیمار پریشان لوگ گھبرائے گھبرائے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ کہیں کوئی عورت دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی اور مرد کسی دائی کی تلاش میں آوازیں دیتا پھر رہا تھا۔ کوئی اپنے بچوں کو آوازیں دیتا پھر رہا تھا۔ کوئی اپنے بچوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ غرض یہ کہ ہر کوئی پریشان حال تھا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ آج صبح سویرے ہی ایک گاڑی پاکستان جائے گی۔ جونہی اسپیشل ٹرین آئی لوگ بھاگ دوڑ کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ ہم بھی ٹھس کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ ایک کنبہ اور ہمارے ساتھ تھا۔ اس افراتفری میں جو کھانا بچوں کے لئے ساتھ لیا تھا وہ نیچے دب گیا۔ بچے سہمے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ دو دن رات گاڑی جوں کی چال چلتی رہی۔ ایک بہت ہی چھوٹی سی بچی بیتاب ہو کر بار بار کہتی امی جان لوکھی (روکھی) ہی روٹی دیجئے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ سالن نہیں پکا۔ گاڑی چلی تو سب لوگ اپنے اپنے آبائی شہر کے در و دیوار کو حسرت بھری نظروں سے تک رہے تھے اور ساتھ ہی بخیریت پاکستان پہنچنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ جب گاڑی امرتسر کے اسٹیشن پر پہنچی تو کچھ سکھ غنڈے چلتی گاڑی میں گھس آئے ان کے ساتھ فوجی گورکھے شراب کے نشے میں دھت تھے جو بیک زبان کہتے تھے۔ ہمیں لڑکیاں چاہئیں۔ ایک بڑھیا کا جوان لڑکا برداشت نہ کر سکا اور ان کے ساتھ لڑ پڑا اور لوگ بھی مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اس ہنگامے میں خدا جانے غنڈوں نے کیا چیز اس لڑکے کے سر پر ماری کہ خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ گاڑی رک گئی۔ ہمارے فوجی جو گاڑی کی حفاظت کر رہے تھے۔ فوراً آ گئے ان کے آتے ہی گورکھے بھاگ گئے مگر لڑکا زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ اس نے اپنی جان کی قربانی دے کر ماؤں بہنوں کی لاج رکھ لی اور جامِ شہادت نوش کیا۔ ضعیف العمر ماں ایک طرف کھڑی سینہ کوبی کر رہی تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور زیرِ لب پاکستان زندہ..... کہا اور شہادت کی آخری ہچکی لی۔ ہندو فوجی اس کی لاش اتارنے کی ضد کر رہے

تھے۔ ماں چلائی۔ ارے اپنے ناپاک ہاتھ میرے شہید بیٹے کو نہ لگاؤ۔ خوں خوار بھیڑیو! میرے شیر دل بچے کو مار ڈالا۔ اب اس دکھیا کو بھی مار دو۔ میں ہرگز اس کی لاش اس زمین پر نہ اترنے دوں گی۔ میرے بچے نے حصول پاکستان میں بہت جدوجہد کی ہے۔ ماں تڑپ تڑپ کر بین کر رہی تھی۔ کہ ہمارے کچھ فوجی سرنگوں خاموش کھڑے تھے۔ اس المناک منظر نے ان کو بھی افسردہ کر دیا تھا۔ سب کی آنکھیں پرنم تھیں۔ اتنے میں گاڑی کو حرکت ہوئی۔ سب لوگ عقیدت واحترام کے موتی اپنی پلکوں پر لئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اس خاتون پر کیا بیتی معلوم نہ ہوسکا۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ گاڑی امرتسر سے تھوڑی سی دور پھر رک گئی۔ مارے خوف ودہشت کے برا حال تھا جو دعائیں جس کو یاد تھیں پڑھنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی نے رینگنا شروع کیا تو جان میں جان آئی۔ الغرض شام تک وہ پاک سرزمین آ گئی تھی۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے مہاجرین اپنا سب کچھ قربان کر کے آئے تھے اور جسے قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں حاصل کیا تھا۔ آزاد وطن مقدس سرزمین پر سکون کا سانس لیا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر عجیب قسم کی افراتفری اور کہرام مچا ہوا تھا۔ سوچ رہے تھے کہ اب ہم کہاں جائیں کدھر جائیں۔ آخر پلیٹ فارم نمبر ۵ پر جہاں اور لوگ بیٹھے تھے ہم بھی جگہ تلاش کر کے اپنا مختصر سا سامان لگا کر ٹرنک کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ قریبی ہوٹل سے چائے منگوائی جو شکر کی تھی۔ اس چائے کی خوشبو اور ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ آزاد فضا اور پاکستان کی پہلی چائے کبھی نہیں بھول سکتی۔ اتنے میں دور ضا کار کھانا اور دودھ لے کر آئے اور بچوں کو دینے لگے۔ بچوں نے دونوں ہاتھ کمر کی طرف کر لئے اور سر کی جنبش سے انکار کر دیا حالانکہ بچے بھوکے تھے۔ ایک نلکے پر جا کر بچوں کے خاک آلود چہرے صاف کئے تو ایسا معلوم ہوا کہ آج ان کے چہروں سے غلامی کی خاک اتر کر آزادی کی چمک نمایاں ہوگئی ہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات کو شبنم پڑنے لگی تھی۔ ہم اس سوچ میں تھے کہ اب کیا کریں کہاں جائیں۔ ایک صاحب نے آ کر کہا سب مہاجرین ایم اے او کالج کے ہوسٹل میں مقیم ہوگئے ہیں۔ جگہ کافی ہے۔ آپ لوگ وہاں چلے جائیں اس فرشتہ رحمت نے ہماری

رہنمائی کی اور ہم کالج میں چلے گئے۔ پھر زندگی کس موڑ پر لائی اور زندگی کس طرح گزری یہ الگ قصہ ہے۔ ان حالات اور واقعات کو گزرے طویل مدت ہوگئی لیکن ہمارے ذہنوں پر آج بھی انگریز کی مکاری عیارانہ چال اور بھارت کے ہندو سکھوں کا ظالمانہ برتاؤ اور انسانیت سوز سلوک ایک گہرے گھاؤ کی طرح موجود ہے۔ (۲۷)

لدھیانے سے لاہور تک

حافظ لدھیانوی

میں محکمہ خوراک لدھیانہ میں ملازم تھا جب تقسیم پاک و ہند کا اعلان ہوا۔ قائداعظم کی محنت شاقہ، خلوص، ایثار اور بے لوث خدمت دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت کے قیام کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ علامہ اقبال کا خواب ۱۴ اگست کی شب شرمندہ تعبیر ہوا۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کی انتھک کوششوں، طلبہ کی جدوجہد آزادی اور عامۃ المسلمین کی مشترکہ کاوشوں سے مملکت خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔ قید و بند اور جدوجہد نے انعام کی صورت اختیار کر لی، یہ فتح عظیم تھی۔ یہ کامرانی کا لمحہ تھا جس نے صدیوں کے غبار کا مایوسیوں اور ناکامیوں کے ایک طویل دور کا خاتمہ کیا۔۔۔۔۔ آج ہر مسلمان ایک نئی فضاء میں سانس لے رہا ہے۔ آزادی مل گئی مگر اس آزادی کے لیے، پاکستان کی سرحد تک پہنچنے کے لیے ان مسلمانوں کو بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں جو پاکستان کے متصل بھارتی علاقوں میں تھے۔ آزادی کے اعلان کو ایک دن بھی نہ گزرا تھا کہ مسلمانوں کو ابتلا و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھ اور ہندو جتھے بنا کر مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کرنے لگے۔ وہ معصوم بچیاں جن کو ہندو اور سکھ ہمسایوں نے شادی کے وقت رخصت کیا تھا، انہی کو نشانہ ہوس بنایا جانے لگا، بچے بوڑھے کی تمیز اٹھ گئی، عورتوں کا تقدس پامال ہونے لگا۔ ہر طرف قیامت برپا ہو گئی۔

ہمارا مکان مس براؤن ہسپتال اور سول ہسپتال کے سامنے تھا۔ رات دن زخمی ان ہسپتالوں میں آتے، تلواروں سے زخم کھائے ہوئے، برچھیوں سے بدن دریدہ، بھالوں سے زخم چھلنی، نیزوں سے گھائل، بندوقوں کی زد میں آ کر مجروح ہونے والے بے گناہ موت کے منہ میں آنے والے ان ہسپتالوں میں لائے جاتے برآمدے زخمیوں سے بھر گئے ہسپتال کے دالانوں میں زخمی کراہ رہے تھے۔ ان کے زخم کھلے تھے۔ ان پر پھایا بھی نہ رکھا گیا تھا، زخموں سے خون رس رہا تھا، ڈاکٹر صاحبان، ہسپتال کا عملہ حتی المقدور مصروف خدمت تھا۔ لواحقین حیرت کے مجسمے بنے

اپنے عزیزوں رشتے داروں کی چارپائیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ بے بس نہتے مسلمانوں پر حملے ہوئے۔ وہ بھاگ کر کہاں جاتے، غنڈے ہر جگہ ان کا تعاقب کر رہے تھے شراب کے نشے میں دھت وہ تو مسلمانوں کے شکار کے لیے نکلے تھے۔ دوراہا نہر کا پانی سرخ ہو گیا، دیہات سے لاشیں بہہ بہہ کر آ رہی تھیں... بے گور و کفن لاشیں ...جنہیں جاننے پہچاننے والا کوئی نہ تھا.... انکا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کلمہ گو تھے، مسلمان تھے، بتوں کے پجاری نہ تھے، خدا کو ایک ماننے والے، حضور اکرم ﷺ کے شیدائی تھے، یہ الگ دین رکھتے تھے اس لیے کفران سے برسرپیکار تھا۔ حق و باطل کی جنگ ہمیشہ جاری رہے گی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

گاڑیوں میں نہنگ سنگھ نیزے سنبھالے اور تلواریں لیے مسلمانوں کو تلاش کر رہے تھے۔ گاڑیاں خون سے رنگین ہو گئیں۔ جب لدھیانہ اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو ڈبوں سے لاشیں برآمد ہوتیں۔ کسی کا بازو نہیں تھا کسی کا سر تن سے جدا کر دیا گیا تھا، کسی کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا۔ کسی کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے تھے ....تاریخ عالم میں ایسی سفاکی کی مثال شاید ہی مل سکے۔ انہی دنوں ایک واقعہ سنا۔ دیوندر ستیارتھی مشہور ادیب، افسانہ نگار گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی، ایک نہنگ خون آلود آنکھوں، وحشت درندگی کا لباس پہنے ڈبے میں داخل ہوا۔ چہرے پر نفرت کی سیاہی پھیل رہی تھی....اس نے للکار کر کہا کہ یہاں کوئی مسلا تو نہیں؟ دیوندر ستیارتھی کے دل میں ایک ادیب، محبت والے انسان کا دل تھا۔ اس نے یقین دلایا کہ یہاں کوئی مسلمان نہیں۔ نہنگ نے نیزے سے ٹٹی کا شیشہ توڑا اور، اندر ایک مسلمان دبکا کھڑا تھا... باہر نکل ہم تو مسلمانوں کی بو سونگھ لیتے ہیں وہ بیچارہ اجل رسیدہ لڑکھڑاتا ہوا ٹٹی سے باہر آ گیا۔ پلیٹ فارم پر چل ،کیا گاڑی خراب کرائے گا! نہنگ اسے دھکا دیتا ہوا پلیٹ فارم پر لے گیا اور نیزوں اور بھالوں سے اسے قتل کر دیا...سب دیکھ رہے تھے لیکن کسی میں جرات نہ تھی کہ ظلم و وحشت کے اس کھلے

مظاہرے کو، اس انسانیت سوز فعل کو روک سکے یا مزاحمت کر سکے.... دیوندر سیتارتھی کو بڑا دکھ ہوا۔ اس نے نہنگ سے اتنا کہا کہ تو گاڑی خراب کرنے کو کہہ رہا تھا مسلمان کے خون ناحق سے، اس کے وحشیانہ قتل سے۔ اب کون سا دھرتی کا روپ نکھر گیا ہے؟ یہ بربریت اور درندگی کا دور تھا۔ ہمسائیوں کی جانیں محفوظ نہ تھیں ایک ہی محلے میں بسنے والے، دیوار سے دیوار ملی ہوئی، نسلوں سے اکھٹے رہنے والے خوفزدہ تھے۔ جن سے حفاظت کی توقع تھی، جن ہمسائیوں پر ناز تھا وہی جان کے دشمن، عصمت کے ڈاکو بن گئے وہی مسلمانوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ وہ مسلح جتھوں کو اپنے ہی محلے میں لا کر قتل و غارت کا بازار گرم کراتے تھے ایک گاؤں کا مسلح جتھے دوسرے گاؤں جاتے، ہندوؤں اور سکھوں کو اطلاع کر دی جاتی وہ مسلمانوں کو گھیرے میں لیے رہتے، بچیاں پکارتیں ہمیں جانے دو۔ بوڑھے کہتے تو تو میرا یار تھا، تجھے کیا ہو گیا۔ جوان اپنے ساتھیوں سے کہتے ابھی کل کی بات ہے ہم ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ پلے بڑھے تھے... مگر ان ظالموں پر تو خون سوار تھا۔ منظّم گروہ حملہ کرتا، بچیوں کو اٹھا کر لے جاتا۔ بوڑھے جوان قتل کر دیئے جاتے۔ نیزوں پر معصوم سروں کی نمائش کی جاتی۔ بچیوں کی آوازیں آتیں: بابا یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ بھیا ہمیں ان درندوں سے چھڑاؤ.... مگر جواب کون دیتا وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔

لوگ قصبوں اور دیہات کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کرنے لگے۔ اپنی اپنی بیل گاڑیوں اور چھکڑوں پر رات کی تاریکی میں بچا کھچا سامان لے کر نکلتے مگر منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ان آفت زدوں، حرماں نصیبوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا، سامان لوٹ لیا جاتا۔ ہندو سکھ غنڈے چھپ کر مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیتے۔ فصلوں پر چھپ کر بیٹھ جاتے، جب کوئی قافلہ یا اکا دکا مسلمان جان بچاتا ہوا گزرتا تو اس پر حملہ کر دیتے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی، لاوارث لاشوں پر آنسو بہانے والا انکو ٹھکانے لگانے والا کوئی نہ رہا۔ ہندو سکھ مسلمانوں کی بے بسی پر قہقہے لگا رہے تھے کھلے میدانوں پر گدھ منڈلا رہے تھے لاشوں کے اردگرد گدھ ہی گدھ تھے۔ اس وحشت ناک منظر میں ظلم و سربریت کے ان دنوں میں شرافت اور انسانیت کی بھی چند مثالیں سننے

میں آئیں۔ ایک گاؤں میں سردار بشن سنگھ بہت بڑا زمیندار تھا۔ اسکے برابر میں مسلمان زمیندار کا گھر تھا۔ دونوں کی گہری دوستی تھی ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے، شادی بیاہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ سکھ زمیندار کی بہت بڑی قدیمی حویلی تھی حویلی کیا تھی؟ ایک قلعہ تھا جو اسکے آباؤ اجداد نے تعمیر کیا تھا۔ ہمسائے کی ننھی بچی اسے چچا کہا کرتی تھی۔ بچی کی عمر دس گیارہ برس کی تھی اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے جو سارا دن سکھ زمیندار کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ بشن سنگھ جب کوئی چیز اپنے بچوں کے لیے لاتا تو ان بچوں کے لیے بھی ویسی ہی چیز لاتا... یہ بچے اسے اپنی اولاد کی طرح پیارے تھے۔ شام کو مسلمان زمیندار جب اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا، تھوڑا آرام کر کے، کھانا کھا کے وہ چوپال میں آ بیٹھتا۔ بشن سنگھ بزرگوں کے تعلقات، ان کے خلوص، ان کی محبت اور بھائی چارے کے قصے سناتا اور ان تعلقات پر اسے فخر تھا۔ دونوں زمینداروں کی دوستی، رفاقت اور محبت کے سارے گاؤں میں ضرب المثل تھی.... مسلمان کے گھر میں جب شادی بیاہ کا موقع آتا تو سردار بشن سنگھ اپنے کارندوں کو لے کر پہنچ جاتا، سارے انتظامات خود کرتا، اپنے ہاتھوں سے جھنڈیاں لگاتا۔ ہمسائے کی بیٹی کی شادی ہوئی تو اس میں بھی وہ پیش پیش رہا۔ جب لڑکی سسرال سے آتی تو سب سے پہلے اپنے چچا کو سلام کرنے اور دعائیں لینے جاتی، وہ پیار سے اسکے سر پر ہاتھ رکھتا، جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ ہوتا وہ اپنی منہ بولی بیٹی کو دیتا۔ کئی نسلوں سے محبت کا یہ سلسلہ، بھائی چارے کا یہ انداز چلا آ رہا تھا۔ اب آزمائش کا وقت تھا۔ سردار بشن سنگھ نے جب اس نفرت کے لاوے، وحشت کے سیلاب کو اپنے گاؤں کی طرف آتے دیکھا تو اس نے مسلمان زمیندار کو اپنی حویلی میں منتقل کر لیا۔ اس نے مسلمان بھائی کو یقین دلایا کہ اس کی زندگی میں کوئی ہاتھ، اس کے ناموس سے، اس کی عزت سے نہیں کھیل سکتا۔

پروگرام کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح جتھے نے اس گاؤں کا رخ کیا۔ اسلحے سے لیس قتل و غارت اور لوٹ مار کے ارادے سے وہ گاؤں میں داخل ہوئے۔ پل بھر میں قیامت برپا ہو گئی۔ بستے رستے گھر اجڑ گئے، سامان لوٹ لیا گیا، نوجوان جنھوں نے مزاحمت کی موت کے

گھاٹ اتار دیا گیا۔ بوڑھوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا، ہندو سکھ غنڈے نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ سب سے آخر میں جتھے نے سکھ زمیندار کی حویلی کا رخ کیا اور مسلمان زمیندار کے بارے میں پوچھا۔ بشن سنگھ نے کہا وہ رات کو گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے اپنے دو جوان بیٹوں کو مسلمان زمیندار کے کنبے کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا تھا اور انہیں ہدایت کی تھی کہ ان بچوں تک کسی ظالم کا ہاتھ نہ پہنچے۔ جتھے کے سردار نے کہا: بشن سنگھ! ہمیں معلوم ہے کہ وہ آپ کی حویلی میں ہے آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں، ہم نے کئی روز سے ناکہ بندی کی ہوئی ہے، وہ بھاگ کر نہیں جا سکتا، آپ نے اسے چھپایا ہوا ہے۔ بشن سنگھ نے غصے سے کہا وہ یہاں نہیں ہے۔ غنڈے زبردستی حویلی کے اندر داخل ہو گئے۔ سکھ زمیندار کے لڑکوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ حملہ آوروں نے سوچا کہ زمیندار کی حویلی میں نجانے کتنے مسلح لوگ ہیں، ان کے چند ساتھی ڈھیر ہو گئے، باقی جان بچاتے ہوئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ ہم اس کا بدلہ لینے ضرور آئیں گے۔

اس فائرنگ میں زمیندار کا بڑا لڑکا بھی کام آیا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی۔ وہ ڈیوڑھی سے مدافعت کرتا ہوا مارا گیا۔ بشن سنگھ بیٹے کی لاش پر پہنچا، اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: تو نے خاندانی شرافت کی لاج رکھی لی، تو نے اپنے باپ، دادا کی محبت داستان کو اپنے خون سے لکھا... تو نے میری نصیحت پر عمل کیا... میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ مسلمان زمیندار بھی لاش پر ڈھاڑیں مار مار کر رویا۔ بشن سنگھ جیپ میں مسلمان زمیندار اور اسکے بچوں کو لے کر رات کی تاریکی میں نکل کھڑا ہوا اپنے کارندوں کو رائفلیں دے کر ساتھ کر لیا وہ اور اسکا بیٹا رائفلیں لیے ہوئے آگے آگے تھے۔ بشن سنگھ نے اپنے دوست اور بچوں کو کیمپ میں باحفاظت پہنچا دیا۔ ایسے واقعات دونوں طرف ہوئے، مسلمانوں نے اپنے ہمسائے، اپنے پرانے ساتھیوں، اپنے بچپن کے دوستوں کو ہر طرح کی امداد مہیا کی، ان کی آبرو اور ناموس کی حفاظت کی۔ انکو واہگہ تک پہنچایا... مگر یہ واقعات چند تھے۔ سکھوں اور ہندوؤں نے مشرقی پنجاب کے دیہات میں حشر برپا کر رکھا تھا۔ قتل و غارت لوٹ کھسوٹ جاری تھی۔ فوج شہروں میں متعین

تھی، وہ بھی ناکافی تھی۔ حملہ آور تو سینکڑوں کے جتھے میں آتے تھے فوج کہاں تک حفاظت کرتی۔ بستیاں اجڑ گئیں گھر تباہ ہو گئے، وہ کچھ ہوا جسے احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا، یہ انسانیت کے ماتھے پر ایک ایسا بدنما داغ تھا جس کو سات سمندروں کے پانی بھی نہیں دھو سکتے۔ لدھیانہ نسبتاً محفوظ جگہ تھی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ آبادی تھی۔ اگر کسی مسلمان کا ہندو کے محلے میں مکان تھا تو وہ اس کشیدگی سے پہلے ہی اپنے عزیزوں کے ہاں اٹھ آیا تھا۔ مسلمان آبادی میں کوئی غیر مسلم نہیں تھا اس لیے مسلمانوں میں جرات تھی، حوصلہ تھا، آنے والے برے وقت کی حفاظت کے لیے انکے پاس وافر اسلحہ تھا۔ جن کے پاس اسلحہ تھا ان کو مکانوں کی چھتوں پر جہاں سے حملے کا خطرہ تھا متعین کر دیا تھا۔ نوجوانون نے مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ تمام رات پہرا دیتے۔

اردگرد کے محلے کے لوگ بھی ہمارے محلے میں آ گئے، ہمارا مکان وسیع تھا۔ سارے محلے کے مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں گرمیوں کا موسم تھا دوسرے محلوں سے آنے والے لوگ چھتوں پر، کمروں میں اور گلیوں میں جہاں جگہ ملی اپنے بچوں کے ساتھ ٹھہر گئے۔ گھروں سے بچی ہوئی اشیاء خوردنی اٹھا کر لائے تھے۔ سب کے لیے اکٹھا کھانا پکتا اور تقسیم ہو جاتا۔ جانوروں کو ذبح کر کے گزر بسر کی۔ دوسرے محلوں تک جانا دشوار تھا۔ کرفیو لگا تھا۔ میرا راشنگ آفیسر سکھ تھا۔ اس کو مجھ سے محبت تھی۔ آٹے کی چار بوریاں رکھ کر میرے گھر تک پہنچ گیا، سکھ کو دیکھ کر مسلمانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا، میں نے محلے والوں کو بتایا کہ وہ محبت کی وجہ سے اس کڑے وقت میں مجھ تک راشن پہنچانے آیا ہے۔ میں نے سردار صاحب کو یہ صورت حال بتائی تو وہ جلدی بوریاں چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے کہنے لگا: خدا حافظ! آپ جب تک یہاں ہو ہر قیمت پر آٹا مہیا کرتا رہوں گا۔ کرفیو لگ جانے کے بعد گلیاں سنسان ہو گئیں، سارا چہرہ خوف و ہراس کی لہر میں تھا۔ ہر لحظہ جان کا خطرہ تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ میرا جوانی کا عالم تھا۔ چھپتا چھپاتا اسپتال پہنچ کر زخمیوں کی دیکھ بھال کرتا۔ جو کچھ مجھ سے بن پڑتا انکی امداد کرتا۔ کئی بار گولیوں

کی زد سے بچ نکلا۔ ماسٹر تاج الدین انصاری احرار کے سرکردہ لیڈر تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے سراپا ایثار تھے۔ انکی وجہ سے مسلمانوں کو تھوڑا بہت سہارا تھا۔ حکام کے ساتھ انکے تعلقات تھے۔ ہندو غنڈے انکا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ اس سہارے کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ ماسٹر صاحب گولیوں سے بچتے ہوئے، چھتوں پر پھلانگتے ہوئے میرے گھر تک پہنچ گئے۔ میں نے زبردستی انہیں ایک رات اپنے گھر میں رکھا۔ وہ مجھ سے کہتے رہے: حافظ صاحب مسلمان مر رہے ہیں۔ زخمی ہسپتالوں میں کراہ رہے ہیں، میں کیسے چین سے بیٹھ سکتا ہوں! اگر میری جان مسلمانوں کے کام آجائے تو اس سے بڑھ کر میری خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے۔ میں اس ضعیف العمر شخص کے جذبے اور بلند حوصلے کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے روز وہ مجھے بتائے بغیر گھر سے باہر نکل گئے۔ سامان خورد ونوش ختم ہوگیا۔ بچے ماؤں کی چھاتی سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ مائیں انہیں جھوٹی تسلیاں دے رہی تھیں۔ کہ چند روز کی بات ہے ہم پاکستان پہنچ جائیں گے۔ ایک دو جتھوں نے حملے کیے مگر ہمارے مسلح نوجوانوں نے انھیں پسپا کر دیا۔ حملہ آوروں کے چند آدمی مارے گئے۔ اس کے دیگر جتھوں کو ہمارے محلوں کی طرف آنے کی جرات نہ ہوئی۔

ایک روز اعلان ہوا کہ مسلمان چھاؤنی کیمپ چلے جائیں۔ وہاں سے انہیں ریل کے ذریعے پاکستان بھیجا جائے گا۔ اس اعلان میں امید کی کرن تھی کیمپ میں ہر لحظہ زندگی کو خطرہ تو نہیں ہوگا، فوج کے دستے حفاظت کے لیے معین ہونگے۔ میری بڑی بہن کا دپھگوڑا میں انتقال ہو گیا تھا۔ بہنوئی لدھیانہ میں وفات پا چکے تھے۔ ایک یتیم بھانجی تھی جس کا والدہ نے جہیز تیار کیا تھا کہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ والدہ نے ہی اسے پالا تھا۔ اسکے جہیز کا سامان اکٹھا کر کے والدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری طرف دیکھا، میں نے جہیز کو ساتھ لے جانے کی حامی بھر لی۔ والدہ ماجدہ نے سونے کے زیور ایک برتن میں ڈال کر ٹوکری کے کونے میں دبا دیئے۔ کہا کہ چند روز کی بات ہے حالات سازگار ہو جائیں گے تو آ کر نکال لیں گے۔۔ والد مرحوم نے والدہ کو سمجھایا، یہ چند دنوں کی بات نہیں، واپس آنے کا کوئی امکان نہیں، چنانچہ زمین کھود کر زیور

نکالے، کمرے مقفل کیے، در و دیوار پر حسرت کی نگاہ ڈالی، زندگی بھر کی یادوں کو الوداع کہا... گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔ میں نہ جانے کیوں ایک بار کوٹھے پر چڑھ گیا اردگرد کے مکانوں پر نظر ڈالی جن میں میرا بچپن گزرا تھا۔ میں نے ہمسائے کی بیری کو دیکھا۔ جس کی شاخیں ہماری چھت تک آ گئی تھیں، جس سے میں چھپ چھپ کر سرخ بیر کھایا کرتا تھا، ساتھ والے مکان کو دیکھا جس کے مکین جا چکے تھے۔ اس گھر میں ادبی محفلیں منعقد ہوتی تھیں، شعر و شاعری کا دور تھا۔ یہ ادبی گھر سونا تھا۔ ہم نے ایک ریڑھی کا بندوبست کیا۔ والدہ ماجدہ نے ضروری سامان کی گٹھڑیاں باندھ لیں۔ والدہ محترمہ نے سمجھایا کہ اکیلی جان لے کر چلنا دشوار ہے، سامان کون اٹھائے گا، وبال جان بن جائے گا۔ والدہ بضد تھیں کہ کہیں ٹھکانہ تو کرنا ہوگا۔ چند کپڑے تو ساتھ ہوں۔ ریڑھی پر چند گٹھڑیاں لاد کر چلے۔ جب بازار سے گزرے تو ہندو اور سکھ ہماری حالت پر قہقہے لگانے لگے۔ ان قہقہوں کا جواب ہمارے پاس چند آنسو تھے۔ ہم سر جھکائے کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ میری بھانجی، میری والدہ، میرے والد محترم پیدل پیدل چل رہے تھے۔ والدہ برقع میں تھیں، ضعیفہ تھیں قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی۔ میرے والد انہیں سہارا دیتے۔ میری بھانجی نے انکا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے کہا امی برقع اٹھا کر چلیں۔ یہ مصیبت کا وقت ہے۔ مگر انہوں نے کہا: بیٹا! ساری عمر چہرہ ننگا نہیں کیا، کیا میں غیر مسلموں کو چہرہ دکھاؤں؟ میں خاموش ہو گیا، حیا و پاکیزگی کی تصویر کو میں دھندلانا نہیں چاہتا تھا۔

ریڑھی کھینچتے کھینچتے میری ہتھیلیوں پر رٹن پڑ گئے تھے۔ زندگی بھر مشقت کا کام نہیں کیا تھا، سینے میں درد ہونے لگا شہر سے مختلف گوشوں سے کارواں کیمپ کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ بیبیاں جن کی کسی نے ایک جھلک بھی نہ دیکھی تھی، برہنہ سر ان قافلوں میں شامل تھیں۔ مرد سروں پر گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے ساتھ چل رہے تھے میری بیوی چھ ماہ کے بچے کو ساتھ چمٹائے چل رہی تھی، دمے کی مریضہ تھی، سانس اکھڑا ہوا تھا۔ قدم قدم پر رک کر چلتی تھی۔ میں کبھی اپنی والدہ کو کبھی بیوی کو مڑ کر دیکھتا۔ گرتے پڑتے کیمپ تک پہنچ گئے۔ کیمپ میں شور و بکا آوازیں آ رہی تھیں۔ بچے

بلک بلک کے رو رہے تھے، وہ باعصمت باحیا عورتیں شرافت ونجابت میں بے مثال تھیں۔آج اپنے دوپٹوں سے منہ چھپائے دھوپ میں بیٹھی تھیں۔مرد خورد ونوش کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔میرا بچہ ڈبے کا دودھ پیتا تھا جو ختم ہو چکا تھا۔میں بچے کو دیکھ کر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اے رازق کائنات ہم تو ایک دو روز کا فاقہ برداشت کر سکتے ہیں،اس معصوم بچے پر رحم فرما۔میرا ایک ہم جماعت پرت پال سنگھ تھا جو فوج میں بھرتی ہو گیا تھا، کپتان کے عہدے پر تھا۔وہ مجھ سے ملنے آیا۔میں نے بلکتا ہوا بچہ اس کے آگے کر دیا۔وہ مجھ سے لپٹ گیا تھوڑی ہی دیر بعد وہ دودھ کے دو تین ڈبے لے آیا۔مجھے تسلی دی کہ جس چیز کی ضرورت ہو، مجھے کہہ دیا کرو، مہیا کر دیا کرونگا۔ہم کھلے میدان میں تھے شدت کی گرمی تھی کوئی سایہ نہ تھا۔درختوں کی ٹہنیاں کاٹ کر چادریں تان لی تھیں مگر وہ گرمی کی شدت کو کیسے روک سکتی تھیں۔

والدہ صاحبہ کے آنسو نہ تھمتے تھے، بھانجی یاس کے تصویر بنی بیٹھی تھی۔میں تسلی دیتا رہا کہ چند روز کی بات ہے، ہم پاکستان کے جھنڈے تلے آرام کریں گے جو ہمارے خوابوں کا محور ہے اور ہماری امنگوں کی نشانی ہے۔والد مرحوم کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا۔انکی دعائیں ہمارے لیے سہارا تھیں۔وہ سارا دن کلام پاک کی تلاوت کرتے کیمپ کے تقریبا سارے لوگ والد مرحوم کے پاس دعا کے لیے حاضر ہوتے اور وہ خشوع وخضوع کے ساتھ پاکستان پہنچ جانے کی دعا کرتے۔انتظار یہ تھا کہ گاڑی کب آئے اور ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں۔میرے اسکول کے پرنسپل جے بی لیڈرا اپنے شاگردوں کو تلاش کرتے کرتے مجھ تک پہنچ گئے، میں انکا چہیتا شاگرد تھا۔انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں مجھ پر بہت مہربانیاں کیں تھیں۔انکے چہرے سے محبت واضطراب کی صورت میں نظر آتی تھی۔وہ اپنی معنوی اولاد کے غم میں انکو سہارا دینے، ان کی فوری حاجات پورا کرنے کے لیے یہاں تک پہنچے تھے۔اس زمانے میں استاد اور شاگرد کا رشتہ کتنا مقدس ہوتا تھا۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ میں ابھی مہیا کر دونگا۔میں خاموش رہا، میرا ایک ہم جماعت بول پڑا سر! اسے سگریٹ کی طلب ہے۔میں نے ہر چند انہیں

یقین دلایا کہ یہ بات نہیں، اس نے یونہی کہہ دیا۔مجھے شرم آئی کہ پرنسپل صاحب کہیں گے کہ میرا شاگرد سگریٹ پیتا ہے۔وہ خود سگریٹ نہ پیتے تھے، مگر انہوں نے سگریٹ کی جو ڈبیاں ملیں مجھے لا کر دیں۔میرا سر شرم سے جھک گیا۔خجالت کی وجہ سے میرے منہ سے شکریے کے الفاظ بھی نہ نکلے، وہ سگریٹ دے کر چلے گئے۔لوگ اپنا اپنا سامان ریلوے لائن کی طرف ڈھیر کر رہے تھے کہ جب گاڑی آئے تو ڈبے میں رکھا جائے یوں سامان کے انبار لگ گئے اور گاڑی پر چڑھنے کے لیے جگہ نہ رہی۔ہر آدمی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔اپنا وطن اپنا شہر اس کے لیے زنداں بن گیا تھا۔وہ گلیاں، وہ بازار جن میں بچپن اور جوانی کے ایام گزرے تھے۔اس میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔اب اس منزل مقصود کی طرف نگاہیں لگی تھیں۔جن کے لیے عزت مال وجان کی قربانیاں دی تھیں۔کیمپ میں چند روز قیام کیا۔ایک روز کسی نے کیمپ میں دستی بم پھینکا تو بھگدڑ مچ گئی۔لوگ پہلے ہی خوفزدہ تھے۔انکے خوف وہراس میں اضافہ ہو گیا۔یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ غنڈے فوجیوں سے مل کر کیمپ پر حملہ نہ کر دیں۔

اللہ اللہ کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں، بلوچ رجمنٹ پہنچ گئی جسے ہمارے ساتھ لاہور تک جانا تھا۔رجمنٹ کے نوجوانوں کو دیکھ کر حوصلے بلند ہوئے۔گاڑی آ گئی نفسانفسی کا عالم تھا، ہر شخص جان بچانے کی فکر میں تھا۔لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے کر گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔میں نے بروقت سامان اٹھا کر گاڑی میں پھینکا اور والدہ صاحبہ کو گھسیٹتا ہوا گاڑی کے ڈبے تک پہنچ گیا۔بیوی اور بھانجی کو سوار کرایا۔گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ کہاں تھی۔لوگ گھٹریوں کی طرح بیٹھے تھے، پہلو بدلنا مشکل تھا۔والد ماجد مسجد میں تھے، انکو لینے جاتا تو خواتین کی دیکھ بھال کون کرتا۔چار و ناچار میں بھی سوار ہو گیا۔بلوچ رجمنٹ کے فوجی گاڑی کے اوپر مشین گنیں لگا کر بیٹھ گئے، کچھ گاڑی کے باہر حفاظت کر رہے تھے، مجھے والد محترم کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اس ضعیف العمری میں گاڑی میں کیسے سوار ہونگے۔کس طرح منزل مقصود تک پہنچیں گے۔گاڑی میں چڑھنے کی کشمکش میں میرے پاؤں سے جوتا نکل گیا۔کپڑے پہنے ہوئے کئی روز ہو گئے تھے، دھکم پیل میں

وہ بھی ایک دوجگہ سے پھٹ گئے، جسم گردوغبار سے اٹا ہوا تھا۔ آنکھیں مسلسل بیداری سے بوجھل ہورہی تھیں.... یہ زندگی کی سب سے کڑی آزمائش تھی۔ لوگ ہجوم کو چیرتے ہوئے گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گاڑی کے اوپر پناہ گزین اپنے اپنے سامان سے لپٹے ہوئے تھے۔ پائدانوں پر لوگ کھڑے تھے۔ گاڑی چلتی تو اشک بار آنکھوں سے اپنے وطن کو دیکھا، یادوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ شہر کا ایک ایک کوچہ ایک ایک گلی نظروں میں پھر گئی۔ کالج میں گزرے واقعات ،ساتھیوں کے ساتھ گزرے اوقات ،سکون وآرام سے بسر کیے ہوئے لمحات.... ہنگامے محبتیں ،رفاقتیں.... تعلیمی دور کی برکات ،جدو جہد زندگی کا آغاز ،بزرگوں کی صحبتیں ،مشاعرے ،ادبی نشستیں، شبینے ،دینی ماحول.....ان گنت یادیں افق ذہن پر نمودار ہوئیں، جوں جوں شہر دور ہوتا جا رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ خدا جانے ان گلیوں، ان کوچوں ،ان احباب، ان عزیزوں کو پھر کب دیکھنا نصیب ہو.... یہ آزادی کے لیے، آزاد مملکت کے لیے، دین کے لیے، اسلام کے لیے بہت بڑی قربانی تھی۔ اشکوں سے چہرہ بھیگ گیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن رئیس احرار اور مفتی محمد نعیم بھی اسی کارواں میں شریک تھے.... جن کو کانگرس کے زعما پر ناز تھا کہ وہ اس نازک مرحلے میں انکی نگہداشت کریں گے، جنہوں نے کانگرس کے لیڈروں کے ساتھ جدو جہد آزادی میں حصہ لیا تھا اور جوان کے ہم نوا رہے تھے اب وہ بھی کسمپرسی کے عالم میں جان کے خوف سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں بھی پاکستان کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ جو متحدہ ہندوستان کے حامی تھے وہ بھی اس نوزائیدہ مملکت میں سر چھپانے کے لیے آئے۔ سارے سہارے جھوٹے تھے۔ ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، نظریات باطل ہو گئے، ذہنی خاکے دھندلا گئے.... ایک ہی حقیقت تھی کہ مسلم لیگ کی جدو جہد نے ،نوجوانوں کی جدو جہد سے ایک مملکت معرض وجود میں آئی۔ یہ مسلم لیگ کے نظریات کی فتح تھی۔

گاڑی کے رکتے ہی خوف وہراس کے سائے منڈلانے لگتے۔ بلوچی رائفلیں اور اسٹین گنیں سنبھال کر آنے والے کسی حادثے کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد تھے۔ اسٹیشن گزرتے گئے ایک

ہی جگہ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں سکڑ گئیں۔ چھ ماہ کا بچہ بھوکا تھا۔ دودھ ختم ہو چکا تھا۔ پانی کا قطرہ قطرہ اس کے منہ میں ٹپکا رہے تھے تاکہ معصوم بچے کی جان بچ جائے۔ گرمی کی شدت تھی۔ پانی بھی ختم ہو گیا۔ لدھیانہ تا لاہور کا سفر چند گھنٹوں کی بات تھی۔ دو دن میں طے ہوا۔ جگہ جگہ گاڑی روک لی جاتی۔ بے وجہ گھنٹوں ٹھہرایا جاتا۔ یہ بھی مسلمانوں کو اذیت دینے کا ایک انداز تھا۔ یہ بھی آزمائش کی گھڑیاں تھیں۔ آخر پاکستان کی حدود دکھائی دینے لگیں، مایوس چہرے گلاب کی طرح کھل اٹھے ہمارے آنسوؤں کی دعائیں قبول ہوئیں...اب ہم ایک آزاد مملکت ،آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔ ہمیں ارض پاکستان کی خوشبو آرہی تھی یہ بہاروں کی سرزمین تھی۔ تصوراتی پیکر کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے.....ہم پاکستان پہنچ چکے تھے۔ ہم نے منزل مراد پالی تھی۔ ہم ارض پاک پر سر بسجود ہو گئے بارگاہ رب العزت کے سامنے اپنی پیشانیوں کو جھکا دیا۔ یہ زمین ہماری ساری قربانیوں، ساری کلفتوں، ساری پریشانیوں سے زیادہ پیاری تھی۔ اس کے لیے ہی تو ساری کشمکش تھی۔ طویل جدجہد کی تھی۔ نجس و ناپاک لوگوں نے حتی المقدور پاکستان کے وجود کی مخالفت کی مگر عزم صمیم رکھنے والے باطل کی طاغوتی قوتوں سے ٹکرانے والے مسلمانوں کے عظیم رہنما قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی فراست سے یہ عظیم مملکت ہمیں حاصل کر کے دی۔ پاکستان آتے ہی ایک سو اشعار پر مشتمل ایک نظم لکھی تھی جسکی گردش دوراں سے لے کر مطلع صبح تک کے احساسات کی ترجمانی کی تھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

چمک رہا ہے جہاں میں وہ میرے فن کی طرح
نہیں ہے کوئی وطن میرے وطن کی طرح
روش روش پر مری چاہتوں کے پھول کھلے
کھلا ہوا ہے گلستاں میرے سخن کے طرح
وہی ہی روپ وہی تازگی وہی نکہت
تمام بزم چمن ہے ترے بدن کی طرح
میرے وطن کی ہر ایک شے عزیز ہے مجھ کو
یہاں کی مٹی بھی ہے تیرے پیر ہن کی طرح
ہر اک درد وطن کو گلے لگا یا ہے
بہت عزیز ہے غم زلف پر شکن کی طرح
مرا وطن ہے میر ے سوزوساز کی دنیا
مرے وطن کی بہاریں سدا رہیں آباد
ہر اک پھول شگفتہ ہے انجمن کی طرح

ہم اپنے وطن کی سرزمین میں داخل ہو چکے تھے، لاہور اسٹیشن پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے اترے۔ والدہ صاحبہ کو سہارا دے کر آہستہ سے اس مقدس سرزمین پر چلایا۔ دو روز کے پیاسے تھے، ہم ایک دروازے سے گذرنے لگے، ایک فوجی نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا دوسرے دروازے سے گزرو۔ والدہ صاحبہ کی چیخ نکل گئی، ہمشیرہ صاحبہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نیرنگئی زمانہ کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور دوسرے دروازے کی طرف سے چل پڑے۔ ہم شکستہ حال، تھکے ماندے، بھوکے پیاسے لاہور کی سرزمین پر اترے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ ہمشیرہ کے پاس پانچ روپے تھے۔ یہی دولت تھی جو ہم ساتھ لائے تھے۔ اسٹیشن سے باہر لان میں اس قافلے کو ٹھہرایا گیا، اسٹیشن پر

اترتے ہی بچے نے گردن ڈھلکا دی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بیوی نے بچے کو سینے سے چمٹا لیا، پانی کے قطرے بچے کے منہ مین ٹپکائے۔ دودھ لیا، چمچہ چمچہ اسکو پلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ والدہ کی زبان پر شکر کے کلمات جاری ہو گئے۔ مہاجرین کے لیے لاہور کیمپ کھل چکا تھا۔ اجڑے ہوئے خاندان ان کیمپوں میں آ گئے۔ لدھیانہ میں ایک لاکھ افراد کا قافلہ روانہ ہوا۔ اسکی حفاظت کے لیے ہندو سپاہی تھے۔ اس قافلے میں ہمارے شہر کے معززین بھی تھے۔ بیل گاڑیوں پر سامان رکھا تھا، اکثر لوگ پیدل چل رہے تھے۔ انہوں نے سیدھا راستہ اختیار نہ کیا کیونکہ ہر جگہ خطرہ تھا۔ ہندو اور سکھ سپاہیوں کے انداز سے پتا چلاتا تھا کہ وہ کسی بڑی سازش میں شریک ہیں۔ لیاقت علی خاں مرحوم کو اس سازش کا علم ہو گیا۔ انہوں نے پنڈت نہرو کو پیغام بھیجا کہ لدھیانہ کے گردونواح سے ایک لاکھ مہاجرین کا قافلہ آ رہا ہے، ایک بڑی سازش کا انکشاف ہوا ہے۔ آپ فوراً ہندو اور سکھ سپاہی ہٹا کر مسلمان فوجی متعین کر دیں جو قافلے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سرحد تک آئیں اگر ایسا نہ ہوا تو پاکستان سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے سلامت بھارت نہ پہنچ سکیں گے۔ پنڈت نہرو اہمیت خطرات کو بھانپ گئے۔ انکو ہندوؤں کی جانیں بہت عزیز تھیں۔ انہوں نے پیغام ملتے ہی ہندو اور سکھ فوجیوں کو واپس بلا لیا اور مسلمان فوجی متعین کر دیئے۔ اس طرح ایک لاکھ مہاجرین کا قافلہ صحیح سلامت واہگہ پہنچ گیا۔ ایک دفعہ سید عطا اللہ بخاری تقریر فرما رہے تھے۔ اللہ تعالی نے انہیں استدلال کا انوکھا انداز عطا فرمایا تھا بات ہندوؤں کی ہو رہی تھی۔ شاہ جی ہندوؤں کی ذہنیت کے بارے میں فرما رہے کہ جب انکو تکلیف پہنچتی ہے تو مسلمانوں کے ہمدرد بن جاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ بچہ جب گود میں ہوتا ہے تو ڈاڑھی کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے۔ میرے بچے نے بھی ڈاڑھی کو زور سے پکڑا۔ اگر میں جھٹکا دے کر ڈاڑھی چھڑواتا تو بالوں کے ٹوٹنے کا خطرہ تھا میں نے ترکیب سوچی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سر کے بال کھینچنے لگا۔ جیسے جیسے میں بال کھینچتا جا رہا تھا اس گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی۔ بالکل اسی طرح ہندوؤں کا معاملہ ہے جتنی زور سے آپ اسکی بودی کھینچیں

گے وہ آپکی ڈاڑھی چھوڑتا جائے گا ورنہ وہ آپکی ڈاڑھی کا ایک ایک بال کردے گا..... بات ساری قوت کی ہے۔ یہ بات تو ضمناً آ گئی۔ ہم اسٹیشن پر بیٹھے سوچ رہے تھے کہ کہاں ٹھکانہ کیا جائے۔ ہمارے ایک عزیز مصری شاہ میں رہتے تھے۔ وہ ریلوے میں ملازم تھے۔ لاہور کے ایک سال کے قیام میں زیادہ تر وقت انہی کے ہاں گزرا۔ ہمیں اس کسمپرسی میں یہی جائے پناہ نظر آئی... کیمپ میں رہنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ وہاں کا انتظام ناقص تھا۔ وہ متوسط گھرانہ تھا مگر خلوص و مروت کی دولت سے مالا مال تھا انکی محبت اور شفقت نے ہمارے زخموں پر پہلا پھایا رکھا۔ انہوں نے ہمیں ایک کمرہ رہنے کے لیے دیا۔ ہم نے زمین پر بستر لگا لیے سامان رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ بھانجی کا جہیز اور تن کے کپڑے تھے۔ ایک دو بستر بند تھے جس میں جہیز کے کپڑے لپیٹ دیئے گئے تھے۔ میں نے دوست کے گھر کے نچلے حصے میں یہ سامان رکھ دیا۔ خیال تھا کہ جب مستقل ٹھکانہ مل جائے گا وہاں منتقل کرلیں گے۔ مجھے والد محترم کی فکر دامن گیر تھی۔ وہ ضعیف العمر تھے۔ سوجھتا نہ تھا کیا کروں۔ آنسو دعا بن کر نکلے .... سارا گھرانکے لیے دعائیں کرتا تھا۔ اللہ تعالی اپنے بندوں کا خود ہی محافظ ہوتا ہے۔ وہ اندھیرے میں روشنی اور مشکلات میں آسانیاں پیدا کر دیتا ہے کئی روز کرب اور پریشانی میں گذرے ...ایک ہفتے بعد والد صاحب بخیریت لاہور پہنچ گئے۔ چہرے پر وہی سکون کا نور، وہی قلب مطمئن، زبان پر کلام پاک کی تلاوت .... اللہ تعالی کے برگزیدہ بندے رضا کے مقام پر ہوتے ہیں، خوشی ہو یا غم، رنج ہو یا پریشانی، بیماری ہو یا صحت وہ اس عطائے الہی کا تصور کرتے ہیں اور اسکی رضا میں خوش رہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن پاک نے ان کے بارے میں کہا کہ اللہ کے دوستوں کو، اولیا اللہ کو خوف ہوتا ہے نہ حزن۔

گھر سے نکلتے ہوئے تین چار چیزیں اٹھالیں تھیں۔ ایک بی اے کی ڈگری اور محکمہ خوراک میں ملازمت کے کاغذات، ایک کالج کے زمانے میں یادگار تصویر، دوستوں کے خطوط۔۔۔۔۔ والد محترم نے فرمایا کہ کچھ پہننے کا سامان لے لو، میں نے ادب سے عرض کیا اللہ مالک ہے جس نے یہاں تن ڈھکنے کو دیا ہے وہاں بھی ہر طرح پردہ پوشی کرے گا۔ روزی کا کوئی نہ

کوئی وسیلہ پیدا کر دے گا۔ لاہور کی سرزمین پر قدم رکھا تو پاؤں ننگے، شیو بڑھی ہوئی پتلون پھٹی ہوئی تھی۔ ایک ادبی پرچہ ''شاہکار'' میں میری غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ اس ہیئت کزائی کے ساتھ ''شاہکار'' کے دفتر پہنچا، اس ادبی مجلّے کے مدیر آصف تھے۔ دوسرا کپڑوں کا جوڑا نہ تھا کہ تبدیل کر لیتا... دفتر میں داخل ہوا آصف صاحب نے مجھے دیکھا، پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ میں انقلاب زمانہ کی تحریر پڑھ رہا تھا۔ وہ ادبی تحریر لکھ رہے تھے، یہ بے حرف تحریریں مہاجرین ہی پڑھ سکتے تھے کہ انہوں نے اپنے آنسوؤں سے، خون سے یہ تحریر لکھی تھی۔ آصف صاحب نے دوبارہ نظر اٹھائی، میرے لبوں پر بے بسی کی مسکراہٹ پھیل گئی... مجھے پہچان لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے، ادھورے ادھورے فقرے بول سکے... یہ کیا ہو گیا یہ کیا حالت بن گئی، پاکستان کب آئے گھر والے صحیح سلامت آ گئے بچے بھی ساتھ ہی ہیں؟ انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی فقرے کہہ ڈالے۔ میں نے ان سوالات کے جوابات میں اتنا کہا: جو بیت چکی وہ بیت چکی ...اب ہر طرح خیریت ہے۔ اب کوئی غم کوئی پریشانی نہیں۔ ہمیں اپنا مقصود مل گیا۔ ہم منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ میں انکے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک پرانی لکھی ہوئی غزل انکی طرف بڑھادی۔ میں نے کہا ہو سکے تو کچھ پیسے دیجئے۔ انہوں نے دس کا نوٹ میری طرف بڑھایا پھر کہا میرے لائق کوئی خدمت؟ میں اس مصیبت میں آپکی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ میں مزید گفتگو کیے بغیر سلام کیے واپس آ گیا۔ شیو کا سامان خریدا حلیہ ٹھیک کیا، ایک دوست سے کپڑوں کا جوڑا عاریتاً مانگا... بھارت کی ناپاک گرد کو جھاڑ کر جو صعوبتوں اور کلفتوں کا نشان تھی۔ مولانا لطیف انور گورداسپوری میرے بزرگ تھے۔ وہ ان دنوں ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے۔ خبروں کا پنجابی ترجمہ کرنا انکا کام تھا۔ جب یہ قیامت بپا ہوئی تو علامہ کو میرے بارے میں بے حد پریشانی ہوئی۔ انہوں نے ریڈیو میں بارہا اعلان کروایا کہ حافظ لدھیانوی کا جس کو علم ہو وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے۔ اخبارات میں خبر شائع کرائی گئی کہ حافظ لدھیانوی اگر یہ خبر پڑھیں تو فوراً مجھ سے ملیں۔ یہ دور پریشانی کا تھا، اخبار کی خبریں کون دیکھتا، ریڈیو کے اعلان کو کون سنتا! ایک دوست مجھ سے ملے اور علامہ کی پریشانی کا ذکر کیا، انکی

پریشانی اور انکے خلوص نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔ میں ریڈیو اسٹیشن پہنچا....میری طرف دیکھا اشکوں کی برسات لگ گئی، مجھ سے لپٹ گئے ''حافظ تم آ گئے الحمدللہ کب آئے؟ خیریت سے آئے کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟ وہ روتے ہوئے یہ جملے کہتے جا رہے تھے۔ میں ان سوالوں کا کیا جواب دیتا! جب حواس درست ہوئے تو میں نے ساری سرگزشت سنائی۔ علامہ کی حالت میری سرگزشت کی علامت بن گئی، کرب انکے چہرے سے عیاں تھا۔ انہوں نے چائے منگوائی پھر فرمایا کہ آج رات سکون کی نیند سو سکوں گا، مجھے میرا دوست مل گیا۔ سچی دوستی کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے، بہت ہی کم ایسے احباب ہوتے ہیں، جن پر پریشانی کے وقت بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ جو دوستی کے مختلف مراحل میں ساتھ دیتے ہیں، ایسے ہی مخلص بے لوث دوستوں میں چودھری محمد اسلم بھی تھے۔ انکے بھائی لدھیانہ میں بجلی کے محکمے میں ایس ڈی او تھے۔ ہمارے محلے میں رہتے تھے اسلم اپنے بھائی کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہم دونوں کا روز و شب کا ساتھ تھا۔ اسلم نے دسویں تک تعلیم لدھیانہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ وہ دلاور چیمہ کا رہنے والا تھا تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے اپنے آباؤ اجداد کی زمینوں کی دیکھ بھال کی اور جا کے چٹھہ میں چاولوں کا وسیع پیمانے پر کاروبار کیا۔ اس کاروبار میں اسکا ایک ہندو شریک تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر مکمل اعتماد تھا۔ لاکھوں کا کاروبار تھا۔ تقسیم پاک و ہند میں اسکا شریک کاروبار بھارت چلا گیا۔ لاہور سے اپنے دوست سے ملنے دلاور چیمہ گیا چوہدری محمد اسلم نے میری دکھ بھری کہانی سنی، آبدیدہ ہو گیا، وہ اتنا پریشان اور مضطرب ہوا کہ صرف تسلی کے لیے اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے میں تو ایک روز اس کے پاس گزار کر واپس لاہور آ گیا۔ حکومت نے اسلم کو کسٹوڈین مقرر کر دیا جس نے اپنے ملازم کے ہاتھ مجھے رقعہ بھیجا جس کا ایک ایک حرف اسکی محبت کا آئینہ دار تھا اس نے مجھے دلاور چیمہ میں سکونت اختیار کرنے کی پیش کش کی تھی، اور لکھا تھا کہ یہاں آپ ہر طرح سکون و اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں گے اس نے کاروبار میں شرکت کی پیش کش کی، ہندو حصہ دار کے وسیع و عریض الاٹمنٹ کی بات کی، دکانوں میں حصہ دینے کی بات کی یہ بہت بڑی پیش کش تھی۔

میں نے رقعہ پڑھ کر والد محترم کے ہاتھ میں دے دیا انہوں نے ایک ایک لفظ غور سے پڑھا خاموش ہو گئے میں انکے حکم کا منتظر تھا میں نے مودبانہ دریافت کیا کہ میرے لیے کیا حکم ہے، میں جواب میں کیا لکھوں فرمایا: ''سراج! میں جانتا ہوں اسلم تمھارا بے لوث دوست ہے میں اسکی محبت اور خلوص کو بارہا دیکھ چکا ہوں بیٹا! دوستی بے غرض ہونی چاہیے اس پر کوئی غرض کا دھبہ نہیں لگنا چاہئے۔ اگرچہ مہاجر ہونے کی حیثیت سے ہمارا حق ہے مگر تمھاری دوستی میں کاروبار حائل نہیں ہونا چاہیے، اللہ رازق ہے، آج نہیں تو کل حالات سدھر جائیں گے''۔ ابا جی یہ کہہ کر خاموش ہو گئے میری آنکھوں سے چشمے ابل پڑے، اس کسمپرسی اس ضعیف العمری میں والد محترم کو عزت نفس کا کتنا پاس ہے۔ میں نے اشک آلود چہرے سے انکی طرف دیکھا اور انکے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا پھر میں نے چودھری صاحب کو شکریہ کا خط لکھا تب مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا شدت سے احساس ہوا۔ میرے ذخیرہ علم میں وہ الفاظ نہیں تھے کہ میں اپنے مخلص دوست کا شکریہ ادا کر سکتا۔ میں گھر سے روزگار کی تلاش میں نکلا جب مصری شاہ کے پل سے گزرا تو پیچھے ایک شور سنائی دیا۔ معلوم ہوتا تھا حشر برپا ہو گیا.... یہ ناگہاں آفت کہاں سے آ گئی؟ پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیلاب کا پانی طوفانی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح کئی فٹ بلند ہو گئی.... پانی دکانوں میں داخل ہو گیا، لوگوں کا سامان پانی میں بہہ گیا اتنی مہلت کہاں تھی کہ سامان سمیٹ کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جاتا۔ نشیبی علاقوں کے مکانوں میں پانی بھر گیا۔ بارش تھی کہ مسلسل ہو رہی تھی، پانی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا....سڑک کے درمیان پانی زور سے گزر رہا تھا۔ میں دیواروں کو تھام تھام کر گرتا پڑتا رہائش گاہ تک پہنچا۔ وہاں چاروں طرف پانی دریا کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ بھانجی کا جہیز جو دوست کے مکان کے نچلے حصے میں رکھا تھا۔ وہ پانی میں تیر رہا تھا...کون اسے بچاتا! دو روز کے بعد پانی کی سطح کم ہونا شروع ہوئی....آخری ریلا گزر گیا تو لوگ واپس اپنے گھروں میں آنے لگے۔

جب ہم لاہور پہنچے تو ہندوؤں کے سارے علاقے خالی تھے، دروازے کھلے تھے اور گھر سامان سے بھرے تھے، بھارت روانہ ہوتے وقت ہندو صرف قیمتی اشیاء لے جا سکے، لوگ خالی

گھروں سے چیزیں اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔مہاجر خالی گھروں پر قبضہ کر رہے تھے۔ہم بھی ایک خالی مکان میں داخل ہوئے یہ گھر رام گلی میں تھا۔گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی چھوٹے چھوٹے کھلونے صحن میں بکھرے ہوئے تھے۔کمرے میں زیورات کے خالی ڈبے تھے۔گھر میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی ایک آسودہ گھرانے کو ضروت ہوتی ہے....ڈنر سیٹ ،صوفہ سیٹ، کرسیاں، ،قالین ،برتن،ٹرنک کپڑے....چیزوں کی نفاست سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھر کسی نفیس الطبع شخص کا تھا،اسکی ملکہ حسیں ذوق کی مالک تھی۔گیراج میں ایک کار بھی تھی۔ہم نے وہاں رات بسر کی ،میری بھانجی نے فرش دھویا ،کھلونوں کو اٹھاتے ہوئے اسکی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ہمارے پاس کیا تھا جو اس گھر میں لاتے جو کچھ مشقت سے اٹھا کر لائے تھے وہ سیلاب کی نظر ہو گیا تھا دوسرے روز مجسٹریٹ صاحب مکان کے سامان کی فہرست تیار کرنے آئے میرے واقف تھے میری خیریت پوچھی اور کہا: حافظ صاحب! آپ اس مکان میں اطمینان سے قیام کریں ،فہرست بعد میں بنا دیں گے۔پھر کار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہ کار آپکے کس کام کی آپ تو درویش آدمی ہیں۔میں اشارہ سمجھ گیا۔میں کمزور طبیعت کا مالک تھا، کچھ تقسیم کے ہنگامے نے کمر توڑ دی، مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر پولیس آ گئی یا کسی دوسرے مجسٹریٹ نے فہرست نہ تیار کرنے کی وجہ پوچھی تو کیا جواب دونگا۔یہ میرا وہم تھا ورنہ لوگ تو دو دو چار چار کوٹھیوں پر قبضہ کر کے سامان ہضم کر گئے تھے۔میں تمام رات جاگتا رہا کہیں پرسش نہ ہو،دوسرے دن خالی ہاتھ واپس مصری شاہ چلے گئے ،یہ لوٹ مار کا دھندہ ہمارے بس کی بات نہ تھی۔مقامی افراد اور مہاجرین میں سے اکثر نے لوٹ مار کی۔ہندوؤں کے مال واسباب کو مال غنیمت جانا۔بے دھڑک گھروں میں گھس گئے اور سارے سامان کا صفایا کر دیا۔وہی چیزیں بازار میں لا کر اونے پونے داموں فروخت کر دیں اور پیسے کھرے کر لیے، جن کے پاس پیسہ تھا انہوں نے کوڑیوں کے مول سامان خریدا اور گھر بھر لیے۔جگہ جگہ مہاجر کیمپ تھے۔جن کی حالت ناگفتہ تھی یہ کیمپ برائی کے مراکز بن گئے۔گناہوں سے توبہ کرنے والے، خدا سے خطاؤں کی معافی مانگنے والے، جو مہاجرین قافلوں کے ساتھ آئے

تھے، جنھوں نے خدا سے، اس کے احکام پر چلنے اور صالح زندگی گزارنے کے عہد کیے تھے، وہی ہر قسم کی برائی کے مرتکب ہوئے۔مہاجر اپنے اپنے کلیم کے فکر میں تھے، محکمہ بحالیات کے چکر کاٹ رہے تھے۔دن بھر دفتر کے سامنے کھڑے رہتے، بارسوخ آدمی۔شاتر اور چالاک لوگ کامیاب تھے۔انہوں نے جس طرح بھی ہو سکا فارم داخل کرا کے کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا۔اسی دوران آتش زدگی کی وارداتیں ہوئیں، شاہ عالمی کا بازار جل کر راکھ ہو گیا بازار کے درمیان ایک مسجد تھی۔دونوں طرف کے مکان جل کر راکھ ہو گئے مگر اس مسجد کو آنچ تک نہ آئی ....اللہ تعالی اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔لوٹ مچی ہوئی تھی۔جس کی ہندوستان میں گز بھر زمین بھی اپنی ملکیت نہ تھی وہ وسیع وعریض کوٹھیوں کے مالک بن گئے، مکانوں کی طرح دکانیں بھی سامان سے بھری ہوئی تھیں انکی الاٹ منٹ کے لیے لوگ بھاگ دوڑ کرنے لگے اگر کسی کو موقع کی دکان مل گئی اس کے وارے نیارے ہو گئے ہزاروں روپے مالیت کے سامان کا پل بھر میں مالک بن گیا۔سیٹھ بن بیٹھا، اکڑ کر چلنے لگا، ایسے میں معززین نظر سے گزرے جن کا لاکھوں روپے کا کاروبار تھا، باوقار زندگی گزار رہے تھے۔انکو یہاں آ کر دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے میسر آتی تھی۔ہمارے شہر میں ایک خاندان تھا جس کا ملٹری سپلائی کا کاروبار تھا۔مگر لاہور آنے کے بعد میں نے انھیں کچہری میں عرضیاں ٹائپ کر کے پیٹ کا جہنم بھرتے دیکھا ہے۔مفتی ضیاءالحسن صاحب مفتی محمد نعیم کے بڑے صاحبزادے تھے۔ایک دن اچانک ان سے ملاقات ہوگئی انہوں نے سارے حالات سنے، افسوس کیا کہ ہمیں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ملی۔انکے ایک دوست رضوی صاحب ''ملاپ'' اخبار کی بلڈنگ میں رہتے تھے....''ملاپ'' کا دفتر انارکلی کی نکڑ پر تھا ایک بڑا احاطہ تھا، اس اردگرد کمرے تھے۔مہاجرین نے ایک ایک دو دو کمروں پر قبضہ کر لیا تھا۔سامنے چادریں تان کر صحن بنا لیا تھا۔رضوی صاحب اوپر کی منزل میں قیام پذیر تھے۔مفتی ضیاءالحسن نے ان سے بات کر کے ہمیں دو کمرے رہائش کے لیے دلوا دیئے۔ایک بڑے کمرے میں ہندوؤں کا سامان بھرا تھا جسے رضوی صاحب نے تالا لگا رکھا تھا وہ رات کی تاریکی میں کمرے کا تالا کھول کر سامان خورد برد

کرتے ،خدا جانے وہ یہ سامان رات کو کہاں پہنچا دیتے ، یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ میں یہ سب منظر دیکھ رہا تھا....قول وفعل کے اس تضاد نے میری آنکھیں کھول دیں۔ انکی گفتگو انکے کردار کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ چند روز رضوی صاحب اوپر کی منزل میں رہے، جب کمرہ خالی ہوگیا تو وہ بھی کسی عالیشان بنگلے میں منتقل ہوگئے ...انہوں نے اپنے ایثار، اپنی قربانی کی قیمت قبول کرلی۔ میں ملازمت کے لیے تگ ودو کرنے لگا، ایک دوست کی وساطت سے مجھے منٹ یعنی ایک ٹکسال میں مجھے عارضی ملازمت مل گئی.... مجھے اس کمرے کا چارج دیا گیا جو چاندی کی اینٹوں سے بھرا ہوا تھا ہمارا کام چاندی کی اینٹوں کو ٹکسال تک پہنچانا تھا اور بس...سارا دن اور کوئی کام نہ تھا، ہم دس پیسے کی چائے کا سیٹ چاندی کے ڈھیر پر رکھ کر پیتے ....دو تین ماہ یہ نوکری رہی۔ ایک دن اس نوکری سے بھی جواب مل گیا، پھر بیکاری کا دور شروع ہو گیا۔ محکمہ خوراک کے کاغذات میرے پاس تھے۔ تقسیم ہند کے وقت میں محکمہ خوراک میں انسپکٹر تھا۔ ایک روز کاغذات کے لیے محکمہ خوراک کے سیکٹری سے ملاقات کے لیے گیا انہوں نے مجھ سے کاغذات لیے اور دوسرے روز مجھے ملازمت دے دی۔ میں انکوئری آفیسر مقرر ہوگیا، تنخواہ ایک سو پچیس روپے ماہانہ تھی۔ بیس ڈپو کی چیکنگ میرے ذمے تھی۔ یہ دور تھا جب چینی نایاب تھی۔ ڈپو کے مالکان نے جعلی کارڈ تیار کر رکھے تھے اور ان کارڈوں پر حاصل کردہ چینی بلیک کر کے دولت اکھٹی کر رہے تھے۔ انکوائری آفیسر کا ماہانہ ''وظیفہ'' مقرر تھا۔ تین چار سو روپے ہر ڈپو پر مقرر تھے۔ اس طرح انکوائری آفیسر کی ہزاروں کی آمدنی تھی۔ ڈپوؤں کے علاوہ دکانوں سے بھی آمدنی ہوتی تھی ۔لیکن گھریلو تربیت نے یہاں بھی مجھے حرام کمائی سے باز رکھا۔ سستا زمانہ تھا تنخواہ شریفانہ طریقے سے گزارنے کے لیے کافی تھی ۔مکان الاٹ نہ ہوا تھا مگر ''ملاپ'' کے دفتر میں دو کمروں میں رہائش رکھے ہوئے تھے اور ذہنی آسودگی میسر تھی۔(۲۸)

اور بھوانی مسلمان سے خالی ہوگیا

عبدالمجید قریشی

میرا سابق وطن بھوانی ضلع حصار (مشرقی پنجاب) میں چالیس پچاس ہزار کی آبادی کا بارونق شہر تھا۔ مسلمان اس آبادی کا صرف چوتھائی حصہ تھے سکھ یہاں برائے نام تھے۔ یہ لوگ موٹر ڈرائیوری کا پیشہ کرتے تھے۔ اور دیر تک بے اثر رہے لیکن بعد ازاں مقامی سول اسپتال میں ایک سکھ اسسٹنٹ سرجن کی آمد نے ان کو منظم کر دیا تھا اور انہوں نے یہاں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کر ڈالا تھا۔ مسلمان زیادہ تر پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ تھے لیکن جسمانی لحاظ سے چاق و چوبند، مضبوط اور دلیر تھے۔ مسلم لیگ کی مقامی شاخ بالکل کمزور تھی۔ اس شہر میں جہاں کانگریس کے جلوسوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو جیسی اہم اور بلند پایہ شخصیتیں تقریر کر چکی تھیں، وہاں مسلم لیگ کے کسی تیسرے درجے کے آدمی کو بھی یہاں آنا نصیب نہ ہوا تھا۔ بھوانی شہر کی بیشتر آبادی ہندوؤں کی تھی جن میں بنئے مہاجنوں کی تعداد زیادہ تھی۔ تجارت اور کاروبار کی باگ ڈور تمام تر انہی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی۔ بنیے طبعاً بزدل تھے شہر میں ذرا سا شور وغل ہوتے ہی یہ لوگ اپنی دکانیں بند کر کے بھاگ اٹھتے۔ ہندوؤں کی سب سے فعال جماعت راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ تھی جس کا اولین مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کی نسل کشی تھا۔ یہ جماعت ہندوستان میں ہسپانیہ کی تاریخ دہرانا چاہتی تھی۔ مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ اس جماعت کے رضا کاروں کو ہسپانیہ کی تاریخ کے اس دور کا خاص طور پر مطالعہ کرایا جاتا تھا جس میں عیسائیوں نے مسلمانوں پر انسانیت سوز، وحشت ناک اور بہیمانہ مظالم ڈھانے کے بعد ان کے بچے بچے کو اس سرزمین سے نکال باہر کیا تھا جہاں مسلمانوں نے کم وبیش سات آٹھ سو برس نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی تھی۔ راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ نے اپنے اس مقصد کی خاطر ایک لمبی مدت صرف کی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بنیوں کے نوجوان لڑکے جو اپنے سے کم عمر مسلمان لڑکوں کے سامنے خم کھاتے تھے، طاقت کے نشے میں سرشار نظر آنے لگے۔ اس جماعت کے رضا کار گجر دم

ایک دوسرے کو جگاتے پھرتے، پھر ایک جگہ جمع ہو کر ورزش کرتے، لاٹھیاں اور بلم چلانا سیکھتے اور چاقوؤں اور چھروں سے حملہ کرنے کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ فسادات سے کوئی ایک ماہ پیشتر راشٹریہ سیوک سنگھ کے ان رضا کاروں نے مسلمانوں کے قتل و غارت کے عملی مظاہرے کے لیے ایک ریلوے ٹرین منتخب کی۔ وہ بھوانی ریلوے اسٹیشن سے کوئی دو اسٹیشن پرے اس گاڑی پر سوار ہوئے۔ گاڑی کا رخ بھوانی ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔ یہ رضا کار ایک درجن کے قریب تھے اور انھوں نے اس موقع پر صرف ایک ڈبے کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا، چنانچہ سات مسلمان جن میں تین بھوانی شہر کے باشندے تھے، اس حادثے میں کام آئے۔ ایک مسلمان نوجوان جو بھوانی کا رہنے والا تھا، گاڑی سے کود پڑا۔ خوش قسمتی سے جہاں وہ گرا وہاں ریت کے ٹیلے تھے اور اسے کوئی چوٹ نہ لگی۔ اس طرح یہ نوجوان بھاگ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ شہر پہنچ کر اس نے مسلمانوں کو اپنے بدقسمت ساتھیوں کے انجام کی خبر سنائی۔ سات مسلمان مسافروں کی لاشیں پہنچتے ہی شہر میں فوراً کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ پولیس کی حفاظت اور بہت تھوڑے مسلمانوں کی معیت میں جلد از جلد ان شہداء کی تدفین عمل میں لائی گئی۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں زبردست اشتعال پیدا ہوا، لیکن مسلمانوں نے صوبے کی مکدر فضا کے پیش نظر اور مسلمان تھانیدار کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہندوؤں کی اس زیادتی پر صبر کیا اور حالات کا خندہ پیشانی سے ملاقات کرنے کی ٹھان لی۔ اس واقعے کو بمشکل ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دوپہر شہر میں اس قدر زبردست دھماکا ہوا کہ اس کی بازگشت پورے شہر میں سنی گئی۔ دراصل شہر کے وسط میں ایک مکان میں راشٹریہ سیوک سنگھ کے کچھ نوجوان رضا کار بم سازی میں مصروف تھے کہ ایک بم پھٹ گیا۔ جس سے ایک رضا کار بری طرح جھلس گیا اور اس کا ایک ہاتھ جسم سے الگ اور ایک آنکھ بیکار ہو گئی۔ کرفیو ختم ہوئے ابھی دو دن ہوئے تھے کی اب پھر کرفیو نافذ کرنے کی نوبت آ گئی۔ بم پھٹنے کے دس پندرہ دن بعد تک شہر میں بظاہر سکون و اطمینان رہا لیکن اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ فریقین ایک دوسرے کے محلوں میں جانے سے حتی الوسع گریز کرتے تھے۔

۱۵ اگست کو یوم آزادی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ مسلمان بھی جلسے اور جلوس میں شامل ہوئے باوجود یکہ اس موقع پر پاکستان کے قیام کو برا بھلا کہا گیا اور قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی اکابر کی شان میں گستاخی کی گئی۔ مسلمان حالات کے پیش نظر پرامن ہی رہے۔ انہوں نے اپنے گھروں کو کانگریس کے ترنگے جھنڈوں سے سجایا اور رات کو چراغاں بھی کیا لیکن ہندوؤں کو امن کی یہ پرکیف فضا گوارا نہ تھی۔ ہزار برسوں کی غلامی سے دبا ہوا ہندو راج آزادی کے پہلے ہی دن مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ پندرہ اگست ہی کو ایک ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا جس کی آڑ لے کر ہندو بخوبی فساد کی ابتدا کر سکتے تھے۔ ہوا یوں کہ یوم آزادی کی صبح تھانہ شہر کے تھانیدار ظہور احمد خاں تھانے پر کانگرس کا جھنڈا نصب کر رہے تھے کہ یہ جھنڈا ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ یہ ایک اتفاقیہ واقعہ تھا، لیکن ہندو اس پر بڑے مشتعل اور برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے برملا الزام لگایا کہ مسلمان تھانیدار نے دیدہ دانستہ ہمارے قومی پرچم کی توہین کی ہے اور ہم اس توہین کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس ہجوم میں کچھ سنجیدہ اور بردبار قسم کے ہندو بزرگ موجود تھے جنہوں نے تھانیدار کی اس یقین دہانی پر کہ یہ ایک اتفاقیہ واقعہ تھا، معاملہ رفع دفع کرا دیا ورنہ ہجوم کے لیے بے قابو ہونے میں کوئی دیر نہ تھی۔ ۲۹ء اگست کو جمعے کا دن تھا۔ مسلمان نہانے دھونے اور جمعے کی نماز ادا کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ گیارہ بجے کے قریب شہر میں فساد شروع ہونے کی اطلاع موصول ہوئی۔ فساد کی ابتدا حسب معمول ہندوؤں کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے علاقے میں بڑی بزدلی سے ایک مسلمان نوجوان کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ یہ نوجوان اپنے پیٹ کو پکڑے ہوئے گرتا پڑتا ہی قریبی مسلمان محلے تک پہنچ گیا اور وہیں دو چار منٹ بعد دم توڑ گیا۔ اس کے بعد نہتے مسلمان راہ گیروں اور ہندو آبادی میں گھرے مسلم گھرانوں پر پے در پے قاتلانہ حملے ہونے لگے۔

فسادات سے پہلے اپنے آپ کو منظم کرنے کے لیے مسلمانوں نے کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا تھا۔ ان کے پاس انسانی قوت تو تھی لیکن اسلحے کی مقدار بالکل ناکافی تھی۔ انہیں بدلے ہوئے

حالات کی رفتار کا صحیح اندازہ ہی نہ تھا۔ فسادات شروع ہونے سے دو روز پیشتر چار پانچ مسلمان ایک قریبی مسلمان ریاست سے اسلحہ خریدنے گئے لیکن جب یہ لوگ واپس آ رہے تھے ان کی بس کا انجن خراب ہو گیا۔ اس طرح یہ بدنصیب لوگ ہندوؤں کے نرغے میں پھنس گئے اور ان کے لا ئے ہوئے اسلحے پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا۔ ان سب مسلمانوں کو ایک مکان میں قید کر دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اگلے روز ان سب کو تہہ تیغ کر دیا جائے لیکن ان بے چاروں کی زندگی ابھی باقی تھی۔ اس گاؤں کی ایک بڑھیا جس کے پاس اس مکان کی چابی تھی، رات کو اس کا جزبہ رحم جاگ اٹھا۔ اس نے تالا کھول کر ان سب کو رہا کر دیا اور یہ لوگ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے اور بعد ازخرابی بسیار بھوانی پہنچے۔ جس روز فساد شروع ہوا، مسلمانوں کے پاس تمام شہر میں محض پانچ چھ بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ ان میں دو بندوقیں ایسے کم حوصلہ اور بزدل آدمیوں کے قبضے میں تھیں جنہوں نے انہیں خود استعمال کیا نہ دوسروں کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ دو رائفلوں کی نالیاں پھٹ گئیں۔ اب صرف دو رائفلیں ایسی باقی رہیں جو میدان کار میں آخر وقت تک کام آئیں۔ گو ہتھیاروں کی یہ تعداد بہت ہی قلیل تھی لیکن مسلمانوں نے مورچے لگانے کے لیے ایسے عمدہ مقامات کا انتخاب کیا کہ شام تک مسلسل گولیوں کا تبادلہ ہونے کے باوجود ایک مورچے پر صرف ایک مسلمان شہید ہوا جبکہ دشمن کے خاصے آدمی کھیت رہے اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے "جیالے" مار کھا کر گھروں میں جا گھسے۔ اگلے روز ہندو اس وقت گھروں سے برآمد ہوئے جب ان کی امداد کے لیے بھارتی فوج کا ایک پورا دستہ پہنچ گیا۔ ان فوجیوں نے آتے ہی رائفلوں اور اسٹین گنوں کے منہ کھول دیے۔ جدید ترین آتشیں اسلحے کے سامنے مسلمانوں کی پرانی رائفلیں، لاٹھیاں، نیزے، بلم اور اسی قبیل کے دوسرے دقیانوسی ہتھیار بے کار ہو کر رہ گئے۔ نہتے مسلمان بھارتی فوجیوں کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ سینکڑوں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے صرف ایک دن میں اس خونیں ہنگامے کی بھینٹ چڑھ گئے۔

فسادات سے دو تین روز پہلے تھانیدار ظہور احمد خاں کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ ان کی جگہ ایک

سفید ریش سکھ تھانیدار تعینات ہوئے، ان کی عمر اس وقت پچاس برس ہو گی۔ وہ نہایت نیک طینت اور بے تعصب آدمی تھے۔ انہوں نے بھوانی کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کی اتنے خلوص کے ساتھ خدمت کی کہ شاید کوئی مسلمان بھی نہ کر سکتا تھا۔ جب تک ان کا انتظام برقرار رہا، انہوں نے اپنے ماتحت پولیس اہل کاروں کو جانبداری پر مائل ہونے سے باز رکھا، تاہم جب باہر سے بھاری تعداد میں فوجی جوان آ گئے تو وہ مجبور ہو گئے۔ جب پولیس کے مسلمان عملے سے ہتھیار واپس لے گئے تو ماتحت ہندو سب انسپکٹر اور دوسرے ہندو اہلکاروں نے یہ سازشیں کی کہ ان تمام مسلمان ملازموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ تھانیدار صاحب کو خبر ملی تو انہوں نے بڑی سختی سے اس منصوبے کی مخالفت کی اور ان تمام لوگوں کو ان کے کنبوں کے ہمراہ بہ حفاظت مسلم کیمپ میں پہنچوا دیا۔ مسلم کیمپ کے لیے راشن کی فراہمی کا انتظام بھی انہی سکھ تھانیدار کے سپرد تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً مسلم کیمپ کا چکر لگاتے رہتے اور پوچھ پوچھ کر مسلمانوں کی ضروریات پوری کرتے۔ مسلمانوں کو شروع شروع میں پانی کی قلت کے باعث بڑی تکلیف اٹھانا پڑی کیمپ مرزا نذیر بیگ صاحب کے باغ میں قائم کیا گیا تھا۔ مسلمان تین چار دن باغ کی "ڈگی" کا گندہ پانی پیتے رہے، بعد میں تھانیدار صاحب نے اجازت دے دی کہ مسلمان کیمپ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر لگے نل سے پانی لے لیا کریں۔ ادھر تھانیدار صاحب کی یہ کرم فرمائیاں تھیں اور ادھر بھوانی کے ریذیڈنٹ مجسٹریٹ مسٹر جین چاہتے تھے کہ ان ستم رسیدہ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں لیکن اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔ مسٹر جین کا تقرر اس عہدے پر کوئی تین چار ماہ پیشتر ہوا تھا۔ وہ ایک نہایت متعصب اور فتنہ پرور افسر تھے اور فسادات کو منظم کرنے میں ان کے مشوروں کا خاصا دخل تھا۔ ان سے پہلے کنور سریندر سنگھ بیدی، جو مشہور شاعر ڈپٹی کمشنر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے چھوٹے بھائی تھے، یہاں ریذیڈنٹ مجسٹریٹ تھے۔ اگر کنور صاحب اس زمانے میں وہاں مجسٹریٹ ہوتے تو بھوانی شہر کے امن میں اس درجہ خلل پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کنور سریندر سنگھ بیدی کے مسلمانوں کے ساتھ بہت مخلصانہ تعلقات تھے اور سیر و شکار وغیرہ کے لیے وہ ان ہی کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے۔

جب مسلم کیمپ قائم ہوگیا تو مسٹر جین معاینے کے لیے آئے۔اس روز ان کے تکبر کی انتہا نہ تھی۔ وہ فوج کے جوانوں کے ساتھ بڑے اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔مرزا نذیر بیگ اور دوسرے معزز مسلمان جب ان کے استقبال کے لیے آئے تو وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے: مرزا صاحب! کہاں ہے آپ کا خدا اور کہاں ہے اس کی مدد؟ (نعوذ باللہ) دیکھا آپ لوگوں نے اپنا پاکستان؟ مرزا صاحب نے فرمایا: ڈپٹی صاحب! خدا سے ڈریئے اور ایسا نہ کہیئے۔خدا موجود ہے اور موجود رہے گا۔یہ کچھ ہو ہمارے اعمال کی سزا ہے اور ہم اس پر نادم ہیں۔ایک متکبرانہ مسکراہٹ جین صاحب کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی، وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن خاموش رہے، پھر کیمپ کا حال دریافت کرنے لگے۔کچھ دیر گھومے پھرے اور چل دیئے۔اللہ کی شان دیکھئے کہ اس واقعے کو ابھی دو ہی دن گزرے تھے کہ مسٹر جین ایک حادثے کی نذر ہو گئے۔وہ اپنی کار میں حصار جا رہے تھے کہ مخالف سمت سے آنے والے ایک تیز رفتار فوجی ٹرک سے تصادم ہوگیا۔حادثہ اس قدر شدید تھا کہ ان کی کار چکنا چور ہوگئی اور مسٹر جین موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔ہمارا مکان جس گلی میں تھا اس میں سارے مکانات ہندوؤں کے تھے۔ہمارے گھر کی پشت پر مسلمانوں کا محلّہ تھا جس سے ہندو بہت خائف تھے۔فسادات سے چند روز پہلے ہماری گلی کے ہندوؤں نے ایک نام نہاد امن کمیٹی بنائی اور مسلمانوں کو بھی اس میں شامل ہونے کی دعوت دی، چنانچہ مسلمان بھی اس امن کمیٹی میں شامل ہو گئے اور فریقین میں یہ طے پایا کہ شہر میں چاہے کہیں فساد ہو ہم اپنے محلوں میں فساد نہیں ہونے دیں گے۔ہم اس معاہدے پر آخر وقت تک کاربند رہے۔اگر ہم اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے پر تل جاتے تو محلے کے سارے کے سارے ہندو کھیت رہتے کیونکہ وہ سب کے سب بنتے تھے اور ان کے پاس اسلحے کا نام ونشان تک نہ تھا مگر ہمارا یہ اقدام اسلامی تعلیمات اور مردانگی کی روح کے منافی ہوتا لہٰذا ہم نے معاہدے کا احترام کیا اور ایک موقع پر کچھ ہندوؤں کی حفاظت بھی کی۔ہمارے محلے دار لال گوکل چند آریہ پرانے کانگرسی تھے جو امن کی اس مہم میں پیش پیش تھے لیکن سب جانتے تھے کہ وہ موقع پرست اور منافق آدمی ہیں۔فساد کے پہلے دن جب مسلمان ابھی

محلے میں موجود تھے، باہر کے کچھ شوریدہ سر مسلمان نوجوان ہماری گلی میں گھس آئے اور لالہ گوکل چند کے مکان پر جا کر للکارے۔لالہ جی، ان کی بیوی اور بیٹیاں مکان کے چھجے پر ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئیں۔والد صاحب کو معلوم ہوا تو وہ بھاگ کر وہاں پہنچے اور بڑی مشکل سے ان کی جان بچائی۔ فساد کے دوسرے دن جب ہمارے محلے کے مسلمان بھی بھارتی فوج کے حملوں سے گھبرا کر بھاگنے لگے تو کچھ گھرانے ایسے بھی تھے جنہوں نے خوف کے مارے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر لیے اور بزعم خود اپنے آپ کو محفوظ خیال کیے بیٹھے رہے۔جب لالہ گوکل چند کو معلوم ہوا کہ محلے کے اکثر مسلمان بھاگ چکے تھے اور محلے میں اکا دکا گھروں میں کچھ مسلمان ابھی تک موجود ہیں تو انہوں نے ہندو نوجوان بلوا لیے اور ان مسلمانوں کو ختم کر دینے کا پروگرام بنایا۔ان ظالموں نے مکانوں کے دروازے توڑ توڑ کر ان مسلمانوں کو ہلاک کر ڈالا۔کچھ مسلمان عورتیں اور بچے کمروں کے اندر چھپے ہوئے تھے جن کے مضبوط دروازے ٹوٹ نہ سکے تو چھتوں میں سوراخ کر دیے گئے اور مٹی کے تیل میں بھیگے روئی اور کپڑے کے گولے آگ لگا کر کمروں کے اندر پھینکے گئے۔کمروں کے دروازے باہر سے بند کر دیے گئے تاکہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔اس طرح وہ بدنصیب مسلمان آگ اور دھوئیں میں گھٹ گھٹ کر مر گئے۔میرے ایک دوست نے بعد میں خط کے ذریعے مجھے مطلع کیا کہ ہمارے مکان کو لوٹنے میں بھی لالہ گوکل چند پیش پیش تھے۔فسادات کے دوران پنڈت نیکی رام شرما کی پوزیشن بھی نہایت افسوس ناک اور قابل اعتراض تھی۔پنڈت جی صوبائی کانگرس کی مجلس عاملہ کے رکن اور مقامی کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ان کی متعصّبانہ ذہنیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک موقع پر جب کیمپ میں مسلمانوں نے تھانیدار صاحب سے درخواست کی کہ ان کے لیے تھوڑے سے نمک کا انتظام کر دیا جائے تو پنڈت نیکی رام شرما اس وقت وہیں موجود تھے۔انہوں نے مسلمانوں کے منہ پر تھانیدار سے کہا: سردار صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ ان نمک حراموں کے لیے نمک کا انتظام فرماتے ہیں۔میرا بس چلے تو میں ان کو گولیوں سے اڑا دوں۔انہی دنوں بھوانی سے پندرہ سولہ میل دور مسلمان راجپوتوں کے مشہور قصبے کلانور ضلع

روہتک میں مسلمان اور ہندو راجپوتوں کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد پورے علاقے میں امن و امان قائم رکھنا اور حالات کو ہر قیمت پر دگرگوں ہونے سے بچانا تھا۔ امن و آشتی کی ایسی کوششیں پنڈت نیکی رام شرما جیسے شر پسند لوگوں کو کہاں برداشت تھیں، چنانچہ اس نے اس موقع پر ایک شرمناک سازش کی۔ ان کی یہ سازش اگر کامیاب ہو جاتی تو ضلع روہتک میں زبردست فسادات شروع ہو جاتے کلانور کانفرنس میں مسلمان اور ہندو راجپوتوں کے علاوہ کسی اور کو شرکت کی اجازت نہ تھی مگر پنڈت نیکی رام شرما نے اپنے بھتیجے دویا پرشاد کو، جو ایک گریجویٹ نوجوان تھا، کلانور بھیجا تاکہ وہ اس کانفرنس کی سرگرمیوں کا پوری طرح جائزہ لیتا رہے اور اگر اسے کامیاب ہوتا دیکھے تو وہاں سے فوراً لوٹ کر کلانور بھوانی کے درمیان ہندو دیہات میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرے جس سے یہ کانفرنس ناکام ہو کے رہ جائے۔

یہ کانفرنس جیسا کہ توقع تھی، نہایت کامیاب رہی۔ اسے کامیاب ہوتے دیکھ کر دویا پرشاد کلانور سے چل پڑا۔ راستے میں یہ شخص جس ہندو آبادی سے بھی گزرا، وہاں اس نے مسلمانوں کے خلاف نہایت اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کیا اور ہندوؤں کو بھڑکایا کہ کلانور کانفرنس میں جو ہندو اور راجپوت نمائندے شریک ہوئے تھے وہ تمام کے تمام وہاں مار ڈالے گئے ہیں۔ اس خبر سے ہندو راجپوتوں کا مشتعل ہونا ایک لازمی امر تھا، چنانچہ وہ لوگ کلانور پر چڑھائی کرنے اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے لیکن اس اثنا میں ایک بوڑھے ہندو راجپوت کو خیال آیا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ایک راجپوت سے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، اتنی بڑی بدعہدی کی امید نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سب کچھ اس برہمن زادے کی شرارت اور دھوکا ہی ہو۔ اس نے بپھرے ہوئے ہندو نوجوانوں کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، مجھے کلانور جانے دو۔ اگر میں وہاں مارا بھی گیا تو مجھے مسلمان راجپوتوں کی اس حرکت پر کوئی رنج و افسوس نہ ہوگا، البتہ میری اور دوسرے راجپوتوں کی موت کا انتقام لینا تم لوگوں پر فرض ہوگا اور اگر میں زندہ سلامت لوٹ آیا تو تھوڑی دیر میں تمام صحیح حالات تم لوگوں کے سامنے ہوں گے۔ یہ کہہ کر بوڑھا راجپوت گھوڑے پر

سوار ہوا اور کلانور پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا کہ کلانور کانفرنس کا اجلاس جاری ہے اور ہندو راجپوتوں کا قتل تو کیا کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ یہ بوڑھا راجپوت اطمینان سے واپس آیا اور اس طرح اس زبردست فساد کا خطرہ ٹل گیا۔ اب ہندو راجپوتوں نے ودیا پرشاد کو تلاش کرنا شروع کر دیا تاکہ اس شر پسند کو ایسی سخت سزا دی جائے جو دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ لیکن وہ بدبخت خرمن امن میں آگ لگا کر بھوانی پہنچ گیا تھا۔

۱۹۴۷ء کے ان فسادات میں ہندو راجپوتوں کی من حیث القوم تعریف کرنی پڑے گی۔ ان لوگوں نے فسادات میں بہت ہی کم حصہ لیا اور ہندوستان میں ان کی ریاستوں میں بھی فسادات برپا نہیں ہوئے۔ بڑودہ، بیکانیر، جے پور، جودھ پور، اودے پور اور جیسلمیر جیسی راجپوت ریاستوں کے مسلمان اب تک وہیں آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں، البتہ جاٹوں کو خواہ وہ ہندو تھے یا سکھ خدا جانے مسلمانوں سے کیا پرخاش تھی کہ انہوں نے ان کو تباہ برباد کر ڈالنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ انہوں نے اور ان کی ریاستوں یعنی پٹیالیہ، نابھہ، جیند، کپورتھلہ، فرید کوٹ، الور اور بھرت پور نے مسلمانوں پر وہ مظالم ڈھائے کہ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ بھوانی شہر میں ہندو راجپوت آباد تھے۔ ان کی حالت خاصی مستحکم تھی اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے۔ وہ اگر چاہتے تو شاید ہمارے شہر میں فسادات برپا کر سکتے تھے لیکن آزادی سے چند ماہ پہلے کچھ سرپھرے مسلمان نوجوانوں نے برسر بازار ایک ہندو راجپوت وکیل چرنجیت سنگھ کو پیٹ ڈالا تھا۔ چرن جیت سنگھ بھوانی میونسپل کمیٹی کا پریذیڈینٹ بھی رہ چکا تھا۔ سیرت النبی ﷺ کے جلسوں میں اکثر تقریر کرتا اور رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ ﷺ کہتا۔ بہرحال یہ واقعہ افسوس ناک تھا، اس کے بعد فریقین میں بظاہر صلح صفائی ہو گئی تھی لیکن ہندو راجپوتوں کے دلوں میں کدورت باقی رہی اور اس کا اظہار انہوں نے ان فسادات میں کیا۔ وہ فسادات میں صرف پہلے دن شریک ہوئے اس کے باوجود انہوں نے اپنے محلوں میں کسی نہتے اور اکیلے دکیلے مسلمان پر کوئی وار نہیں کیا اور اس طرح راجپوتی شان برقرار رکھی، تاہم ان کے بوڑھے اور سنجیدہ

افراد راجپوتوں کی فسادات میں شمولیت پر افسوس اور ندامت کا اظہار کرتے رہے۔

۱۹۴۷ء کے یہ فسادات قیامت صغریٰ سے کم نہ تھے۔ان فسادات میں ایسے ایسے واقعات دیکھنے میں آئے کہ لوگوں نے اپنی زندگی بچانے کے لیے اپنے بیوی بچوں تک کی کوئی پرواہ نہ کی۔ بعض آدمیوں نے اپنے ماں باپ کو یوں بے یارومددگار چھوڑ دیا جیسے ان سے کبھی تعلق ہی نہ تھا۔ ماں کی مامتا کا کیا ٹھکانہ لیکن اس زمانے میں ایسی مائیں بھی دیکھی گئیں جنہوں نے اپنے دودھ پیتے جگر پاروں کو راہ کا کانٹا سمجھ کر پھینک دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ایسے جگر خراش مناظر بھی دیکھنے میں آئے کہ ایک انسان دم توڑ رہا تھا اور اس کے نہایت قریبی عزیز اسے اس حالت میں تنہا چھوڑ کر چل دیئے۔بھوانی میں میرے واقف ایک صاحب تھے جو اچھے تعلیم یافتہ اور دین دار آدمی تھے۔ان کی ایک لڑکی سات آٹھ برس کی تھی۔لڑکی مجذوب قسم کی تھی اور اس نے بڑی خاموش طبیعت پائی تھی۔کسی سے بولنا نہ چالنا،کسی نے کھانے کو دے دیا تو کھالیا ورنہ خاموش بیٹھی رہتی۔ فساد کے خوف سے جب یہ صاحب گھر سے رخصت ہونے لگے تو اپنے تمام بچوں کو ساتھ لے لیا لیکن اس مجذوبہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ان کی والدہ نے کہا بھی کہ اسے بھی ساتھ لے لو مگر وہ نہ مانے۔ اس سنگدلی پر والدہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔انہوں نے بڑی شفقت سے اس لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بیٹی! تجھے اللہ کے حوالے کیا کہہ کر وہاں سے چل پڑے۔خدا ہی جانتا ہے کہ اس غریب لڑکی کا کیا حشر ہوا۔فسادات کی ان شب ہائے تیرہ وتار میں بھی اللہ کے کچھ نیک بندوں نے انسانیت کے ایسے چراغ روشن کیے جن کی روشنی سے راستے جگمگا اٹھے۔شجاع الدین خاں بھوانی میں چونے کا کاروبار کرتے تھے۔پیسے والے آدمی تھے بلکہ یوں سمجھئے کہ تیس چالیس ہزار کی اسامی تھے۔ان کے والد اسی پچاسی برس کی عمر کے بزرگ تھے،قریبی مسجد میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا ان کا مشغلہ تھا۔فساد کے دوسرے دن جب ان کا محلّہ غیر محفوظ نظر آنے لگا تو شجاع الدین خاں بھی بھاگنے کی فکر کرنے لگے۔انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ مسلم کیمپ قائم ہو چکا ہے،اس لیے وہ یہ سوچ رہے تھے کہ بھاگ کر مسلمان آبادی والے کسی نواحی گاؤں میں پہنچ جائیں،چنانچہ وہ اپنے والد

صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ شہر کی حالت بہت خراب ہے،اب تو یہاں سے بھاگنا ہی اچھا ہوگا۔والد کہنے لگے: بیٹا! مجھے کہاں لیے پھرو گے،میں بوڑھا آدمی ہوں۔مجھے یہیں اللہ اللہ کرنے دو۔میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو کوئی مجھے مارے گا۔لیکن شجاع الدین خاں نہ مانے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ہرگز یہاں نہ چھوڑوں گا۔آپ اٹھیں اور میرے ہمراہ چلیں۔یہ کہہ کر انہوں نے بڑے میاں کو اپنی کمر پر بٹھایا اور اپنے کنبے کے لوگوں کے ہمراہ لے کر بھاگ نکلے۔ جب یہ لوگ شہر کی حدود سے گزرنے لگے تو وہاں کھڑے ہندوؤں نے ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان تعداد میں کم بلکہ نہتے بھی تھے،تاہم اس گئی گزری حالت میں بھی انہوں نے کئی گنا زیادہ اور مسلح ہندوؤں کا مقابلہ کیا۔لیکن اللہ کو ان کی فتح منظور نہ تھی اور وہ بھاگنے لگے۔ان بھاگنے والوں نے شجاع الدین خاں سے بہت کہا کہ وہ اپنے والد صاحب کو چھوڑ کر اپنی جان بچالیں مگر وہ مرتے مرگئے مگر انہوں نے اپنے والد کا ساتھ نہ چھوڑا۔دونوں باپ بیٹا شہید کر دیئے گئے۔

میری اہلیہ کی بڑی ہمشیرہ کی دونوں ٹانگوں پر ان دنوں فالج گرا ہوا تھا اور وہ چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ان کے شوہر دلی گئے ہوئے تھے اور وہ اپنی والدہ کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ان کے ہمراہ ان کے دو بچے بھی تھے۔جس روز مورچہ ٹوٹا اور مسلمان مجبور ہو گئے کہ شہر کو خیر باد کہہ کر مسلم کیمپ کا رخ کریں،اس روز عجب افراتفری اور آپا دھاپی کا عالم تھا۔تڑاتڑ گولیاں چل رہی تھیں اور ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔اس خاتون کو اپنی بے بسی اور بے چارگی کا بڑا احساس تھا۔وہ زار زار رو رہی تھیں۔شاید وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ یہ لوگ انہیں اس حالت میں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔انہیں روتے دیکھا تو ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد نے کہا: بہن! روتی کیوں ہو؟ کیا تم سوچتی ہو کہ ہم تمہیں یہیں چھوڑ جائیں گے؟نہیں،جب تک رشید احمد کے دم میں دم ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔چنانچہ جب وہ اپنے مکان سے باہر نکلے،گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور رشید احمد اپنی اپاہج بہن کو پیٹھ پر سوار کیے بھاگے جا رہے تھے۔یہ مرحلہ بڑا سخت تھا لیکن رشید احمد اور عزیز احمد دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے اپنی بہن اور ان کے دو بچوں کو

باحفاظت کیمپ میں پہنچا کر دم لیا۔ اسی طرح میرے ایک ہم وطن محبوب خاں کی گود میں ان کی نواسی تھی جس کی عمر دو تین سال تھی۔ محبوب خاں کے داماد یعنی اس لڑکی کے باپ نے بار بار ان سے کہا کہ اس لڑکی کو پھینک دو لیکن انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جب تک میری جان میں جان ہے میں اس ننھی سی جان کو اپنی گود سے الگ نہ کروں گا، چنانچہ یہ لڑکی ان کے ہمراہ پاکستان پہنچ گئی اور آج یہ لڑکی کتنے ہی بچوں کی ماں ہے اور اپنے گھر شاد و آباد ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کی یہ کہانی اس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک بھوانی کے اس مردِ مجاہد کا ذکر نہ کیا جائے گا جس کا نام مرزا قدیر بیگ تھا۔ وہ مرزا نذیر بیگ کے صاحبزادے تھے جن کی کوٹھی کے احاطے میں مسلم کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ ان کی کوٹھی شہر سے کچھ دوران کے باغ میں واقع تھی۔ یہاں ہر آن قریبی دیہات کے ہندوؤں کے حملوں کا پورا پورا خطرہ تھا لیکن جب مرزا صاحب نے سنا کہ شہر میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے تو وہ اپنی کوٹھی کو جس میں ان کے والدین، بیوی بچے اور بہن بھائی موجود تھے، اللہ کے حوالے کر کے اپنی رائفل لیے شہر کے مورچے پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے والد نے انہیں روکا بھی لیکن اس ایثار پیشہ مسلمان نے ان کی ایک نہ سنی۔ شہر کے جس مورچے کی حفاظت مرزا قدیر بیگ کر رہے تھے وہ سب سے اہم مورچہ تھا۔ انہوں نے جان ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے خوف و ہراس کی اس فضا میں جس سرفروشی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ انہوں نے جرات و مردانگی کے اس مقابلے میں بھوکے پیاسے صبح سے شام کر دی تھی مگر ہندو حملہ آوروں کو مسلمان محلوں کی طرف بڑھنے نہ دیا ان کا نشانہ اس قدر سچا تھا کہ ان کی رائفل سے گولی جب بھی نکلتی دشمن کے کسی نہ کسی آدمی کو کھیت پڑتی تھی۔ دور نزدیک اونچی اونچی حویلیوں پر بیٹھے ہندو بندوقچی ان پر گولیاں برسا رہے تھے لیکن خدا کے فضل و کرم سے وہ مامون و محفوظ رہے اور مورچے سے اس وقت لوٹے جب رات ہو چکی تھی اور حملہ آور تنگ آ کر واپس جا چکے تھے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آخر تک لڑنے والوں میں اکثریت ہندو راجپوتوں کی تھی ورنہ راشٹریہ سیوک سنگھ کے بہادر نوجوان تو میدان چھوڑ کر ایسے غائب ہو گئے کہ ڈھونڈنے سے بھی

ان کا نام و نشان نہ ملتا تھا۔ سچ ہے جان دینا بڑی بات ہے یہ ہر کسی کا کام نہیں۔ اگلے روز مرزا قدیر بیگ کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کی جمعیت ان کی کوٹھی پہنچی اور بڑی سرگرمی سے پوری کوٹھی کی تلاشی لی لیکن مرزا صاحب نہ ملے اور ملتے بھی کہاں، وہ تو اپنی کوٹھی کے ایک تہ خانے میں آرام سے بیٹھے تھے اور اس تہ خانے کی چھت پر فرش بچھا ہوا تھا جہاں ان کی بیمار والدہ لیٹی ہوئی تھیں۔ رات کو مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر کوٹھی سے باہر نکلے اور روہتک کی طرف چل پڑے۔ اللہ کی مدد شامل حال تھی، وہ راتوں رات بخیریت روہتک پہنچ گئے اور اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرے لیکن گرفتاری کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا انھوں نے اسی روز سکھ کا بھیس بدلا، نقلی ڈاڑھی لگائی اور دلی روانہ ہو گئے۔ پھر وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان پہنچے اور ملتان رہائش اختیار کی۔ سکھ کے لباس میں مرزا صاحب کی تصویر اب بھی ان کے پاس موجود ہے اور ہم نے بھی اسے دیکھا ہے۔ ہمارے شہر کے ایک ہندو رئیس لالہ کشن لال جالان تھے۔ انہوں نے ایک اندھے کی حالت سے متاثر ہو کر ایک لاکھ روپے کے قریب رقم اپنی جیب خاص سے صرف کر کے ۱۹۳۵ء میں شہر میں ایک پرفضا مقام پر آنکھوں کے امراض کا عظیم الشان اسپتال تعمیر کرایا۔ اس اسپتال کے انچارج ایک ہندو نوجوان ڈاکٹر مقرر ہوئے، نام پرشوتم دت گردھر اور ملتان شریف کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر گردھر بڑی محبت کے انسان اور نہایت خلیق معالج تھے۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفا رکھی تھی۔ مریضوں کے ساتھ انکا سلوک بہت ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا اور ہندو مسلمان کی ان کے ہاں کوئی تمیز نہ تھی۔ ڈاکٹر پرشوتم دت اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر نارائن داس نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جس شجاعت اور دلیری سے اسپتال کے مسلمان مریضوں کی جانیں بچائیں وہ انسانیت کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔ ہندو حملہ آوروں کی سنگدلی اور شقاوت قلبی دیکھئے کہ وہ لوگ بیمار مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کی غرض سے مقامی اسپتال میں بھی پہنچ گئے۔ سول اسپتال میں جہاں ایک متعصّب ہندو اسسٹنٹ سرجن تعینات تھا انہیں کامیابی نصیب ہوئی۔ وہاں سب مریض ختم کر دیئے گئے۔ ایک دوسرے گروہ نے آنکھوں کے اسپتال کا رخ کیا۔ ڈاکٹر پرشوتم دت

کوان کے ارادوں کی خبر مل چکی تھی۔انہوں نے اسپتال کے تمام دروازے بند کر دیئے اور دونوں بھائی رائفلیں لے کر اسپتال کی دوسری منزل پر پہنچ گئے۔ڈاکٹر صاحب نے حملہ آوروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ یہ فراموش کر چکے ہیں کہ دنیا میں انسانیت نام کی بھی کوئی چیز موجود ہے اور اتنے گر چکے ہیں کہ دکھی اور بیمار انسانوں کی جان لینا بھی شیوہ مردانگی سمجھتے ہیں۔ نہتے انسانوں کا قتل آپ کی نگاہوں میں ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔آپ کو اپنی اس ذلیل حرکت پر شرم محسوس کرنی چاہیے۔کل آپ اپنے اس گھناؤنے فعل پر پچھتائیں گے،لیکن انسانیت آپ کو کبھی معاف نہ کرے گی۔آپ لوگوں کے لیے اب بھی وقت ہے کہ اس بیہودہ خیال سے باز آئیں اور یہاں سے چلے جائیں ورنہ جب تک ہم دونوں بھائیوں کے جسم میں جان اور ہماری رائفلوں میں گولیاں موجود ہیں ہم آپ لوگوں کو اپنے مریضوں تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ نے حملہ آوروں کے ایک حصے پر خوشگوار اثر ڈالا مگر شرارت پسند عنصر نے مخالفانہ نعرے بلند کیے،ان پر مسلمانوں کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا اور انہیں مار ڈالنے اور اسپتال کو نذر آتش کر ڈالنے کی دھمکیاں دیں،تاہم ڈاکٹر صاحب نے حوصلہ نہ ہارا اور وہ ان دھمکیوں سے بالکل نہ گھبرائے۔ان کی ہمت وعزم دیکھ کر حملہ آوروں کی ہمت پست ہوگئی اور وہ ان کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے وہاں سے چلے گئے۔ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک ایک مسلمان مریض کے پاس گئے اور انہیں اطمینان دلایا کہ جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں،وہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کریں گے،چنانچہ جو مریض تندرست ہو جاتا وہ اسے مسلمانوں کے مقامی کیمپ میں پہنچا دیتے۔یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا حتٰی کہ اسپتال کا آخری مسلمان مریض مسلم کیمپ میں داخل ہو گیا۔(۲۹)

سرور بیگم کی سرگزشت

سرور بیگم محلّہ نواب پورہ بھرت پور کی رہنے والی تھیں جہاں ان کا خاندان صدیوں سے آباد تھا۔یہ لوگ ریاستی فوج و پولیس میں ملازم تھے۔جب حالات بگڑے تو یہ خاندان نقل مکانی کر کے بندھانیوں کے محلے نواح پہاڑ گنج دہلی کرایہ کے مکان میں منتقل ہو گیا۔سرور بیگم کے ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔بھائی پیش بینی کے طور پر عین ہنگاموں سے ذرا قبل لاہور چلے گئے۔انھوں نے اپنے والدین اور رشتہ داروں کو بھی سمجھایا کہ لاہور چلے جائیں کیونکہ حالات سنبھلنے کی امید نہیں ہے لیکن کوئی تیار نہیں ہوا۔۱۴ اور ۱۵ اگست کے درمیان (۲۷ ویں رمضان) ان کے مکان پر شر پسندوں نے حملہ کیا۔جب بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو سرور کے بڑے بہنوئی ایوب خاں نے برابر کے مکانوں کی دیواریں توڑ کر ایک گلی میں راستہ بنایا اور خاندان کے چھوٹے بڑے افراد کو لے کر بڑی سڑک کی طرف چلے۔افسوس ہے کہ وہ سب کے سب شہید کر دیئے گئے۔سرور بیگم کے والد مظہر الدین قسمت کے اچھے تھے کہ ان کو اتفاقاً پہنچنے والے ایک ٹرک نے زبردستی سوار کرا کے پرانے قلعہ پہنچا دیا اگرچہ وہ برابر کہہ رہے تھے کہ میرے بال بچے دوسری طرف جا چکے ہیں اور وہ اکیلے نہیں جائیں گے۔اس افراتفری میں سرور بیگم جن کی عمر اس وقت ۷۔۶ سال تھی مع اپنی بڑی بہنوں جن کی عمریں دو ایک سال زیادہ تھیں،گھبراہٹ کے عالم میں اپنے ماموں کے مکان کی طرف چلی گئیں جو قریب ہی واقع تھا۔وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ ان کے ماموں پہلے ہی بال بچوں کے ساتھ جا چکے تھے۔ان لڑکیوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں؟ وہ ماموں کے گھر غسل خانے میں کنڈی لگا کر بیٹھ گئیں۔غسل خانے میں دو چھوٹے گھڑے پانی سے بھرے رکھے تھے۔ تین دن تک وہ پانی استعمال کرتی رہیں۔جب پانی ختم ہو گیا اور بلوائی مکان لوٹنے کے بعد اس میں آگ لگانے لگے تو یہ تینوں بہنیں گھبرا کر باہر نکلیں اس وقت وہ تقریباً نیم بیہوشی کے عالم میں گر پڑیں،ابھی بلوائی کچھ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ بچے کھچے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے پرانے قلعے پہنچانے کے واسطے ایک ملٹری ٹرک آ پہنچا انھوں نے لڑکیوں کو اٹھا کر ٹرک میں ڈال دیا اور پرانے

قلعے پہنچا دیا جہاں مسلسل گم شدہ بچوں کے سلسلے میں اعلانات ہو رہے تھے۔ دو دن بعد سرور کے والد کو اپنی بیٹیوں کی اطلاع ملی تو وہ ان کو لے آئے اور پھر جس اسپیشل ٹرین سے لاہور پہنچے وہ تقریباً ایک ہفتہ میں پہنچ سکی تھی۔ لاہور سے یہ لوگ حیدر آباد سندھ چلے گئے جہاں ان کے بھائی موجود تھے اور پھر یہ خاندان وہیں آباد ہو گیا۔ سرور بیگم اس وقت ۴۰۰ کوارٹر گل بہار کے بالمقابل معہ اپنے خاندان کے شاد و آباد ہیں۔ (۳۰)

قرول باغ اور پہاڑ گنج کی تباہی

محمد غالب اشک صاحب یونٹ اکاؤنٹینٹ نے دہلی کی تباہی اور بربادی کی داستان اس طرح بیان کی ہے:

۸ ستمبر ۱۹۴۷ء یہ دن دہلی کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد دن تھا۔ اسی دن پورے اہتمام سے مسلمانوں کا خون بہایا۔ جو کمی اس سے پہلے دنوں میں رہ گئی تھی اسے آج پورا کر دیا گیا۔ بعض مسلمان رؤسا جن کو گورنمنٹ نے حفاظتی مسلح گارڈ مہیا کی تھی وہ آج واپس بلا لی گئی اور دہلی کی ہندو پبلک کو عام اجازت دی گئی کہ وہ دل کے ارمان نکالے۔ طلوعِ سحر کے وقت ہوائی اڈّے پر بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور ان کی لاشوں کو شہر کی مختلف سڑکوں اور درختوں کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ عورتوں سے زنا کیا گیا۔ ان بدنصیب لوگوں میں بیشتر مسلمان افسر تھے جو پاکستان آنے کے لئے ہوائی اڈّے پر مارے گئے۔ ہزاروں مسلمان قلعہ (پرانا) میں پناہ لینے کے لئے جاتے ہوئے شہید ہوئے۔ قرول باغ کے کتنے مسلمان ظلم و استبداد کا نشانہ بنے۔ اور اسکا اندازہ مسلمانوں کے آتش زدہ مکانوں، سڑکوں اور گلیوں میں بکھری ہوئی لاشوں سے کیا جا سکتا تھا۔ حکومت کا کام صرف یہ تھا کہ کرفیو لگا کر ہندو غنڈوں کو مسلمانوں کو قتل کرنے کا موقع اور مدد دے۔ قرول باغ سے زیادہ پہاڑ گنج میں ظلم ہوا۔ ہم نے جلتے ہوئے مکان اور سر بفلک شعلوں کو دیکھا، تقریباً دو میل سے بھی یہ شعلے ہی معلوم ہوتے تھے۔ کتنے مسلمان شہید ہوئے کچھ خبر نہیں لیکن وہاں سے بچ کر جو لوگ پرانے قلعہ میں پناہ گزیں ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ جب گھروں کو آگ لگائی گئی تو مسلمان اپنے گھروں سے نکل کر جس طرف بھی بھاگتے تھے اسی طرف سے ملٹری ان کے سامنے آ کر ان پر گولیاں برساتی تھی۔ (۳۱)

سٹی اسٹیشن دہلی، آنکھوں دیکھا حال

جناب انعام الحق ہادی امروہوی دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام کے وقت فوجی ملازمت میں تھے اوران کا قیام بمعہ اہل خانہ پہاڑ گنج میں تھا انہوں نے اپنے اور اپنے خاندان پر گزرنے والی المناک سرگزشت ہماری درخواست پر قلم بند فرمائی ہے اس سرگزشت میں سب سے زیادہ دردانگیز وہ مناظر ہیں جن کے ہادی امروہوی صاحب عینی شاہد ہیں اور الحمدللہ ۱۰ اعثمانیہ کالونی شارع الطاف علی بریلوی میں قیام پذیر ہیں ، ہادی صاحب کے بیان کی تلخیص قریب قریب ان ہی کے الفاظ میں ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں میرا عنفوان شباب تھا۔ میں اس وقت انڈین آرمی میں ملازم تھا ستمبر / اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں جس پیمانے پر خون مسلم کی ارزانی ہوئی اسکی مثال ۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی اوّل کے بعد دستیاب نہیں ہوتی۔ اس دوران سڑک، ریلوے اسٹیشن، بازاروں اور گلیوں میں رونما ہونے والے دردانگیز سانحات شاید کبھی بھی پورے طور پر ضبط تحریر میں نہ آسکیں گے۔ چند واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ اس خونی ہنگامے میں میرے قریبی، عزیزوں کی جانوں کا نذرانہ بھی شامل ہے، زندگی ناپائیدار ہے، وقت تیزی سے گزر رہا ہے آنے والی نسل کو کچھ خبر نہیں ہے لہذا آج سے تقریباً ۴۸ سال قبل خود اپنے اور اپنے خاندان پر گزرنے والی حقیقی داستاں حیات مختصراً نذر قارئین کررہا ہوں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ قیام پاکستان کی جدوجہد اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے خون سے عبارت ہے لہذا پاکستان کی مضبوطی کے واسطے ضروری ہے کہ سابقہ قربانیوں کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے۔ مشرقی پنجاب، دہلی بھرت پور، الور وغیرہ علاقوں میں ۱۹۴۷ء کے دوران مسلمانوں کا قتل روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میں برٹش فوج میں ملازم تھا۔ میرے گھر کے لوگ دہلی کے علاقے پہاڑ گنج میں مقیم تھے۔ جن میں میری والدہ مرحومہ، ماموں، دو بہنیں اور دو بھائی شامل تھے۔ دہلی میں قتل عام سے قبل افواہوں کی گرم بازاری تھی چنانچہ چھوٹے

موٹے واقعات بڑھتے بڑھتے بڑے ہنگاموں میں تبدیل ہوگئے اور وسط ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہمارا محلّہ بھی لپیٹ میں آ گیا اور حالت کچھ ایسی ہوگئی کہ راہِ فرار مسدود نظر آنے لگی جب ہر طرف مایوسی کے بادل چھا گئے تو مجبوراً نقل مکانی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ میں اپنے خاندان سمیت ایک تانگے والے کو منہ مانگے پیسے دیکر دہلی ریلوے اسٹیشن تک لے جانے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہم لوگ جلدی جلدی بھرا پُرا گھر چھوڑ کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگے والا نامعلوم کن کن راستوں سے ہوکر بالاخر خیریت کے ساتھ دہلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ راستے میں جو مناظر نظر سے گزرے انکی کیفیت ناقابل بیان ہے ہر طرف آہ و بکا، چیخ و پکار کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سڑکوں پر خون سے لت پت لاشیں پڑی تھیں ہم سب لرزتے کانپتے دہلی ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اسی اسٹیشن پر سینکڑوں بار آنا جانا ہوا لیکن آج یہاں کا عالم ہی دوسرا تھا۔ اس وقت اسٹیشن پر ہزاروں پریشان مسلمان مسافر جگہ بہ جگہ حسرت و یاس کی تصویر مجسم بنے بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بُری طرح اُداسی چھائی ہوئی تھی لحہ بہ لحہ موت کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر پہلی پریشانی یہ ہوئی کہ میرا ایک چھوٹا بھائی جو کہ "اسٹیٹمین " State" man" اخبار کے دفتر میں کام کرتا تھا اسٹیشن نہ پہنچ سکا کیونکہ اس کی رات کی شفٹ میں ڈیوٹی تھی اب اگر ہم لوگ اس کا انتظار کرتے تو اہل خاندان کی زندگیاں خطرہ میں پڑ جاتیں۔ راستہ بند ہونے کی وجہ سے وہ بے بس تھا ہم سب شدید پریشانی کے عالم میں تھے بلکہ ایک طرح مایوس ہو چکے تھے۔ حالت یہ تھی کہ سوائے دعا کے اور کچھ چارہ نہ تھا اسی دوران وطن امروہہ یوپی بھارت جانیوالی گاڑی پلیٹ فارم پر لگ گئی چنانچہ مزید انتظار کئے بغیر ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنے اہل خاندان کو اس میں سوار کرادیا۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد میں خدا حافظ کہہ کر دور تک اس کو دیکھتا رہا۔ دہلی سٹی سے چند منٹ کے فاصلے پر واقع اسٹیشن شاہدرہ تھا جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں پلیٹ فارم سے باہر آ کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کی طرف چلا گیا جو اس وقت بند تھا اور لوگ باہر بنچوں پر بیٹھے شہر کی حالت زار پر دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کررہے تھے میں بھی ان میں شامل ہو

کر گفتگوئیں خاموشی کے ساتھ سننے لگا۔اسی دوران اتفاقاً ایک رشتہ دار سے ملاقات ہوئی وہ ریلوے اسٹیشن پر کام کرتے تھے۔انھوں نے فوراً میری خیریت معلوم کی میں نے اس وقت تک کی روداد سنائی اور کہا کہ گھر والوں کو امروہہ جانے والی ٹرین میں ابھی ابھی رخصت کر کے آرہا ہوں میری یہ بات سن کر ان کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا وہ حیرانی اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگے۔ غضب ہوگیا جس گاڑی میں تم نے اپنے گھر والوں کو سوار کرایا ہے وہ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ شاہدرہ اسٹیشن پر کٹ گئی ہے۔یہ سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی میں نے کہا کے بھائی تمھیں یقین ہے کہ ریل کٹ گئی ہے۔انہوں نے کہا کہ قیامت آگئی ان سے معلوم ہوا کہ اس گاڑی میں سوار زیادہ تر مسافروں کو گاڑی سے اتار کر سکھوں اور ہندوؤں نے قتل کر دیا تھا اس واقعہ کی خبر پھیلتے ہی دیکھتے دیکھتے دہلی شہر میں خون کی ہولی زور وشور سے شروع ہوگئی اور سٹی ریلوے اسٹیشن دہلی بھی پوری طرح لپیٹ میں آگیا۔گویا شاہدرہ کا واقعہ ایک سگنل تھا میرا دماغ اس خبر کو سن کر ماؤف ہوگیا اور اسٹیشن سے باہر کی نازک فضا کا اندازہ کر کے گھبراہٹ میں دوبارہ اسٹیشن کے اندر پہنچ گیا یہ وہ نازک لمحات تھے کہ میری سمجھ بوجھ کی قوت قطعاً جواب دے گئی۔اتفاقاً ایک گاڑی پلیٹ فارم نمبر۲ پر کھڑی ہوئی تھی میں بلا سوچے سمجھے گاڑی کے سرونٹ ڈبہ میں داخل ہوگیا اور ڈبے کی دوسری جانب منہ کر کے بیٹھ گیا میری پشت کی کھڑکی پلیٹ فارم نمبرا کی طرف تھی ابھی دس پندرہ منٹ اسی حال میں گزرے ہوئے ہوں گے کہ میری آنکھوں کے سامنے پلیٹ فارم نمبرا میں قتل عام شروع ہوگیا میرے چھوٹے سے سرونٹ والے ڈبے میں دو سیٹیں آمنے سامنے تھیں اور اس میں پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے اب میں نے گھبرا کر پلیٹ فارم نمبرا اور نمبر۲ پر نظر دوڑا کر دیکھا تو ایک خوفناک ترین منظر نگاہ کے سامنے تھا۔زندگی میں انسان کی درندگی اور مقتولین کی بے چارگی اور زندگی کے واسطے تڑپ آج ۴۸ سال گزرنے کے باوجود جب رات کو بھی خیال آجاتا ہے تو صبح ہو جاتی ہے۔اس وقت سینکڑوں انسانوں کو اس طرح ذبح کیا جارہا تھا جیسے وہ انسان نہیں جانور تھے سکھوں کا ایک گروہ انسانوں کو جبریہ زمین پر پٹخ پٹخ کر ذبح کر رہا تھا دوسرا انہی تڑپتے انسانوں

کے پیٹ چاک کر کے بہیمانہ عمل میں مصروف تھا۔میرے ڈبہ میں ایک مسلمان جوان لڑکا میرے سامنے بیٹھا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا گیا۔میں نے خاموشی کے ساتھ اس کی ہمت بندھاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا بھئی کیوں اس قدر پریشان ہو ہمت سے کام لو لیکن وہ برابر کھڑکی سے مسلسل جھانک جھانک کر مزید پریشان ہوتا گیا یہاں تک کے وہ اٹھا باتھ روم میں جا کر اپنے پاجامہ کی جگہ دھوتی ہندوانی پہن کر باہر نکلا چند منٹ تک اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتے ہوئے اپنا بیگ لے کر پلیٹ فارم کی جانب اتر گیا۔اس وقت پلیٹ فارم پر پچیس تیس مسلمان دم توڑ رہے تھے اور ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا وہ لڑکا جونہی بچتا بچاتا آگے کی جانب جانے لگا ٹھیک اسی لمحہ چند سکھ نوجوان آگے بڑھے اور کچھ پوچھے بغیر اس غریب کا پیٹ چاک کر دیا اور وہ میری آنکھوں کے سامنے دیگر انسانوں کے ساتھ تڑپنے لگا۔اس نوجوان کی ہلاکت نے دماغ کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا پلیٹ فارم پر جگہ بہ جگہ سینکڑوں کی تعداد میں نعشیں بکھری ہوئی تھیں،اور خون بہہ بہہ کر سب طرف پھیل رہا تھا۔اس وقت کا ایک انتہائی کرب ناک نظارہ یہ بھی دیکھا کہ دس بارہ اور پندرہ سال کے سکھ نوجوان اور غیر مسلم لڑکے تڑپتے اور نیم مردہ انسانوں کو اپنے پیروں سے دھکیل دھکیل کر اور ٹھوکریں مار مار کر پلیٹ فارم سے ریلوے لائنوں پر نیچے پھینک رہے تھے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اس کیفیت کا احاطہ کر سکوں اس وقت کا عالم دراصل ناقابل بیان ہے،میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں میں نے مسلسل درود شریف کی تلاوت خاموشی کے ساتھ شروع کر دی جس سے مجھ کو قدرے سکون قلب حاصل ہوا قدرے وقفہ کے بعد خدا معلوم وہ کون سی نادیدہ قوت تھی جس کی مدد سے اپنے چہرے کو اس طرح رکھنے کی کوشش میں کامیاب ہوگیا گویا میرے اوپر ان حالات کا کوئی خاص اثر نہیں ہے بات یہ تھی کہ ذرا سی گھبراہٹ کے مظاہرہ کے معنی میرے مسلمان ہونے کا اعلان تھا اور پھر پلیٹ فارم نمبرا مجھے وہ تین سکھ اچھی طرح یاد ہیں جن پر میں اسی دوران اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال رہا تھا جو اس خوفناک خونی دنگل کو بڑے اطمینان کے ساتھ اس طرح دیکھ رہے تھے گویا کوئی دلچسپ تماشا ہو رہا ہو وہ بڑے اطمینان کی کیفیت میں اِدھر اُدھر محو خرام تھے غالباً وہ

اپنے ان قصائی صفت قاتلوں کی ہمّت بندھا رہے تھے جو قتل عام میں مشغول تھے زندگی کے ان خوفناک لمحات میں سوائے ذات خداوندی کے اور کوئی بچانے والا نہ تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ اگر اسی ڈبہ میں بیٹھا رہتا تو ممکن تھا کہ وہیں میرا قتل ہو جاتا لیکن اللہ کو بچانا مقصود تھا اس لئے میں نے سوچا کہ کچھ نہ کچھ قدم اٹھانا چاہیئے چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کو آخری بار یاد کیا اور اپنی زندگی کو اس کے سپرد کر کے پلیٹ فارم کی دوسری طرف کا دروازہ کھولا ریلوے لائن جس پر کوئی گاڑی نہیں تھی اتر گیا جب میں اتر رہا تھا تو وہ تینوں سکھ پلیٹ فارم ۲ پر ٹہلتے ہوئے میرے نزدیک آ گئے مجھے خوف سے پسینہ آ گیا لیکن اوسان سنبھال کر میں نے ان کو مخاطب کر کے پنجابی زبان میں کہا :سردار جی یار ذرا ہاتھ تو پھڑیں !

ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا اور میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا بہت مہربانی میں نے پیچھے دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا اور لاشوں کو اور تڑپتے انسانوں کو جگہ جگہ بکھرتا ہوا دیکھتا ہوا دوسرے پلیٹ فارم کے گیٹ تک پہنچ گیا یہاں ایک دوسرا دردانگیز نظارہ دیکھا گیٹ کے قریب ہی قریباً ۶۰ ، ۷۰ مسلمان عورتیں بچیاں زمین پر بیٹھی ہوئی اور دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں ۔ وہ زیادہ تر سفید برقعوں میں ملبوس تھیں انہوں نے مجھے فوجی وردی میں دیکھا تو انتہائی کرب و بے چینی کے ساتھ چلاّ چلاّ کر کہنے لگیں ۔ اے فوجی بھائی ہمیں بچاؤ۔ اے بھائی خدا کے لئے ہماری مدد کرو، میری یہ کیفیت کہ اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی ان بے کس اور بے بس مظلوم خواتین اور بچیوں کے واسطے کیا کر سکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا کہ اگر توفیق الٰہی ہوتی تو ان کی خاطر جان دے دیتا انتہائی رنج وافسوس کے ساتھ خون کا سا گھونٹ پیتے ہوئے خود کو لاچار اور بے بس جان کر گیٹ کے باہر آ گیا مجھے اپنی اس بے بسی کا زندگی کی آخری سانس تک صدمہ رہے گا۔ ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر اسٹیشن سے متصل تھانے کی جانب چلا گیا جہاں ایک سکھ پولیس انسپکٹر اپنی وردی میں ملبوس ریلوے کی لمبی آرام کرسی پر دراز تھا۔ مجھ میں نہ جانے کہاں سے ہمت آ گئی۔ میں نے اس انسپکٹر سے کہا۔ سردار جی۔ "ہُن تے بہت ہوگئی اے ۔"

یعنی اب تو بہت خون بہہ چکا اب کھیل ختم کراؤ، سردار جی نے پنجابی میں ہی جواب دیا "تو تہ بچ گیا ہے۔ جا کام کر" یعنی تو تو بچ گیا ہے جا چلا جا۔ یہ بے دردانہ جواب سن کر اس ہی بند ہوٹل کی جانب چلا جس کا پہلے ذکر کر چکا ہوں ۔ ناگہاں ایک درخت کے پاس میرا چھوٹا بھائی اپنی سائیکل کے ساتھ مل گیا ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا جلدی جلدی میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس پر کیا گزری۔ اس نے بتایا کہ یہاں تک خیریت سے پہنچنا غیر ممکن تھا اس لئے دلی اسٹیشن کا رُخ کیا راستے میں یہ بمشکل جان بچاتا اسٹیشن تک پہونچنے میں کامیاب ہوگیا اس نے ہم سب کا حال دریافت کیا میں نے مختصر روداد سنائی اب ہم ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے ہم کو قطعاً علم نہیں تھا کہ اعزاء پر کٹنے والی ٹرین میں کیا گزری اب سوال یہ تھا کہ اپنی جان کیسے بچائی جائے مارنے والے سے جِلانے والا زبردست ہے اللہ کو بچانا تھا لہذا ہم نے اسٹیشن کے فوجی Transit Camp ٹرانزٹ کیمپ میں وقتی طور پر پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سوائے فوجی کے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی چنانچہ اپنا فوجی ملازمت کا حوالہ دیکر اور باہر کے قیامت خیز منظر کا ذکر کر کے کسی نہ کسی طرح میں اور میرا بھائی کیمپ میں داخل ہو گئے ۔ کیمپ کا کمانڈر ایک مسلمان کیپٹن تھا اس تک رسائی حاصل کی اور کل حالات سے آگاہ کیا اس نے کہا کہ اسے سب کچھ علم ہے لیکن وہ مجبور ہے اسٹیشن پر یا شہر میں اس کو مداخلت کی اجازت نہیں ہے کیمپ میں عارضی پناہ تو مل گئی جو میدان جدال وقتال میں نہایت قیمتی بات تھی لیکن اعزاء کی خیریت کی شدید فکر لاحق تھی ۔ اسی بے چینی کے عالم میں تین روز گزر گئے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ماموں اور ممانی بھائی بہنوں کو تلاش کس طرح کیا جائے امن قائم ہونے کے دور دور تک آثار نہیں تھے ۔ حالات مسلسل بگڑتے گئے دیکھتے ہی دیکھتے ہزار ہا انسان کٹ گئے گھروں سے در بدر ہو گئے کسی نہ کسی طرح ہم لوگ پھر فوجی کیمپ سے نکلے اور ایک Refugee Camp ریفوجی کیمپ تھا وہاں پہنچ گئے ۔ وہاں ہزار ہا پریشان حال خاندان کھلے میدان میں پڑے ہوئے تھے، دو روز تک بھوکے پیاسے ادھر اُدھر پانی اور خوراک کے لئے بھٹکتے پھرے کبھی کبھی کچھ کھانے کو ملتا تو گزارا

کرتے ۔اتفاقاً امروہہ کے ایک درویش صاحب مل گئے جو بیمار تھے وہ اس ٹرین میں سوار تھے جس پر حملہ ہوا تھا انہوں نے بتایا کہ تمھاری ممانی کو شاہدرہ اسٹیشن پر شہید کر دیا گیا۔ ماموں اور ماں کے زخم آئے ہیں ماموں کلورومال ہسپتال میں ہیں اور ماں اور بھائی بہنیں شاہدرہ میں ایک شریف کلورومال والے کے یہاں پناہ گزیں ہیں وہ لوگ میرے چھوٹے بھائی کے لئے پریشان ہیں۔ وہ صاحب بھی ٹرین میں امروہہ جارہے تھے انہوں نے بتایا کہ ان کی فیملی کے ۷ افراد بھی سکھوں کے ہاتھوں کرپانوں کی بھینٹ چڑھ گئے اور وہ خود بھی ہمارے گھرانے کے ساتھ کلورومال والے کے گھر پر اپنے اور اپنے عزیزوں کو ڈھونڈنے نکلے تو راستہ نہ مل سکا اور بھگدڑ میں اس کیمپ تک پہنچ گئے اب میں نے ارون ہسپتال میں ماموں کے پاس جانے کی کوشش کی تو بھائی سے بچھڑنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ اس وقت یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ زندہ سلامت ہسپتال تک پہنچ سکوں گا کہ نہیں دوسری طرف کیمپ بھی محفوظ نہیں تھا سکھوں کے غول کے غول امنڈ کر آتے اور کیمپ پر دھاوا بولنے کی باتیں کرتے۔ جبکہ کیمپ میں کم از کم چالیس ہزار بے بس انسان روٹی پانی تک سے ترسے ہوئے تھے۔ مختصر فوجی ٹیم اس کیمپ کی حفاظت کر رہی تھی اور ایسے مقامات پر مشین گنیں لگی ہوئی تھیں جہاں سے حملوں کا خطرہ تھا۔

آخر کار اس ہی کیمپ میں تقریباً پندرہ روز بعد ہمارے رشتہ کے چچا پہنچ گئے جو سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ اور ان کی تصدیق ہوئی کہ ممانی شہید ہوگئیں باقی سب لوگ نہ معلوم کس طرح امروہہ خیریت سے پہنچ گئے ہیں اور پھر میرا چھوٹا بھائی میری فوجی سروس کی وجہ سے کسی نہ سکی طرح تعلقات اور خوشامد کر کے سرکاری جہاز سے ملازم بن کر کراچی پہنچ گیا۔ (۳۲)

ایک ہولناک سفر

دہلی تا لاہور (ریل)

۱۹۴۶-۴۷ء کے دوران دھلی سے لاہور تک نہ معلوم کتنے مسلمان پاکستان پہنچنے کی آرزو دل میں لئے ملک عدم کو سدھار گئے۔ یہ حالات قیامت تک پردۂ خفا میں رہیں گے۔ ذیل میں تاریخی ریکارڈ درست رکھنے کے لئے ڈاکٹر زاہد امجد علی کے سفر دہلی تا لاہور کی المناک روداد کی تخصیص روز نامہ جنگ مورخہ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۰ سے پیش کی جاتی ہے۔ "دہلی کے پرانے قلعے سے ٹرین کی روانگی سے قبل ڈوگرا فوجیوں نے تمام مسافروں کی تلاشی لے کر انہیں ایک چھوٹے سے چھوٹے چاقو تک سے محروم کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مزدور پیشہ لوگوں کے بچے کھچے اوزار بھی چھین لئے تمام مسافروں کو بوگیوں میں بھیڑ بکریوں کی مانند بھرا گیا جس کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں شدید گرمی اور گھٹن پیدا ہوگئی اور جس کی وجہ سے سانس لینا بھی دشوار ہوگیا۔ یہ ٹرین دو دن کے سفر کے بعد جب کسی مسلم آبادی والے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو مقامی مسلمانوں کی امدادی پارٹیوں نے ہماری ٹرین کو اپنے نرغے میں لے لیا وہ لوگ روٹی سالن، پکے ہوئے چاول، سبزی اور فروٹ وغیرہ مسافروں میں کثرت سے تقسیم کر رہے تھے۔ پانی کے لئے بیشمار چھوٹے برتنوں کا انتظام تھا۔ یہیں امدادی پارٹیوں نے مستقبل کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔" کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے اس گاڑی کو بیاس کے اسٹیشن پر حملہ کر کے بالکل صاف کر دینے کا خوفناک منصوبہ تیار کیا ہوا ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے اپنے کمپارٹمنٹس کے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند رکھیں"۔

پوری گاڑی میں توبہ و استغفار کا ورد جاری ہوگیا اور سب کے چہروں پر خوف و ہراس نے اپنا رنگ جما لیا تھا۔ سرخ و سفید جلد زرد پڑ گئی اگرچہ ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا، پھر بھی ہر شخص کو ایک ایک لمحہ انتہائی وحشت ناک اور کربناک معلوم ہو رہا تھا۔ بہت سی عورتیں اپنے اپنے بچوں کو سینوں کے نیچے دبائے ہوئے تھیں۔ قدرتی طور پر اس وقت ہر مرد و زن یہی سمجھ

رہا تھا کہ شاید عنقریب اس گاڑی کے مسافروں کا بھی ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔ابھی ہماری ٹرین بیاس کے اسٹیشن میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ رک رہی تھی کہ اچانک کہیں قریب سے ہی رائفل کی گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس کے بعد مزید گولیاں چلیں اور خاموشی چھا گئی۔لیکن اس اثناء میں توبہ استغفار کا ورد تیز ہوگیا۔اور ٹرین میں دبا دب شور مچنے لگا۔ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ اسٹیشن کے پل کے اوپر سے چند آدمی تیزی سے دوڑے ہوئے ٹرین کی جانب آرہے ہیں۔ ابھی دھندلکا اتنا گہرا نہیں تھا کہ کچھ دور سے آدمی کو پہچانا نہ جا سکے۔اس لئے سرمئی دھندلکے میں دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ چند سکھوں کا ایک گروہ تھا جو غالباً پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گاڑی پر حملہ کرنے کے لئے آرہے تھے۔گاڑی کے ساتھ چلنے والی ڈوگرہ فوج نے ہوائی فائر صرف اشارہ دینے کے لئے کیے تھے لیکن غلط فہمی کی بنا پر حملہ آور یہ سمجھ بیٹھے کہ فوجیوں نے ہم پر گولی چلائی ہے۔اسی لئے وہ سب چھپ گئے۔ پھر چند لمحے انتظار کے بعد کچھ آدمیوں کو بات کرنے کے لئے فوجیوں کے پاس بھیجا اور ساتھ ہی ساتھ پھر دوسرے لمحے نیزوں، بھالوں، تلواروں اور کرپانوں سے مسلح وہی سکھ حملہ آوروں کا گروہ، فوجیوں کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہوکر کسی مخصوص اشارہ سے اپنے مزید ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔آناً فاناً سکھوں اور ہندوؤں کی جنوبی یلغار، بے بس ومجبور اور نہتے مسافروں پر ٹوٹ پڑی چونکہ ٹرین کے بیشتر ڈبوں کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند تھے جس کی وجہ سے انہیں کھولنے کے لئے حملہ آوروں کو تھوڑا وقت صرف کرنا پڑا لیکن باہر سے بڑے بڑے پتھروں اور کلہاڑیوں کی مسلسل چوٹیں پڑنے سے ٹرین کے بوسیدہ تختے کب تک محفوظ رہ سکتے تھے۔دوسری طرف وہ کھڑکیاں حملہ آوروں کے بہت کام آئیں، جو پہلے سے کھلی ہوئی تھیں۔ آخر کار تھوڑے ہی وقت میں ہر کمپارٹمنٹ ایک قصاب کی دکان کا منظر پیش کرنے لگا۔ بہت حملہ آور اندر گھس آئے تھے جو تلواروں، نیزوں اور کلہاڑیوں سے نہتے اور بے بس لوگوں پر مسلسل وار کر رہے تھے۔حملہ آوروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو زخموں سے چور مسافروں کو کھینچ کھینچ کر بوگی سے باہر پھینک رہے تھے، جہاں ہر بوگی کے سامنے بہت سے

حملہ آور موجود تھے۔اور جو باہر گرنے والے مردوں عورتوں اور بچوں کے جسموں کے مختلف حصوں کو نہایت بے دردی سے کاٹ کاٹ کر الگ پھینک رہے تھے۔اس کے علاوہ بہت سے حملہ آور ایسے بھی تھے جو گرنے والے زخمیوں کو کھینچ کر پلیٹ فارم پر لے جاتے تھے، جہاں ایک کنواں تھا، کچھ وحشی قسم کے سکھ وہاں پہلے سے موجود تھے، جو بے رحم قصاب کی مانند ہاتھ، پاؤں دھڑ اور سر وغیرہ کو بہت سے ٹکڑوں میں کاٹ کاٹ کر کنوئیں میں پھینک رہے تھے۔عورتوں نے اپنے بچوں کو پہلے ہی سینوں کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔تمام مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔دعا وثناء کی تیز آوازیں آہ وفغاں اور چیخ وپکار میں شامل ہوکر پر ہول سماں پیدا کر رہے تھے۔شیر خوار معصوم بچوں کا رو رو کر تڑپنا دیکھ کر ہمدردانہ دل رکھنے والے ہر انسان کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔شام کے گہرے دھندلکے مزید تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔حملہ آوروں کی اکثریت منہ پر کپڑے باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی خوفناک لگ رہے تھے۔ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ظلم وبربریت کا خوفناک دیوتا آج ہی اپنی خون کی پیاس ہمیشہ کے لئے بجھا لے گا۔

ڈاکٹر امجد علی کی سرگزشت

چودہ نفوس پر مشتمل ہمارا خاندان جس وقت ٹرین میں سوار ہوا تھا، میری عمر تقریباً آٹھ سال تھی، لیکن گھر کے تیار کردہ اصلی گھی، تازہ پھل، باقاعدہ ورزش اور بزرگوں کے بے پناہ شفقت نے مجھے غیر معمولی صحت مند بنا دیا تھا۔جس کی وجہ سے ہر دیکھنے والا میرے متعلق یہی رائے رکھتا تھا کہ میری عمر تقریباً تیرہ یا چودہ سال ہے۔ظاہری طور پر بڑا نظر آنے کے باوجود والدہ کی ممتا بھری ضد کی وجہ سے مجھے بھی لیڈیز کمپارٹمنٹ میں بیٹھنا پڑا تھا۔میرے چچا جو میرے ہم عمر تھے۔میرے ہی ساتھ تھے ٹرین پر حملہ ہوتے ہی میری والدہ نے مجھے اور چچا کو نیچے دبوچ لیا۔ ہمارے علاوہ میری ایک چھوٹی بہن کو بھی انھوں نے چھپایا ہوا تھا، جو صرف چھ ماہ کی تھی۔ چونکہ اس بچی کی صحت بھی بہت اچھی تھی اس لئے وہ ہر وقت کھیلتی رہتی تھی۔لیکن اب جبکہ اسے بھی دبوچ لیا گیا تو وہ بہت زیادہ گھبرا گئی اور پھر اس کی چیخیں بھی بے ہنگم شور میں شامل ہوگئیں وہ وقت ایسا ہولناک اور درد

ناک تھا کہ ہر مرد، عورت اور بچہ اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا، آہ و بکا اور چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ نفسانفسی کے عالم میں تھا خون کا دریا تھا جو پانی کی مانند بے تحاشہ بہہ رہا تھا۔ اور یہی وہ وقت تھا جبکہ بہت سی عورتوں کو اپنے بچوں کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اگرچہ معصوم جگر گوشوں کی دلخراش چیخیں اور آہیں عرش معلیٰ کو بھی لرزاں کرنے کے لئے کافی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے حملہ آوروں نے بے شمار عورتوں اور بچوں کو کاٹ کاٹ کر پھینک دیا۔

اچانک ایک طاقت ور ہاتھ نے میری کلائی پکڑ کر باہر کھینچا، ساتھ ہی تیز قسم کے کئی جھٹکے محسوس ہوئے اور دوسرے لمحے میں کمپارٹمنٹ سے نیچے بے شمار لاشوں اور زخمیوں میں پڑا ہوا تھا۔ نیچے گرنے کے بعد ایسا محسوس ہوا گویا اچانک نیند آ گئی ہو۔ کچھ دیر تک غنودگی طاری رہی اس کے بعد میں خود بخود اپنے ہوش وحواس میں آ گیا۔ حملہ آور ابھی تک قتل عام کر کے اپنی ظالمانہ اور سفاکانہ کاروائی میں مصروف تھے۔ میں نے سوچا اگر ان میں سے کسی کو بھی شک ہو گیا کہ میں زندہ ہوں تو وہ مجھے فوراً ختم کر دیں گے۔ اگرچہ اپنی دانست میں انہوں نے مجھے بھی ختم ہی کر دیا تھا۔ لیکن مشیت ایزدی کو ابھی میری موت منظور نہیں تھی شاید ہندوؤں اور سکھوں کی ظلم و بربریت سے بھرپور کاروائی کو دیکھنے کے لئے قدرت نے مجھے بچا لیا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ خطرہ بھی تھا، کہ ناگہاں مجھے کوئی دیکھ نہ لے اچانک ایک اور وزنی تانبے کا پاندان میرے سر پر گرا۔ یہ پاندان کچھ اس طرح سے گرا تھا کہ اس کا ایک کنارہ میری پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ میں نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ بغیر ہاتھ ہلائے اس پاندان کو اپنی پیشانی سے ہٹا دوں، کیونکہ مجھے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر کسی بھی دشمن کا اٹھا ہوا خطرناک قدم اس پاندان پر پڑ گیا تو یہ میرے سر کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ تمام حقیقت مجھ پر عیاں ہونے کے باوجود میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ایسا کرنا گویا دشمن کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا میں چاروناچار ساکت و جامد پڑا رہا۔

قدرت کی مدد

اچانک ایک سکھ نے میرا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ اور وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے کنویں کی جانب لے جانے لگا۔ ابھی وہ چند قدم بھی نہیں چلنے پایا تھا کہ ایک سکھ تیزی سے دوڑتا ہوا آیا، اور مجھے لے جانے والے سکھ سے اونچی آواز میں جلدی جلدی بولا۔ "مان سنگھ جلدی واپس چلو، پچھلے اسٹیشن سے بلوچ ملٹری کی گاڑی روانہ ہو گئی ہے۔" اتنا سننے سے ہی مان سنگھ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور تمام حملہ آوروں کو اونچی آواز سے واپس چلنے کے لئے کہتا ہوا تیزی سے دوڑتا چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے بعد میری جان میں جان آئی۔ بھیگی بھیگی رات مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکی تھی، قرب وجوار میں پر ہول خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی جھینگروں کی آواز کے ساتھ کسی کمزور اور نحیف زخمی کی ڈوبتی ہوئی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ بیاس ریلوے اسٹیشن کا پل ٹرین کے عین درمیانی حصہ کے اوپر، اندھیرے میں ایسا لگ رہا تھا گویا کسی خوفناک جانور نے ٹرین کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس وقت ٹرین درمیانی ریلوے لائن پر تھی، جس کے دونوں جانب ریلوے لائنیں تھیں۔ ہماری ٹرین کے دونوں جانب تمام بوگیوں کے سامنے لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے انہیں لاشوں میں سسکتے ہوئے شاید کچھ زخمی بھی تھے جن کی کمزور اور نحیف آوازیں کبھی کبھی سکوت کو توڑتی ہوئی زندگی کا احساس دلا دیتی تھیں۔ میں بھی لاشوں کے ایک انبار میں خاموشی سے پڑا ہوا لامتناہی خیالات کے سمندر میں اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن تھا۔ کچھ زخمی ایسے بھی تھے جو تڑپتے ہوئے میرے اوپر آ گئے تھے۔ لیکن میں کسی نئے حملہ آوروں کے خوف کی وجہ سے ہلنے جلنے کو بھی خطرناک سمجھ رہا تھا۔ اچانک ٹرین نے روانگی کے لئے سیٹی دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ لوگ لاشوں اور زخمیوں میں سے نکل کر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ انہی میں کچھ زخمی بھی تھے۔ جو صحیح طور پر چل بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے بھی چاہا کہ جلدی سے اٹھ کر گاڑی میں سوار ہو جاؤں لیکن ۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔ اب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میں تو کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں تھا۔ میرے دونوں گھٹنے بہت بری طرح زخمی تھے۔ میری پیشانی سر، داہنا ہاتھ، اور بائیں کلائی پر

بھی بڑے بڑے زخم تھے کمر اور پسلیوں پر اندرونی چوٹوں کے علاوہ داہنا بازو بھی تقریباً الگ ہو چکا تھا۔ٹرین میں سوار ہونے کے لئے جدو جہد کرنے کی وجہ سے اب مجھے بڑی بڑی چوٹوں کے بارے میں معلوم ہوا۔انہی زخموں اور چوٹوں کی وجہ سے پورا جسم چور چور محسوس ہو رہا تھا۔میں کھسک کر ٹرین کا ہینڈل پکڑنا چاہتا تھا۔لیکن میرے لئے کھسکنا بھی ناممکن تھا آخر کار ٹرین پر چڑھنے والے ایک آدمی سے میں نے مدد کی درخواست کی اس نے مجھے اٹھانا چاہا لیکن قریب سے میری نازک حالت دیکھتے ہی دیکھتے چھوڑ کر خاموشی سے ٹرین میں سوار ہو گیا۔اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی چند لمحے تک تو بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے یہاں کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ لیکن اس وقت مجھے کچھ سکون محسوس ہوا جب اچانک مجھے اپنے قریب سے اپنی پھوپھی کی گریہ و زاری کی دردناک آواز آنے لگی اور میں نے آواز کو پہچانتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ "پھوپھی جان !!! اب ہم تنہا رہ گئے ہیں یہاں سے کیسے جائیں گے گاڑی بھی چلی گئی "پھوپھی جان نے کہا" میں بھی زخمی ہوں، مجھے تو بہت سخت تکلیف ہے، پتہ نہیں صبح تک ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔"اس کے بعد چند باتیں اور کیں اور وہ خاموش ہو گئیں۔غالباً وہ بے ہوش ہو گئیں تھیں۔جس کی وجہ سے مزید بات چیت نہ کر سکیں۔

بلوچ رجمنٹ

اس طرح بیٹھے ہوئے ابھی مجھے تھوڑی دیر گزری تھی کہ اسی ریلوے لائن جس پر کچھ دیر پہلے ہماری گاڑی گزری تھی، پیچھے سے ایک اور ٹرین آتی ہوئی نظر آئی، میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو، یہ بلوچ فوجیوں کی وہی ٹرین ہے جس کے نام سے ڈر کر سارے حملہ آور فرار ہو گئے تھے۔وہ ٹرین آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس جگہ آ کر رکی جہاں ہماری ٹرین کھڑی تھی۔چونکہ فوجیوں کی ٹرین میں روشنی کا مکمل انتظام تھا، نیز یہ کہ ان کے زیر استعمال بڑی بڑی ٹارچیں بھی تھیں۔جن کی مدد سے انہوں نے پورے حالات کا بغور جائزہ لیا۔انہوں نے اپنے کچھ فوجی دستے اسٹیشن پر تعینات کئے اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔تھوڑی دیر کے بعد ایک فوجی جوان پل پر چڑھ گیا اور چھوٹے میگا فون

کے ذریعہ اعلان کیا۔:"اب سے صبح چھ بجے تک کے لئے اسٹیشن کی حدود میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اگر اس مقررہ وقت میں کوئی شخص اس علاقہ میں پایا گیا تو اسے گرفتار کر لیا جائیگا مزاحمت یا خلاف ورزی کی صورت میں بھی گولی ماری جا سکتی ہے۔لہٰذا اس اعلان کو سننے والے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ فوری طور پر اسٹیشن کی حدود سے باہر چلا جائے" یہ اعلان سنتے ہی میں اپنی پھوپھی کو آواز دینے لگا۔پھر نحیف آواز میں ان کا جواب پا کر میں نے کہا۔"اب ہم یہاں سے کیسے جائیں گے۔ہم تو کھڑے بھی نہیں ہو سکتے، یہ فوجی تو ہمیں بھی پکڑ لیں گے"

پھوپھی جان کا جواب تو مجھے یاد نہیں، البتہ اتنا یاد ہے کہ چند فوجی جوان میری آواز سن کر قریب آ گئے تھے۔اور ٹارچ سے میرے زخم وغیرہ دیکھ کر فوراً ہی اسٹریچر پر لٹایا اور پلیٹ فارم پر لے گئے۔پھر تھوڑی دیر کے بعد مجھے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہی۔اس وقت مجھے تھوڑا تھوڑا ہوش تھا، جب اسٹریچر پر ڈال کر کسی ہسپتال میں لے کر جایا جا رہا تھا۔نہ معلوم دن کا کونسا وقت تھا جب ہسپتال کی کھڑکیوں سے دھوپ کی کرنیں ہلکی ہلکی دیکھی جا سکتی تھیں، لیکن غنودگی کی زیادتی کی وجہ سے میں اچھی طرح نہیں دیکھ پا رہا تھا۔نیم غنودگی کے عالم میں اکثر لوگ (جو غالباً سوشل ورکر تھے) مجھ سے میرے والدین اور دیگر عزیز و اقارب کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ یہ تمام معلومات ریڈیو اور اخباروں میں نشر اور شائع کی جائیں گی۔میرے استفسار پر بتایا گیا کہ "اب میں لاہور کے میو ہسپتال میں ہوں۔مختلف امداد باہمی پارٹیوں اور نیشنل گارڈز کے ممبران ہسپتال کے اسٹاف کے ساتھ مل کر مریضوں کو ہر قسم کی امداد اور معلومات بہم پہنچانے میں مصروف ہیں تمام سوشل ورکر کوشش کرتے ہیں کہ وہ حاصل کردہ تمام معلومات اور دیگر کوائف کو مختلف ذریعوں سے پورے ملک میں پہنچا دیں۔جس کے نتیجہ میں امید کی جاتی ہے کہ متاثرہ زخمی کا کوئی عزیز اس خبر اور معلومات کے سہارے اپنے بچھڑے ہوئے عزیز سے آ کر مل جائے۔میرے معلوم کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ "بلوچ ملٹری کی ٹرین کے ساتھ ساتھ روڈ پر فوجی ٹرک بھی چل رہے تھے، وہ مجھے اپنے ٹرک میں ڈال کر لاہور کے اس ہسپتال میں لے آئے

تھے۔اس کے علاوہ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ "اسی ہسپتال کے کسی زنانہ وارڈ میں میری پھوپھی جان بھی زیرِعلاج ہیں" میرے متعلق معلومات جمع کر کے وہ لوگ پورے ملک میں پھیلاتے رہے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک کسی عزیز یا رشتہ دار کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔عیدالاضحیٰ سے صرف دو روز پہلے کی ایک دوپہر کو جبکہ وارڈ کے دروازے پر میری ٹکٹکی لگی ہوئی تھی۔تقریباً تمام مریض میٹھی نیند کی حسین وادیوں میں گم تھے۔صرف چند ایک ایسے تھے جو میری طرح خیالات کی دنیا میں رہتے تھے۔دوسروں کے مرکزی خیالات کیا کیا تھے؟ اب جبکہ دو روز بعد عیدالاضحیٰ کا قومی تہوار خوشیوں کا گہوارہ لے کر آ رہا تھا۔میرے لئے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔کیونکہ اس سے قبل ہم نے کبھی بھی کوئی تہوار بچھڑے ہوئے انداز میں نہیں منایا تھا۔

والد سے ملاقات

اچانک دروازے میں ایک شخص نمودار ہوا اس کے جسم پر نہایت ہی بوسیدہ قسم کا لباس تھا۔کئی جگہ سے پھٹا کُرتا اور پیوند لگی ہوئی پرانی لنگی باندھے ہوئے تھا سر کے بال بہت چھوٹے اور شیو قدرے بڑھا ہوا تھا۔پیروں میں ٹوٹی ہوئی چپل کے اوپر مٹی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔وہ شخص دروازے میں کھڑے ہو کر، نہایت احتیاط اور غور سے پورے وارڈ کا جائزہ لینے لگا اس کی مغموم نگاہیں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ایک ایک بستر کے مریض کا بغور جائزہ لے رہی تھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا وہ شخص کسی مریض کا متلاشی تھا۔ابھی تک وارڈ کے دروازے پر کھڑا ہوا، خاموش نگاہیں تمام اطراف میں گھما رہا تھا اور پھر اچانک اس کی اداس اور بے قرار نظریں، میری منتظر نگاہوں سے ٹکرائیں اور وہ مجھے مسلسل دیکھتی ہوئی گویا پتھرا گئی تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے میرے دل و دماغ میں ایک بجلی سی کوندنے لگی اور دل کے کسی حساس گوشے سے آواز آئی۔"یہی ہیں۔ بالکل یہی ہیں تیرے والد جلدی سے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ جا" دل کی اس آواز کے ساتھ ہی میرے لرزتے ہونٹوں سے از خود نکل گیا۔" کاش میرے والد یہی ہوں " شاید اللہ تعالیٰ نے میرے درد بھرے دل سے نکلی ہوئی یہ دعا قبول کر لی تھی، اسی لئے وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا

میرے قریب آ گیا اور چند لمحے تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہنے کے بعد اچانک دونوں بغل گیر ہو گئے۔اور پھر بوجھل پلکوں میں چھپا ہوا آنسوؤں کا وہ سیلاب جو ایک عرصہ سے بہنے کے لئے موج در موج زور لگا رہا تھا۔زور و شور کے ساتھ بہہ نکلا۔ادھر والد صاحب کا بھی کچھ یہی حال تھا ہچکیاں لیتے ہوئے وہ مجھے دیر تک پیار کرتے رہے۔کچھ دیر تک اسی حالت میں رہنے کے بعد میں نے انہیں پھوپھی جان کے متعلق بھی بتا دیا کہ وہ بھی میرے سامنے اسی ہسپتال میں لائی گئی تھیں۔جملہ معلومات فراہم کرانے کے بعد میں نے والد صاحب سے، بہن بھائی، اور دیگر عزیزوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں تو انہوں نے بتایا۔''جس وقت ٹرین پر حملہ ہوا، ہم نے بھی مقابلہ کرنا چاہا تھا، لیکن دشمن کی تعداد زیادہ تھی ہم لوگ نہتے ہونے کے باعث اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔دشمن سے ناکام ہونے کے بعد مجھے موقعہ ملا کہ اور میں تیزی سے کمپارٹمنٹ کے نیچے گھس کر اندر ہی اندر گھسٹ کر چلتا ہوا۔ملٹری والوں کی بوگی کے سامنے پہنچ گیا۔اور ڈوگرہ ملٹری والوں سے امداد کی درخواست کی۔لیکن ملٹری والے چونکہ دشمن کی حکومت سے تعلق رکھتے تھے۔اس لئے امداد دینے کے برعکس مجھ پر ہی فائر کر دیا۔

جان کیسے بچی

حملہ آوروں اور ملٹری والوں کا ملا جلا رویہ صاف ظاہر کر رہا تھا، کہ وہ سب باہمی رضا مندی اور خصوصی معاہدے کے تحت قتل و غارت گری کر رہے ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ میں نے نیچے لیٹے لیٹے کئی آدمیوں کو دیکھا، جو ملٹری والوں سے امداد حاصل کرنا چاہتے تھے۔اور جب ہماری ٹرین چلنے لگی تو میں بوگی کے نیچے لگی ہوئی لوہے کی ایک موٹی پلیٹ سے لپٹ کر اس کے اوپر لیٹ گیا۔پھر میں اس وقت نیچے سے باہر نکلا جب مجھے امرتسر میں اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ پیچھے سے آنے والی بلوچ ملٹری کی گاڑی کے فوجیوں نے پہلی گاڑی کا مکمل کنٹرول خود سنبھال لیا تھا اور پھر نہایت احتیاط سے بچے کھچے زخمیوں کو لاہور پہنچایا تھا۔لاہور اسٹیشن پہنچنے کے بعد میں نے تمام گاڑی چھان ماری، لیکن تمہارے دادا کی لاش کے علاوہ کسی کا پتہ نہ مل سکا۔تمہارے دادا کی پیشانی

اور پیٹ پر کاری ضرب لگنے کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوئی تھی۔ کچھ دیر تک اسٹیشن پر تلاش کرنے کے بعد تمہاری والدہ بھی زخمی حالت میں مل گئی تھیں۔ اگرچہ ان کے زخم زیادہ گہرے نہیں تھے۔ لیکن تمہاری جدائی کے صدمے نے ان کی ذہنی اور دماغی حالت خراب کر دی تھی۔ تمہارا چھوٹا بھائی، ایک فرشتہ صفت مسافر کے پاس سے بحفاظت مل گیا تھا۔ اس آدمی نے اس وقت بچے کو اپنی گود میں اٹھالیا تھا جب متاثرہ ٹرین بیاس اسٹیشن سے روانہ ہو رہی تھی۔ خدا کے فضل و کرم سے تمہارے بھائی اور تمہاری والدہ کو زیادہ چوٹیں نہیں لگی تھیں۔ اور اب وہ راولپنڈی کے قریب ایک چھوٹے سے شہر "فتح جنگ" میں کچھ نئے عزیزوں کے ہمراہ مقیم ہیں"۔ تمہاری والدہ نے کہا جب افراتفری زیادہ مچی تو حملہ آوروں نے مجھے اور بے شمار دوسری نوجوان و خوبصورت عورتوں اور لڑکیوں کو پکڑ پکڑ کر پلیٹ فارم پر بٹھا دیا۔ جہاں بہت سے دوسرے سکھ حملہ آور ان سب کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے تو میں بیٹھے بیٹھے کھسکتے ہوئے نہایت آہستگی سے پلیٹ فارم سے نیچے کود گئی اور سانس روک لیا انتہائی خاموشی اور ساکت انداز میں لیٹ گئی، تاکہ دیکھنے والا ہر شخص مجھے مردہ تصور کرے۔ چھوٹی بچی "مبینہ" جو صرف چھ ماہ کی تھی۔ ابھی تک میری چھاتی سے چپکی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے لیٹے لیٹے جب بچی کو کچھ سکون محسوس ہوا تو وہ کھیلنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ چونکہ اس کے پیروں میں چھوٹی چھوٹی پازیب پڑی ہوئی تھیں، اس لئے کھیلنے سے آواز پیدا ہونے لگی۔ میں نے کوشش کی کہ اس کے پیر پکڑ لوں تاکہ آواز بند ہو جائے لیکن بچی بھی جیسے کھیلنے کے لئے بضد ہو گئی تھی۔ وہ پکڑے جانے کے بعد اب رونے کی کوشش بھی کرنے لگی۔ میں نے اسے چپ کرانا چاہا، لیکن بے سود۔ اس آواز کو روکنے کی جدوجہد کو کسی دشمن نے بھی سن لیا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور آتے ہی اپنا نیزہ بچی کے سینے میں پیوست کر دیا، نیزہ کی انی بچی کے سینے سے پار ہو کر میری پسلیوں کو بھی پار کر گئی، لیکن میں بالکل خاموش اور ساکت پڑی رہی۔ دشمن نے دوسرا نیزہ بچی کے پھر مارا اور بچی کی معصوم جان قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

پھر جب ٹرین روانہ ہونے لگی تو میں نے بچی کو آخری بوسہ دیا اور معصوم لخت جگر کی لاش

کو آہستہ سے نیچے رکھ دیا اور آنسو بہاتی ہوئی ٹرین میں سوار ہو گئی اور اس طرح میں لاہور پہنچ گئی۔

اب والد صاحب نے اپنا حال بتاتے ہوئے مزید کہا: ''جس وقت سامان کی شناخت کا سلسلہ جاری تھا، میں تمہیں، تمہاری والدہ اور دوسرے عزیزوں کو مختلف مقامات پر تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اور کافی دیر کے بعد تمہاری والدہ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہارے دادا کی تدفین کرائی اور مہاجرین کے لئے قائم کئے گئے کیمپ میں چلے گئے۔ تقریباً روزانہ یہ خبریں ملنے کے بعد کہ آج فلاں جگہ نئے مہاجر آئے ہیں، تو کل دوسری جگہ پہنچے ہیں۔ میں بھی روزانہ شہر کے مختلف مقامات پر قائم کردہ کیمپوں میں جا کر تمہیں تلاش کرتا تھا۔

والد صاحب کی باتیں سن کر اس وقت تو میں خاموش ہو گیا لیکن دوسرے دن قطعی فیصلہ کے انداز میں ان سے کہا۔" آج میں ڈاکٹر سے چھٹی کے لئے کہوں گا پھر ہم جلدی ہی امّی کے پاس روانہ ہو جائیں گے۔ آپ پھوپھی جان سے بھی کہدیں کہ وہ بھی اپنے ڈاکٹر سے چھٹی لے کر روانگی کی تیاری شروع کر دیں" اگرچہ یہ حقیقت تھی کہ ابھی میرے زخم اچھی طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ اب میں کسی سہارے کے ذریعہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کر سکتا تھا۔ پھوپھی جان کے زخموں کے متعلق پہلے ہی اس قسم کی خبر مل چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے چھٹی لینے کا فیصلہ خود ہی کر لیا تھا۔ وہ ذیقعد کی ۱۶ تاریخ تھی جب ہم تینوں (میں والد صاحب اور پھوپھی جان) ٹرین کے ذریعہ پنڈی کے لئے سفر کر رہے تھے۔ کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا میں دور خلاؤں میں ماضی قریب کے حالات و واقعات کو تسلسل دے رہا تھا۔ ٹرین کے تمام واقعات فلم کی مانند میری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اچانک دل میں یہ خیال بجلی کی مانند کوند گیا میں تو آج اور ابھی ان سے ملنے جا رہا ہوں، صرف چند گھنٹوں کی جدائی تو باقی ہے اس کے بعد تو یہ خاندان دوبارہ یکجا ہو جائے گا خواہ دو ماہ تک منتشر رہنے کے بعد ہی کیوں نہ ملے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب یہ زخم خوردہ خاندان، تندرست و توانا اور صحت مند چودہ افراد کے بجائے صرف پانچ نفوذ پر ہی مشتمل رہ گیا ہے۔ (۳۳)

عینی شاہد

گڈھ مکتیشر کے خونیں واقعات کے متعلق جناب حفیظ صفوی (متعلقہ دفتر سی۔ایم۔اے۔ راولپنڈی ۱۹۵۱ء) بیان کرتے ہیں:

"میرے ایک عزیز میرٹھ میں پولیس انسپکٹر تھے۔ ہنگامے کے بعد مجھے انکے ساتھ گڈھ مکتیشر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت غنڈے پولیس اور فوج کی حفاظت میں گڈھ سے واپس جارہے تھے اور گڈھ مکتیشر سے شاہدرے تک پولیس متعین کردی گئی تھی تاکہ ان غنڈوں سے ان کے سیاہ اعمال کا کوئی احتساب نہ کرسکے۔ گڈھ مکتیشر میں مسلمانوں کی ہزاروں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ قصبہ کی مسجد میں کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں لاشیں نہ ہوں۔ وہ نالی جہاں وضو کیا جاتا ہے، اس میں سے کئی انچ خون منجمد تھا۔ مسجد کے صحن میں لاشوں کو دبانے کے لئے ایک بڑا سا گڑھا کھودا جارہا تھا دو باؤلیاں لاشوں سے اَٹی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹے سے تالاب میں لاشوں کا انبار لگ رہا تھا، تالاب کے گرد دیوار کی تعمیر کے لئے بنیاد کھودی جارہی تھی، وہ لاشوں سے بھری ہوئی تھی۔ سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ پولیس اسٹیشن کی دیوار کے قریب بھی لاشوں کے ڈھیر تھے۔ مکانوں سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ ان واقعات کے بعد میرٹھ میں بھی حالات بگڑتے اور تقریباً ایک سال تک چھ سات مسلمان ہر روز قتل کردئے جاتے تھے جن میں غریب مزدور یا رکشا والے زیادہ تھے۔ ان غریبوں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے آتیں اگر کوئی وارث ہوتا تو بدقت اسے لاش مل پاتی ورنہ بیشتر لاشیں مہتروں کے حوالے کردی جاتیں۔ میرٹھ کے چند مسلمان جنھیں میرے دفتر کے بھی کچھ آدمی شریک تھے، لاوارث مقتولین کی تکفین وتدفین کرتے تھے۔ ہمارے اس کام میں پوسٹ مارٹم ہاؤس کے ایک مہتر اور چپراسی نے بہت مدد کی۔ انہی دنوں ایک نوجوان کی لاش ملی جس کو تیزاب ڈال کر اور بلم مار مار کر قتل کیا گیا تھا۔ اسکے ورثاء نے ہمیں بتایا کہ اس نوجوان نے بھی سات کافروں کو جہنم واصل کیا بالآخر شہید ہوا۔ گڈھ کے قتل عام کی تفتیش کے لئے پولیس کا جو اسپیشل اسٹاف مقرر کیا گیا تھا اس میں مسلمان زیادہ تھے اور میں اپنے رشتے دار انسپکٹر

کے ساتھ گیا تھا۔ ایک گاؤں میں تحقیقات کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک دیہاتی بھاگتا ہوا آرہا ہے مگر پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ دراصل گاؤں والوں کی مدد لینے کے لئے آیا تھا، لیکن بات بنا کر کہنے لگا۔ "جو رمسلمانوں نے ہم پر دھاوا بول دیا ہے، ہماری مدد کی جائے۔" پولیس والے فوراً ٹرک لے کر اس ہندو دیہاتی کے ساتھ روانہ ہوئے ہم نے دیکھا کہ ایک ہندو بلم پر لگا ہوا خون صاف کررہا ہے۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بھاگ گیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ دو لاشیں کوڑے کے اندر پھڑک رہی ہیں، کوڑا ہٹا کر لاشوں کو نکالا تو وہ ٹھنڈی ہوگئیں۔ ایک ہندو دیہاتی کو ایک بوڑھی مسلمان عورت کے کان ناک وغیرہ سے زیور نوچتے ہوئے گرفتار کیا گیا۔ غرضیکہ کئی غنڈے گرفتار کرکے میرٹھ لائے گئے لیکن ضمانت پر رہا کرالئے گئے۔ ضلع بلند شہر کے ایک جاٹ کے ہاں سے ایک لڑکی برآمد کی گئی اس کی عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ لڑکی کی حالت ناگفتہ بہ تھی اس کا ایک قدم چلنا محال تھا۔ (تفصیل ناقابل تحریر ہے) وہ صبح تکلیف کی شدت سے بے ہوش رہتی تھی۔ لیکن سول سرجن نے اپنی رپورٹ میں اسے بالغ اور فاحشہ وغیرہ تحریر کیا۔ (۳۴)

ڈاکٹر ہارون رشید شہید کی بیوی کے ساتھ کیا گزری

گڈھ مکتیشر کے لکھی میلے میں ڈاکٹر ہارون رشید محکمۂ صحت کے انچارج تھے۔ وہ بے چارے حالات سے بے خبر اپنے فرائضِ منصبی ادا کررہے تھے، ان کو بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کردیا گیا۔ ان کی اہلیہ کے کپڑوں کو تار تار کردیا گیا اور حکم دیا کہ غنڈوں اور قاتلوں کے موقعِ واردات پر موجود گروہ میں سے کسی شخص کو بطور شوہر ثانی منتخب کرلیں۔ جب انھوں نے سختی سے انکار کیا تو ظالموں نے بے دردی کے ساتھ زدوکوبی کا سلسلہ شروع کیا اس بے بسی کے عالم میں اسلام کی اس مایہ ناز بیٹی نے قریب بہتی ہوئی گنگا کی آغوش میں پناہ لے کر عصمت وعفت بچالی، وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں خاصی دور بہتی چلی گئیں۔ اتفاقاً کسی دردمند انسان کی نظر پڑی اس نے باہر نکالا، زندگی کی رمق باقی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا معجزہ دکھایا اور بچ گئیں۔ رئیس احمد جعفری مرحوم نے اپنی کتاب "تاریخ مسلم لیگ" میں لکھا ہے کہ وہ اپنے وطن لاہور میں مقیم ہیں۔ (۳۵)

ایک بہن کی فریاد

محترمہ جوہر سلطانہ صاحبہ ہیڈ مسٹریس گورنمنٹ گرلز پرائمری اسکول کلیٹن روڈ ۔ کراچی ۔(ساکن جہانگیر روڈ، ایسٹ)امرتسر کی مہاجرہ ہیں ۔آپ کا کل خاندان امرتسر میں شہید ہوا، اُن کی دردانگیز سرگزشت درج ذیل ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷کو پاکستان وجود میں آیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ حکومت بنادی تا کہ مسلمان آرام سے زندگی بسر کرسکیں لیکن یہ پاکستان ہزاروں مسلمانوں کے خون سے وجود میں آیا ہے۔ ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوئیں، سینکڑوں بہنیں اپنے محبت کرنے والے بھائیوں سے چھوٹ گئیں ۔۱۴اگست کا دن میرے لئے ایک مصیبت کا دن ہوتا ہے۔ ہر طرف سے خوشی کے نعرے بلند ہوتے ہیں، فوجی بینڈ بجاتے ہیں، توپوں سے سلامی دی جاتی ہے، تمام اسکول اور کالج بند ہوتے ہیں ۔اور کیوں نہ ہوں اس دن ہمارا پیارا پاکستان بنا تھا۔لیکن میں اپنے پیارے بھائیوں اور ماں باپ کو یاد کر کے روتی ہوں، ان کے معصوم اور بے گناہ چہرے میری آنکھوں میں گھومتے ہیں ۔کاش وہ زندہ ہوتے اور پاکستان بننے کی خوشیوں میں شریک ہوتے ۔لیکن نہیں ۔ایسا نہیں، ان کو شہید ہو کر اپنے پاک خون سے پاکستان کی جڑیں مضبوط کرنا تھیں، اس پاکستان کی بنیادوں میں میرے چاہنے والے بھائیوں اور والدین کا خون بھی شامل ہے۔

میرے بھائی گورنمنٹ سرونٹ تھے اور محکمہ ءِ تعلیم میں کیشئر تھے ۔تمام کیش انکی تحویل میں رہتا۔ یہی وجہ تھی جو انھوں نے اپنی ڈیوٹی پر گورنمنٹ کے کیش کی حفاظت کرتے ہوئے جان دی، انھوں نے اپنے فرض پر جان قربان کردی لیکن اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے ۔۱۴ اگست کی شام کو بھائی جان چپراسی اور چوکیدار کے بیوی بچے پناہ کی غرض سے ہمارے گھر میں آ گئے، میرے بھائی جان نے ان کی حفاظت کی ۔ہم ایسی جگہ رہ رہے تھے جہاں مسلمان کم تھے اور سِکھ بہت زیادہ، اُن سے ہمارے گھرانے کے تعلقات برادرانہ تھے، ہمیں ان سے کوئی خوف یا خطرہ نہ تھا، انھوں نے

ہمارے جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ جب یہ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے آئے تو تمام محلے میں شور مچ گیا کہ مسٹر کاظمی نے مسلمانوں کو ہمارے اوپر حملہ کرنے کے لئے بلایا ہے، تمام اکٹھا ہو کر بھائی صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے ۔" کیا تم نے مسلمانوں کو ہمارے اوپر حملہ کرنے کے لئے بلایا ہے؟ " بھائی جان نے جواب دیا۔" میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں، یہ لوگ صبح ہوتے ہی چلے جائیں گے، آپ لوگ بالکل فکر نہ کریں ۔" تمام رات ہم نے پریشانی کے عالم میں گزاری۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ہم لوگوں نے سحری کھا کر روزہ رکھ لیا۔ شہر کے حالات سن سن کر میرا بُرا حال تھا، خوف سے دل دھڑک رہا تھا اور آنکھوں سے ایک نہ تھمنے والا سیلاب رواں تھا۔ میرے دونوں بھائی اور ابا جان مجھے پیار کرتے اور دلاسا دیتے کہ " جب تک ہم زندہ ہیں، کوئی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اس وقت میری عمر ۱۴ سال کی تھی ۔صبح ہوتے ہی سب کاموں میں مشغول ہو گئے ۔ہم نے سامان باندھ لیا کہ آج لاہور روانہ ہو جائیں گے ۔ بھائی جان کا ایک سکھ دوست آیا اور کہنے لگا کہ " آپ لوگ کہیں نہ جائیں، دو بجے میں آپ سب کو اپنی گاڑی میں اسٹیشن چھوڑ آؤں گا۔" یہ بھائی جان کا جگری دوست تھا اور ہمارے گھر کے بالکل برابر رہتا تھا۔ اس کی بہن میری ہم جماعت اور بہترین سہیلی تھی ۔کیوں کہ جمعۃ الوداع تھا، لہذا سب نے نہا دھو کر نئے کپڑے زیب تن کئے اور گھر میں ہی نماز ادا کی ۔ دو بجے کے قریب بھائی جان کا چوکیدار دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا۔" بابو جی سِکھ آ گئے ۔ وہ کرپانیں لئے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ گیٹ کھول دو ورنہ آگ لگا دی جائے گی ۔" میرے والد صاحب، بڑے بھائی اور والدہ روزے اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے ذرا کچھ سونے لگے تھے، جاگ اُٹھے ۔ بھائی جان مجھے ساتھ لے کر دوسری دیوار پر گئے جہاں ان کا دوست اور میری سہیلی رہتی تھی ۔اسنے کھڑکی کھولی اور یہ کہہ کر فوراً بند کردی کہ " ہمارے گھر نہ آنا کہیں اور چلی جاؤ۔" میں بڑی پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں دیوار کود کر اپنی ایک ٹیچر کے گھر چلی گئی جو ہمارے گھر کے پیچھے رہتی تھیں ۔ میری یہ ٹیچر سکھ تھیں اور ان کی لڑکی میری سہیلی، انھوں نے میری آواز سن کر دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں چُھپا کر باہر سے کُنڈی لگا

دی۔میرے بھائی جان اور والد صاحب نے محلّہ کے ایک گھر میں پناہ لی جہاں انھیں شہید کر دیا گیا لیکن میں یہی سمجھتی رہی کہ جس طرح میں چھپ گئی ہوں، اسی طرح وہ بھی چھپ گئے ہوں گے۔دوسرے دن سِکھ ملٹری کی گاڑیوں میں ہمارے محلّہ میں آئی۔یہ فوجی، جوان لڑکیوں اور عورتوں کو پکڑ کر لے جانے کی غرض سے آئے تھے۔محلے کے لوگوں کو بلا کر اس افسر نے کہا۔"تم نے مسلمانوں کی لڑکیوں کو پناہ دی ہے ان کو باہر نکالو ورنہ تمھارے گھروں میں آگ لگا دی جائے گی۔"میری ہمدرد ٹیچر نے مجھے ایک دھوبی کے گھر پہنچا دیا۔وہاں میلے کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا میں کپڑوں کے ایک ڈھیر میں چھپ کر بیٹھ گئی اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دل میں دعا کر رہی تھی کہ " یااللہ! واسطہ تجھے تیرے حبیب علیہ الصلاۃ والسلام کا مجھے ان دشمنوں سے بچالے اور میرے پیارے بھائیوں کی جان بچالے۔" تھوڑی دیر بعد سِکھ فوجی چلے گئے اور میری ٹیچر نروَیدن کور (گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول امرتسر) مجھے اپنے گھر لے آئیں جہاں میں ۱۵ یوم تک رہی۔اس عرصے میں بھائیوں کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔(میری محسنہ نے معلوم کرلیا تھا مگر مجھے نہیں بتایا)

ایک روز بلوچ رجمنٹ "امرتسر ہسپتال" سے زخمی مسلمانوں اور مریضوں کو لینے آئی تو میری ٹیچر نے کہا کہ "تم اگر پاکستان جانا چاہو تو ہم تمھیں بھیج دیں۔"میں نے اقرار کرلیا اور انھوں نے مجھے بلوچ رجمنٹ کے ہمراہ پاکستان بھیج دیا۔یہ گاڑیاں میو ہسپتال لاہور میں آئیں۔ تمام مریضوں اور زخمیوں کے رشتے دار اُن کو لینے کے لئے آئے، لیکن مجھے لینے کے لئے کون آئے؟ کوئی ہو تو آئے۔ڈرائیور نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔"بیٹی تم کہاں جاؤ گی؟" میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔"میں کہاں جاؤں میرا کوئی نہیں ہے نہ میں کسی سے واقف ہوں، لیکن ہاں صرف یہ جانتی ہوں کہ یہ پاکستان ہے، مسلمانوں کا اپنا ملک۔۔۔"اتنے میں میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ میو ہسپتال ہے، شاید یہاں ڈاکٹر امیر الدین صاحب میرے بھائی کے جاننے والے موجود ہوں۔میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کا پتہ معلوم کردو۔" ڈرائیور نے ان کو بلایا۔ڈاکٹر صاحب میرے حالات سن کر بہت

رنجیدہ ہوئے اور انھوں نے مجھے اپنے گھر بھجوا دیا جہاں میں اپنی سہیلیوں کے ہمراہ بہت آرام سے رہی اور اپنے بھائیوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ نہ ملے۔کچھ عرصے بعد میرے رشتے داروں کو پتہ چلا اور وہ مجھے کراچی لے آئے۔یہاں آکر میں گورنمنٹ اسکول میں ملازم ہوگئی۔ اس زمانے میں اَن ٹرینڈ ٹیچر کو ملازمت دی جاتی تھی میں مس حسین صاحبہ سے جو نہایت ہمدرد خاتون تھیں، ملی وہ میرے حالات سن کر رونے لگیں اور انھوں نے مجھے ملازمت دلوادی۔کراچی آکر میں نے اپنی سہیلی راج کرنی (امرتسر میں) کو اپنے بھائیوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے خط لکھا۔اس نے جواب دیا، میرے پیارے بھائیوں کے بارے میں تحریر کیا کہ ان کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور لاشوں کو جلا دیا گیا۔اب رہی سہی امید بھی ختم ہوئی، پہلے تو دن رات انتظار کیا کرتی تھی کہ شاید وہ آجائیں اور مجھ سے آکر مل لیں لیکن افسوس وہ مجھے نہ مل سکے۔اب بھی یہ خیال ہے کہ شاید میرے پیارے بھائی آجائیں۔(۳۶)

نہ خط آتا ہے کوئی نہ خبر معلوم ہوتی ہے
نہ جانے کب اب وہ ساتھی کونسی بستی میں بستے ہیں

جالندھر کے خونیں واقعات

جالندھر شہر اور اس کے مضافات پر ۱۹۴۷ء کے خوفناک ایّام میں کیا گزری، یہ روزنامہ ڈیلی ٹیلی گراف لندن کے نامہ نگار خصوصی کی زبان سے سنیئے:

آج (۲۲ اگست ۱۹۴۷ء) میں جالندھر پہنچا۔ یہ شہر ایک ہنستا بولتا صاف ستھرا مقام تھا، لیکن اب یہ مُردوں کی بستی ہے۔ جس کی فضائیں شعلوں اور دھوئیں کے مرغولوں سے محصور نظر آ رہی ہیں۔ یہاں پیر کے دن ۱۸ اگست کو (یوم عیدالفطر) ہلاکت کا قصہ شروع ہوا اور منگل کے روز اپنی معراج پر پہنچ گیا۔ سرحدی فوج کے نوجوان مسلم کپتان نے مجھے شہر کے دروازے پر روکا۔ اس نے کہا "اس شہر میں حالات قابو میں رکھنے سے ہماری جمعیت جونا کافی ہے، قاصر رہ گئی ہے۔ مقامی حکام فتنہ و فساد کرنے والوں کی امداد کر رہے ہیں۔ اگر آپ شہر میں جانا چاہتے ہیں تو اپنی ذمّہ داری پر جا سکتے ہیں۔" میں کار میں سوار تھا۔ شہر میں داخل ہو گیا، میں نے دیکھا کہ ہر کوچے اور ہر بازار میں سِکھ اپنی تلواریں لہراتے ہوئے پھر رہے ہیں اور مسلمانوں کے مکانات کو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا رہے ہیں۔ پنڈت نہرو کی پولیس کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے۔ اور ایک چوراہے پر بچے کھچے مسلمان جمع ہو رہے ہیں۔ ایک لاکھ بیس ہزار کی مسلم آبادی میں سے یہی مٹھی بھر لوگ باقی رہ گئے تھے۔ قریب کے کوچے سے آگ لگانے والوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، وہ ان گھروں کو جنھیں یہ مسلمان چھوڑ آئے تھے، لوٹ رہے تھے اور نذرِ آتش کرتے جاتے تھے۔ عام اندازہ یہ ہے کہ جالندھر شہر میں دو دن کے اندر تقریباً ایک ہزار مسلمان تہہ تیغ کئے گئے۔ اس تعداد میں سے نصف وہ لوگ ہیں جو منگل کی شب کو گھروں میں سوتے ہوئے زندہ جلا دیئے گئے۔

جالندھر کے مضافات:

لندن ٹائمز کے نامہ نگار کا بیان مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء حسب ذیل ہے۔

"ان دنوں مشرقی پنجاب میں قتل عام، ہلاکت اور بربادی کا جو طوفان برپا ہے، وہ جنگ کے دہشت ناک مناظر سے کئی ہزار گنا زیادہ ہولناک ہے، یہ ایک عام رائے ہے جو فوج کے

برطانوی اور ہندوستانی افسر اپنے چشم دید حالات کی بنا پر ظاہر کر رہے ہیں سِکھ اندھا دھند مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں اور وہ مشرقی پنجاب کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کر رہے ہیں۔ روزانہ سینکڑوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ ہزاروں کو مغرب کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ غیظ و غضب میں اسقدر اندھے ہو رہے ہیں کہ کہیں کہیں اپنے مکانوں کو بھی نذرِ آتش کر دیتے ہیں۔ (غالباً ملی جلی آبادی میں ایسے واقعات ہو رہے ہوں گے) سفّاکی کے اس کھیل کو اونچے طبقے کے سکھ لیڈروں نے منظّم طور پر چلایا ہے۔ امرتسر اور جالندھر جیسے بعض بڑے بڑے شہروں میں اب خاموشی طاری ہے کیونکہ وہاں ایک بھی مسلمان متنفس باقی نہیں رہا۔ میں نے ہفتے کے آخری دن ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دیکھ بھال کی، مجھے کوئی پچاس گاؤں جلتے نظر آئے۔ سکھوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ ان کا جتھا جو پچاس سے لے کر دو سو افراد پر مشتمل ہوتا ہے کسی گوردوارے میں جمع ہو جاتا ہے اور اکا دُکا مسلمانوں کو قتل کرنے کی وارداتیں شروع کر دیتا ہے۔ بہت سے جتھے سکھ ریاستوں سے آ کر اُدھم مچاتے ہیں۔ ہر جتھے کے پاس دو چار رائفلیں، فوجی یا دیسی ساخت کے بم، نیزے اور بھالے، ٹوکے، تلواریں اور کرپانیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس لاٹھیوں کے سوا دوسرا کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ جب سِکھ مسلمانوں کے کسی گاؤں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو مسلمان گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر نقارے بجاتے ہیں تاکہ گردونواح کے مسلمان انکی مدد کے لئے آ جائیں، وہ سکھ حملہ آوروں پر اینٹیں اور پتھر پھینکتے ہیں لیکن سِکھ رائفلوں سے فائرنگ کرتے ہیں تاکہ مسلمان چھتوں سے اتر جائیں، حملہ کی دوسری لہر میں مسلمانوں کے گھروں پر بم پھینکتے ہیں اور جب مسلمان گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگنے یا چھپنے کی کوشش کرتے ہیں تو سِکھوں کا جتھا ان پر ٹوٹ پڑتا ہے اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو جاتا ہے۔ حملہ آوروں کی ایک ٹولی جو لمبی لمبی داڑھیوں والے پینشن خور بوڑھے فوجیوں پر مشتمل ہے مشعلیں ہاتھوں میں لئے آگے بڑھتی ہے، یہ بوڑھے مکانوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ گھروں میں چھپے ہوئے مسلمان جان بچانے بھاگتے ہیں تو گھڑسوار سکھ انھیں قتل کر دیتے ہیں۔

یہ قاتل سورمے انتہا درجے کے بزدل ہیں۔لیکن یہ مسلح ہیں اور ملکی حکام ان کو بھرپور مدد دیتے ہیں۔ مسلح پولیس اور فوج ان کے ساتھ نہتے دیہاتی مسلمانوں پر حملوں میں شریک ہوتی ہے۔ برطانوی افسروں نے ایسے جتھے دیکھے ہیں جن میں مختلف ہتھیاروں سے مسلح عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ یہاں لرزہ خیز مظالم کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔مردوں، عورتوں اور بچوں کو بلا امتیاز قتل کر دیا جاتا ہے پھر لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ایک گاؤں میں پچاس لاشوں میں سے تیس عورتوں کی تھیں۔ان جتھوں کی قیادت سابق فوجی افسر یا سپاہی کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ ایک بزدلوں کا گروہ ہے۔ایک جتھے نے جو پوری طرح مسلح تھا، مسلمانوں کی پندرہ بستیاں تاراج کیں اور پانچ سو کے قریب مسلمانوں کو کاٹ ڈالا۔لیکن اب گاؤں کے مسلمانوں نے جن کی جمعیت کچھ زیادہ نہ تھی، رائل انڈین آرمی کور کے ایک سابق کپتان کی سرکردگی میں اس جتھے کا مقابلہ کیا اور ان کے چھ آدمی ہلاک کر کے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اسی طرح دو برطانوی افسروں نے سکھوں کے ایک ہجوم کو جو ایک ٹرین پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا منتشر کر دیا۔

لدھیانہ اور اس کے مضافات

اس علاقے کے مسلمانوں پر جو کچھ گزری اس کی کسی قدر تفصیل ڈیلی ایکسپریس کے نامہ نگار نے مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھی ہے۔

"آج لدھیانہ تباہ و برباد کر دیا گیا یہ شہر دہلی سے ایک سو نوے میل جانب شمال واقع ہے اس شہر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔آج اس شہر کے تقریباً ایک لاکھ سکھوں نے سکھ پولیس کی مدد سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس کی توقع پہلے سے کی جا رہی تھی۔سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف وحشیانہ اقدامات کا یہ معرکہ جو لدھیانہ میں ہوا، اپنی تنظیم اور وسعت کے اعتبار سے مشرقی پنجاب میں ہونے والے تمام خونیں واقعات سے زیادہ سنگین ہے۔

میں نے کاروائی شروع ہونے کے نصف گھنٹے بعد موٹر کار پر سوار ہو کر شہر کا دورہ کیا۔ شہر جل رہا تھا، شور وغل مچانے والے سکھوں کا بے پناہ ہجوم من مانی کر رہا ہے۔خون آشامی کے

اندھے جوش نے اس ہجوم کو پاگل بنا رکھا ہے۔مسلمان اپنے اپنے گھروں میں بند ہیں۔شہر میں ہر طرف خطرے کے نقارے بج رہے ہیں، کہیں کہیں مسلمان سکھوں پر اینٹیں یا بم پھینک رہے ہیں۔سکھ بلوائیوں کا ہجوم پولیس کی مدد سے مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہا ہے، اس مقصد کیلئے گھاس پھونس، چیتھڑے اور مٹی کا تیل وغیرہ استعمال کیا جا رہا ہے۔سکھ ٹامی گن سے لے کر نیزوں، بھالوں اور تلواروں تک ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہیں وہ مسلمانوں کو گھروں سے نکال نکال کر قتل کر رہے ہیں بلکہ اس کا شکار کھیل رہے ہیں۔ایک سکھ نے جو میرے قریب سے گزرا مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ہم ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے"۔(۳۷)

ریاست کپورتھلہ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا انخلاء

یہ خوفناک سرگزشت "میں خون کو کیسے بھلا دوں" کے عنوان سے ۱۹ اگست ۱۹۸۱ء کے روزنامہ نوائے وقت کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

میری عمر ان دنوں تقریباً ساڑھے دس برس تھی۔ میں کپورتھلہ بچہ مسلم لیگ کا ایک عام سا سرگرم رکن تھا۔ بچہ مسلم لیگ کا دفتر شیر گڑھ مسجد کے ایک حجرے میں تھا۔ بچہ مسلم لیگ کی کاروائیوں میں ۱۴ سال سے کم عمر بچے شرکت کرتے تھے جہاں سے جلوسوں اور جلسوں کے بارے میں بچوں کو ضروری ہدایات ملتی تھیں۔ مئی ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں مسلمانوں کا ایک بڑا جلوس نکلا جس کے بعد مسلمانوں کی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔ یہ کشمکش بڑھ کر فساد کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ فسادات ایسے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے جن کی قریوں اور بستیوں کے نقشے بدل دیئے لاکھوں محبّ وطن افراد کو زیر زمیں سلا دیا۔ ہزاروں خاندانوں کو بے خانماں تباہ و برباد کر دیا ماؤں سے بچے اور بہنوں سے بھائی چھین لئے۔

مشرقی پنجاب کے باقی شہروں کی طرح کپورتھلہ میں بھی حالات بگفتہ بہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء قیام پاکستان کے دن شہر کے گردونواح میں حالات نازک ترین صورت اختیار کر گئے۔ جالندھر میں ہندو سکھوں نے مسلمانوں کے مکانوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا نتیجے مسلمان قافلوں کی شکل میں پاکستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔ انہیں راستوں پر ہی مشین گن کی گولیوں سے دانوں کی طرح بھونا جانے لگا ان کی لاشیں مرداروں کی خوراک بننے کے لئے وہاں چھوڑ دی جاتی تھیں قافلوں سے بھاگے اور بچھڑے ہوئے بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو بے دردی سے گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا جاتا، ان کے خون سے مکانوں کے اندر باہر، سڑک کے کنارے درختوں پر گل کاریاں بنیں ہوئی جگہ جگہ دکھائی دیتی تھیں اور بعض کے اعضاء کاٹ کر انہیں پاکستان کی طرف دھکیل دیا جاتا۔ ان حالات سے بچنے کے لئے پناہ گزیں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کپورتھلہ شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ شہر کافی حد تک پرامن محفوظ سمجھا

جا رہا تھا۔ کیونکہ یہاں مسلمانوں کی آبادی ۶۰ فیصد سے زائد تھی۔ مقامی مسلمانوں نے ان کی ہر ممکن مدد کی لیکن شہر کا امن دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء ۱۱ شوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز جمعرات محلّہ جٹ پورہ میں کرفیو لگا دیا گیا اور باقی شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی اس کی وجہ سے مسلمانوں میں خوف و ہراس بڑھ گیا۔ چھپ چھپ کر مسلمانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت شروع کر دی اور روز بروز اس میں اضافہ ہوتا گیا (کپورتھلہ کے مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت اور گورداس پور تک پاکستان کی امکانی سرحدوں کے باعث یہ حصہ پاکستان میں شامل ہوگا)۔

۳ دسمبر کے روز تمام شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ نتیجتاً مسلمان پنجرے میں بند چڑیا کی مانند پھڑ پھڑانے لگے۔ جن مسلمانوں کے گھر ساتھ ساتھ واقع تھے انہوں نے ایک دوسرے کے مکانوں میں راستہ بنا لیا اور مناسب حفاظتی جگہوں پر مورچہ بندی کر لی۔ کرفیو صرف آدھے گھنٹے کے لئے اٹھتا تھا۔ اس دوران مسلمان فرار ہونے کی کوشش کرتے تھے اور اگر کوئی خاندان جالندھر کیمپ تک پہنچ جاتا تو اُسے خوش نصیب سمجھا جاتا تھا لیکن عموماً ہوتا یہ تھا کہ بھاگنے والے خاندان کرفیو کا وقت ختم ہونے تک کرفیو کے مضافاتی علاقوں سے باہر نہ نکل پاتے اور گولیوں کا نشانہ بن جاتے اور اگر کوئی کرفیو کی حد سے باہر ہو بھی جاتا تو متعصب سفاک سکھوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہو جاتا۔ اور ان کی لاشوں کا پرسان حال کوئی بھی نہ ہوتا اور وہ درندوں کی خوراک بنتیں۔

۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کپورتھلہ ایک ریلیف ٹرین پہنچی۔ مقامی ہندوؤں اور سکھوں نے مشہور کر دیا کہ یہ گاڑی پاکستان حکومت نے بھیجی ہے۔ اس میں ۸۳ مال گاڑیوں کے ڈبے تھے ۱۰ ستمبر ڈیڑھ بجے مسلمانوں سے کھچا کھچ بھری یہ گاڑی روانہ ہوئی۔ اور چار بجے تک صرف چند میل دور کھوج والا اسٹیشن تک پہنچ سکی، جہاں گاڑی پر تعینات ہندوؤں اور سکھوں کی فوج نے انسانیت اور شرافت کا جامہ اتار پھینکا اور درندوں کی سی حرکت شروع کر دی۔ اس روز کئی ہزار آدمیوں میں سے صرف ایک سو کے قریب زخمی بچ سکے۔ انہیں اردگرد کے مسلمانوں نے اٹھا کر رندھیر سنگھ ہسپتال

تک پہنچایا۔ جہاں ان کی مرہم پٹی نہیں کی گئی اور ان میں سے اکثر نے ہسپتال کے باہر ہی دم توڑ دیا۔اس دن اغواء ہونے والی مسلمان لڑکیوں کا آج تک نشان نہیں مل سکا۔ جن میں میرے خاندان کی دو عورتیں بھی شامل تھیں اس گاڑی میں چند خوش نصیب بچے تھے۔ وہ بہت کسمپرسی کی حالت میں کئی ہفتے بعد پاکستان پہنچے۔۱۴ستمبر ۱۹۴۷ء صبح صادق کے وقت اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ ہمارے گھر کے تمام افراد چھروں تلواروں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر اپنے مکان کے دفاعی مقامات پر جم گئے۔تاکہ ہندوؤں اور سکھوں کے حملے کا مقابلہ کر سکیں کچھ دیر بعد نعروں کی آوازیں مشین گن کی گولیوں کی تڑتڑ میں مدغم ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ کرفیو کی وجہ سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔اس لئے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ آوازیں جہاں سے اٹھی تھیں اور ان پر کیا بیتی۔ وہ شہر جہاں میں نے جنم لیا تھا وہ گھر جہاں میں نے پرورش پائی تھی۔ وہ میدان جہاں میں کھیلتا تھا وہ سڑکیں گلی کوچے جہاں میں گھومتا تھا۔اس وقت یہ تمام جگہیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھیں۔ ستمبر کی ایک دوپہر ہم سب دوپہر کے کھانے پر بیٹھے ہی تھے کہ حویلی کے بڑے پھاٹک پر دستک ہوئی۔ جھانک کر دیکھا گیا کہ باہر فوج کے چند سپاہی کھڑے ہیں اور ان سے کچھ فاصلے پر چھوٹے ٹینک میں مسلح فوجی بھی موجود تھے۔ اندر سے ہی گفت وشنید کے بعد پھاٹک کھولا گیا۔عورتوں اور بچوں کو کیمپ میں باحفاظت پہنچا دینے کے وعدے پر ٹرک پر لا دیا گیا۔ابھی ٹرک اس محلے سے کچھ دور ہی گیا تھا کہ روک کر سب کی جامہ تلاشی ہوئی۔اور جن بچوں کے پاس جیبی چاقو بھی پائے گئے۔ان کے نرم ونازک رخساروں نے سخت گرم فوجی ہاتھوں کا لمس چکھا اور چاقو ان سے چھین لئے گئے۔اس کے بعد ٹرک وزیراعلیٰ ریاست کپورتھلہ کی قیام گاہ پہنچا جہاں اس قسم کے چودہ ٹرک اور کھڑے تھے۔ ہر ٹرک کے سواروں کے چہروں پر پریشانی کا خوف وہراس ہویدا تھا۔معلوم ہوا کہ شہر کے معزز خاندانوں کی عورتوں اور بچوں کو کیمپ تک پہنچانے کا انتظام ریاستی حکومت نے کیا تھا۔شام کو چار بجے پندرہ ٹرک جالندھر پناہ گزیں کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ان کی حفاظت کے لئے دو بلوچی سپاہی، سکھ ملٹری کے ٹینک اور ٹرک تھے۔لیکن جب یہ کانوائے آدھی کھوئی کے مقام

کے قریب پہنچا چاہتا تھا تو سکھ فوج پہلے ہی رخصت ہو گئی شاید مسلمانوں کو خطرے میں دھکیل کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی۔آدھی کھولی پر سب ٹرک روک دیئے گئے۔ جے ہند اور ست سری اکال کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ پاکستانی فوج کے دو بلوچ سپاہی اس نہتے قافلے کے لئے حفاظتی دیوار بن گئے اور ذرا سی دیر میں طوفان چھٹ گیا۔اور قافلہ پھر رواں دواں ہوا۔مغرب کے بعد یہ قافلہ جالندھر کیمپ میں داخل ہوا۔تمام راستے میں نے مسلمانوں کی لاشیں بکھری دیکھیں ان میں زیادہ لاشیں تازہ تھیں چند سے ابھی خون بہہ رہا تھا۔ بہت سی لاشوں کے ہاتھ پاؤں ناک آنکھیں ندارد تھیں۔عورتوں کی برہنہ لاشوں پر کپڑا ڈالنے والا کوئی نہ تھا ایک جگہ ہمارے ٹرک خون سے چکنی سڑک پر سے گزرے۔ دور کھیتوں میں آدھی کھوئی سے ذرا آگے مسلمانوں اور مسلح سکھوں کے درمیان جنگ کا خونی ڈرامہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

جالندھر کیمپ کی فوجی چھاؤنی کی بارک ۹۲ میں ہمیں پناہ ملی۔ یہ بیرک بیت الخلاء کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔اسے سب عورتوں بچوں نے مل کر رہائش کے قابل بنایا اس پوری بیرک میں عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف دو مرد ایک میرے گونگے چچا اور ایک رشتے کے ماموں تھے۔کیمپ میں ہر روز ہر فرد کو ایک چھٹانک فی کس کے حساب سے آٹا ملتا اور بعض دن وہ بھی نہیں ملتا تھا۔اس راشن سے صرف بچوں کا پیٹ بھرا جاتا۔ مائیں اور بہنیں اکثر اوقات فاقوں سے رہتیں۔ ہر وقت کیمپ میں بھارتی فوج گشت کرتی ہوئی دہشت وغنڈہ گردی کر کے خوف وہراس پھیلاتی رہتی تھی۔

۲۵ستمبر ۱۹۴۷ء کو میرے والد صاحب پر وزیراعلیٰ کی نظر عنایت ہوئی انہوں نے ایک ٹرک کا انتظام کیا۔ہمارے خاندان کے افراد کو لیکر جالندھر چھاؤنی چھوڑ آئے۔ یہ مہربانی اس لئے ہوئی تھی کہ ان دنوں وزیراعلیٰ کی چہیتی بیٹی بیمار تھی۔شہر میں موجود تمام ڈاکٹروں نے اس کی طرف سے مایوسی ظاہر کر دی تھی۔مگر میرے والد صاحب کے ہاتھوں اسے شفا نصیب ہوئی۔ میرے والد فسادات میں اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اس کا علاج کرنے جاتے رہے۔اس ٹرک نے دوپہر تین بجے سے روانہ ہو کر رات نو بجے جالندھر کیمپ پہنچایا۔اس طرح بارہ میل کا راستہ چھ گھنٹے میں

طے کیا۔ ہر خطرے کی جگہ ڈرائیور ٹرک کو روک دیتا ہے اور جب تک اس کی مٹھی گرم نہ کی جاتی وہ آگے نہیں بڑھتا تھا۔ کیمپ تک پہنچنے تک ایک سو پانچ روپے ڈرائیور کی جیب میں جا چکے تھے۔ میں ہر شام میں اپنے والد اور چچا کے انتظار میں کیمپ کے دروازے پر کھڑا ہوتا اور مایوسی سے لوٹ جاتا۔ ۲۵ ستمبر کو جوکا نوائے آیا میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ ٹرک جس میں میرے والد سوار تھے وہ کپورتھلہ سے ان کے ساتھ تھا لیکن معلوم نہیں راستے میں وہ کہاں رہ گیا ہے۔ میرا دل یہ سن کر زور زور سے دھڑکنے لگا میں وہاں ہی کھڑا رہا۔ سب بچے چلے گئے تھے کیمپ میں سب لوگ پابندی کی وجہ سے بارکوں میں مقید ہو چکے تھے۔ آخر کار نو بجے دور سڑک پر ایک بتی روشن دکھائی دی جو آہستہ آہستہ قریب ہی آتی گئی اور کافی دیر بعد ایک ٹرک کیمپ میں داخل ہوا اس میں مجھے اپنے والد اور چچا کو پا کر ایسی خوشی ہوئی جس کی لذت میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔

میرے بڑے بھائی جو ۱۰ ستمبر کی ریلیف ٹرین میں تھے اب تک لا پتہ تھے اس وجہ سے والدین کی پریشانی مجھے بھی متاثر کئے ہوئے تھی۔ پانی کی قلت کے باعث کئی کئی وقت پیاسے رہنا پڑتا تھا۔ راشن بھی باقاعدگی سے نہیں ملتا تھا۔ اس لئے بھائی فاقوں سے تنگ آ کر جالندھر کیمپ سے فرار ہو کر پاکستان کی طرف روانہ ہو گئے تھے ان سے درختوں کے پتے کھائے نہیں جاتے تھے اور نہ ہی جوہڑ کا پانی پیا جاتا تھا۔ ۲۶ ستمبر کے روز جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کیمپ کمانڈر کی طرف سے کیمپ خالی کر دینے کا نادر شاہی حکم دے دیا گیا اوپر طوفانی بارش اور نیچے سیلاب نے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ جو کچھ اثاثہ وہ اپنے گھروں سے لائے ہیں اسے بھی یہاں چھوڑ کر کیمپ سے پانچ میل دور ریلوے لائن کے کنارے لاڈووالی کے قریب پڑاؤ ڈالا اتفاقاً ایک پاکستانی کرنل جو کہ چند سپاہیوں کے ساتھ ایک دن کے لئے وہاں قیام پذیر تھا۔ اس نے کیمپ میں ہمارے خاندان کو پناہ دی۔ صندوق پر صندوق رکھے گئے۔ اس پر لوگ بیٹھے اوپر بارش نیچے سیلاب، دبی زبان میں پاکستان کی سلامتی کے لئے دعائیں آنکھوں کے سامنے پناہ گزینوں کے کیمپ کے اجڑنے کا منظر اس طوفان میں مسلمانوں کی لاڈووالا کی طرف جانے والی لمبی لمبی قطاریں ہم بھیگتے

قدرت کا یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ رات اسی طرح گزر گئی۔ اگلے دن دوپہر کے وقت کشتی نما ٹرک عورتوں اور بچوں کو لے کر پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے بھر میں خون ہی خون دیکھا۔ عورتوں اور بچوں کی سر بریدہ لاشیں اور کٹے ہوئے اعضاء سیلاب میں تیرتے ہوئے دیکھے بعض جگہ لاشوں کی سڑاند سے دماغ اڑا جاتا تھا کئی جگہ مکانوں سے آگ کے شعلے اٹھتے بھی دیکھے۔

بالآخر رات گئے ہمارا ٹرک واہگہ سرحد میں داخل ہوا۔ عورتوں نے ٹرک رکوایا۔ نیچے اتر کر سب نے دو رکعت نفل نماز شکرانہ پڑھی سب نے فلک بوس نعرے لگائے۔ سرزمین پاکستان میں داخل ہوتے وقت جو لذت محسوس ہوئی وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے علیحدہ ہی تھی اور آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔ لاہور کیمپ میں تین دن رہے اس کے بعد ایک دن صبح سے دوپہر تک شہر میں ایک رشتہ دار کے یہاں رہے۔ دوپہر کے بعد تانگہ میں میری امّی مجھے اور میری بہن کو جلد ماموں کے گھر لے گئیں ماموں کے گھر ہم ڈیڑھ ماہ رہے۔ وہاں پہلے سے رشتہ داران کے گھر پناہ گزین تھے۔ (۳۸)

سید سعید احمد صاحب کا بیان

ریاست بھرت پور کی پولیس میں بحیثیت محرر ملازم تھے اور فسادات کے وقت تھان ڈیگ میں تعینات تھے۔ موصوف کا تعلق سادات بیانہ سے ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ تھانہ ڈیگ میں میرے علاوہ صرف تین مسلمان سپاہی تھے۔ قصبے کے چند مسلمان اور تھانہ کے کچھ لوگوں کو میرے متعلق علم تھا کہ میں مسلمان ہوں ورنہ بیشتر مسلمان، جاٹ اور گوجر میرے گلمچھوں کی وجہ سے جاٹ سمجھتے تھے۔ تھانے دار میرے خسر موسیٰ رضا صاحب کا شاگرد تھا اور اسی باعث میرا بڑا خیال رکھتا۔ فسادات سے ایک ماہ پہلے میرے خسر ڈیگ آئے تو تھانیدار نے اُن سے کہا کہ "نائب صاحب حالات خراب ہوتے جارہے ہیں آئندہ نہ جانے کیا صورت ہو! آپ کی لڑکی میری بہن سمان ہے، میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو، میری رائے ہے کہ آپ اسے یہاں سے لے جائیں اور سعید احمد کو بھی لے جانے کی کوشش کریں۔" میرے خسر (مرحوم) نے جب مجھ سے گفتگو کی تو خود جانے سے انکار کر دیا لیکن بیوی اور بچے کو لے جانے کی اجازت دے دی۔

غالباً جون ۱۹۴۷ء کے آخری عشرہ میں موضع نوگاواں اور موضع نونیرا والوں میں زمین کے معاملہ پر جھگڑا ہوا جس میں دونوں طرف کے کچھ لوگ زخمی ہوئے لیکن تھانے میں رپورٹ درج کرانے کوئی نہ آیا۔ دوسرے روز نونیرا والوں نے پنچایت بلائی، اور تمام گاؤں والوں نے طے کر کے چوڑیاں، ایک دوپٹہ اور کچھ روپے نوگاواں کے میو مسلمانوں کے چودھری کے گھر بھیجے (یہ چیزیں منگنی کی رسم پر لڑکی کے لئے بھیجی جاتی ہیں) نوگاواں کے غیور مسلمان اس کمینگی کو برداشت نہ کر سکے اور زبردست فساد ہوا جس میں میو مسلمان کم اور جاٹ زیادہ زخمی ہوئے۔

دوپہر دو بجے تھانے میں ہنگامے کی رپورٹ درج کرائی گئی۔ ان دونوں گاؤں میں امن قائم رکھنے کے لئے تھانہ کی پولیس ناکافی تھی لہٰذا بھرت پور پولیس ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی گئی تقریباً ۴ بجے بھرت پور سے ڈی ایس پی رام سنگھ کی معیت میں مسلح پولیس کے چار ٹرک ڈیگ پہنچے۔ ڈی ایس پی نے تھانے دار کو کچھ ہدایات دیں پھر پولیس کے ساتھ نوگاواں روانہ ہو گیا،

وہاں پہنچ کر اس نے میو مسلمانوں سے گالم گلوچ کی جس سے بات اور بڑھ گئی۔ پولیس نے گولی چلا دی میو بجائے جان بچانے کے مقابلے پر اُتر آئے۔ لیکن لاٹھی اور رائفل کی گولی کا کیا مقابلہ؟ پولیس نے مسلمانوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اُتارا اس قتل عام میں بچوں اور عورتوں کو بھی نہ چھوڑا جو بھی سامنے آیا مارا گیا۔ تقریباً ۲۵۰ میو شہید ہوئے اور کئی سو افراد کو گرفتار کر کے بھرتپور بھیج دیا گیا گرفتار شدگان میں زیادہ تر زخمی تھے۔ اس قتل عام میں جو بھرت پور میں مسلمانوں کا پہلا قتلِ عام تھا صرف ایک جاٹ سپاہی کے معمولی زخم آئے۔

اس کے بعد پوری ریاست میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ جن سنگھی اور مہاسبھائی غنڈے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ پہر سر میں مسلمان قتل کئے گئے۔ بیانہ میں مسلمان قتل ہوئے۔ لیکن بیانہ کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جان بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ میوات میں مسلمانوں کا زبردست قتل عام ہوا ہزاروں میو جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے جن سنگھی اور مہاسبھائی درندوں کا شکار ہوئے ان کاروائیوں میں ملٹری اور پولیس ہندو بلوائیوں سے پورا پورا تعاون کرتی جو مسلمان بچ جاتے ان کو پولیس گرفتار کر لیتی اور سِسکا سِسکا کر مار دیتی۔

تھانہ ڈیگ میں گرفتار کر کے لائے جانے والے ایک مسلمان میو چودھری اسماعیل نے رو رو کر مجھے بتایا کہ۔ "ہمارے گاؤں پر رات کے دو بجے حملہ ہوا، ہمارے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر کر آگ لگا دی۔ سب لوگ گھبرا کر گھروں سے باہر نکل آئے اتنے میں کئی زبردست دھماکے ہوئے اور بہت سے آدمیوں کے پرخچے اُڑ گئے جان بچانے کے لئے گاؤں سے باہر بھاگے تو گولیاں چلنے لگیں۔ یہ پتہ نہیں کیسے گاؤں سے نکل آیا اور جھاڑیوں میں چُھپ گیا۔

میری ٹانگ میں گولی لگنے کی وجہ سے آگ بھری ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک گولیاں چلنے اور چیخ و پکار کی آوازیں کانوں میں آتی رہیں پھر میں بے ہوش ہو گیا۔ صبح جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ بلوائی اور فوجی ہماری عورتوں کو گھیر گھیر کر میدان میں لا رہے ہیں، ان میں میری دونوں بہنیں اور بیوی بھی تھی، اس کی گود میں میرا ڈیڑھ سالہ لڑکا تھا ظالموں نے

اس کی گود سے لڑکے کو چھین کر آگ میں پھینک دیا۔ میں نے یہ دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔

مجھے شام کو ہوش آیا۔ بلوائی جا چکے تھے اور ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ بچوں، بوڑھوں، جوان اور عورتوں کی برہنہ لاشیں۔ میری بیوی ایک بہن اور گاؤں کی اکثر عورتوں کی عزت لوٹ کر ظالموں نے مار دیا اور باقی کو لے گئے مغرب کے وقت ملٹری کے کچھ ٹرک ادھر سے گزرے ان لوگوں نے مجھے یہاں سے پولیس کے حوالے کر دیا۔ زخم کے خراب ہونے کی وجہ سے اسماعیل کو تیز بخار تھا اور دو دن سے کھانے کو بھی کچھ نہ ملا تھا، میں نے تھانے دار سے کہہ کر اس کے کھانے کا انتظام کیا لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن اللہ نے اُسے تمام دُکھوں اور ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا۔ پوری ریاست میں افراتفری کا عالم تھا، مسلمان رات کے اندھیرے میں چُھپ کر بھاگ رہے تھے۔ ڈیگ میں مہاسبھا اور جن سنگھ کے مقامی لیڈروں اور ملٹری اور پولیس کے درمیان ہونے والی میٹنگوں میں چوری چھپے میں بھی شریک ہوتا۔ اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازشوں سے باخبر رہتا۔ ڈیگ میں بسنے والے بیشتر مسلمان ہجرت کر گئے تھے لیکن بہت سے اب بھی موجود تھے۔ پھر راجہ کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا جو پوسٹروں کی صورت میں ہر جگہ تقسیم کیا گیا، اس میں کہا گیا تھا کہ "جو مسلمان ریاست سے چلے گئے ہیں وہ واپس آ جائیں اس لئے کہ یہ کاروائی صرف میوات کو دبانے کے لئے کی گئی تھی نہ کہ عام مسلمانوں کو۔ اگر آئندہ ریاست کے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچائے گا تو اسے سزا دی جائیگی اور ان کی حفاظت اور نقصانات کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔" اس فرمان کے جھانسے میں بہت سے مسلمان آئے۔ ڈاکٹر زین العباد صاحب ڈیگ میں جانوروں کے اسپتال میں ڈاکٹر تھے۔ اُنھوں نے بھی ابتدائی ہنگاموں کے بعد اپنے بیوی بچوں کو آگرہ بھیج دیا تھا فرمان جاری ہونے پر آگرے سے بیوی بچوں کو بلوا لیا۔ میرے علم میں یہ بات آئی تو میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ ہندوؤں کی مکّاری ہے۔ لیکن وہ نہ مانے اور کہا کہ "تم جوان آدمی اور ناتجربہ کار، جس انداز سے میں سوچ اور

سمجھ سکتا ہوں تم نہیں سوچ سکتے۔" فرمان جاری ہونے کے ایک ہفتے بعد میں رات کے وقت خاموشی سے ڈیگ سے نکلا پا پیادہ گوردھن اور پھر متھرا سے ریل میں سوار ہو کر آگرہ پہنچا۔ اپنے عزیزوں اور دیگر اہلِ بیانہ سے مل کر انھیں بتایا کہ ہرگز واپس نہ جائیں اس لئے کہ وہ فرمان سازش کے تحت جاری ہوا ہے"۔ نومبر ۴۷ء کے آخری دنوں میں مسلمانوں کا پوری ریاست میں منظّم طور پر قتل عام ہوا۔ ڈاکٹر زین العباد ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی شہید کر دیئے گئے۔ جو لوگ بھرت پور واپس چلے گئے تھے قتل کر دیئے گئے یا پھر شدھی کر لئے گئے ہوں گے۔ (۳۹)

خواجہ سعید حسن پرنسپل پولیس ٹریننگ اسکول کا بیان (اقتباسات)

اگست ۱۹۴۷ء کا آخری ہفتہ تھا۔ میں کلب جا رہا تھا کہ کچھ مسلمانوں نے میری کار روکی اور بتایا کہ پٹیالہ ریلوے اسٹیشن پر غیر مسلموں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے اور پولیس خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ میں نے ریلوے اسٹیشن کا رُخ کیا اور دیکھا کہ ایک مسلمان زخمی حالت میں پلیٹ فارم پر پڑا ہے۔ میں نے اسے ہسپتال پہنچایا۔ لیکن وہ گہرے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا۔ ۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک ہندو بم بناتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ غیر مسلموں نے یہ بے پر کی اُڑا دی کہ اسے ایک مسلمان نے بم مار کر ہلاک کیا ہے۔ اس بات کا بہانہ بنا کر غیر مسلموں نے بازاروں اور گلیوں میں مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے اور اس کے نتیجے میں ایک مسلمان شہید ہو گیا۔ دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچا دی گئیں اور اگلے روز مسلمان اور غیر مسلم دونوں بھاری تعداد میں ہسپتال میں جمع ہو گئے وہ اپنی اپنی لاشوں کو جلوس کی صورت میں لے جانا چاہتے تھے۔ یوں اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہسپتال کے احاطہ میں فساد ہو جائے۔ ایس پی بابو سنگھ وہاں پہنچا اور اس نے مجھے بھی بلا بھیجا۔ ہسپتال پہنچ کر میں نے دیکھا کہ مسلمان اگرچہ تعداد میں کافی ہیں لیکن اکثر و بیشتر غیر مسلح تھے۔ جبکہ غیر مسلموں کے پاس کافی اسلحہ تھا۔ بابو سنگھ نے مجھ سے کہا کہ میں فریقین کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کروں۔ مسلمانوں نے کہا کہ وہ لڑنے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتے۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ شہید کی لاش کو تجہیز و تکفین کے لئے لے جائیں۔ پھر میں غیر مسلموں کی طرف گیا۔ وہ بدتمیزی پر اُترے ہوئے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ وہ بابو سنگھ کی شہ پر مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس سے ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں بابو سنگھ سے یہ کہتے ہوئے چلا آیا کہ ایس پی کی حیثیت سے یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ امن و امان کو برقرار رکھے۔ غیر مسلموں نے لاش ہسپتال سے لی۔ اور ایک بہت بڑے جلوس کی شکل میں شمشان بھومی کی طرف چل دیئے راستے میں انہیں جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آیا، یہ اس پر ٹوٹ پڑے انہوں نے بعض مقامات پر مسلمانوں کے مکانات کو بھی نذر آتش کر دیا۔

۳ ستمبر ۴۷ء کو مسلمانوں پر کھلے عام حملے کئے گئے، اگلے روز آئی جی نے مجھے دفتر بلایا اور کہا کہ میں دو ماہ کی چھٹی پر چلا جاؤں۔ کیونکہ حکومت اس پوزیشن میں نہیں کہ اپنے افسروں کا تحفّظ کر سکے۔ میرے پاس کوئی متبادل راستہ نہ تھا۔ چنانچہ چھٹی کی درخواست دی اور گھر چلا آیا۔ اُسی روز کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اور آرمی نے فرسٹ سکھ بٹالین کے جی او سی لیفٹیننٹ جنرل بلونت سنگھ کی کمان میں کنٹرول سنبھال لیا سیکنڈ پٹیالہ بٹالین کے تمام مسلمانوں کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ اُس دن مسلمانوں کا وسیع پیمانے پر قتل عام ہوا بچ نکلنے والے مسلمانوں نے پناہ کے لئے میرے گھر کا رُخ کیا، یہاں جگہ نہ رہی، تو میں نے گردوپیش میں بسنے والے رشتہ داروں کے ہاں ان کا بندوبست کیا۔ مرحوم خواجہ محمد ہاشم کا مکان گھر سے کافی دور تھا۔ اور کئی مسلمانوں نے ان کے گھر میں بھی پناہ لی، لیکن سکھ اور ہندو فسادی ان کے گھر میں گھس گئے اور تمام مسلمان مردوں کو شہید کر دیا۔ بیشتر خواتین اپنی عزت بچانے کے لئے کنوئیں میں کود گئیں۔ ایک عمر رسیدہ خاتون گرتی پڑتی میرے مکان میں پہنچی اور مجھے اس حملے کے بارے میں بتایا مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خواجہ محمد ہاشم اور ان کے بھتیجے خواجہ کاظم حسین پچھواڑے کی کھڑکی کی سلاخیں کاٹ کر باہر کود گئے اور قریبی امام باڑے میں جا چھپے، میں نے انہیں تیسرے دن وہاں سے نکالا تین چار دنوں میں دس بارہ ہزار کے لگ بھگ افراد نے ان گھروں میں پناہ حاصل کی۔ پانی کے کنکشن کاٹ دیئے گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے ہمارے گھروں میں کنویں موجود تھے۔ یہ بہت عرصہ سے زیر استعمال نہیں تھے، ہم نے ان کی صفائی کی اور ان کا پانی استعمال کرنے لگے۔ خوراک خریدنے کے لئے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے اپنے گوداموں کی تمام گندم تقسیم کر دی فرنیچر اور دروازوں سے چولہے کی لکڑی کا کام لیا گیا۔ ایک صبح میں نے دیکھا کہ ایک ٹرک ہمارے باغ کی جانب آ کر رکا۔ اس میں سے کچھ فوجی نکلے اور انہوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ میں نے وہاں موجود تمام افراد سے کہا کہ لیٹ جائیں۔ فوراً ہی مشین گن کا ایک برسٹ آیا اور دو گولیاں ایک معصوم بچے اور ایک بوڑھی خاتون کے آر پار ہو گئیں۔

میں نے فوراً پرائم منسٹر گردیال سنگھ ہریکا کو فون کیا اور انھوں نے ایک آرمی میجر کو معاملے کی تحقیق کے لئے بھیجا۔ اس کے بعد ہم پر کوئی فائر نہ ہوا اور نہ ہمیں کسی اور طریقہ سے ہراساں کیا گیا۔ آئی جی پولیس نے ایک اے ایس پی کو میرے مکان پر بھیجا کہ وہ مجھ سے اسلحہ واپس لے لے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے اسلحہ دینے سے انکار کر دیا کہ جب تک مہاراجہ خود حکم نہ دے میں اسلحہ نہیں دوں گا، کیونکہ میں آرمز ایکٹ سے مستثنیٰ ہوں چوتھے دن ایک ملٹری آفیسر آیا اور مجھ سے کہا کہ میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہادر گڑھ قلعہ میں منتقل ہو جاؤں۔ میں جانتا تھا۔ مرحوم عبدالوحید خاں کے مکان میں پناہ گزیں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ جب ۵ ستمبر کو عبدالوحید خاں اور ان کے اہل خانہ کو ان کے بھائی میجر مغنی پٹیالہ سے لے گئے تھے، چنانچہ میں نے جواب دیا کہ میں ان پناہ گزیں بھائیوں کو یوں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ایک دو روز بعد مجھے اجازت مل گئی کہ میں ان پناہ گزینوں کو بھی اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں، کیونکہ اس وقت تک پالیسی بدل گئی تھی اور بچ نکلنے والے مسلمانوں کے لئے بہادر گڑھ قلعہ میں کیمپ بنا دیا گیا تھا۔

صدر مسلم لیگ کی شہادت

میں یہاں ایک اور واقعہ بھی بیان کرتا چلوں۔ پناہ گزین کیمپ میں منتقلی سے ایک دو روز پہلے کی بات ہے کہ ایک سکھ صوبیدار میجر میرے ہاں آیا اور کہا کہ پٹیالہ اسٹیٹ مسلم لیگ کے صدر شیخ وزیر محمد کو پرائم منسٹر نے یاد کیا ہے میں شیخ صاحب کو لایا اور خود بھی ان کے ساتھ ٹرک میں سوار ہو گیا۔ سید محمد رضا ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج پٹیالہ بھی ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ صوبیدار میجر نے یہ کہتے ہوئے مجھے ٹرک سے اتار دیا کہ وہ پرائم منسٹر کے حکم کے بغیر مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ یہ دونوں سید محمد رضا اور شیخ وزیر محمد پھر لوٹ کر نہ آئے البتہ ان کی لاشیں ایک سڑک پر پائی گئیں۔

شہر کی حالت

کیمپ کی طرف روانگی سے قبل ایک آرمی افسر نے مجھے کہا کہ میں پرائم منسٹر کی تحریری اجازت کے بغیر اسلحہ ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں اس کے ساتھ پرائم منسٹر ہاؤس پہنچا اور انہوں نے مجھے ہتھیار

ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ پرائم منسٹر ہاؤس کے ہاں جاتے ہوئے میں نے راستہ میں دیکھا کہ شہر تباہ ہو چکا تھا اور سڑکوں پر جا بجا سینکڑوں مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی ٹانگوں سے رسّے باندھ کر انہیں سڑکوں پر گھسیٹا جا رہا تھا۔

مسلمانوں کے کیمپ

پہلے روز تو میں نے اپنے ہاں کے تمام پناہ گزینوں کو کیمپ میں پہنچایا اور اگلے روز اپنے اہل خانہ کے ساتھ وہاں پہنچا۔ مجھے معلوم ہوا کہ گزشتہ روز انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا میں نے پرائم منسٹر سے رابطہ قائم کیا ور انہوں نے آٹا اور دال بھجوائی۔ میجر عبداللطیف خان نے تمام مراحل پر بھر پور مدد کی۔ ان کے فوجیوں کو غیر مسلح کر کے کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا وہ بھی ہمارے خوب کام آئے۔ شروع شروع میں ہندو دکاندار بھاری قیمت پر اشیاء فروخت کرتے تھے۔ میں نے پرائم منسٹر سے رابطہ کیا چنانچہ ان ہندو دکانداروں کو وہاں سے نکال دیا گیا اور پرائم منسٹر نے ہمیں اجازت دیدی کہ ہم سپلائیز کے لئے کنٹریکٹرز کا بندوبست کر لیں۔ ہم ان کنٹریکٹرز سے آنہ فی روپیہ کے حساب سے منافع میں حصہ لیتے اور اس رقم کو بیواؤں اور یتیموں کے لئے اور بیماروں کی ادویات پر خرچ کرتے۔ اس رقم میں تقریباً ایک ہزار لحاف تیار کرا کے ضرورت مندوں میں تقسیم کئے گئے۔ ریاست پٹیالہ میں یہ خون ریزی جنرل بلونت سنگھ آئی جی دلیپ سنگھ اور ریاست کے ایک سابق وزیر گھبیر سنگھ نے کروائی تھی۔ (۴۰)

دہلی اور نواح دہلی میں خون مسلم کی ارزانی

دہلی اور پانی پت کے مسلمانوں کی تباہی اور خانہ بربادی کی داستان بڑی طویل اور دردانگیز ہے۔ اس خوفناک داستان کی چشم دید شہادت ایک پاکستانی فوجی نے اس طرح بیان کی ہے:

۳۔۴ ستمبر ۱۹۴۷ء

۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو یہ صورتِ حال تھی کہ دہلی کی طرف آنے والی ٹرینوں پر شہر کے مفصلات میں حملے کئے جاتے اور مسلمان مسافر تہ تیغ کئے جاتے۔ اِس کی ایک مثال پالم ریلوے اسٹیشن کے قریب دیکھنے میں آئی۔ دہلی کے نواحی دیہات میں ۳ ستمبر کو فسادات پھوٹ پڑے۔ پالم کے ہوائی اڈّے سے مجھے جلتے ہوئے دیہات کا دھواں نظر آ رہا تھا اور یہ دیہات ۳ یا ۴ میل سے زیادہ دور نہ تھے ان دیہات کے مسلم باشندوں کو لوٹا گیا، قتل کیا گیا اور انکو گھروں سے نکال دیا گیا۔ جو خوش قسمتی سے بچ نکلتے وہ پناہ ڈھونڈنے کے لئے ہمارے پاس آ جاتے۔ کیونکہ ہمارے پاس ہوائی اڈّے کے رقبے کی حفاظت کے لئے کچھ مسلم فوجی سپاہی موجود تھے۔ یہ پناہ گزیں کوئی تین سو کے قریب تھے۔ جب آنریبل سردار عبدالرب نشتر ۸ ستمبر کو دہلی سے واپس جا رہے تھے تو اُن پناہ گزینوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مصیبتوں اور شکایتوں کی داستان سنائی۔

۷ ستمبر ۱۹۴۷ء

آٹھ بجے صبح میں کناٹ پیلس والے مکان سے نکل کر دہلی ریلوے اسٹیشن روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر میں نے اپنے مختصر قیام کے دوران دیکھ لیا کہ صورتِ حال بالکل غیر معمولی رنگ اختیار کر چکی ہے، میں وہاں اپنے بھائی سے ملنے گیا تھا جو فوج میں افسر ہے اور گزشتہ شب پنجاب میل سے دہلی پہنچا تھا اور اس مکدّر اور خطرناک فضا کی وجہ سے ریلوے اسٹیشن ہی پر رات بسر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اسی رات کا واقعہ ہے کہ دہلی ریلوے اسٹیشن پر، مسلمان مسافروں پر تین دستی بم پھینکے گئے۔ جن سے دس آدمی ہلاک اور بہت سارے زخمی ہوئے۔ اس دن قبل دوپہر جو ٹرینیں دہلی

پہنچیں ان کے بعض ڈبوں میں خون گرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو پنجاب میل میں سوار کیا جو بمبئی جا رہی تھی، یہی تنہا ٹرین تھی جو دہلی سے روانہ ہوئی اور اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا۔ جو ٹرین بھی دہلی سے جی، آئی، پی لائن پر روانی ہوتی وہ نظام الدین اولیا اسٹیشن پر روک لی جاتی۔ مسلمان مسافر گھسیٹ کر باہر نکالے جاتے اور ہلاک کر دیئے جاتے۔ جو مسلمان مارے گئے، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

۸ ستمبر ۱۹۴۷ء

آج کا دن دہلی اور نئی دہلی میں قتلِ عام، لوٹ مار اور آتشزنی کے اعتبار سے عام طور پر سب سے زیادہ ہولناک دن تصور کیا جاتا ہے۔ کناٹ پیلس میں مسلمانوں کی قریباً تمام دکانیں لوٹ لی گئیں۔ مثلاً میر حسینی بخش، کیپیٹل بوٹ ہاؤس، عمر اینڈ کمپنی، غنی اسٹور، فاضل بھائی وغیرہ۔ چاندنی چوک، صدر بازار، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج میں مسلمانوں کی دکانیں لوٹ لی گئیں، ان کا مال و اسباب نہایت وسیع پیمانے پر لوٹا گیا اور ان محلوں میں صدہا مسلمان قتل کر دیئے گئے۔

غنڈوں کا دھاوا

۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو علی الصبح پانچ بجے پچاس ہزار سکھوں، ہندو جاٹوں اور جن سنگھیوں کے ایک جم غفیر نے مہرولی پر آناً فاناً دھاوا بول دیا اور مسلمانوں کے محلوں پر ٹوٹ پڑے، حملہ آوروں میں سکھ سب سے آگے تھے۔ مسلمانوں نے بھی مقابلہ کیا اور مناسب مورچوں پر جم گئے، حملہ آور جدید قسم کے آلات حرب سے مسلح تھے ان کے پاس رائفلیں، بندوقیں، حتیٰ کہ ٹامی گنیں اور برین گنیں تھیں۔ ان کی تنظیم ظاہر کر رہی تھی کہ حملہ پوری تیاری سے منظّم کیا گیا تھا۔ انہوں نے ادھم خاں کے مزار کی طرف سے جو اونچی جگہ واقع ہے، ہمارے گروہ پر نیز خانقاہ پر چڑھائی کی، خانقاہ کے صوفیوں، درویشوں اور فقیروں نے جان توڑ مقابلہ کر کے ان کے پے در پے حملے روکے، جب وہ خانقاہ میں داخل ہو کر وہاں کے مکینوں کا قتل عام کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو انہوں نے گرد و نواح کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ مہرولی کے دوسرے مورچوں پر بھی مسلمانوں نے خوب

مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کا منہ موڑ دیا۔

ایک شریف ہندو انسپکٹر پولیس

مہرولی کا سب انسپکٹر پولیس دینا ناتھ حضرت خواجہ قطب کا عقیدتمند تھا اور درگاہ شریف اور اسکے متعلقین کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ اس نے چند مسلمان کانسٹبلوں کی معیت میں اپنا فرضِ منصبی بجالانے اور درگاہ شریف کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ اس اثنا میں کوئی چھ سات سو مسلمان مرد، عورتیں اور بچے میرے گھر میں نیز خانقاہ میں پناہ لینے کے لئے جمع ہوگئے۔ دس بجے کے قریب حملہ آور شکست کھا کر پسپا ہوگئے۔ گیارہ بجے فوج پہنچ گئی جس نے مہرولی اسٹیشن میں مارشل لا لگا دیا۔ حملہ آور، فوج کے آنے سے پہلے منتشر ہو چکے تھے۔ مہرولی کے مسلمانوں کو فوج نے محصور کر لیا۔ فوجی ہر طرف دہشت پھیلا رہے تھے۔ خانقاہ کے پناہ گزینوں کے پاس پانی کا جو ذخیرہ تھا وہ جلد ختم ہوگیا اور ہر طرف سے العطش العطش کی صدائیں آنے لگیں۔ دو مسلمان مشکیں لے کر پانی لانے کے لئے نکلے۔ فوج نے ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر ڈالا۔ جب پانی نہ ملنے کے باعث تکلیف کا سامنا ہونے لگا تو میں نے مسٹر دینا ناتھ سب انسپکٹر پولیس سے مدد مانگی۔ دینا ناتھ جو درگاہ شریف کا عقیدت مند تھا۔ خانقاہ نشینوں، میرے کنبے کے لوگوں اور دوسرے پناہ گزینوں کو حضرت خواجہ قطب الدین کاکیؒ کی بڑی درگاہ شریف کی طرف لے گیا، بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہندو بلوائیوں نے دینا ناتھ کی اس انسانیت نوازی کا بہت بُرا منایا اور اسے دھوکے سے یوسف سرائے کے ہندوؤں میں لے جا کر قتل کر دیا۔

۱۵ ستمبر کو یعنی دو دن کے بعد ایک فوجی افسر کی معیت میں علاقہ مجسٹریٹ گپتا اور انسپکٹر پولیس ہیرالال درگاہ شریف کے کیمپ میں آئے اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے نکل جائیں، انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مسلمان ایسا نہیں کریں گے تو انہیں ہولناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ سرکاری اور فوجی افسران کو کسی قسم کی امداد نہیں دیں گے۔ مہرولی کے مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ تو آٹھ سو سال سے مہرولی میں آباد ہیں اور مہرولی شاہجہاں کی دلّی سے بہت زیادہ

پرانی بستی ہے ہماری درخواست ہے کہ درگاہ شریف اور اس سے تعلق رکھنے والے خدّام کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ ہماری اس درخواست پر انسپکٹر ہیرالال اور مجسٹریٹ نے بہت درشت کلامی سے کام لیا، ڈرایا دھمکایا اور فی الفور جگہ چھوڑنے کا حکم دیا۔ اسی روز شام کے وقت درگاہ شریف کے اندر فوجیوں نے کئی مسلمانوں کو گولی مار کر شہید کر دیا، متعدد زخمی ہوئے۔ کچھ مسلمان درگاہ کے احاطے میں ایک کنوئیں سے پانی بھر رہے تھے، ملٹری نے ان پر بھی گولی چلا دی، ملٹری نے درگاہ شریف میں گھس کر متعدد حملے کئے۔ درگاہ شریف کے احاطے سے مشرق کی طرف مسلمانوں کے چند جھونپڑے تھے حملہ آوروں نے انہیں آگ لگا دی اور ملٹری نے حملہ آوروں پر گولی چلانے کے بجائے ان مسلمانوں پر فائر کئے جو بھاگ کر درگاہ کی طرف آ رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں نے باؤلی میں پناہ لی، کچھ درگاہ کے پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے، ملٹری نے ان پر بھی گولیاں چلائیں، کئی مسلمان مارے گئے۔ (۴۱)

امرتسر اور اس کے دیہات

جناب فضل حق پشاوری کا بیان

امرتسر کے حالات یوں تو اگست کے آغاز ہی سے زیادہ نازک صورت اختیار کرنے لگے لیکن ۱۸ اگست کے بعد تو حالات کی خرابی شدید سے شدید تر کیفیت اختیار کرنے لگی۔ ۱۸ اگست کو امرتسر پولیس کے سپرنٹنڈنٹ میاں محمود علی خان تبدیل ہو کر راولپنڈی چلے گئے ان کی جگہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سنبھال لی جو سکھ واقع ہوا تھا۔ اس نے عہدہ سنبھالتے ہی پولیس کے مسلمان جوانوں کو حکم دیا کہ اپنی بندوقیں لائن میں جمع کرا دیں اور دس دن کے لئے چھٹی پر چلے جائیں۔ جو ملازم اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا اسے جیل میں قید کر دیا جائے گا۔ مسلم پولیس کو اس طرح نکال دینے کے بعد اس نے سکھ پولیس کو حکم دیا کہ مسلمان کرفیو کے اوقات ختم ہونے پر بھی باہر نکلیں تو انہیں گولی سے اڑا دو۔ سکھ کرفیو کے اوقات میں بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے لگے۔ ۱۸ اگست کے بعد ملٹری شہر کا امن قائم رکھنے کے لئے متعین کی گئی وہ بھی سکھوں ڈوگروں اور گورکھوں پر مشتمل تھی۔ عام مسلمانوں سے ہتھیار چھین لئے گئے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مسلمان سکھوں کا برابر مقابلہ کرتے رہے۔ اور شہر بھر میں کئی مقامات پر دست بدست لڑائیوں کی نوبت آتی رہی۔ سکھ مسلمان کو جہاں کہیں پاتے تھے اس پر حملہ کر دیتے تھے اور مسلمان انہی کی کرپانیں چھین کر انہیں ہلاک کر رہے تھے۔ رات کے وقت جنگ انتہائی شدت اختیار کر جاتی تھی۔ ہر طرف سے بموں کے پھٹنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کے کسی محاذ پر شدید گولہ باری ہو رہی ہے۔ شہر امرتسر کے شمالی حصہ میں نسبتاً امن تھا کیونکہ فیض پورہ میں سو فیصد مسلمان آباد تھے اور ان کے ڈر کے مارے سول لائینز اور لارنس روڈ کے ہندو اور سکھ دم نہیں مار سکتے تھے۔

دس اگست کو درجن بھر سکھوں نے ''لوہارکا'' اور ''فیض پورہ'' کے درمیان چار نہتے مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ اس کے جواب میں فیض پورہ کے مسلمانوں نے

۷ سکھوں کو مار گرایا۔ اسی روز تین ہزار سکھوں کے ایک مسلح لشکر نے موضع لوہارکا کا محاصرہ کر لیا۔ جب لوہارکا سے دودھ لانے والے مسلمانوں اور دوسرے مزدوروں میں سے کوئی شخص بھی فیض پورہ نہ پہنچا تو فیض پورہ کے مسلمانوں نے ایک گھڑسوار مسلمان کو دریافت حال کے لئے بھیجا۔ اس نے دیکھا کہ سکھوں نے چاروں طرف سے لوہارکا کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ سکھوں نے اس مسلمان پر گولی چلائی لیکن نشانہ خطا گیا۔ اس نے واپس آ کر اطلاع دی۔ چار مسلمان سائیکلوں پر چڑھ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس گئے اور اسے لوہارکا کے حال کی خبر دی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا کہ اس وقت میرے پاس پولیس کی جمعیت نہیں جسے اس طرف بھیج سکوں۔ سائیکل سوار مسلمان چھاؤنی گئے اور بلوچ رجمنٹ کے افسر سے امداد کے طالب ہوئے۔ اس نے بارہ فوجی تین ٹرکوں پر سوار کر کے لوہارکا کی طرف بھیج دیئے۔ سکھ فوجی ٹرکوں کو دیکھ کر بھاگ گئے اور کچھ گنے کے کھیتوں میں چھپ گئے۔ ایک سکھ پکڑا گیا جس نے سر کے بالوں سے لے کر گھٹنوں تک لوہے کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے پاس چار گز لمبا ایک برچھا، ایک تلوار اور ایک چھرا تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان شام تک وہیں رہے۔ رات گیارہ بجے وہ چھاؤنی واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کی اطلاع پا کر سکھوں کا لشکر پھر ایک بار اکٹھا ہو گیا۔ جس نے رات کے دو تین بجے لوہارکا پر ہلہ بول دیا۔ سکھوں کے پاس ۳۰۳ نمبر بندوقیں بھی تھیں جن سے وہ فائر کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر اندھا دھند گولیاں چلانے کے بعد سکھ گاؤں میں داخل ہو گئے۔ اور مسلمانوں کو قتل کرنے لگے۔ جوان بچے، مرد اور عورتیں سب ان کے ہاتھوں شہید ہونے لگے۔ اکثر عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں مار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ بعض نے مٹی کا تیل کپڑوں پر چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا لی اور جل کر مر گئیں۔ جوان مرد مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور کچھ زخمی ہو گئے۔ چند مسلمان رات کے اندھیرے میں جان بچا کر نماز فجر کی اذان کے وقت فیض پورہ پہنچے اور حال بیان کیا۔ محلّہ بھر میں کہرام مچ گیا۔ دو جوان ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر گئے جو انگریز تھا اس نے کہا میں اپنا بوریا بستر لپیٹ چکا ہوں نیا ڈپٹی کمشنر تمہاری امداد کرے گا۔ یہ جواب لے کر چھاؤنی میں بلوچ

رجمنٹ کے آفیسر سے فریاد کی۔ اس نے ایک کرائے کی موٹر لاری پر ایک تھانیدار اور دو سپاہی ساتھ کر دیئے اور فیض پورہ کے تین مسلمان بھی جو بندوقوں سے مسلح تھے ساتھ ہو لئے۔ اس جمعیت نے لوہار کا جا کر بچے کھچے مسلمانوں کو نکالا۔ زخمیوں کو سنبھالا۔ کچھ سکھ سامنے آئے جنہیں اس پارٹی نے فیروں پر دھر لیا اور متعدد سکھ ہلاک کر دیئے۔ زخمیوں میں میں نے ایسے ضعیف العمر بوڑھوں کو دیکھا جن پر ہاتھ اٹھاتے انسان کو شرم آنی چاہئے۔ ایک پانچ برس کی بچی کو دیکھ کر تو بے اختیار آنسو نکل آئے۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی سب کے سب شہید کر دیئے گئے تھے اور اس پر بھی برچھے سے حملہ کیا گیا تھا۔ برچھا پسلی میں گھس گیا تھا۔ اس بچی کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ بیٹا کچھ کھاؤ گی تو اس نے پانی مانگا۔ چمچے سے اسے گرم دودھ پلایا۔

شہر کے دوسرے حصوں میں بھی مسلمانوں پر اسی قسم کے بلکہ اس سے بھی شدید ترنوعیت کے حملے ہو رہے تھے۔ اس لئے ہمارے محلّہ کے مسلمان گھروں سے نکل کر آغا خاں کی سرائے میں جمع ہونے لگے۔ ہم سب تین دن وہاں رہے۔ سرائے اور اس کے نزدیک کا کنواں قلعہ نما تھا۔ ہم وہاں شبانہ روز پہرہ دیتے تھے۔ ۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی شب کو سکھوں نے سردار شوکت حیات خان کے خسر میاں مقبول حسین کی کوٹھی کو آگ لگا دی۔ جو ہم سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر تھی۔ کوٹھی کے مکین لاہور جا چکے تھے۔ ۱۵ اگست کو دس بارہ سکھ ننگی تلواریں لے کر ہم پر حملہ آور ہوئے اور ہمارے دو آدمیوں کو گھائل کر دیا۔ ہم سب برچھے اور بھالے لے کر ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان سب کو واصل بہ جہنم کر دیا اور لاشوں کو گنے کے کھیت میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس کے تین مسلمان جوان ہمارے پاس آئے انہوں نے کہا کہ آپ لوگوں کے بچنے کی صورت نہیں کیونکہ سکھ لوگ مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو ریلوے اسٹیشن یا چھاؤنی پہنچا آتے ہیں شام کو ہم بھی لاہور چلے جائیں گے۔ ہم اس روز پولیس کی معیت میں چھاؤنی پہنچے جہاں مسلمان ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔

۱۴ اگست کی شام سکھوں نے فیض پورہ کے محلّہ کو لوٹا اور پندرہ اگست کی صبح کو آگ لگا دی۔ ہمارا خیال تھا کہ ۱۵ اگست کو امن قائم ہو جائے گا لیکن ہمارا خیال غلط ثابت ہوا ہمیں اسی روز شام کو لاہور کی طرف جانے والی لاریاں مل گئیں۔ جن پر سوار ہو کر ہم لاہور کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ خالصہ کالج میں بے شمار سکھ، ڈوگرے، اور گورکھے فوجی جمع ہیں۔ جن کی آنکھوں سے شرارت اور خباثت ٹپک رہی تھی۔ اگر ہمارے ساتھ بلوچ رجمنٹ کی گارڈ نہ ہوتی تو ہم میں سے ایک متنفس بھی امرتسر سے زندہ وسلامت نکل نہ سکتا۔ خالصہ کالج کے دونوں دروازوں میں بلوچ رجمنٹ کے دو ٹرک کھڑے تھے جن کے پاس رائفلیں اور برین گنیں تھیں۔ ہمارا قافلہ اس طرح بخیریت وہاں سے گزر گیا۔

جب ہم لاہور پہنچے تو ہم نے کئی جگہ ہندوؤں کے مکانوں کو جلتے ہوئے دیکھا۔ رام گلی کے پاس ایک فوجی ٹرک کے سکھ سپاہیوں نے ہم پر فائر کئے۔ جو خالی گئے۔ ادھر سے بلوچ رجمنٹ کے جوان نے برین گن کی باڑھ مار دی۔ معلوم نہیں سکھ فوجیوں پر اس کا کیا اثر ہوا۔ ایک اور نقطہ پر ایک سکھ نے ہماری لاری پر فائر کیا گولی انجن کو لگی اس سکھ کو ہمارے محافظ دستہ کے کپتان نے پستول کا نشانہ بنا کر وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ رات کے گیارہ بجے ہم والٹن کیمپ میں پہنچے۔ اس وقت بھوک اور پیاس کی شدت سے ہمارا حال بہت پتلا ہو رہا تھا۔ سحری کا کھانا نہ ملنے کے باعث ہم روزہ بھی نہ رکھ سکے روٹی ہمیں اگلے دن ایک بجے جا کر مل سکی جو ہم نے بصد شکر کھائی۔ (۴۲)

مجیٹھ ضلع امرتسر اور فتح گڈھ ضلع گورداسپور کا نواحی علاقہ

جناب سید احمد لکھتے ہیں:

مجیٹھ ضلع امرتسر اور فتح گڈھ ضلع گورداسپور کے نواحی علاقہ میں جہاں میں مقیم تھا سکھوں نے متعدد مراکز بنا کر جون اور جولائی کے مہینوں میں اکال سینا کی بھرتی شروع کر دی تھی ان دنوں میں امرتسر کا شہر فسادات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ سرکردہ سکھ ذیلداروں اور جتھے داروں نے سکھوں میں آتشیں اسلحہ تقسیم کئے۔ اور سکھ لوگ تیز دھار والے اوزار دھڑا دھڑ بنانے لگے۔ نہنگوں کی بھرتی زور شور سے شروع ہوگئی۔ میں نے سکھوں کی ان خفیہ جنگی تیاریوں کے متعلق مسلم اخبارات، مسلم لیگ، وائسرائے، گورنر پنجاب اور قائداعظم کو اطلاعات بھیجیں۔ خفیہ پولیس کو صحیح صحیح حالات بتائے لیکن حکومت پنجاب نے نئے نہنگوں کو خلاف قانون قرار دینے کے اعلان کے سوا اور کوئی کارروائی نہ کی۔ میں نے ہر دوروال میں اصحاب ثروت مسلمانوں سے اپیل کی کہ روپیہ اکٹھا کر کے حفاظت کا سامان بہم پہنچایا جائے لیکن کوئی سرمایہ دار مسلمان اس کام کے لئے روپیہ دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ یہ حال دیکھ کر مسلمان نوجوان اپنے طور نیزے، بھالے، تلواریں اور خنجر وغیرہ بنوانے لگے۔

جولائی کے اخیر میں وڈالہ افغاناں کے قریب علاقہ مجیٹھ کے ایک گاؤں میں ایک سکھ ایک پٹھان کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ جس کی بنا پر پولیس نے وڈالہ کے تیرہ سرکردہ اشخاص جو سب کے سب پٹھان تھے گرفتار کر لئے۔ اس کے بعد سکھوں نے رندھیر سنگھ عرف دھیرو کوٹلہ والا کی سرکردگی میں وڈالہ افغاناں پر حملہ کر دیا۔ وڈالہ کے دوسرے مسلمانوں سے کہا گیا کہ ہم تو صرف پٹھانوں کی خبر لینے کے لئے آئے ہیں تمہارے ساتھ کوئی غرض نہیں وڈالہ کے سرکردہ پٹھان تو گرفتار ہو چکے تھے باقی ماندہ نے سکھوں کا مقابلہ کیا ۱۷ سکھ مارے گئے اور لڑائی میں چار پانچ پٹھان شہید ہوئے۔ سکھوں کی تعداد ہزار نفوس سے زیادہ تھی اور مقابلہ میں صرف (۱۱) پٹھان لڑ رہے تھے۔ چار گھنٹہ جنگ ہوتی رہی آخر میں سکھ جمیعت غالب آ گئی اور انہوں نے گاؤں میں

داخل ہو کر پٹھانوں کے ۲۹ افراد جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی تھے قتل کر دیئے۔ اور ان کے گھر بار لوٹ لئے۔ صرف ایک گھر سے سکھوں کو نوے ہزار روپیہ کی کرنسی ہاتھ آئی۔ اس کے علاوہ وہ لاکھوں کا مال لوٹ کے لے گئے۔ دوسرے مسلمانوں کو سکھ تسلی دیتے رہے کہ یہ معاملہ ذاتی عداوت کا ہے اس میں سکھ اور مسلم قوم کا کوئی سوال نہیں۔ مجیٹھ کی پولیس نے سکھ غنڈوں کے خلاف کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔ اس واقعہ کے دو یا تین دن بعد سکھوں نے چک سکندر پر حملہ کر دیا۔ سکھوں کی جمعیت دو ہزار کے لگ بھگ تھی مقابلہ کے لئے صرف چالیس پچاس مسلمان جوان نکلے جو آتشیں اسلحہ سے یکسر محروم تھے۔ اس لڑائی میں ۲۳ سکھ اور ۵۹ مسلمان مارے گئے۔ کیونکہ لڑنے والے مغلوب ہو گئے تھے۔ بعد ازاں سکھوں نے نظام پورہ، پتلی، اٹھوال اور حمزہ کے مواضعات پر حملہ کئے موخر الذکر دو مقامات پر سکھ بری طرح پٹے۔ ان دیہات میں برابر تین دن مقابلہ ہوتا رہا۔

۱۳ اگست کو مجیٹھ اسٹیشن پر کسی سکھ نے مسلمان مسافروں کے ڈبے پر بم پھینکا جس سے چار مسلمان شہید ہو گئے۔ اسی دن شام کو فتح گڈھ چوڑیاں میں ریل گاڑیاں سے اترنے والے سکھوں پر مسلمانوں نے حملہ کر کے دو کو مار گرایا۔ ۹ اگست کو دبلہ تیجہ ضلع گورداس پور میں سکھوں نے شبخون مار کر ایک مسلمان مرد دو عورتوں اور پانچ بچوں کو شہید کر دیا۔ اس جگہ ایک سکھ بھی قتل ہوا جس کی لاش کو سکھ اٹھا کر رمداس لے گئے۔ ۱۰ اگست کو رندھیر سنگھ نے موضع نواں پنڈ پر حملہ کر دیا۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ چوّن سکھ مارے گئے چھ مسلمان شہید ہوئے رندھیر سنگھ بھی زخمی ہوا۔ اسی رات کو سکھوں نے پھر مسلمان نمازیوں پر حملہ کر دیا۔ جب کہ وہ تراویح پڑھ رہے تھے۔ ۱۷ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ۲۰ اگست کو سکھوں نے موضع بوہڑ والہ کو تاراج کیا۔ اور پھر بدّووال پر ہلہ بول دیا۔ جس میں رسالدار میجر چوہدری محمد خاں شہید ہوئے۔ تیرہ سو سکھوں کا یہ جتھہ بدووال اور فتح وال کو تاراج کرنے کے بعد ہر دوروال کی طرف بڑھا۔ ہر دوروال کے مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ سترہ سکھ ہلاک کر ڈالے جتھا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ یہ جتھا جاتے جاتے ایک

مسلمان چرواہے اور تین مسلمان کسانوں کو قتل کر گیا۔ جو راستے میں انہیں ملے۔ سکھ جتھے کی اس شکست کے بعد ہر دوروال کے مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سکھوں کی جمعیتیں آمادہ پیکار ہیں اور وہ پھر حملہ کریں گے اس لئے مجیٹھ فتح گڈھ اور رمداس کے سارے علاقہ کی مسلم آبادیوں کو خالی کر دینا چاہئے۔ ہمارے پاس حفاظت و مدافعت کا سامان بہت کم تھا اس لئے آبادیاں خالی کر دی گئیں۔ اور تمام دیہات کے مسلمان دریائے راوی کے کنارے دود کے پتن پر جمع ہونے لگے۔

دیہات کو خالی کر دینے کا فیصلہ کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۸ اگست کو حد بندی کمیشن کے فیصلہ کا اعلان ہو چکا تھا اور عام مسلمان جو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ہمارا علاقہ پاکستان میں جائے گا مایوس ہو کر بددل ہو گئے تھے۔ (۴۳)

دود کے پتن کا محشرستان

مولوی مظہر الدین صاحب مظہر رمداسی صابری اپنی داستان کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سکھوں کے جتھے کی شکست کے اگلے دن بارش ہوتی رہی۔ دوسرے دن رات کو بارش ذرا تھمی ہی تھی کہ سکھوں کا ایک جم غفیر مسلمان پناہ گیروں کے اس قافلہ کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا جو دریا کے کنارے پر ایک میل کے طول میں پھیلا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے گھوڑیوں پر سوار ہو کر سارے قافلے کو خبردار کیا اور بہادر اور ہمت ور اشخاص مقابلے کے لئے نکلے۔ اور جوانمردی کے ساتھ مزاحمت کرنے لگے۔ سکھوں کی تعداد سات آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ملٹری کے دستے بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے قافلے کے قریب پہنچ کر بارش کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سکھوں نے آگے بڑھ کر قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ چیخ پکار فریاد وفغاں کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عورتیں مرد اور بچے سراسیمہ ہو کر دریا کی طرف بھاگے اور دریا میں چھلانگیں لگا لگا کر اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کرنے لگے۔ سکھ دریا کے کنارے پر گولیوں، برچھیوں نیزوں کرپانوں اور کلہاڑیوں سے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے۔ ادھر دریا کی موجیں پناہ ڈھونڈنے والوں کو غرق آب کر کے موت کے آغوش میں لے رہی تھیں عصر سے لے کر مغرب تک یہ سلسلہ جاری رہا سیکڑوں مسلمان سکھوں کے ہاتھوں سے مارے گئے۔ سیکڑوں نذر آب ہو گئے۔ سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ ماں کو بچے کی، بھائی کو بہن کی، شوہر کو بیوی کی اور بیٹے کو باپ کی خبر نہ تھی۔ مغرب کے قریب سکھوں کا جتھہ مال مویشی اور بیل گاڑیوں پر لدا ہوا سامان لے کر لوٹ گیا۔ اب ہر شخص اپنے عزیزوں اور رقیبوں کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا۔ مجھے اپنی بیوی اور بچے دریا کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آئے۔ بچے ماں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے۔ بڑھ کر ان کے پاس پہنچا اور موجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کی ہمت بڑھاتا ہوا انہیں بمشکل کنارہ کے قریب لایا۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ طاقت نے جواب دیا۔ میں تن بہ تقدیر ہو کر انہیں خدا حافظ

کہہ رہا تھا کہ دو آدمی قریب سے گزرے۔ میں نے ان کی منت کی انہوں نے ہمیں کنارے تک پہنچایا۔ بیوی اور بچوں کو کنارہ پر بٹھا کر میں والدہ کی تلاش میں نکلا ان کی گود میں میرا چار سالہ بچہ اویس تھا۔ مجھے قوی اندیشہ تھا کہ میری والدہ اور اویس موجوں کی نذر ہو چکے ہیں لیکن خدائے کریم نے اپنی قدرت کاملہ سے دونوں کو بچا لیا اور وہ مجھے مل گئے۔ میرا بڑا ہمشیر زادہ صادق بی۔اے اور میری ایک عم زاد بہن کے تین جوان بیٹے اور ایک بیٹی شیر خوار بچہ سمیت دریا کی نذر ہو گئے۔ میرا ایک بیٹا رضا محمود نوری غوطے کھانے کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکا۔ ہماری طرح اور بہت سے خاندانوں کو اسی قسم کے صدمات اٹھانے پڑے۔

رات کی تاریکی ہزار قسم کی ہولناکیاں لے کر وارد ہوئی۔ کنارے پر جہاں لوگ بیٹھے تھے ہر طرف لاشیں پھیلی ہوئی تھیں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہزاروں کتے چیخ رہے تھے۔ بجلی کی چمک بھیانک کیفیتوں پر رہ رہ کر روشنی ڈالتی تھی اور دہشت زدہ انسانوں کو اور بھی ڈرا رہی تھی۔ اس روشنی میں دور کہیں مویشی کھڑے نظر آتے تھے تو عورتیں چلانے لگتیں لو وہ جتھا آ گیا۔ لو وہ جتھا آ گیا۔ دہشت اور ہراس کا یہ عالم تھا کہ کئی عورتوں کے حمل ساقط ہو گئے۔ متعدد ہوش وحواس کھو بیٹھیں اور پاگل ہو گئیں۔ اوپر سے مینہ برس رہا تھا نیچے دریا کا بہتا ہوا پانی گزر رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی خون منجمد ہو کر رہ گئے۔ اب دریا کا سیلاب برق رفتاری کے ساتھ پھیلنے لگا۔ لوگ اٹھے اور چھنیاں کے گاؤں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ جو دریا سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ چھنیاں سے سکھوں کا ایک گاؤں دھوبہ چار میل کی مسافت پر تھا۔ وہاں سکھوں کے حملے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔

اگلے روز ۲۷ اگست کو ڈیڑھ ہزار کے قریب مسلمان چھنیاں کی بستی میں موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہزاروں دریا کے کنارے سیلاب ہی میں بیٹھے موسلا دھار بارش کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ سیلاب کی وجہ سے چھنیاں کی بستی اور سکھوں کے دیہات کے مابین ایک نالہ حائل ہو گیا۔ اس لئے حملے کا خطرہ تو جاتا رہا لیکن دریا اور نالہ دونوں چڑھاؤ پر تھے۔ طغیانی دم بدم

زور پکڑ رہی تھی۔ اور جزیرہ کی وسعت کا دامن تنگ تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سب کو موت کا خطرہ سامنے کھڑا نظر آنے لگا۔ کوئی کلمہ طیبہ پڑھ رہا تھا۔ کوئی آیت کریمہ کا ورد کر رہا تھا۔ بعض لوگ لیڈروں کی شان میں بے نقط قصیدے سنا رہے تھے۔ بعض شومیء اعمال اور ناسازیٔ بخت کے شکوے کر رہے تھے۔ چند یوم اسی عالم میں گزر گئے بارش تھم جانے کے باعث دریا اور نالہ کا پانی اترنے لگا۔ کشتیاں ناپید ہو چکی تھی۔ بیل گاڑیاں لانے والوں نے گاڑیاں توڑ کر ان کے تختوں کو رسوں سے باندھا اور اپنے خاندانوں کو ان تختوں پر سوار کر کے پار جانا شروع کر دیا۔ کئی خاندان اس طرح دریا عبور کر گئے اور کئی بمشکل واپس آنے میں کامیاب ہو سکے کیونکہ ان کے افراد تیرنا نہیں جانتے تھے۔ نالہ پایاب ہو رہا تھا اس لئے سکھوں کے حملہ کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ چند روز کے بعد ملاح بھی دو کشتیاں لے کر نمودار ہوئے۔ اور سیکڑوں روپے لے کر لوگوں کو پار پہنچانے لگے۔ حشر کے اس عالم میں بھی لوگوں کو دولت سمیٹنے کی فکر لاحق تھی۔ بعض لوگ دلال بن کر روپیہ کماتے تھے۔ لوگوں سے پیشگی وصول کر کے آنکھ تک نہ ملاتے تھے۔ بلکہ استفسار پر مغلظات سناتے تھے۔ ملاح ایک کشتی میں مسافروں کو لادتے تھے منجدھار میں ان کے سامان کو دریا میں پھینک دیتے تھے۔ دوسرے ملاح اس سامان کو لپیٹ کر دوسری کشتی میں لاد لیتے۔ ان طریقوں سے اور اس حال سے لوگ دریا کو عبور کرتے رہے۔ ہم نے ملاحوں کو چھ سو روپیہ دے کر دسویں روز ۲۱ اگست کو دریا عبور کیا۔ اور پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ جہاں کسمپرسی اور حکام کی سنگ دلی کے مصائب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ (۴۴)

تھی خدا پر اک نظر اور ناخدا پر اک نظر　　وہ بھی کیا عالم تھا جب کشتی سر ساحل نہ تھی

سکھوں کی عہد شکنی اور سفا کی

مولوی مظہر صاحب اپنے بیان میں رقم طراز ہیں:

شام پورہ کے سکھوں نے وہاں کے مسلمانوں سے گرنتھ صاحب اور قرآن مجید پر حلف اٹھا کر عہد کر رکھا تھا کہ وہ حملہ آوروں کا مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد اور حفاظت کریں گے۔ جب شام پورہ اور رمداس کے گردنواح کے دیہات سکھوں کے حملوں کی تاب نہ لا کر خالی ہونے لگے تو شام پورہ کے مسلمان بھی گاؤں کو خالی کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ شام پورہ کے سکھوں نے ان سے کہا کہ آپ معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں یہ کہہ کر انہیں روک لیا۔ رمداس سے نکلنے سے ایک دن قبل میں نے شام پورہ کے چوہدری غلام محمد سے پوچھا کہ کیا سکھ آپ لوگوں کو زبردستی روک رہے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے اور سکھ اس پر کاربند ہیں مسلمان جب نماز پڑھتے ہیں تو سکھ ننگی کرپانیں لے کر پہرہ دیتے ہیں۔ میں نے چودھری صاحب کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔

جس روز دریا کے کنارے ہم سب سیلاب کی وجہ سے دریا کا کنارہ چھوڑ کر چھنیاں کے گاؤں میں پہنچے تو شام پورہ کے چودھری غلام محمد اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ سراسیمگی کے عالم میں بھاگ کر وہاں پہنچے اور میرے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگے۔ انہوں نے بتایا کہ شام پورہ کے سکھوں نے عہد شکنی کی۔ اور حملہ آور جتھے کے مقابلے میں ہماری حفاظت کرنے سے قاصر رہ گئے۔ بلکہ حملہ آوروں کے ساتھ مل کر انہوں نے شام پورہ کے مسلمانون کا قتل عام کیا عورتوں تک کو برہنہ کر کے تلاشی لی پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک سکھ نے چودھری صاحب پر تلوار کا وار کیا۔ چودھری کی بیٹی اپنے باپ سے لپٹ گئی اور تلوار کا زخم کھا کر شہید ہو گئی۔ چودھری صاحب بھاگ نکلے۔ سکھوں نے تین میل تک ان کا تعاقب کیا لیکن وہ بچ کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے۔ سکھوں نے شام پورہ کے مسلمانوں کی جوان لڑکیاں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ اور باقی ماندہ اشخاص کو قتل کر دیا۔ چودھری صاحب کے خاندان کے سارے افراد شہید کر دیئے

گئے۔ وہ تنہا بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکے۔

رمداس کے قریب سکھوں کے ایک گاؤں شاہ پور پوربیاں میں بھی اسی قسم کا حادثہ رونما ہوا۔ وہاں کے مسلمان جلاہوں کو سکھ آخر وقت تک تسلیاں دیتے رہے۔ لیکن آخر کار انہیں بھی تہ تیغ کر دیا گیا۔ رمداس کے ایک قاضی صاحب بھی سکھوں پر اعتماد کر کے اپنے اہل وعیال سمیت وہیں رہ گئے تھے۔ مسلمانوں کے نکل جانے کے بعد سکھوں نے ان کا گھر بھی لوٹا سردار اوتم سنگھ انہیں اہل وعیال سمیت اپنے گھر لے گیا اور دو ہزار روپیہ لے کر ان کے لئے ایک لاری کا بندوبست کر دیا۔ جب قاضی صاحب کی لاری ڈیرہ بابا نانگ پہنچی تو سکھوں نے ان کے خاندان کی بڑی بے عزتی کی دو نوجوان لڑکیاں چھین لیں۔ باقی خاندان بڑی مشکل سے ڈیرہ کا پل عبور کر کے پاکستان کی حدود میں داخل ہو سکا۔ (۴۵)

چند عبرت انگیز مناظر

مولوی مظہرالدین رمداس لکھتے ہیں:

اس سفر ہجرت کی حشر سامانیوں میں میں نے چند ہوش ربا واقعات ایسے بھی دیکھے جن کا اثر میرے دل و دماغ پر سے عمر بھر زائل نہ ہوگا۔ حملہ کے روز جب کنار دریا پر جمع ہونے والے مسلمان نفسانفسی کے عالم میں اپنے آپ کو دریا کی موجوں کے حوالے کر رہے تھے۔ میں نے اپنے محلّہ کی ایک اسی سالہ بڑھیا زینت کو دیکھا کہ موجوں کی لپیٹ میں آ کر ڈوب رہی ہے بڑھیا نے مجھے دیکھ کر آواز دی بیٹا مجھے پکڑو میں نے کوشش سے اسے پکڑا لیکن زیادہ وقت تک ضعیفہ کو لے کر نہ تیر سکا۔ میں نے ایک بیل کی دم اسے پکڑا دی لیکن ایک جوان مسلمان نے جو بیل پر سوار تھا لات مار کر ضعیفہ کے ہاتھ سے دم چھڑوا دی اور وہ مائی میرے دیکھتے دیکھتے پانی میں ڈوب گئی۔

جب ہم پہلی بار چھنیاں کے گاؤں میں جا کر مقیم ہوئے تھے تو تلونڈی ارائیاں کا ایک بھاری قافلہ وہاں پہنچا۔ ان میں سے ایک نوجوان روتا ہوا فریاد کر رہا تھا۔ کہ میں اپنی ضعیف اور لنگڑی ماں کو اٹھا کر چند میل لایا تھا لیکن تھک ہار کر اسے رمداس کے قریب ریلوے لائن پر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اسے یہ کہہ آیا ہوں کہ بچوں کو دریا پار چھوڑ کر تجھے لے جاؤں گا۔ اب مجھ میں چلنے کی سکت نہیں رہی، میرے پاس دو ہزار روپیہ ہے اگر کوئی شخص میری ماں کو اٹھا لائے تو میں یہی دو ہزار روپیہ اس کی نذر کر دوں گا۔ جب کوئی شخص بھی جان کے خوف سے اس طرف جانے پر آمادہ نہ ہوا تو وہ نوجوان چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ قافلہ اس کی چیخ و پکار سے بے پرواہ دریا کی طرف چلا گیا۔ اور ملاحوں کو ہزاروں روپے دے کر پار اتر گیا۔

ہم جس روز رمداس سے نکل کر سرشام جٹا گاؤں کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں فقیروں کے ایک تکیے میں ستانے کے لئے ٹھہر گئے۔ وہاں پندرہ بیس درویش اطمینان خاطر سے بیٹھے تھے۔ رات کے اندھیرے میں چاروں طرف سے بم پھٹنے کی سماعت شکن آوازیں آ رہی تھیں میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیوں نہیں نکلتے۔ انہوں نے جواب دیا کہ نکل کر کہاں جائیں

کیا ادھر کوئی اور خدا ہے اگر مرنا ہے تو ہم یہیں مرشد کے مزار کے سامنے مریں گے۔

کنار دریا پر حملے کے بعد میں نیم جانی کی حالت میں بدن پر لحاف اوڑھے پانی میں بیٹھا تھا۔ قریب سے ایک معصوم بچی کے چیخنے اور چلانے کی آواز آنے لگی۔ یہ لڑکی اپنے باپ کو پکار رہی تھی۔ دریافت کرنے پر ایک عورت نے بتایا کہ اس کی ماں شہید ہو گئی ہے۔ اور باپ دریا میں ڈوب گیا ہے۔ اس بچی کی عمر پانچ سال ہے اس کی گود میں اس کی ایک ننھی بہن بھی ہے جس کی عمر تین دن سے زیادہ نہیں۔ عورت نے کہا کہ یہ لڑکی مجھے پوچھتی ہے کہ میں اپنی ننھی بہن کو دریا میں پھینک دوں۔ میں یہ حالات سن کر سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ انتہائی کوشش کے باوجود اٹھ کر اس کی مدد نہ کر سکا۔ میری برادری کا ایک جوان لڑکا محمد حسین اٹھا اور اس لڑکی کو کپڑا پہنا آیا۔ ہوا کے تند جھونکے کپڑے کو بدن پر ٹکنے نہیں دیتے تھے۔ سید بوٹے شاہ شہید کی اہلیہ نے اس بچی کو لحاف اوڑھایا۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے مناظر میری بدنصیب آنکھوں نے دیکھے والدین کی شہادت کے بعد شیر خوار اور کمسن بچے سیلاب میں پڑے بلک رہے تھے۔ مگر کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ کیونکہ سب کے لئے محشرستان میں اپنے بچوں کا سنبھالنا امر محال ہو رہا تھا۔ (۴۶)

تحصیل ترنتارن کی سرگزشت

ملک چراغ دین اور چودھری طفیل حسین تحریر فرماتے ہیں:

ہم جلال آباد تحصیل ترنتارن کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے علاقہ میں جولائی کے نصف آخر ہی میں مسلمانوں کے اکّا دکّا قتل کی وارداتیں شروع ہوگئی تھیں۔ جن کا مقصد مسلمانوں کو دہشت زدہ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نہنگ سکھ دور افتادہ راستوں میں اکیلے دکیلے مسلمان کو مار ڈالتے تھے۔ سکھوں نے بعض مقامات پر فقیروں کے تکیوں پر جو بالعموم آبادی سے دور ہوتے ہیں شبخون مار کر فقیروں اور مسافروں کو بھی قتل کیا۔ سکھ لیڈر اس قسم کے واقعات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور قاتلوں کو انعام دیتے تھے۔ پنتھک پارٹی کا جتھہ دار اودھم سنگھ نگو کے ان دنوں کار میں بیٹھ کر دیہات کا چکر لگایا کرتا تھا۔ اور گوردواروں میں جا کر سکھوں کو خفیہ ہدایات دیا کرتا تھا۔ سکھوں کی اس ساز باز کا نتیجہ سب سے پہلے جتھے دار مذکور کے اپنے گاؤں ناگوکی میں برآمد ہوا جہاں ۲۴ یا ۲۵ جولائی کی شام کو جب کہ مسلمان روزہ افطار کر کے ایک جگہ جمع ہو کر نیاز کا کھانا کھا رہے تھے سکھوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں بہت سے مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ان کے مکانوں کو آگ لگا کر نعشیں اس آگ میں پھینک دیں۔ زندہ بچوں تک کو اس آگ میں ڈال دیا۔ اگلے روز ایک لڑکی کی جلی ہوئی نعش ملبہ سے نکالی گئی جس کی بغل میں قرآن مجید تھا ناگوکی کے کچھ مسلمان گھوڑوں پر سوار ہو کر جلال آباد اور تھانہ دیرووال میں پہنچے۔ جلال آباد سے مسلمانوں کی ایک جمعیت فی الفور اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے روانہ ہوگئی اور تھانہ دیرووال سے پولیس چل پڑی۔ ان کے پہنچ جانے کی بدولت سکھ بھاگ نکلے اور ناگوکی کے باقی ماندہ مسلمان قتل ہونے سے بچ گئے اور اگلے روز صبح کے وقت ناگوکی سے ہجرت کر کے جلال آباد اور دیرووال میں پناہ گیر ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد سکھوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے امن کمیٹیاں بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اس آگ کو پھیلنے سے روکنا چاہئے۔ ان کی نیت خراب تھی۔ چند روز بعد موضع لدّ ڑ کا لیفٹیننٹ سوداگر سنگھ بی اے مسلمانوں کے گاؤں بھلائی پور میں

صلح وامن کی بات چیت کرنے کے بہانے سے آیا۔ وہاں جلال آباد کے چند سرکردہ مسلمان بھی بلائے گئے تھے۔ اس چال کا مقصد یہ تھا کہ بھلائی پور اور جلال آباد کے سرکردہ مسلمانوں کو جمع کر کے ختم کر دیا جائے کیونکہ سوداگر سنگھ اپنے ہمراہ ایک جتھا لے کر آیا تھا جو اس نے بھلائی پور کے باہر کھیتوں اور فصلوں میں چھپا رکھا تھا۔ سوداگر سنگھ کے جانے کے کوئی دس پندرہ منٹ بعد اس جتھے نے بھلائی پور پر حملہ کر دیا۔ مسلمان اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر مقابلے کے لئے ڈٹ گئے۔ سکھ گولیاں چلا رہے تھے لیکن مسلمانوں نے انہیں جلد ہی شکست دے کر بھگا دیا۔ سوداگر سنگھ مذکور اپنے ہمراہ تین ہمراہیوں کے ساتھ وہیں کھیت میں رہا۔ اب بھلائی پور کے لوگ خوف زدہ ہو کر گاؤں سے نکلنے لگے لیکن جلال آباد کے مسلمانوں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ جلال آباد سے دو سو مسلمان باری باری تمہارے گاؤں میں آ کر تمہاری حفاظت کیا کریں گے۔ جب سکھوں نے یہ حال دیکھا کہ جلال آباد کے دوسرے دیہات کے مسلمانوں کی امداد کر رہے ہیں تو انہوں نے ناگوں کی طرف سے خود جلال آباد پر حملہ کر دیا۔ جلال آباد کے مسلمانوں نے مقابلہ کیا سکھ مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے۔ اس لڑائی میں سکھوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں کافی جان نقصان برداشت کرنا پڑا۔

سکھوں نے ترن تارن کی تحصیل کے ایسے علاقوں میں حملے شروع کر رکھے تھے جہاں ان کی اکثریت تھی۔ تھانہ ویرووال کے علاقہ میں جہاں مسلمان کثرت سے آباد تھے وہ دم نہیں مارتے تھے اور مسلمانوں کو امن پسندی کا یقین دلاتے رہے۔ آغاز اگست میں سکھوں نے ترنتارن کے قصبہ میں مسلمانوں پر حملہ کیا اور مسلمانوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ جلال آباد چونکہ مسلمانوں کا مرکز تھا اس لئے ایک دفعہ شکست کھانے کے بعد پھر کئی روز انہوں نے اس طرف کا رخ نہ کیا۔ مسلمانوں نے اپنے قصبہ سے ہندوؤں کو نکال دیا کیونکہ وہ سکھوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور انہیں جلال آباد کے مسلمانوں کی حفاظتی سرگرمیوں کی خبریں دیتے رہتے تھے۔ انہی دنوں میں خواص پورا اور ویرووال میں ملٹری کے کیمپ کھل گئے۔ وہاں جو فوجی آئے وہ سب کے سب

ہندو اور گورکھے تھے۔ ایک دو سکھ افسر اسی علاقہ کے ایک گاؤں کھڈور صاحب کے بھی تھے جن کا جتھے دار اودھم سنگھ سے بہت یارانہ تھا۔ اودھم سنگھ نے اس ملٹری کو جلال آباد کے مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا ایک روز اس ملٹری نے آکر جلال آباد کا گھیراڈال لیا جیپ کاریں قصبہ کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگیں۔ گورکھے گھروں میں گھس گھس کر مردوں کو باہر نکالنے لگے۔ یہ گورکھے مسلمان عورتوں کو گالیاں دیتے تھے۔ انہوں نے تمام مردوں کو جن میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے ایک مقام پر جمع کیا۔ اور سب کو کان پکڑنے اور سر نیچا اور پیٹھ اونچی رکھنے کا حکم دیا۔ اردگرد سنگینوں کا پہرہ لگادیا۔ جو مسلمان سر اونچا کرتا تھا گورکھے اس کی پیٹھ پر رائفلوں کے بٹ مارتے تھے اور سنگینیں چبھوتے تھے۔ جو گورکھے جیپ کاروں میں بیٹھ کر قصبہ کے اردگرد چکر لگا رہے تھے وہ بلاوجہ فائر بھی کرتے جاتے تھے۔ امرتسر کا سکھ سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں موجود تھا۔ اور سپاہیوں کو ہدایت کر رہا تھا کہ ان کو پانی وغیرہ ہرگز نہ پلایا جائے اور نہ کان پکڑنے کے مجوزہ طریقہ میں کوئی فرق آئے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اکثر مسلمان روزے سے تھے، افطار کے وقت جب مسلمانوں نے روزہ کھولنے کے لئے پانی مانگا تو انہیں نے سنگینوں سے کچوکے دیئے گئے۔ کئی آدمیوں کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ زمین مسلمانوں کے خون اور پسینے سے گارا بن گئی۔ گورکھا فوج کے اس ظلم وتشدد اور اس دہشت آفرینی سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ قصبہ جلال آباد کو اُڑا کر رہیں گے۔ سحری کے وقت مسلمانوں نے پھر پانی مانگا لیکن پھر انہیں بٹوں اور سنگینوں سے زدوکوب کیا گیا۔ صبح نمودار ہوئی تو گورکھوں کے دل میں رحم آگیا۔ انہوں نے پانی کی مشکیں منگوائیں اور مسلمانوں کو کان پکڑنا چھوڑ کر پانی پینے کی اجازت دے دی۔ ایک دو آدمیوں کو قصبہ کے اندر سب کا کھانا لانے کے لئے بھیج دیا۔ عورتیں اس حد تک خوف زدہ ہو رہی تھیں کہ اپنے آدمیوں کی آواز پر بھی دروازہ نہیں کھولتی تھیں۔ دوسرے دن شام تک مسلمانوں کا چناؤ ہوتا رہا۔ معزز اور چیدہ چیدہ اشخاص کو نیز طاقت ور اور لڑاکے جوان مردوں کو ایک طرف کر دیا گیا۔ عشاء کے وقت باقی ماندہ کو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اور پچاس کے قریب مسلمانوں کو ملٹری والے تیسرے دن

ویرووال لے گئے۔ جاتے وقت سکھ سپاہی گلی گلی اور کوچے کوچے میں پکار پکار کہتے تھے کہ بہتر ہے مسلمان یہاں سے بھاگ جائیں ورنہ سکھ آکر ان سب کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتیں اٹھا کر لے جائیں گی۔ جس روز جلال آباد کے مسلمانوں پر یہ ظلم وتشدد ہو رہا تھا اس روز سکھوں کے متعدد دیہاتوں نے مل کر موضع بھلائی پور پر پھر حملہ کر دیا۔ بے شمار سکھوں کو دیکھ کر اور جلال آباد کے مسلمانوں کا حال سن کر بھلائی پور کے مسلمانوں کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ دو آدمی گھوڑوں پر سوا ہو کر جلال آباد پہنچے انہوں نے ہاتھ باندھ کر گورکھا ملٹری سے منت سماجت کی کہ ہماری حفاظت کے لئے چلیں لیکن گورکھے انہیں یہ جواب دیتے تھے کہ ہماری رائفلیں خراب ہیں کام نہیں کرتیں۔ وہ دو آدمی ہیں وہیں کھڑے روتے اور واویلا کرتے رہے۔ آخر دو گھنٹہ کے بعد گورکھا گارڈ بھلائی پور کی طرف گئی۔ سکھ حملہ آور اس وقت تک اپنا کام تمام کر کے جا چکے تھے۔ جو مسلمان بھاگ کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے وہ بھاگ گئے تھے۔ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کی لاشوں کے ڈھیر وہاں لگے ہوئے تھے۔ جن کو کتے اور گدھ جھنجھوڑ کر کھا رہے تھے۔ ملٹری وہاں کا حال دیکھ کر واپس جلال آباد آگئی۔ اور وہاں سے اگلے دن پچاس مسلمانوں کو گرفتار کر کے ویرووال چلی گئی۔

اس ظلم وتشدد کو سہنے کے بعد جلال آباد کے مسلمان بھی سخت ہراساں ہوگئے اور ان میں سے کئی خاندان قصبہ سے نکل کر دریا کے پار ریاست کپورتھلہ میں جانے لگے۔ مشہور تھا کہ کپورتھلہ کے مہاراجہ نے اپنی ریاست میں امن قائم رکھنے اور مسلمانوں کی حفاظت کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ مزید برآں وہاں اسّی فیصدی مسلمان آبادی بھی تھی۔ اسلئے جلال آباد سے نکلنے والوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ یہ حال دیکھ کر گردونواح کے چھوٹے چھوٹے مسلمان دیہات بھی خالی ہوگئے۔ سکھوں نے ان گاؤں کو اطمینان خاطر سے لوٹا اور نذر آتش کر دیا۔ ابھی جلال آباد میں مسلمانوں کی خاصی تعداد مرنے مارنے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ پولیس اور ملٹری روزانہ وہاں آ آ کر کام کے دو دو چار چار آدمیوں کو گرفتار کر کے لے جاتی تھی۔ پولیس اور ملٹری کو قصبہ کی

طرف آتا دیکھ کر مرد کھیتوں میں جا کر چھپ جاتے تھے یا دریا کی طرف بھاگ جاتے تھے۔

جلال آباد کی جمعیت کمزور ہو چکی تھی۔اس لئے ناگوکی کے جتھے دار اودھم سنگھ نے جلال آباد پر حملہ کرنے کے لئے بڑا جتھا تیار کیا اور عیدالفطر کے اگلے دن دھاوا بول دیا۔حملہ آوروں نے چاروں طرف سے قصبہ کا محاصرہ کر لیا۔رہے سہے مسلمانوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔شام کے چار بجے سے لے کر ساڑھے آٹھ بجے تک لڑائی ہوتی رہی اور آخر سکھ بھاگ نکلے۔ سکھوں کا جانی نقصان بہت زیادہ ہوا۔۳۵ مسلمان اس جنگ میں شہید ہو گئے۔حملہ آور تالے توڑنے کے لئے ہتھوڑے اور آگ لگانے کے لئے مٹی کے تیل کی بوتلیں ساتھ لائے تھے جنہیں وہ میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔اس کے بعد گوردوارہ کھڈور صاحب میں سکھوں کا ایک دیوان منعقد ہوا جس میں جتھے دار اودھم سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ بھی شامل تھے۔اس دیوان میں مسلمانوں کو ختم کرنے اور وہاں سے نکالنے کا تازہ پروگرام بنایا گیا۔جلال آباد چونکہ پولیس اور ملٹری کا معتوب بن چکا تھا اس لئے گردونواح کے دیہات مسلمان موضع سرائے تلونڈی میں جمع ہو رہے تھے۔سکھوں نے سرائے تلونڈی پر حملہ کیا اور وہاں بھی منہ کی کھائی۔اس کے بعد سرائے تلونڈی میں بلوچ ملٹری کی چوکی قائم ہو گئی۔اور پندرہ دن تک امن رہا۔بلوچ گارڈ تبدیل ہوئی تو مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔تلونڈی اور جلال آباد کے مسلمان گھروں سے نکل کر ویرووال کے ملٹری کیمپ میں جمع ہونے لگے اب وہاں ریاست کپورتھلہ کے پناہ گیر بھی آنے لگے تھے۔مسلمان ملٹری نے ویرووال سے فتح آباد اور بھرووال تک قافلے کا ساتھ دیا۔اور اس کے بعد ہندو ملٹری نے قافلے کو امرتسر کی طرف ہانکا۔راستے میں اس ملٹری کے ہاتھوں مسلمانوں کو جیسی جیسی ذلتیں برداشت کرنی پڑیں وہ ناقابل بیان ہیں۔سکھ جتھوں نے راستے میں حملے کئے۔ہوائی جہازوں نے مشین گن سے فائر کئے۔ترن تارن کی ملٹری نے گولیاں چلائیں۔یہ قافلہ لڑتا بھڑتا امرتسر پہنچا اور وہاں سے مسلمان ملٹری کی تحویل میں وسط ستمبر کے قریب پاکستان میں داخل ہوا۔(۴۷)

پکیوان اور اس کے مضافات

محمد مقصود عالم صاحب لکھتے ہیں:

پکیوان اور اس کے گردونواح کے دس بارہ دیہات کی فضا پرامن رہی۔ان دیہاتوں کے سرکردہ لوگوں نے امن کمیٹیاں بنا رکھی تھیں پکیوان کے چودھری محمد ابراہیم صدر مسلم لیگ ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنے کے لئے سرگرم رہتے تھے۔۱۶ اگست کو اعلان ہوا کہ حد بندی کے کمیشن نے ۱۸ جون والی تقسیم بحال رکھی ہے اور گورداسپور کا سارا ضلع پاکستان ہی میں شامل رہے گا۔ اعلان کے باعث ہندوؤں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔چودھری محمد ابراہیم نے اپنے علاقہ میں امن قائم رکھا اور ہندوؤں کو تسلیاں دیں اور ہندو اتنے خوش ہوئے کہ چودھری صاحب کو مبارکباد کہنے لگے۔۱۷ اگست کی شام کو اعلان ہوا کہ ضلع گورداسپور کی تین تحصیلیں کاٹ کر ہندوستان میں شامل کر دی گئی ہیں۔اس اعلان نے مسلمانوں کو افسردہ خاطر کر دیا۔ان کی امیدوں کا خون ہو گیا۔وہ صبر کے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔

۱۸ جون کو دن کے ڈھائی بجے ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔جس کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنا تھا لیکن ایک ہندو نے کھڑے ہو کر ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا۔ادھر سے مسلمان مقرروں نے بھی جوابی تقریریں کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہندوؤں نے تعدی کی تو مسلمان بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔مسلمانوں نے اس جلسہ کی باتوں کو چنداں اہمیت نہ دی لیکن ہندو حملہ کی تیاریاں کرنے لگے۔انہوں نے چپکے چپکے کلانور کے تھانہ دار رام گوپال کھتری کو پولیس اور فوج بھیجنے کے لئے پیغام بھیج دیا مسلمان بے خبر رہے۔۲۱ جون کو نماز عصر کے وقت پکیوان کے مسلمانوں پر ہلہ بول دیا گیا۔سب سے پہلے فوج اور پولیس نے چودھری محمد ابراہیم کے مکان پر حملہ کیا۔دوسری طرف مسلمانوں نے ہندوؤں کے مکانوں پر ہلہ بول دیا لڑائی شروع ہو گئی۔اطراف و جوانب سے سکھوں کے جتھے جوق در جوق آنے لگے جو آتشیں اسلحہ سے مسلح تھے مسلمان گولیوں کی تاب نہ لا کر پسپا ہوئے۔سکھوں نے گاؤں میں داخل ہو کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔گھروں کو آگ لگا دی۔بچوں کو اٹھا اٹھا کر جلتی آگ میں پھینکا۔عورتوں کی سخت بے حرمتی کی۔رام گوپال نے ۲۵ کنستر مٹی کا تیل جو کہ ڈپو میں تقسیم کرنے کے لئے پکڑا تھا۔سکھوں

کودے دیا تا کہ مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگا سکیں۔ چودھری محمد ابراہیم گاؤں سے باہر کھیتوں کی دیکھ بھال کے لئے گئے ہوئے تھے۔ جب گاؤں سے چیخ و پکار کی صدائیں اٹھیں تو گاؤں کی طرف دوڑے۔ اپنے گھر سے تھوڑے فاصلہ پر پہنچ کر آپ نے ہندوؤں کو للکارا کہ یہ کیا طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا ہے۔ سکھوں نے چودھری صاحب کو گھیرے میں لے لیا۔ چوہدری صاحب نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے لڑ رہے تھے۔ سکھ ان پر تلواروں اور برچھیوں سے وار کر رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کی جنگ کے بعد اسلام کے اس فرزند نے شہادت کا بلند مرتبہ حاصل کیا۔ سکھوں نے دین محمد مؤذن، عنایت اللہ احمدی، چودھری لال دین، جھنڈے خاں نمبردار، میاں علی محمد اور چالیس کے قریب گاؤں کے دیگر افراد کو کمال بے رحمی سے قتل کیا۔

گاؤں کے مسلمان مرد، عورتیں اور بچے اس حملہ کے بعد گھروں سے نکلے کچھ تو دریائے راوی کی طرف چلے گئے جو کچھ کلانور کی راہ سے صدہا قسم کے مصائب و آلام کا مقابلہ کرتے ہوئے جسٹر ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے گئے پکھوان پر حملہ ہوا تو گردونواح کے دیہات بھی خالی ہونے لگے۔ اور پتن ڈیرہ ملک پر مسلمان پناہ گزیں جو ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں کے اس ہجوم پر ملٹری نے حملہ کر دیا اور گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ سینکڑوں آدمی گولیاں کھا کھا کر خاک وخون میں لوٹنے لگے۔ ہزاروں نے دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ اور ڈوبنے لگے۔ دریا لاشوں سے اٹ گیا۔ پانی شہیدوں کے خون سے رنگین نظر آنے لگا۔ مسلمان مولی گاجر کی طرح کٹ رہے تھے۔ بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار نے محشر کا سا نقشہ پیدا کر دیا تھا۔ اس عالم میں کچھ لوگ جانوروں کی دموں کا سہارا لے کر دریا کو عبور کر سکے۔ سب کے سب اتنے خوفزدہ تھے کہ چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پکیوان کے کچھ لوگوں نے ہندوؤں کے گھروں میں پناہ لی تھی ان پناہ گیروں کا سامان ہتھیا لیا گیا۔ عورتوں کے زیورات اتار لئے گئے ان میں کئی ایک سے انتہا درجہ کی بدسلوکی بھی کی گئی۔ آخر ان سب کو دریا کے کنارے پر لایا گیا اور کہا گیا کہ دیکھو وہ دریا کے پار پاکستان ہے کیا تم وہاں جانا چاہتے ہو۔ یہ کہتے تھے اور تلوار یا برچھا مار کر مسلمان کو ہلاک کر دیتے تھے کہ لو اس طرح تم جلدی پاکستان پہنچ جاؤ گے۔ (۴۸)

اوجلّہ کی سرگزشت

جناب عبدالقدیر رشک لکھتے ہیں:

سیدھے سادھے دہقانوں کا خیال تھا کہ ۱۷ اگست کی صبح لامتناہی مسرتوں کو دامن میں سمیٹے نمودار ہوگی۔ کیونکہ گہرے سبزی مائل پرچم سرکاری دفاتر پر لہرا لہرا کر اسلامیان گورداسپور کو روشن مستقبل کا پیغام سنا رہے تھے۔ ۱۷ اگست کو ہلال عید نظر آیا۔ میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ پیچھے سے آواز آئی ''گورداسپور ہندوستان میں شامل ہو گیا'' اسلامی پرچم دفاتر سے اتار کر آگ میں جلا دیئے گئے۔ یہ سنتے اوجلہ کی مسرت آفریں بستی پر اداسی چھا گئی۔ پھر یہ اداسی یہاں سے نکل کر قریبی بستیوں میں پھیل گئی۔ بچے اداس بوڑھے اداس، انتہا یہ کہ نوجوانوں کے چہروں سے اداسی ٹپکنے لگی۔ میں نے کہا فدایان رسول ﷺ کے غیور بیٹو! مومن تو خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ خلافِ توقع اسی شام سکھ غنڈوں کا جتھا گاؤں کی جنوبی سمت پر حملہ آور ہوا۔ ہم نے نوجوانوں کے جذبات کو ابھارا۔ چنانچہ مٹھی بھر مجاہد کفار کے لشکر کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ دشمن نے فائرنگ شروع کر دی۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ بستی کی مشرقی سمت سے سکھوں کا بھاری جتھہ آبادی میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تیس نوجوانوں کو مشرقی سمت میں جوابی حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ نوجوان عورتوں سے اپیل کی گئی کہ وہ چھتوں سے دشمن پر پتھر برسائیں۔ بزرگان دین بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو گئے کہ امت مرحوم کی آج لاج رکھنا۔ ہمارے پاس نہ بندوق تھی نہ رائفل۔ اندھیری رات میں ہم اپنے عزائم کا دیپک لئے آگے بڑھتے رہے۔ گولیوں سے اکھڑ اکھڑ کر گرنے والی مسجد کی اینٹوں اور پلاسٹر کی تہوں کے درمیان کھڑے ہوئے مٹھی بھر مجاہد جن کے چہروں سے پسینہ اور جسموں سے خون ٹپک رہا تھا۔ مکمل دو گھنٹے تک دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ دو گھنٹے کے بعد جنوبی سمت کے حملہ آوروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پھر مغربی سمت کے محافظوں نے مل کر سکھوں کو مار بھگایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک مجاہد سراج الدین شہید اور چند نوجوان زخمی ہوئے ہیں۔ دشمن اپنے مجروحوں اور لاشوں کو ساتھ لے گئے تھے۔ اس لئے ان کے نقصان کا اندازہ نہ ہو سکا۔

صبح عید تھی۔ خوشیوں سے لبریز عید نہیں۔ محرم سے زیادہ ماتمی عید۔ جس کے متعلق سکھ

غنڈوں نے پہلے ہی پروگرام مرتب کر رکھا تھا۔ بعض کمزور دل بھائیوں کا خیال تھا کہ عید نہ پڑھی جائے۔ لیکن بستی کے غیور نوجوانوں نے ارادہ کر لیا کہ جب تک ان کے رگوں میں سرخ خون کا ایک قطرہ تک موجود ہے وہ سنت محمدی ﷺ کی عظمت کو اجاگر کرتے رہیں گے۔ چنانچہ امامت میرے سپرد ہوئی۔ کیونکہ امام مسجد نماز عید ادا کرنے کے حق میں نہ تھے۔ مسجد سے باہر مضبوط نوجوانوں کو بطور محافظ دستہ استعمال کیا گیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد جب خاکسار خطبہ پڑھ رہا تھا تو تین مختلف سمتوں پر سکھوں کے جتھے تیزی سے بڑھتے نظر آئے۔ امام مسجد نہایت بدحواسی کے عالم میں چلایا۔ ''بھاگو دشمن آ گئے'' میں نے پوری قوت سے گرج کر کہا۔ ہم کتوں کی موت مرنا پسند نہیں کرتے۔ میرے ان الفاظ پر دیہاتی نوجوانوں کے مکے تن گئے اور وہ بپھرے ہوئے شیروں کی طرح جوابی حملہ کے لئے پوری تنظیم کے ماتحت اپنے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ خوش قسمتی سے حملہ آوروں کے پاس سوائے دستی بموں کے اور کچھ نہ تھا۔ دشمن کے بموں کو غلط نشانوں پر پھینکوا کر گونجیلی آوازوں اور آتشیں ٹکڑوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب ہر مسلم برچھا بردار سکھ برچھا بردار کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ نوجوان موت و حیات کی اس کشمکش میں ارادہ کر چکے تھے۔ کہ ننگ انسانیت سکھ غنڈوں کی ستم رانیوں اور دست درازیوں سے وطن عزیز کی مقدس سرزمین کو پاک کرنا ہے۔

کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد سکھ ایک مردہ اور ایک نیم مردہ ساتھی اٹھا کر بھاگ گئے۔ ہمارے ایک نوجوان کو معمولی زخم آئے۔ وطن عزیز کی مدافعت اور حفاظت کے لئے نوجوان عید کے عیش و آرام کو خیرآباد کہہ کر سارا دن مورچوں پر کھڑے حملہ کے منتظر رہے۔ بعد از دوپہر معلوم ہوا کہ قریب کے گاؤں (گھرالہ) کے بیسیوں مسلمان ہندو ملٹری اور سکھوں نے موت کے گھاٹ اتار دیئے ہیں۔ پھر اطلاع آئی کہ موضع ورق میں ایک سو مسلمان لقمۂ اجل ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی تھانے وال، نبی پور، حیات نگر، ہمراج پور خالی ہو گئے۔ اب دس میل کے علاقہ میں صرف اوجلہ رہ گیا تھا جہاں مسلمان آبادی تھی۔ ہمارے دونوں جوان بصد مشکل گورداسپور کے نہنگوں سے بچتے شہر کے لیڈروں سے ملے التجا کی گئی کہ صرف ایک رائفل یا بندوق سے نوازا جائے۔ بجائے اس کے کہ ان کی درخواست پر التفات فرمایا جاتا انہیں حقیر سمجھ کر تسلی دینی بھی گوارا نہ کی۔ حملوں کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے ہم بھی ہجرت پر مجبور ہوئے۔

ہمارے گھر لٹے، مسجدوں میں الو بولے، آباؤ اجداد کی قبروں کی توہین ہوئی۔ ہم نے بصد حسرت و یاس وطن عزیز کو چھوڑا۔ رات جنگل کے گوشے میں بسر کی۔ کیونکہ مسلمانوں کا کسی آبادی میں رہ سکنا ناممکن تھا۔ مجھے حضرت یسوع ناصری علیہ السلام کے الفاظ یاد آ گئے کہ پرندوں کے لئے گھونسلے، لومڑیوں کے لئے بھٹ ہیں لیکن ابن آدم کو دنیا میں سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ۲۴ اگست کو ہمارا قافلہ دریائے راوی کے کنارے جا پہنچا۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا وہ کشتیوں میں سوار ہو کر پار جانے لگے۔ ساحل سے ہٹی ہوئی کشتیاں دیکھ کر میرے رفیقوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنا زخمی پاؤں پانی میں ڈال دیا۔ وہ گھبرائے میں نے کہا ''ناخدا جن کا نہیں ان کا خدا ہوتا ہے''۔ دفعتاً گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا گونج اٹھی۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ لوگ سراسیمہ ہو کر دریا میں چھلانگیں مارنے لگے۔ حاملہ عورتیں پیٹ پکڑ کر بے تحاشا بھاگتی تھیں۔ معصوم بچے دھیرے دھیرے آغوش نیستی میں سمٹتے جاتے تھے۔ آشفتہ سر موجیں مُردوں کو آگے بڑھ کر آغوش میں چھپا لیتی تھیں۔ دریا کی وسعتیں دور تک بچھی ہوئی پھاڑ کھانے والے سکھ درندوں کو گھور رہی تھیں۔ نواحی دیہات سے دھوئیں کے بادل اٹھتے پھر انسانی ایندھن کی چنگاریاں چیخوں کے ساتھ بلند ہو جاتیں۔ ہم آنکھیں بند کئے بدستور آگے بڑھتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دریا کا پانی ایک طرف سمٹ کر راستہ بنا رہا ہے۔ ہم نہ موسیٰ تھے نہ ہارون لیکن موسیٰ سے افضل رسول کی امت ضرور تھے۔ ہم نے جب خطہ پاک پر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ میرے ۳۷ رفیق آغوش دریا میں ابدی نیند سو گئے ہیں۔ وہ مر گئے لیکن میں تاحال زندہ ہوں۔ ان کا ماتم کرنے کے لئے۔ اور ملتِ مظلوم کو بتانے کے لئے کہ ہمارے اقبال کی داستان بھی ایسے وقت سے شروع ہوئی تھی جب کہ کفر کی آندھیاں شمع رسالت ﷺ کو گل کرنے کے لئے مدینہ کی چار دیواری کی طرف بڑھ رہی تھیں اور تین سو تیرہ فدایان رسول ﷺ کفار کے نیزوں اور تیروں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ (۴۹)

پٹھان کوٹ کی سرگزشت

جناب غلام رسول صاحب نظامی پٹھان کوٹ کے مسلمانوں کی سرگزشت کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

۱۷ اگست کو جب کہ مسلمان عیدالفطر کا چاند دیکھنے کے لئے منتظر تھے آل انڈیا ریڈیو نے اعلان کیا کہ ضلع گورداسپور کی تین تحصیلیں پٹھان کوٹ، گورداسپور اور بٹالہ بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہندوستان میں شامل کر دی گئی ہیں۔ ضلع گورداسپور کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ ان کا ضلع پاکستان میں شامل رہے گا۔ اس اعلان کے سنتے ہی عید کی خوشیاں جاتی رہیں اور ہر طرف رنج و مایوسی کا اظہار ہونے لگا۔ تاہم مسلمانوں نے خیال کیا کہ ہم ہندو راج ہی کے سائے میں اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر قانع ہو جائیں گے جیسی ہمارے مسلمان بھائی ہندو ریاستوں کے اندر بستے ہیں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی حکومت کی مشینری سراسر تبدیل ہوگئی ہر طرف ہندو اور سکھ حکام نظر آنے لگے۔ پولیس اور فوج بھی یکسر غیر مسلم عناصر پر مشتمل تھی۔ عید کے تیسرے دن یعنی ۲۰ اگست کی رات کو پٹھان کوٹ کے بازار میں بجلی کی روشنی یکا یک بجھ گئی۔ اور تاریکی میں بچوں اور عورتوں کے رونے اور چلانے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس کے بعد روشنی پھر نمودار ہوگئی دریافت حال پر پتہ چلا کہ ہندو بدمعاشوں نے محلّہ قاضی پورہ کے مسلمان پارچہ بافوں پر چھاپہ مارا اور تین مسلمانوں کو شہید اور چھ کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد دن دیہاڑے مسلمانوں کے گھر لٹنے لگے مسلمان فریاد لے کر پولیس میں جاتے یا حکام کے پاس پہنچتے تو الٹا انہیں ڈانٹا جاتا تھا۔ اور کہا جاتا تھا کہ تم ہی لوگ فساد کرتے ہو۔

۲۲ اگست کو جمعہ کی نماز کے بعد ہندوؤں کے ایک جم غفیر نے محلّہ قصّاباں پر ہلہ بول دیا۔ ہندو تلواروں، بندوقوں اور بموں وغیرہ سے مسلح تھے۔ مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کو بھگایا اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دوسرے محلوں پر بھی حملے شروع ہوگئے۔ مسلمان تین دن تک مقابلہ کرتے رہے لیکن جب دیکھا کہ حکام اور پولیس کھلم کھلا ہندوؤں کی امداد کر رہی ہے تو مسلمان گھروں سے نکل کر ملٹری سپلائی رسٹ کیمپ میں جمع ہونے لگے۔ اس کیمپ میں سکھ اور

گورکھا ملٹری کی گارڈ حفاظت کے لئے متعین تھیں۔ آٹھ نو ہزار مسلمانوں کے اجتماع کے لئے صرف پانی کے چار نل کھلے چھوڑے گئے جن میں وقت مقرر پر پانی آتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو بقدر ضرورت پینے کے لئے پانی بھی میسر نہیں آتا تھا۔ اگست کا مہینہ تھا شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ صفائی کا انتظام نہ ہونے کے باعث ہر طرف غلاظت پھیل رہی تھی۔ تعفن کے مارے دماغ پھٹے جاتے تھے۔ بچے بھوک اور پیاس کے مارے بلک رہے تھے۔

پٹھان کوٹ کے مسلمان چار دن وہاں رہے۔ چوتھے روز حکم ہوا کہ سب لوگ ایک گھنٹہ کے اندر اندر ڈھانگو کیمپ میں جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ سب کو پیدل چلنا ہوگا۔ جس قدر سامان اٹھا سکتے ہیں ساتھ لے جائیں۔ سب لوگ خوردنوش کا معمولی سامان لے کر روتے پیٹتے ڈھانگو کیمپ کی طرف روانہ ہوگئے۔ جو وہاں سے تین میل کے فاصلے پر جنگل میں بنایا گیا تھا۔ وہاں دیہات سے آئے ہوئے اور مسلمان بھی جمع ہو رہے تھے۔ اس جگہ ملٹری کی ٹوٹی پھوٹی بارکیں تھیں۔ جن کے اندر مسلمانوں نے پناہ لی اکثر باہر کھلی فضا میں پڑے رہے۔ اس کیمپ میں کل پندرہ سولہ ہزار نفوس جمع ہوگئے۔ پہلے دن راشن کے طور پر ۳ بوری آٹا اور ایک بوری نمک کی دی گئی۔ تیسرے اور چوتھے دن کچھ نہ ملا۔ مسلمان پناہ گیر ضلع کانگڑہ کے دیہات سے جوق در جوق آ رہے تھے۔ تعداد روبہ ترقی تھی۔ سرکاری طور پر راشن بہت کم مقدار میں ملتا تھا۔ جو ملتا تھا وہ بھی چھینا جھپٹی کی نذر ہو جاتا۔ خوردنوش کی بعض اشیا قیمتاً ملتی تھیں لیکن بہت گراں اور وہ بھی کم مقدار میں میسر آتی تھیں۔ گندم چھ روپے سیر، گوشت چھ روپے سیر، نمک دو روپے سیر تک بکنے لگا۔ سرخ مرچ دو پیسہ کی ایک ملتی تھی۔ راشن کے انتظام کے لئے سرکردہ اشخاص کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس نے روپیہ فراہم کر کے انگریز افسر کی مدد سے کچھ آٹا وغیرہ خریدا اور اسے بانٹنے کا انتظام کیا۔ لیکن یہ انتظام بھی چل نہ سکا۔ کیونکہ نہ تو سپلائی کے محکمہ سے قیمتاً راشن ملتا تھا نہ دکانداروں سے میسر آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیمپ میں فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ لوگ درختوں کے پتے، خار خشک کی بیلیں، جنگلی کریلے کی بیلیں اور دیگر نباتات ابال کر پیٹ بھرنے لگے۔ اور خلق

خدا بھوک کے مارے مرنے لگی۔

دور دراز کے اقطاع کے لوگ جوق در جوق آ کر اس کیمپ میں جمع ہوتے گئے۔ آنے والوں میں بعض کے سروں پر بودیاں بھی تھیں انہوں نے بتایا کہ ہمیں زبردستی ہندو بنالیا گیا تھا۔لیکن جب دیکھا کہ ہندو بننے والوں کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا تو ہم رات کی تاریکی میں نکل کر بھاگے اور جنگلوں میں چھپتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔آنے والے لوگ اپنے اپنے مصائب زہرہ گداز داستانیں بیان کرتے تھے۔بعض کہتے تھے کہ راستے میں ہندوؤں نے ان کا سارا ساز وسامان لوٹ لیا بعض کا بیان تھا کہ ہندو افسروں نے یہ کہہ کر اپنی اپنی نقدی اور اپنا اپنا قیمتی مال ہمارے پاس جمع کرادو ہم بحفاظت کیمپ میں پہنچادیں گے ہتھیالیا۔

جب راشن کی قلت کے باعث لوگ بھوکوں مرنے لگے تو سب مسلمانوں نے کیمپ کے میدان میں اکھٹے ہو کر نفل پڑھے اور خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔دعا سے فارغ ہوئے کہ آٹے کی بوریوں سے لدا ہوا ایک ٹرک کیمپ کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔لوگ اس ٹرک کی طرف دوڑے۔معلوم ہوا کہ یہ آٹا گورداسپور کی ریلیف کمیٹی نے تریموں کے پتن پر جمع ہونے والے مسلمان قافلے کے لئے بھیجا تھا۔لیکن وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ہر طرف مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں نے تمام مسلمانوں کو شہید کر دیا۔اس لئے وہ راشن ڈھانگو کیمپ لایا گیا ہے۔ یہ حال سن کر مسلمان زاروقطار رونے لگے۔ اور راشن کے پہنچنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔راشن کمیٹی نے یہ آٹا دو چھٹا نک فی کس کے حساب سے تقسیم کر دیا۔

ایک روز بارہ لاریوں کا ایک قافلہ ڈھانگو کیمپ میں پہنچا۔ لاریوں کے انچارج نے بتایا کہ کل تیس لاریاں چلی تھیں لیکن راستہ پر خطر ہونے کے باعث بہت سی لاریاں واپس لَوٹ گئیں۔ان لاریوں پر جتنے لوگ سوار ہو سکے چڑھ گئے۔ مجھے بھی اپنے اہل وعیال سمیت ایک لاری میں سوار ہونے کا موقع مل گیا۔ ہمارا قافلہ ملٹری کی حفاظت میں امرتسر کی راہ سے واہگہ پہنچا جہاں سبز ہلالی پرچم لہراتا دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی۔ واہگہ سے ہم چائنا کیمپ میں لائے

گئے وہاں ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔اور خدا کا شکر ادا کیا۔لاہور پہنچنے کے بعد ہمیں اپنے عزیزوں ،رشتہ داروں اور چالیس پچاس ہزار مسلمانوں کا خیال دامن گیر رہا جو ڈھانگو کیمپ میں پیچھے رہ گئے تھے۔کئی روز کے بعد معلوم ہوا کہ ڈھانگو کیمپ سے پیدل قافلہ چلایا گیا۔اس قافلہ کے لوگ جب لاہور پہنچے تو ان کی زبانی حسب ذیل حالات معلوم ہوئے۔

پہلے کنوائے کے بعد دس دس بارہ بارہ لاریوں پر مشتمل دو اور کنوائے ڈھانگو کیمپ سے پناہ گیروں کو لاد کر لائے لیکن جمعیت چونکہ چالیس پچاس ہزار سے اوپر ہو چکی تھی اس لئے سارے قافلہ کو پاپیادہ ہانکنے کا فیصلہ ہوا راستے میں اور قافلے بھی اس کے ساتھ ملتے گئے۔ یہ قافلہ ڈھانگو سے دس میل فی روز کے حساب سے چلا اور بارشوں میں بھیگتا، راستے کی کڑیاں جھیلتا مصیبتیں اٹھاتا قیام کرتا ہوا دینا نگر پہنچا۔ دینا نگر میں لاتعداد ہندو اور سکھ سڑک کے دونوں طرف کھڑے تھے۔قافلے کے ساتھ ہندو ملٹری تھی۔ ہندو اور سکھ قافلے میں سے خوبصورت اور جوان لڑکیوں کو کھینچ کر لے گئے۔کئی مسافروں کے ٹرنک اور سوٹ کیس گٹھڑیاں وغیرہ انہوں نے چھین لیں۔ ہندو اور سکھ لٹیرے کہتے تھے کہ یہ سب ہندوستان کا مال ہے۔اس لئے یہیں رہے گا۔اگر کوئی مسلمان مزاحمت کرتا تھا تو اسے وہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا تھا۔ قافلے کا طول آٹھ میل تھا۔ دینا نگر میں اس پر بم بھی پھینکے گئے۔اور گولیاں بھی چلائی گئیں۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے اور بہت زخمی ہو گئے۔ یہ قافلہ گرتا پڑتا گورداسپور پہنچا اور وہاں کے ریلیف کیمپ میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں مسلمان ملٹری قلیل تعداد میں موجود تھی۔ان مسلمان فوجیوں نے دینا نگر جا کر چند ایک چھینی ہوئی لڑکیاں برآمد کیں۔شہیدوں کی لاشیں ٹرکوں میں بھر کر لائے زخمیوں کو ٹرکوں میں لاد کر لاہور کی طرف روانہ کر دیا۔ قافلہ دو دن گورداسپور ٹھہرا اور وہاں سے دھاریوال کی طرف چلا۔ دھاریوال سے یہ قافلہ نہر کی پٹری پر سے گزر رہا تھا کہ سکھوں نے اس پر زبردست حملہ کیا۔ یہ حملہ قافلے کے اس حصے پر کیا گیا جس کی نگران سکھ اور گورکھا ملٹری تھی۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے جن کی لاشیں نہر میں پھینک دی گئیں۔اس جگہ سے بھی سکھوں نے کئی مسلمان عورتیں اٹھالیں۔

بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے سکھوں پر جو کھیتوں میں چھپ گئے تھے کچھ فائر بھی کئے۔ قافلہ وہاں سے ڈیرہ بابا نانک پہنچا۔ چونکہ وہاں بھی دینا نگر کی طرح چھین جھپٹ کا خطرہ تھا اس لئے مسلمان فوجیوں نے آگے جا کر ڈیرہ میں جا بجا پہرے لگا دیئے۔ ڈیرہ بابا نانک کے پل پر سکھ ملٹری کی گارڈ متعین تھی۔ ان سکھوں نے پل پر سے گزرنے والوں کی تلاشی لی اور جو کچھ ان کے پاس از قسم نقد و زیور قیمتی مال تھا ہتھیا لیا۔ اس طرح یہ قافلہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو کر پاکستان پہنچا۔

جناب غلام حسین امرتسری لکھتے ہیں کہ میری پھوپھی کا خاندان تحصیل بٹالہ کے ایک گاؤں دائم ننگل میں مقیم تھا۔ جب وہ گاؤں سے نکل کر ڈیرہ بابا نانک کی راہ سے پاکستان جانے لگے تو پل پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ یہ لوگ دوسرے مسلمانوں کے ہمراہ دو روز دریائے راوی کے کنارے بیٹھے رہے۔ اور گھاس پھوس کھا کر گزارا کرتے تھے۔ تیسرے دن صبح کے وقت سکھوں نے حملہ کر دیا۔ میری پھوپھی زاد بہنوں اور ان کی دو نندوں نے خدا کا نام لے کر دریا میں چھلانگیں ماردیں اور دریا کے پانی نے انہیں ہمیشہ کے لئے چھپا لیا۔ ان کے چار ننھے بچوں میں سے صرف ایک بچہ تین بچے اپنی ماؤں کے ساتھ دریا کی نذر ہو گئے۔ بٹالہ سے میرے ماموں کے خاندان نے نارووال تک کا سفر انتہائی مصیبت میں اختیار کیا اور چھ دن میں درختوں کے پتے وغیرہ کھا کر وہاں پہنچے۔(۵۰)

فیروز پور اس کے مضافات

جناب احمد علی صاحب سراج تحریر فرماتے ہیں:

ہمارا گھر فیروز پور شہر میں امرتسری دروازہ کی بندگلی میں سب سے اخیر میں واقع تھا۔ جس کے اردگرد تمام سکھ آباد تھے۔ ۱۷ اگست کی شام کو حد بندی کمیشن کے فیصلہ کا اعلان ہوا اور فیروز پور جیسا مسلم اکثریت رکھنے والا شہر بھی ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۸ اگست کی رات کو ہم گھر میں بیٹھے اطمینان کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ قریب کے چوک سے لاٹھیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں اور ''ہائے مر گیا ہائے مر گیا'' کا شور برپا ہوا۔ عین اسی وقت چوک میں سکھوں نے نعرے لگائے۔ ان نعروں کی صدائے بازگشت شہر بھر کے تمام محلوں سے اٹھی اور ہر طرف سکھوں کے نعرے بلند ہونے لگے پھر خاموشی طاری ہوگئی اور لوگ سو گئے۔ ایک گھنٹہ کے بعد پھر نعرے سنائی دینے لگے۔ اس طرح سکھ رات بھر نعرے مار مار کر دہشت پھیلاتے رہے۔ ۱۹ اگست کی صبح نمودار ہوئی تو فضا بہت دہشت زدہ سی نظر آرہی تھی۔ تاہم ہمارے خاندان کے افراد جو دفتروں میں ملازم تھے اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گئے۔ ابھی دفتر میں کام کرتے ہوئے گیارہ بجے تھے کہ ہمیں دفتر سے فوراً چلے جانے کا حکم مل گیا کیونکہ شہر میں فساد شروع ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ فیروز پور اسٹیشن پر جو مسلمان مسافر ٹکٹ خرید رہے تھے۔ ان پر سکھوں نے حملہ کر دیا۔ اور بہت سے مسلمانوں کو مار ڈالا۔ اس کے ساتھ سکھوں کے جتھوں نے مسلمانوں کے محلوں پر دھاوا بول دیا۔ ۱۹ اگست کو ٹھیک صبح دس بجے شہر بھر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ہمارا دفتر چھاؤنی میں تھا۔ میں وہاں سے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں گولیاں چل رہی تھیں میں نے ایک درخت کی اوٹ میں پناہ لی۔ چند منٹ کے بعد اسٹیشن کی حدود سے باہر نکلا۔ وہاں ریلوے ملازمین کے کوارٹر تھے ان ملازمین نے مجھے اپنے ہاں پناہ دی۔ شہر میں ۲۴ گھنٹہ کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ دوسرے دن پھر ۲۴ گھنٹہ کا کرفیو لگا دیا گیا جو ۲۱ اگست کو صبح ۸ بجے ختم ہوتا تھا۔ لیکن اس روز حکم صادر ہوا کہ ۸ بجے سے بارہ بجے تک کرفیو ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے لئے ہوگا۔

پھر دو گھنٹہ کرفیو لگے گا اور ۲ بجے سے شام چھ بجے تک مسلمانوں کو چلنے پھرنے کی اجازت ہوگی۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا۔ اس لئے میں وہاں سے چل پڑا ٹاؤن ہال کے پاس ملٹری کے پہرہ دار نے مجھے روکا وہ مسلمان تھا۔ اس نے مجھے بات سمجھائی اور واپس جانے کے لئے کہا۔ اس لئے میں اسٹیشن پر چلا گیا۔ اور ۲ بجے تک وہیں رہا اور پھر گھر کی طرف واپسی کے دوران ہی میرے گھر والوں نے مکان تبدیل کرلیا تھا۔ محلوں کے محلے مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔ دھوبیوں کے بیل کھلے پھر رہے تھے سڑکوں پر جا بجا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مرغیاں بطخیں، بھیڑیں بکریاں بازاروں میں آوارہ پھر رہی تھیں۔ مسلمان گوجروں کی گائیں اور بھینسیں رسّوں اور زنجیروں سمیت کھلی پھر رہی تھیں مسلمانوں کے محلوں میں ہُو کا عالم تھا۔ اور عمارتیں دھڑا دھڑ جل کر گر رہی تھیں۔ اپنے گھر کے نزدیک پہنچا تو میرے چھوٹے بھائی نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ اس نے مجھے بتایا کہ گھر تبدیل کرلیا گیا ہے اور اب وہ مسلم اکثریت والے ایک محلّہ میں چلے گئے ہیں۔

۲۱ اگست کی صبح کو میرے والد گھر کے افراد کو لے کر شہر سے بھاگ کر جانے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت کرفیو صرف ہندوؤں کے لئے کھلا تھا۔ جب وہ اپنا سامان لے کر اسٹیشن پر پہنچے تو ملٹری نے انہیں روکا اور کہا کہ تم مسلمان کیوں گھر سے باہر نکلے ہو۔ قطار میں کھڑے ہو جاؤ تمہیں گولی مار دی جائے۔ والد نے منت سماجت کی اور کہا ہمیں اس بات کا علم نہ تھا کہ کرفیو صرف ہندوؤں کے لئے کھلا ہے۔ اس پر ملٹری والوں نے کہا کہ سامان یہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ چنانچہ وہ سب واپس لوٹ آئے۔

۲۱ اگست کی شام کو ہم اپنے گھر سے کچھ سامان اٹھانے کے لئے گئے۔ اس امر کے باوجود کہ کرفیو صرف مسلمانوں کے لئے کھلا تھا سکھوں کے ایک گروہ نے ہم پر اینٹیں برسانی شروع کر دیں ہم نے ملٹری کی مدد سے جو آگ بجھا رہی تھی کچھ سامان نکالا اور اسٹیشن کو چل دیئے۔ رات کے دس بجے گاڑی چلی اور ہم لاہور پہنچ گئے۔

جناب غلام قادر صاحب لکھتے ہیں:

یوں تو مشرقی پنجاب کے ہر ضلع میں کشت وخون اور قتل وغارت کے دردناک واقعات ظہور پذیر ہوئے لیکن فیروز پور کا ضلع بدترین آلام ومصائب کا تختۂ مشق بنا رہا۔ اس ضلع میں غایت درجہ کے تشدد کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے چھوٹے بڑے تمام افسر اور اہلکار ہندو اور سکھ تھے۔ جو اپنی قوم کے فسادی عنصر کی کھلی طرف داری کرتے رہے۔ موگا اور فاضلکا کی تحصیلوں میں ۱۵ اگست سے پہلے ہی قتل وغارت کی وارداتیں شروع ہوگئیں تھیں۔ موگا میں ایک مسلمان مجسٹریٹ اور سب پوسٹ ماسٹر کو ان کے بال بچوں سمیت قتل کر دیا گیا۔ فاضلکا سے ابوہر جانے والی سڑک پر تین مسلمان گاڑی بانوں کو قتل کیا گیا۔ کوکری تحصیل موگا میں شبخون مار کر مسلمانوں کے تین چار خاندان تہ تیغ کر دیئے گئے۔

۱۳ اگست کو پولیس کے تمام مسلمان ملازمین سے ہتھیار لے لئے گئے اور انہیں نکال دیا گیا۔ ۱۵ اگست کو فیروز پور میں یوم آزادی کی خوشی میں جانور ذبح کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ فاضلکا میں کئی مسلمانوں کو گھروں اور دکانوں سے نکال کر شارع عام میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۷ اگست کو اعلان ہوا کہ فیروز پور کا ضلع ہندوستان میں جائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہر جگہ جتھے جمع ہونے لگے۔ اور ۱۹ اگست کو صبح دس بجے ان جتھوں نے فیروز پور شہر اور ضلع بھر کے دیہات میں مسلمانوں کے قتل عام کی مہم شروع کر دی۔ فرید کوٹ اور پٹیالہ کے فوجی دستے اور ضلع فیروز پور کی پولیس ان کی امداد کر رہی تھی۔ فرید کوٹ سے نکلنے والے مسلمانوں کو فیروز پور کی سیدھی راہ سے قصور کی طرف آنے سے روک دیا انہیں کہا گیا کہ مکتیسر کی راہ سے آئیں جہاں سکھوں کا ایک بے پناہ لشکر جمع ہو رہا تھا۔ اس لشکر نے فرید کوٹ کے مسلمانوں کے قافلے پر حملہ کرے نوے فیصد مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ عورتیں چھین لیں۔ مکھو تحصیل زیرہ کی طرف سے آنے والے قافلوں کو تلونڈی نپالال کے ایک مسلمان چودھری نے سکھ تھانیدار سے مل کر تباہ کرایا۔ ضلع فیروز پور کے مسلمانوں پر اتنی تباہی آئی۔ کہ بمشکل پچاس فیصدی پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو سکے ہوں گے۔

جب ملٹری مسلمانوں کو قافلوں کی صورت میں لانے لگی تو عورتوں کو برہنہ کر کے ان کی تلاشی لی گئی۔ برہنہ عورتوں کا ایک قافلہ قصور تک آیا جہاں اسے کپڑے پہنائے گئے۔

شیخ مہر علی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

میں موگا کے مشہور شیخ خاندان کا ایک فرد ہوں ہمارا خاندان تجارت پیشہ تھا۔ اگست کے آغاز ہی سے موگا کی فرقہ وارفضا مکدّر نظر آنے لگی۔ غیر مسلم جلسے کرتے تھے۔ سبزی منڈی میں بم پھینکا گیا جس سے ایک مسلمان شہید ہوا اور چند زخمی ہو گئے۔ ۶ اگست کو سکھوں نے قبرستان پر شبخون مارا اور چھ مسلمان فقیروں کو جو وہاں سو رہے تھے شہید کر دیا۔ ان حادثات کی وجہ سے موگا کے مسلمان وہاں سے نکلنے لگے۔ ۱۸ اگست کو ہمارا خاندان بھی لاہور آنے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ راستے میں غیر مسلم ہم پر حملہ کرنے کے لئے چھپے بیٹھے تھے انہوں نے ہم پر ریوالور سے فائر کئے۔ میرا نوجوان بھتیجا وہیں شہید ہو گیا۔ ۱۹ اگست کو ہمیں ہسپتال سے مرحوم کی لاش ملی جسے ہم نے پولیس کی حفاظت میں سپرد خاک کیا۔ اسی دن شام کو ہم فیروز پور پہنچ گئے۔ اور فیروز پور میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو ۲۰ اگست کو لاہور آ گئے۔

اہلیہ حکیم محمد نعمان ساجد تحریر فرماتی ہیں

میں جولائی کے وسط میں اپنے برادر عزیز قاضی مبارک احمد ٹیلیگراف کلرک کے ہاں فاضلکا پہنچی۔ اگست کے شروع میں میرے بھائی کو حکم ملا تمہیں بہال نگر میں تبدیل کر دیا گیا ہے بھائی اکیلے وہاں چلے گئے اور ۱۵ اگست کو اہل وعیال کو لے جانے کے لئے واپس لوٹے۔ ۱۶ اگست کو ہم گاڑی پر سوار ہونے والے تھے کہ شہر میں فساد ہو گیا۔ سکھ مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کے گھر بار لوٹنے لگے۔ ہم رک گئے۔ خیال تھا کہ فساد کی رو تھم جائے گی۔ لیکن ۱۸ اگست کو عید کے دن سارے فاضلکا میں وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ لوٹ مار اور قتل وغارت کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ شہر میں مکانات کو آگ لگا دی گئی۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ سکھ اور ہندو غنڈے کوچہ وبازار میں مسلمان عورتوں کی بے عزتی کرتے نظر آنے

لگے۔ یہ ہیبت ناک مناظر دیکھ کر اور خوفناک حالات سن کر ہم بہت گھبرائے اور ۱۹ اگست کو صبح سویرے ہی گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ راستے میں کئی جگہ بڑی بڑی عمارتیں جلتی ہوئی نظر آئیں۔ راستے میں غنڈوں کے ایک گروہ نے ہمارے تانگے پر حملہ کرنا چاہا لیکن کوچوان گھوڑے کو تیز دوڑا کر ہمیں خطرے سے نکال لایا۔ اسٹیشن پر گاڑی تیار تھی ہم اس میں بیٹھ گئے۔ ہمارے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ بستر اور کیش بھی ہم اپنے ساتھ نہیں لا سکے تھے۔ میں، میری بھاوج، اس کے دو بچے اور میرا بھائی جانیں بچا کر اسٹیشن پر پہنچے تھے۔ خیال تھا کہ گھر کا سامان مقفل ہے۔ امن چین ہونے پر بھائی آ کر لے جائیں گے۔ لیکن جو لوگ ہمارے بعد فاضلکا سے نکلے ان کا بیان ہے کہ ہمارے نکلنے کے فوراً بعد ہمارے مکان کو لوٹا گیا پھر نذر آتش کر دیا گیا۔ مکان تو ہمارا نہ تھا ہم کرایہ دار تھے لیکن ہمارا بیس ہزار روپیہ کا ساز وسامان سکھ اور ہندو لٹیروں کی نذر ہو گیا۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ ہم عزت وآبرو اور جان کی سلامتی کے ساتھ نکل آئے۔ (۵۱)

تحصیل زیرہ کا بے پناہ قافلہ

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں:

ضلع فیروز پور میں سکھوں نے فسادات برپا کرنے کی ابتدا تحصیل موگا سے کی۔ ۲۲، ۲۳ رمضان بمطابق ۱۰، ۱۱ اگست کو سنا گیا کہ موگا میں تین اہم وارداتیں رونما ہوئی ہیں۔ ایک مجسٹریٹ پر قاتلانہ حملہ ہوا جو زخمی ہونے کے چند گھنٹہ بعد راہی ملک بقا ہو گیا۔ ایک مسلمان سب انسپکٹر پولیس جو تھانے کی طرف جا رہا تھا مار دیا گیا۔ اور ایک میونسپل کمشنر پر ریوالور کے تین فائر ہوئے جو انہی قدموں پر گر کر جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ یہ تمام کاروائی سکھ علاقہ مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی اور اسلحہ کے لائسنس دار لالہ دولت رام کے لڑکوں نے مل کر کی تھی۔ تینوں راشٹریہ سیوک سنگھ کے ممبر تھے۔ اسی رات سکھوں نے دیہات میں مسلم اقلیت پر حملے کئے کوکری ارائیاں کی بستی پر رات کو چھاپا مارا اور کئی خاندانوں کو عورتوں بچوں سمیت تہ تیغ کر دیا۔ بستی کے دو تین آدمی جو باہر کھیتوں میں فصلوں کو پانی دے رہے تھے بچے اور بھاگ کر دوسری بستیوں میں پناہ گزیں ہوئے۔

اگلے دن موضع اندر گڑھ تحصیل زیرہ پر حملہ ہوا اس گاؤں کی نصف آبادی سکھ اور نصف مسلمان تھی۔ امداد کے لئے اردگرد سے بھی لوگ اکٹھے ہو گئے۔ سکھ سکھوں کی مدد کے لئے آئے مسلمان مسلمانوں کی مدد کے لئے جمع ہوئے۔ پہلی جھڑپ میں سکھ گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لڑائی دو دن تک جاری رہی۔ تیسرے دن سکھوں کو سات مسلح لاریوں پر کمک پہنچ گئی جس میں ریاست فرید کوٹ کے سپاہی بھی شامل تھے۔ سکھوں نے بم گرائے اور رائفلوں سے فائر کئے۔ مسلمانوں کے پاس نیزوں اور بھالوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے۔ اس روز مسلمان سینکڑوں کی تعداد میں شہید و زخمی ہوئے۔ جو بیچارے جانیں بچا کر بھاگے ان میں سے اکثر ڈھولے وال تحصیل زیرہ میں داخل ہو گئے۔ اور کچھ ادھر ادھر مسلمانوں کی آبادیوں میں بکھر گئے۔ انگڑھ کے بعد کوٹ قائم خان، کوٹ عیسیٰ خان، نور پور لگھا وغیرہ پر عید کے دن حملے ہوئے۔ ان حملوں میں سکھوں کے ساتھ ڈوگرا ملٹری کے سپاہی بھی شریک تھے۔ حملہ

آوروں نے ان دیہات کے مسلمانوں کو جانی نقصان پہنچایا اور منتشر ہونے پر مجبور کر دیا۔

۲۰ اگست کو موضع تلونڈی پر حملہ ہوا جو مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ اس مقام پر بہت سے مسلمان پناہ گیر جمع ہو رہے تھے۔ دو گھنٹہ مسلسل لڑائی ہوتی رہی۔ سکھ بھاگ گئے ان کے بھاگنے کے فوراً بعد لاریوں پر سوار ڈوگرا ملٹری وہاں پہنچ گئی۔ جس نے مسلمانوں پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ لاتعداد مسلمان چشم زدن میں مٹی کا انبار ہو گئے۔ اب سکھ لوٹے اور انہوں نے گاؤں پر ہلّہ بول کر غارت گری شروع کر دی۔ وہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور جوانوں کو بلا امتیاز قتل کرنے لگے۔ یہ قصبہ منٹوں میں لاشوں کا انبار بن گیا۔ سکھوں نے مکانات کو آگ لگا دی اور آگ کی لپٹیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔

تلونڈی کا یہ انجام دیکھ کر اردگرد کے دیہات کے مسلمان سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلے۔ سکھ ان خانماں برباد لوگوں پر حملے کرتے اور نوجوان اور شکیل لڑکیوں کو اٹھا اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اندازہ ہے کہ اس افراتفری کے عالم میں سکھوں نے مسلمانوں کی چار پانچ ہزار عورتیں ہتھیالی ہوں گی۔ بچے کھچے لوگ مرد، عورتیں بچے زخمی اور تندرست بے سروسامانی کے عالم میں ڈھولے وال پہنچے۔ گاؤں کے اردگرد بے حساب لوگ جمع ہو گئے۔ مشرق، جنوب اور مغرب سے جوق در جوق پناہ گیر آ رہے تھے۔ صرف شمال کی جانب دریائے ستلج کے کنارے کی مسلمانوں کی بستیاں ابھی تک محفوظ بیٹھی تھیں۔

۲۰ یا ۲۱ اگست کو دھرم کوٹ پر حملہ ہوا۔ صبح کے نو بجے تھے کہ دھرم کوٹ اور گردونواح کے دیہات میں خطرے کے نقارے بجنے لگے۔ ڈھولے وال سے سینکڑوں کی تعداد میں مسلمان نیزے اور بھالے سنبھالتے ہوئے دھرم کوٹ کی طرف دوڑے۔ قصبہ میں پہنچ کر مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اور سکھوں پر جو دھرم کوٹ کے مسلمانوں کو لوٹ رہے تھے ہلہ بول دیا۔ سکھوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن ابھی آدھ گھنٹہ نہیں گزرا تھا کہ اس علاقہ کا سکھ ایم ایل اے جیپ کار پر سوار وہاں آن پہنچا اس کے ساتھ چند اور سکھ بھی جو رائفلوں سے مسلح تھے۔ انہوں نے آتے ہی مسلمانوں

پر فائرنگ شروع کر دی۔ چند ہی منٹ میں مشین گن چلنے لگی۔ دوسری جانب سے ڈوگرا ملٹری کی لاریاں آ گئیں وہ بھی گولیوں کی موسلا دھار بارش برسانے لگیں۔ اور دو گھنٹے میں قصبہ کا صفایا کر دیا۔ مرد بھاگ گئے تھے۔ عورتیں اور بچے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ چار بجے شام ملٹری کے ایک افسر نے حکم دیا کہ تمام مسلمان مرد اور عورتیں آدھ گھنٹہ کے اندر اندر اپنے گھروں کو خالی کر کے باہر نکل جائیں کسی قسم کا سامان ساتھ نہ لیا جائے جس کے پاس سامان ہوگا اسے گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ عورتیں فی الفور بچوں کو لے کر گھروں سے نکل پڑیں انہیں برقعے اور چادریں تک سنبھالنے کی بھی ہوش نہیں تھی۔ کچھ مرد باہر کنوؤں پر جمع تھے سب نے اکٹھے ہو کر ڈھولے وال کا رخ کیا۔ عورتیں ابھی دھرم کوٹ سے نکلی ہی تھیں کہ سکھوں نے مکانوں کو نذر آتش کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر دھرم کوٹ کے اردگرد کے دیہات بھی خالی ہو گئے اور ڈھولے وال میں مسلمان پناہ گزینوں کا ایک بے پناہ ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

پناہ گیروں کے اس انبوہ کا خیال یہ تھا کہ دریائے ستلج کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے فیروز پور کی طرف چلیں لیکن ۲۱ اگست کو اطلاع ملی کہ موضع تلونڈی نیپالاں میں زور کی لڑائی ہو رہی ہے شام کو وہ گاؤں بھی اور اس کے گرد و نواح کی بستیاں بھی خالی ہو گئیں جنہیں سکھوں نے آگ لگا دی۔ اسی دن ملٹری کے آدمیوں نے جن کے ساتھ لوہ گڈھ کا سکھ ایم ایل اے بھی تھا مسلمانوں کے دیہات میں گشت لگا کر نوٹس دے دیا کہ گاؤں فی الفور خالی کر دیا جائے۔ یہ سکھ ایم ایل اے کہتا تھا کہ ہم یہاں خالصتان بنا رہے ہیں تم لوگ اپنے پاکستان میں چلے جاؤ۔ یہ حال دیکھ کر ڈھولے وال کے سرکردہ لوگوں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ گاؤں خالی کر دیا جائے چنانچہ گرد و نواح کے مسلمان بھی اپنے بال بچوں کو اپنے گھروں سے باہر نکال لائے۔ سب نے مل کر پاکستان کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

۲۳ اگست کو ڈھولیوال کے چار پانچ لاکھ مسلمانوں کا قافلہ پاکستان کی طرف روانہ ہوا ابھی یہ قافلہ پہلے دن کی منزل سے تین کوس کے فاصلے پر تھا کہ موسلا دھار بارش ہو گئی۔ اونٹ پھسلنے لگے۔ لوگ

سامان پھینکنے لگے۔ غروب آفتاب کے وقت پہلی منزل پر پہنچے جہاں بارش نے ایک دن اور ایک رات روکے رکھا۔ تیسرے دن وہاں سے آگے چلے۔ جب سکھوں کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا قافلہ اس راہ سے جا رہا ہے تو انہوں نے نہر کے بند کاٹ دیئے۔ راستے پانی سے بھر گئے۔ اس لئے قافلے والوں کو اپنی بیل گاڑیاں ساز و سامان سمیت پیچھے چھوڑنی پڑیں۔ ۲۵ اگست کو یہ قافلہ مکھو تھانہ کے قریب پہنچ گیا۔ مکھو کے تھانیدار امر سنگھ نے قافلے کو وہیں روک لیا اور حکم دیا کہ کل سارے قافلے والوں کی تلاشی لی جائے گی۔ اور پھر اسے آگے چلنے کی اجازت دی جائے گی۔ اس نے قافلے کے چیدہ چیدہ اشخاص کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ گیارہ ہزار روپیہ ابھی لا دو تو قافلہ کو تلاشی کے بغیر آگے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔ سرکردہ اشخاص نے واپس آ کر روپیہ جمع کیا۔ رات کے بارہ بجے یہ رقم ادا کی گئی۔ تھانیدار نے حکم دیا کہ صبح آٹھ بجے یہ جگہ خالی کر دی جائے۔ ادھر بارش ہو رہی تھی سرکردہ اشخاص نے پھر منت سماجت کی اور دس بجے تک کی مہلت مانگی۔ اس مہلت کے لئے مزید تین ہزار روپیہ ادا کرنا پڑا۔

اگلے دن قافلہ مکھو سے آگے چلا۔ بیل گاڑیاں ساتھ لے جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اس لئے جو گاڑیاں وہاں تک پہنچ سکی تھی سامان سمیت وہیں چھوڑنی پڑیں۔ ابھی تھوڑی دور چلے تھے کہ تھانیدار پولیس کے سپاہیوں اور سکھ بدمعاشوں کو ساتھ لئے راستہ روکے کھڑا نظر آیا۔ نہر کے پل پر سے گزرنے کی راہ دی گئی اور کہا گیا کہ سب کی تلاشی لی جائے گی۔ مردوں سے نقدی اور عورتوں سے زیور چھینے گئے اور اسطرح چھینے ہوئے مال کا انبار لگتا گیا۔ آگے نہر کی پٹڑی پر مسلح سکھ دو چار فرلانگ کے فاصلے پر کھڑے تھے جو مسلمان وہاں پہنچتا تھا اسے کاٹ کر نہر میں پھینک دیتے تھے۔ ادھر جب پندرہ بیس مرد عورت، بچے وغیرہ گزر جاتے تو فائرنگ ہو جاتی اور کہا جاتا کہ آہستہ آہستہ گزرو۔ فائر کی آواز سن کر لوگ پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ تھانے دار پھر پندرہ بیس آدمیوں کو بلا لیتا تھا اور ان کی تلاشی لے کر آگے روانہ کر دیتا تھا۔ آگے جا کر وہ قتل ہو جاتے تھے۔ اور ان کی نعشیں نہر میں ڈال دی جاتی تھیں۔ چار پانچ گھنٹے یہ قصہ جاری رہا۔ اتنے میں اچانک ملٹری کی تین

لاریاں آن پہنچیں اس ملٹری کا آفیسر لاریوں کو ایک میل پیچھے چھوڑ کر قافلے میں سے گزرتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ تھانیدار نے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنے ساتھی سکھوں کو نقدی اور زیورات کے انبار سمیٹ کر بھاگ جانے کے لئے کہا۔ میجر نے پوچھا تو تھانیدار نے کہا میں علاقہ مجسٹریٹ کے حکم سے قافلے کی تلاشی لے رہا ہوں۔ میجر نے حکم دیا کہ تم فی الفور یہاں سے چلے جاؤ میجر نے تمام قافلے کو پیچھے ہٹایا اپنے سپاہی جو لاریوں میں تھے اپنے پاس بلائے تمام زخمیوں کو یکجا کیا اور ٹرکوں پر لاد کر ۳۵ میل دور موگا کے ہسپتال میں بھجوایا۔ زخمی اس قدر تھے کہ سب کے سب ان ٹرکوں میں نہیں جا سکتے تھے۔ اس لئے کچھ زخمی وہیں سپاہیوں کی تحویل ہی میں رہے تا کہ اگلے دن اٹھائے جائیں۔ اس طرح وہ زخمی دو دن میں موگا کے ہسپتال میں پہنچائے گئے۔ تھانیدار امر سنگھ نے ان زخمیوں پر بھی راستے میں حملہ کرا دیا۔ زخمیوں کے ٹرکوں کے ساتھ جو فوجی سپاہی تھے۔ انہوں نے حملہ آوروں پر فائر کئے اور کئی بدمعاشوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا ان بدمعاشوں میں امر سنگھ تھانیدار بھی تھا جو گولی کھا کر مر گیا۔ قافلہ فوجی سپاہیوں کی حفاظت میں چلا اور چوتھے روز فیروز پور کے پل یعنی پاکستان کے دروازہ پر پہنچا۔ یہ تحصیل زیرہ کے تباہ حال مسلمانوں کا تیسرا قافلہ تھا جو پاکستان میں داخل ہوا۔

تحصیل زیرہ کے متعلق ایک اور بیان

جناب محمد صدیق صاحب ثاقب کا ایک بیان روزنامہ انقلاب مورخہ ۶ ستمبر میں شائع ہوا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

پندرہ اگست تک ریاست فرید کوٹ کے فوجی دستے ترن سنگھ لوبگڈھیہ ایم ایل اے کی جعلی ملٹری اور پولیس مشرقی پنجاب کی باقاعدہ پولیس اور ڈوگرا فوج موگے سے مسلمانوں کا خاتمہ کر چکی تھی۔ یہی وہ دن تھا جس دن موگا کے چودھری عبدالعزیز مجسٹریٹ کو گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ ۱۵ اگست کی رات کو زیرہ تھانے کے تھانیدار صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ فرید کوٹ ریاست کے بعض ملازم سیرے میں بھی وارد ہوئے ہیں اور امرتسر میں مسلم پولیس کو بے ہتھیار کر کے گولیوں

سے اڑا دیا گیا ہے۔ موگے میں مجسٹریٹ کے علاوہ ایک تھانیدار اور دو سپاہیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ یہ حالات سن کر تھانیدار صاحب نے ارادہ کر لیا کہ وہ اسی دن تھانے کے مسلمان عملہ کو لے کر چارج دیئے بغیر نکل جائیں۔ میں انکے مشورے سے اگلے دن زندگی کو خطرے میں ڈال کر چھپ چھپا کر اونٹ پر سوار ہو کر فیروز پور پہنچا۔ وہاں ڈاکٹر نذیر اور سٹی مسلم لیگ کے صدر سعادت نواز خاں سے ملا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان میں ہیں۔ انہیں نواب صاحب ممدوٹ نے خاص طور پر انہیں اس بات کی اطلاع دی ہے اور مجھے رہنے کی تلقین کی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مسلم لیگی زعما فیروز پور اور زیرہ میں وارد ہو کر تمام انتظامات ٹھیک ٹھاک کر دیں گے۔

میں اس روز بڑی مشکل سے گھر پہنچا۔ لدھیانہ اور جالندھر لائن کی گاڑیاں بند ہو چکی تھیں۔ اور زیرے سے دس میل دور تلونڈی بھائی کے مسلمانوں پر حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں تلونڈی اور ارد گرد کے دیہات کے دو تین ہزار مسلمانوں میں سے بمشکل چند سو افراد جان بچا کر زیرے پہنچے۔ میں نے یہ ساری کہانی تھانیدار صاحب سے بیان کی وہ اگلے دن اپنے مسلمان عملہ سمیت مکھو کی طرف روانہ ہو گئے۔ تلونڈی کے بعد سوڈھیوالہ، جوٹیاں، سکھواں، پنڈوری، جٹاں، ہستیاں اور دیگر مسلم دیہات پر حملے ہوئے بعض دیہات سے تو ایک بچہ بھی بچ کر نہ نکل سکا۔ سکھ جوان اور پاکیزہ دوشیزاؤں کو اٹھا اٹھا کر لے گئے۔ ۱۹ اگست کو ایک سکھ تھانیدار زیرہ میں وارد ہوا۔ اس کے ہمراہ تیس سپاہی تھے۔ جو تمام کے تمام چوہڑے اور باؤریئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سپاہی فوج سے نکلے ہوئے یا بھاگے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ۳۰۳ کی رائفل تھی۔ ملیشیا کے پاجامے اور قمیصیں پہنے تھے۔ ان کی قمیص کی کمر پر سیاہ چوکور سا نشان لگا ہوا تھا۔ ان کے چہروں اور آنکھوں سے غیظ و غضب کے شعلے نکل رہے تھے وہ سب کے سب خونی دکھائی دیتے تھے۔ ان کی آمد پر زیرے کے لوگ محسوس کرنے لگے کہ اب زیرہ پر بھی حملہ ہو کر رہے گا۔ میں اس تھانے دار کی آمد کے دو گھنٹہ بعد میونسپل کمیٹی کے پریذیڈنٹ اور امن کمیٹی

کے صدر سردار چنن سنگھ کی معیت میں تھانیدار کے پاس گیا۔اس وقت اس کے پاس زیرہ تحصیل کے سکھ بدمعاش جمع تھے۔جن میں سے بوڑ سنگھ ،سنتو والہ، بلاّ سنگھ گاڈیوال والہ، اورلال سنگھ ڈھنڈیاں والہ قابل ذکر ہیں۔میں نے اور سردار چنن سنگھ نے تھانے دار سے امن کے متعلق بات چیت کی۔تھانے دار نے جواب دیا انسان کے بس میں کیا ہے۔سکھوں سے ناانصافی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو پاکستان مل گیا ہے۔ ہندوؤں کو ہندوستان مل گیا۔سکھوں کو کچھ بھی نہیں ملا اس کے پاس تو صرف گنڈاسا اور برچھا ہے انہی کے بل پر وہ اپنے لئے کوئی راہ نکال لے گا۔جذبات اس قدر بھڑک چکے ہیں کہ ان کا انسداد دشوار ہے یہ جواب لے کر ہم واپس آ گئے۔

راستے میں ہمیں ایک گھڑسوار سکھ ملا جو تھانہ میں اطلاع دینے کے لئے جارہا تھا کہ نیلے والے کے مسلمانوں نے سکھوں پر حملہ کر دیا ہے۔میں اور سردار چنن سنگھ یہ بات سن کر بہت حیران ہوئے کیونکہ نیلے والا ایک ایسا گاؤں تھا جس میں سکھ اور مسلمان برابر کی چوٹ تھے اور ارد گرد کے مسلمان دیہات خالی ہو چکے تھے۔اطلاع ملنے پر تھانیدار اپنی جمعیت کو لاریوں پر بٹھا کر نیلے والے کی طرف روانہ ہو گیا۔آدھی رات کے قریب نیلے والے سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دینے لگے۔صبح سویرے ایک پٹواری میرے پاس بھاگا بھاگا آیا کہ رات فوج اور پولیس نے اکالیوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ نیلے والے پر ہلہ بول دیا تھا۔تین سو مسلمان موقع پر بری طرح ذبح کر دیئے گئے پچیس چھبیس مسلمان بمشکل جان بچا کر نکلے۔مسلمان لڑکیوں اور جوان عورتوں کی ایک لاری بھر کر موگے بھیج دی گئی۔

سکھ مسلمانوں کے دیہات کو تاراج کرنے کے لئے ایک منظّم سکیم پر عمل کر رہے تھے۔ ایک جتھا رتن سنگھ ایم ایل اے کی سرکردگی میں کام کر رہا تھا۔جس کے ہمراہ فوج اور پولیس کے سپاہی بھی ہوتے تھے۔دوسرا جتھا زیرے کی پولیس کے ہمراہ حملے کرتا تھا اور تیسرا ریاست فرید کوٹ کی فوج اور موگے کی پولیس کی قیادت میں ہلے بولتا تھا۔ان تینوں گروہوں کے حملے کرنے کے طریقے مختلف تھے۔چھوٹے چھوٹے دیہات قریب کے کسی حملہ سے متاثر ہو کر خود بخود خالی

ہو جاتے تھے جتھا وہاں پہنچ کر گھروں کو لُوٹتا اور مکانوں کو آگ لگا دیتا تھا۔رتن سنگھ کا گروہ جو چار پانچ سو اکالیوں پر مشتمل ہوتا تھا چھوٹے چھوٹے دیہات کے گرد گھیرا ڈال لیتا تھا۔اس کے بعد رتن سنگھ کی جیپ کاریں مسلح پولیس کے ساتھ گاؤں میں داخل ہوتی تھیں۔رتن سنگھ لوگوں کو امن کی تلقین کرتا تھا اور پولیس کے سپاہی مسلمانوں کی تلاشی لے کر ہتھیار چھین لیتے تھے۔اس کے بعد ہندوؤں کو ایک طرف اور مسلمانوں کو ایک طرف کر کے مسلمانوں پر گولیاں چلا دیتے تھے۔مسلمان فائروں سے بچنے کے لئے بھاگتے تھے تو گھیرا ڈالنے والے اکالی انہیں گنڈاسوں ،برچھوں، کرپانوں اور ٹکوؤں وغیرہ سے کاٹ ڈالتے تھے۔جوان لڑکیوں کی مشکیں کس لی جاتی تھیں اور گاؤں ہی میں ان کی عصمت ریزی کرنے کے بعد انہیں لاریوں میں لاد کر موگے کی طرف بھیج دیا جاتا تھا۔

دوسرے گروہ کے حملے کا طریق بھی قریب قریب یہی تھا فرق صرف یہ تھا کہ پہلے کوئی سکھ تھانے میں جا کر غلط رپورٹ پیش کرتا تھا۔اس پر زیرے کی پولیس وہاں چلی جاتی تھی۔رپٹ دینے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ سکھ اس گاؤں پر حملہ کر رہے ہیں اس لئے پولیس کو چاہئے کہ بروقت ان کی امداد کے لئے پہنچ جائے۔تیسرا گروہ جس میں ریاست فرید کوٹ کے فوجی دستے شامل تھے ان بڑے بڑے دیہات پر حملہ کرتا تھا جہاں مسلمان پناہ گیر جمع ہو جاتے تھے۔بعض مقامات پر تینوں گروہ مل کر حملہ کرتے تھے۔بہک گوجراں، ملانوالہ، نیلے والہ،تلونڈی، جلّے خاں، چوٹیاں ڈھولے والہ،ملہو،تلونڈی، نیپالئی، دھرم کوٹ، قادروالہ،اور لہرہ ایسے مقامات ہیں جہاں تینوں گروہوں نے مل کر سخت حملے کئے۔اور ہر مقام پر دو دو تین تین ہزار مسلمان شہید کر ڈالے۔حملہ کے بعد لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ کئی کئی دن تک جاری رہتا تھا اور پولیس مٹی کا تیل لے جا کر لاشوں کو جلا دیتی تھی۔ ایک شام زیرہ پولیس کے سکھ سب انسپکٹر پولیس کی کارگزاری کی داستان ایک سکھ فخریہ طور پر یوں بیان کر رہا تھا کہ مسلمان تو ہم نے بھی بہت مارے ہیں لیکن اس مائی کے لال کا مقابلہ مشکل ہے جس نے تلونڈی جلّے خاں میں ایک سو سے زیادہ زندہ بچے اپنے ہاتھ سے آگ میں جھونکے۔

تلونڈی جلّے خاں سے جوان عورتوں اور لڑکیوں کی تین لاریاں بھر کر مالوے بھیجی گئیں اور کچھ زیرہ کی پولیس کو تحفۃً پیش کی گئیں۔ ۲۹ اگست کی صبح کو قصبہ زیرہ کے نہتے مسلمانوں کا ایک قافلہ آٹھ مسلمان فوجی سپاہیوں کی معیت میں پاپیادہ فیروز پور کو روانہ ہوا۔ اس وقت تحصیل زیرہ کے وہ مسلمان جو موت کے پنجے سے بچ نکلے تھے لیکن موت ان کی تلاش میں پھر رہی تھی قافلوں کی صورت میں فیروز پور ہیڈ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک قافلے کو جو سید ماملے شاہ کی قیادت میں مکھو سے چلا تھا اسے راہ میں روک لیا گیا۔ اور دس دس کر کے دو ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ دوسرا قافلہ چودھری عبدالعزیز ذیلدار کی قیادت میں پہلے قافلے کی لاشوں پر سے گزرتا ہوا فیروز ہیڈ کی راہ سے قصور پہنچا اس قافلے کے کوئی ایک سو افراد امرسنگھ تھانے دار کی گولیوں کی نذر ہو گئے۔ (۵۲)

جالندھر اور اس کے مضافات

جناب محمد نذیر صاحب رضوی رقم طراز ہیں:

۱۷ اگست کی شام کو ہم عید کا چاند دیکھنے کے لئے کوٹھے پر چڑھے ہی تھے کسی نے پکار کر کہا جالندھر ہندوستان کا حصہ بن گیا ہے۔ ریڈیو پر اعلان ہو گیا۔ ادھر چاند کو دیکھ کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ادھر سے گولی کی سنسناہٹ کان میں سنائی دی۔ عید کی صبح کا آفتاب طلوع ہوا۔ شہر سے خبریں آنے لگیں کہ اڈہ ہوشیار پور میں ایک مسلمان کو قتل کر دیا گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر چار مسلمانوں کو کاٹ کر لائن پر پھینک دیا گیا۔ منڈی فٹن گنج کے قریب چند مسلمان عورتوں سمیت جا رہے تھے وہ سب کے سب شہید کر دیئے گئے۔ پیر مودودی کی مسجد میں سکھ گھس گئے اور مسجد کی بے حرمتی کی۔ شہر میں حکام نے کرفیو آرڈر نافذ کر دیا۔ لیکن یہ نرالا قسم کا کرفیو تھا۔ سکھ اور ہندو جوق در جوق آزادی کے ساتھ چلتے پھرتے تھے۔ مسلمان اگر دروازہ سے باہر قدم رکھتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ شام ہوئی اور ہماری بدبختیوں کی رات شروع ہو گئی۔ ہندوستانی حکومت کے ٹھیکیداروں نے اپنا کام شروع کر دیا انہوں نے پہلے ہی سے پروگرام مرتب کر رکھا تھا۔ ان کی ٹولیاں شہر کے مختلف اقطاع میں پھیل گئیں ہر ٹولی کے پاس ایک ایک لاری تھی جس میں پٹرول، مٹی کا تیل اور آگ لگانے کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک کار تھی جس میں پولیس کے پانچ پانچ سپاہی آگ لگانے کے لئے بٹھائے گئے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ سلسلہ وار فہرست کے مطابق آگ لگانی شروع کر دی۔ ہندو اور سکھ اپنی کمین گاہوں سے گولیاں برسانے لگے۔ جب کوئی مسلمان ان کے فائروں کا جواب دیتا تو پولیس وہاں پہنچ کر اس کے مکان کے گرد گھیرا ڈال لیتی اور بندوق یا رائفل چھین کر اس کے گھر کو آگ لگا دیتی۔ اس شخص کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جاتی۔ پنج پیر سے امام ناصر الدین تک مسلمانوں کی تمام دکانیں اور عمارتیں آگ کی نذر ہو گئیں۔ شہر کے چاروں کونوں سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دینے لگے۔ اس پر ہول کیفیت میں رائفلوں کے فائر اور بموں کے دھماکے اور بھی غضب ڈھا رہے تھے

مسلمانوں کو ہر طرف موت منہ کھولے نظر آنے لگی۔

رات کو دس بجے ہندوؤں اور سکھوں کے ایک ہجوم نے شہر سے باہر کشن پورہ محلّہ کی مسلم آبادی پر حملہ کیا۔ صبح چار بجے تک جنگ ہوتی رہی۔ صبح تک صرف چند مسلمان زندہ برآمد ہوئے باقی شہید کر دیئے گئے۔ مسلم نیشنل گارڈ کے ایک سالار ڈاکٹر غلام محمد بھی اسی محلّہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ اگلے روز صبح کے آٹھ بجے شاہ سکندر کے قبرستان کے قریب کی مسلم آبادی پر حملہ ہوا۔ اس بستی کے تمام مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ صرف چند عورتیں اور چند بچے زندہ بچے۔ اسی اثنا میں ایک مسلمان بھاگا ہوا آیا اس نے کہا کہ شہر میں ملٹری آ گئی ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ مسلمان آدھ گھنٹہ کے اندر اندر شہر خالی کر دیں۔ ورنہ تمام مسلمانوں کو گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ تمام مسلمان گھروں کو چھوڑ کر چل دیئے۔ عجب ہولناک منظر تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی راہ تلاش کر رہا تھا۔ کوئی کسی گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ کوئی کسی بستی میں پناہ لینے کے لئے روانہ ہو رہا تھا ماں کو بیٹے کی خبر نہ تھی۔ بیٹے کو ماں کا پتہ نہ تھا۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں عورتیں چیخیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ بچے سڑکوں کے کناروں پر پڑے چلا رہے تھے۔ اسی ہلچل کے دوران میں بلوچ رجمنٹ ملٹری کا ایک ٹرک آیا ان مسلمان فوجیوں کے زیر نگرانی ستم رسیدوں کا ایک بھاری قافلہ کھرلہ کنکرہ کی طرف چل دیا۔ باقی لوگوں نے شہر کی مختلف جگہوں پر اکٹھے ہو کر ڈیرے ڈال دیئے۔ دو دن کے بعد چھاؤنی میں پناہ گزینوں کا کیمپ کھولا گیا۔ اور لوگ ٹرکوں میں بیٹھ کر اس طرف جانے لگے۔ پناہ گزیں ٹرکوں میں بھوسے کی طرح لادے جا رہے تھے۔ کیمپ میں کسی قسم کا انتظام نہ تھا۔ کھانے کے لئے روٹی اور پینے کے لئے پانی تک میسر نہ آتا تھا۔ کیمپ کی حفاظت کے لئے ڈوگرا ملٹری متعین تھی۔ جس کا رویہ بہت ظالمانہ تھا۔ کیمپ میں ہماری وہ مائیں وہ بہنیں برہنہ سر اور برہنہ پا پھر رہی تھیں جن کو پہلے کسی غیر مرد نے دیکھا تک نہ تھا۔ عورتیں اناج کے ایک ایک دانے کو ترستی پھر رہی تھیں۔ کچھ دن کے بعد پناہ گزینوں کو ٹرکوں اور لاریوں پر لے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو فوجی لاریاں لے کر آتے تھے وہ سرمایہ داروں

سے رشوت لے لے کر ان کے کنبوں کو لاریوں میں بٹھا بٹھا کر لے جاتے تھے۔ غریب اور مفلس منہ تکتے رہ جاتے۔ کچھ دن بعد کیمپ میں غلاظت کے ڈھیر لگنے کے باعث ہیضہ پھیل گیا۔ مشرقی پنجاب کی گورنمنٹ نے حکم دیا کہ ان پناہ گیروں کو بیرکوں سے نکال کر کھلے میدان میں ڈال دیا جائے۔ نیا کیمپ تین میل دور سول پولیس لائن کے سامنے والے میدان میں ڈالا گیا۔ لوگ پا پیادہ چل کر وہاں پہنچے۔ مغرب کے قریب بارش ہونے لگی۔ تین دن تک مسلسل موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ میدان سارا پانی پانی ہو گیا۔ پناہ گزینوں کا سامان ڈوبنے لگا۔ آگ جل نہیں سکتی تھی اس لئے چار دن فاقہ سے رہنا پڑا۔ اس بارش کے دوران میں اس کے بعد بیسیوں پناہ گیر مر گئے۔ بعض کو تو کفن تک میسر نہ آ سکا۔ چار دن کے بعد حکم ملا کہ پناہ گیر پھر بیرکوں میں چلے جائیں۔ سب کے سب پھر وہاں پہنچے پھر حکم ہوا کہ کیمپ گڑھا گاؤں میں جائے گا۔ تمام پناہ گزین ادھر چل دیئے وہاں سے ریلوے کا پھاٹک نزدیک پڑتا تھا۔ دونوں حکومتوں کے درمیان سمجھوتا ہو گیا کہ دونوں قوموں کے پناہ گزین پرامن طریقے سے ادھر سے ادھر پہنچائے جائیں گے۔، اور ادھر سے ادھر لائے جائیں گے۔ یکم اکتوبر سے دو ریل گاڑیاں روزانہ چلنے لگیں جنہوں نے ۱۹ اکتوبر تک گڑھا کیمپ کے واردین کی ساری جمعیت کو اٹھا لیا۔

جناب محمد اصغر صاحب لکھتے ہیں:

پاکستان اور ہندوستان کا اعلان ہوا اور ہندوؤں اور سکھوں نے جالندھر شہر میں اودھم مچا دیا۔ پولیس کے اکثر مسلمان افسر اور سپاہی پاکستان جا چکے تھے جو باقی رہ گئے تھے ان سے ہتھیار لے لئے گئے تھے۔ ہم نے عیدالفطر کی نماز خوف کی وجہ سے اپنے بازار ہی کی مسجد میں پڑھی جس میں صرف سات آٹھ مسلمان شامل ہوئے۔ ہم عید کی نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ شہر بھر میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ہر بازار ہر گلی اور ہر کوچے میں مسلمان شہید ہونے لگے۔ بازاروں میں جعلی ملٹری دکانوں کو آگ لگانے لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سارا شہر دھڑا دھڑ جلنے لگا۔ آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھ اٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ چیدہ چیدہ

مسلمانوں کو آوازیں دے دے کر فلاں افسر تمہیں بلاتا ہے گھر سے باہر نکالا جاتا تھا۔ جونہی وہ نکلتا تھا گولی کا نشانہ بنالیا جاتا تھا۔ عید کی رات کو آگ لگانے کا یہ سلسلہ زور شور سے جاری رہا۔ عید کے اگلے دن بھی ہندو اور سکھ بلوائیوں کی ٹولیاں مقامی افسروں کی سرکردگی میں یہی کام کرتی رہیں۔ مردوں کو گھر سے باہر بلا کر گولی ماردی جاتی تھی۔ عورتوں اور بچوں سے کہا جاتا کہ نکل جاؤ تمہارے گھر کو آگ لگائی جائے گی۔ گھر کا موٹا موٹا سامان لوٹنے کے بعد آگ لگادی جاتی تھی۔ یہ کام بڑے ہی منظّم طریق سے ہورہا تھا۔ کسی بازار یا محلّہ میں پہلے موٹر کے ہارن کی طرح موٹی آواز کا ہارن بجتا تھا۔ جعلی ملٹری کے دستے الارم کی آواز سن کر وہاں پہنچ جاتے تھے اور مسلمانوں کو قتل کرنے لگتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد باریک آواز کا الارم بجتا جس کے معنی یہ تھے کہ راستہ صاف ہے اب اس جگہ کوئی مزاحمت نہیں۔ اس الارم پر غنڈوں کی ٹولیاں ٹوٹ پڑتیں تھیں اور مکانوں اور دکانوں کو لوٹنے لگتی تھیں پھر آگ لگادیتی تھیں۔ آگ لگانے کا سامان پٹرول گھاس پھوس وغیرہ ان کے پاس ہوتا تھا۔ ۱۹ اگست کی صبح کو میں کوٹھے پر چڑھا۔ فوراً ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں نے پاخانہ میں پناہ لی اور جھروکوں میں سے دیکھا کہ محلّہ کی مسجد کی چھت پر سکھوں کی ایک ٹولی کھڑی ہے اور ہر طرف گولیاں برسا رہی ہے۔ نیچے اترا تو ہماری دکان کے آگے غنڈے جمع ہورہے تھے۔ اور مجھے آوازیں دے دے کر بلا رہے تھے۔ میں نے دروازہ نہ کھولا تو انہوں نے دکان کے تالے توڑ کر سامان لوٹا اور آگے نکل گئے۔ یہ حال دیکھ کر ہم نے گھر کی قیمتی اشیاء نقدی اور زیور جمع کئے اور ان کی گٹھڑی باندھ کر اپنے خادم نور محمد سے کہا کہ وہ اس سامان کو لے کر کسی طرف نکل جائے۔ نور محمد گھر سے نکلا۔ میں بالاخانے پر چڑھ کر اسے دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نور محمد بھاگا جارہا ہے اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور تھانے دار پستول تانے ہوئے اس کا تعاقب کررہے ہیں ان کے ساتھ ڈیڑھ سو کے قریب بدمعاش بھی ہیں۔ منوہر لال تھانے دار نے نور محمد کو پکڑ کر اس سے گٹھڑی چھین لی اور پستول کی گولی سے اسے وہیں ڈھیر کردیا۔ ازاں بعد اس کی لاش پر پٹرول چھڑک کر اسے آگ لگادی گئی۔ دس منٹ کے بعد یہ لوگ ہمارے

گھر کا دروازہ توڑنے لگے اے ڈی ایم حکم دے رہا تھا کہ ''لگادو آگ کافر حرامی بدذات بچ کر نہ جانے پائیں۔'' دکان کے دروازوں پر تیل چھڑک کر آگ لگادی گئی اور پارٹی آگے نکل گئی۔

اتنے میں میرے عم زاد بھائی شمشاد عرف مٹو نے اپنے ایک ہندو دوست ملکھی کو بازار میں دیکھا اور اس سے چلا کر التجا کی کہ ہمیں بچاؤ۔ ملکھی نے کہا میں اس شرط پر تمہاری جان بچا سکتا ہوں کہ تم گھر کا کوئی سامان اپنے ساتھ نہ لو۔ آگ ابھی بھڑکی نہ تھی اس لئے ہم اسے بجھانے میں کامیاب ہوگئے اور خاندان کے اکیس افراد گھر سے نکلے۔ ہندو بدمعاشوں نے سب کی تلاشی لی۔ اور بڑی فحش کلامی سے پیش آئے۔ یہ حال دیکھ کر عورتیں اور بچے گلی کی طرف بھاگے۔ میری بیوی حاملہ تھی وہ بیہوش ہوکر گر پڑی۔ آگے جعلی ملٹری کے چار سکھ تلواریں سونتے کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے یہاں رکھ دو۔ وہاں کچھ ہندو بھی آگئے انہوں نے کہا ان کے پاس کچھ نہیں ہم تلاشی لے چکے ہیں۔ ہم گلیوں اور کوچوں میں سے گزرتے ہوئے شام کے قریب چوک مفتیاں میں پہنچے وہاں ہم نے سردار محمد نامی ایک مسلمان کے گھر میں پناہ لی۔ سرشام گولیاں چلنے کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ مسلمان شیخ غلام دستگیر کی کوٹھی کی طرف جارہے ہیں۔ ہمارے کچھ آدمی گھر سے ضروری سامان لینے کے لئے گئے تو دیکھا کہ گھر لوٹا جارہا ہے وہ لوٹ آئے۔ ہم بھی شیخ غلام دستگیر کی کوٹھی پر پہنچے وہاں مسلمان پناہ گیروں کا اتنا ہجوم تھا کہ الامان۔ عورتیں، بچے اور مرد سراسیمگی کے عالم میں اپنے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو تلاش کررہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ حشر کا سا عالم تھا۔ دن کے بارہ بجے ڈوگرے سپاہی اور شہر کے سرکردہ ہندو اس طرف آئے انہوں نے کہا کہ کرفیو لگنے والا ہے اس لئے فی الفور یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ملٹری سب کو گرفتار کرلے گی یا گولی سے اڑادے گی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے اور شہر کی نواحی بستیوں کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم بستی شیخ درویش میں پہنچے وہاں ہماری دکان کے ملازم منشی مشتاق احمد ملے جنہوں نے ہمیں اپنے گھر میں پناہ دی۔ ہم آٹھ دس دن وہاں آرام سے رہے۔

بستیات میں شہر کے پناہ گزین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ اور لوگ ٹرکوں پر سوار ہو کر پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ ٹرک ہزار ہزار اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے میں بنتا تھا۔ ہمارے پاس کچھ نہ تھا اس لئے مجبور و لاچار پڑے رہے۔ آخر لوگوں نے جالندھر چھاؤنی کے کیمپ میں جانا شروع کر دیا۔ ہم بھی گرتے پڑتے چھ گھنٹہ میں وہاں پہنچے۔ رات میدان میں بسر کی۔ اگلے دن ایک بارک ملی جس کی چھت نہ تھی۔ کیمپ میں پناہ گزین ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے۔ راشن کا کوئی انتظام نہ تھا۔ دس دن میں سات دفعہ راشن ملا وہ بھی دو دو تولہ فی کس کے حساب سے۔ کیمپ کمانڈر بڑا درشت مزاج شخص تھا۔ ڈوگرا ملٹری حفاظت پر متعین تھی جو پناہ گیروں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھا رہی تھی۔ عورتوں کی بے حرمتی کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کیمپ سے دو دو ہزار کے حساب سے ٹرک جا رہے تھے۔ اس لئے جن کے پاس سرمایہ نہ تھا۔ صبر کے ساتھ پڑے رہے۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ڈاک خانہ سے آ کر اپنے وی پی اور منی آرڈر لے جاؤ ہم نے منشی غلام محمد کو بھیجا اسے شہید کر دیا گیا۔ پشاور سے میرے بھائی نے ایک آدمی کے ہاتھ مبلغ تین سو روپیہ بھیجا تو ہم آٹا دال حاصل کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس کیمپ میں پانی کی بڑی دقت تھی۔ پانی کے پمپ کا انتظام ایک سکھ کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے موٹر خراب کر دی۔ لوگ جوہڑوں کا گندا پانی پینے پر مجبور ہو گئے۔ اسی حال میں دن گزرتے گئے آخر ایک دن ملٹری کے دو مسلمان کلرکوں نے ہماری مدد کی اور ہمارے خاندان کو دو دو تین تین کر کے ٹرکوں میں سوار کرایا۔ اس طرح ہمارا خاندان جو کبھی لاکھوں کا مالک تھا پائی پائی کا محتاج ہو کر پاکستان پہنچا۔ لاہور میں ہمیں متعدد درخواستیں کرنے پر بھی مکان نہ ملا اس لئے ہم اپنے عزیز ترین رشتہ دار شیخ عبدالرشید سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل کے پاس پشاور آ گئے۔ ابھی تک حصول معاش کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوئی۔

جناب محمد اشرف صاحب رقم طراز ہیں:

میں جالندھر شہر کی بستی غُذاں کا رہنے والا ہوں۔ عیدالفطر کے روز صبح ۸ بجے سے ایک

بجے تک کرفیو کھولا گیا۔ عید کی نماز سے فارغ ہونے کے ایک گھنٹہ بعد ہم نے دیکھا کہ شہر جالندھر کے سر پر دھوئیں کے مہیب بادل چھا رہے ہیں۔ بستیات میں مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت تھی اس لئے بستیات محفوظ رہیں۔ شہر کی حالت خراب ہوئی تو شہر کے لوگ بستیوں میں پناہ لینے لگے۔ اور بالآخر وہاں سے بھی حکماً اٹھا دیئے گئے اور چھاؤنی کے کیمپ میں جانے لگے۔ ہماری بستی کے چاروں طرف مسلمان رجمنٹ کا پہرہ تھا۔ اسی لئے جالندھر شہر اور گردونواح کی تمام بستیوں کے خالی ہونے کے بعد بھی غُذاں کے مسلمان اپنے گھروں میں مقیم رہے۔ سات ستمبر کو مسلم بہار رجمنٹ کے افسر نے کہا کہ پرسوں تک تمام مسلمان کیمپ میں چلے جائیں کیونکہ ہمیں واپس بلا لیا گیا ہے اور ہماری جگہ ڈوگرا فوج متعین ہو رہی ہے۔ ۸ ستمبر کو ہم بھی گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ ایک رات بستی کے اڈے پر گزاری۔ بارش ہو رہی تھی لیکن ہم ڈر کے مارے گھر نہیں جا سکتے تھے۔ صبح کو مبلغ ایک سو ستر روپیہ کرایہ دے کر ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا جس پر سامان لاد کر ہم کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ کیمپ میں داخل ہوتے وقت تلاشی لی جاتی تھی۔ ہم نے فوجی سپاہی کو پانچ روپے دے کر تلاشی سے مخلصی حاصل کی۔ کیمپ میں راشن کی بڑی تکلیف تھی۔ گردونواح کے دیہات سے خورد و نوش کا سامان قیمتاً مل جاتا تھا۔ گندم ایک روپیہ سیر اور چنے دو روپیہ سیر تک بِک رہے تھے۔ پانی کی بہت دقت تھی۔ لوگ جوہڑوں کا پانی پینے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی تو کیمپ تبدیل کر کے پولیس لائن کے قریب میدان میں لگایا گیا۔ اس نئے کیمپ میں تین دن موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ بارش تھمنے پر سڑک پر نکل کر دیکھا تو بیسیوں لاشیں بے گور و کفن پڑی نظر آئیں۔ ۱۵ اکتوبر کو گڑھا کیمپ میں جانے کا حکم ملا۔ وہاں سے اسپیشل ٹرینیں چل رہی تھیں۔ ہم ۱۷ اکتوبر کو ریل گاڑی پر سوار ہو کر لاہور چھاؤنی میں پہنچے۔ کیمپ میں جانے کے بجائے ہم شہر میں چلے گئے۔ جب یہاں کام نہ بنا، سکونت کے لئے مکان تک نہ ملا اور نہ حصول معاش کا کوئی سہارا نظر آیا تو ہم پشاور آ گئے۔ یہاں ہمیں مکان بھی مل گیا ہے اور دکان بھی میسر آ گئی۔

جناب برکت علی صاحب لکھتے ہیں:

میں پندرہ اگست دہلی سے اپنے گاؤں دھوگڑی پہنچا جو جالندھر شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس وقت ہوشیار پور کی تحصیل میں فسادات شروع ہو چکے تھے اور یہ آگ منظّم سازش کے ماتحت تحصیل ضلع جالندھر کی طرف پھیل رہی تھی۔ ہمارے علاقہ میں سب سے پہلے ۱۹ اگست کو موضع تلونڈی میں سکھوں نے وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا دن کے وقت تھانہ قصبہ آدم پور کا سکھ تھانیدار اس گاؤں میں آیا اور مسلمانوں کو تسلی دے گیا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔ اس رات کو گاؤں پر حملہ ہو گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر گاؤں کا صفایا کر دیا گیا۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں پچاس مسلمان شہید ہوئے اور دس زخمی، باقی لوگوں نے بھاگ کر دھوگڑی میں پناہ لی۔ ۲۰ اگست کو شام کے قریب سکھوں کا ایک جم غفیر دھوگڑی کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس لشکر کا سرغنہ موضع جنڈ وسنگھ والا کا سکھ ذیلدار ہزار سنگھ تھا۔ مغرب کے قریب مقابلہ ہونے لگا۔ بلوچ رجمنٹ کی ایک گارڈ بروقت پہنچ گئی جس نے سکھ حملہ آوروں پر فائر کر کے بھگا دیا۔ سکھ بھاگتے وقت اپنا بہت سا سامان مثلاً گھوڑے، بم اور تلواریں وغیرہ پیچھے چھوڑ گئے۔

سکھوں کے دوسرے جتھے اس وقت تک ستووالی، کالا بکرا، بھوگ پور، بھٹے سرائے خاص وغیرہ دیہات کو تاراج کر چکے تھے۔ ۱۶ اگست کو آدم پور پر حملہ ہوا۔ آدم پور میں پولیس اور فوج کی چوکیاں تھیں لیکن اس کے باوجود شام کے ۴ بجے حملہ ہو گیا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مکانوں میں آگ لگانے لگے۔ سکیم یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان کے گھروں کے اندر ہی زندہ جلا دیا جائے۔ بازاروں اور گلیوں میں پولیس گشت کر رہی تھی۔ وہ مسلمانوں کو باہر نکلنے سے روک رہی تھی۔ جو مسلمان چھتوں پر چڑھ کر حملہ آوروں پر اینٹیں برسا رہے تھے انہیں گولی کا نشانہ بنا لیا جاتا تھا۔ جو لوگ بھاگتے تھے انہیں سکھ کرپانوں سے کاٹ ڈالتے تھے۔ آدم پور میں تین سو کے قریب مسلمان مرد و عورتیں اور بچے شہید کر دیئے گئے۔ باقی ماندہ مسلمان بھاگ نکلے۔ اور دھوگڑی میں جمع ہونے لگے۔ آدم پور کا ایک معزز مسلمان اپنے کنبہ سمیت تانگے پر سوار ہو کر چلا تھا کہ تھانہ

کہ قریب پولیس کے سپاہیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس معزز مسلمان اور تانگے والے کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی لڑکیوں کو اٹھا لے گئے اور اس کی بیوی جو حاملہ تھی نزدیک کے کھیت میں لے گئے۔ وہیں اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا جسے سکھوں نے مار دیا اور ماں سے کہنے لگے تو گائے کا گوشت کھایا کرتی تھی اب اپنے بچے کا گوشت کھا۔ چار دن کے بعد یہ عورت ایک شریف ہندو کی مدد سے دھوگڑی پہنچی جس نے اپنی داستان درد سنائی۔

۱۶ اگست سے لے کر ۲۱ اگست تک مواضعات گولی پنڈ، محمد پور، چگّٹی، ننگل سرالہ، بڈالہ، کڈیانہ، سوماں، کوہجے، کراڑی، اور لسّیاں کو سکھ جتھوں نے تاراج کیا موضع کوہجے کے مسلمانوں نے شدید مقابلہ کیا لیکن آتشیں اسلحہ کے مقابلے میں عاجز آ گئے۔ ان دیہات کے کچھ لوگ نور پور کے کیمپ میں چلے گئے جو جالندھر سے جانب شمال وسوہہ کی طرف جانے والی سڑک پر دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اور کچھ دھوگڑی میں پناہ گزیں ہوئے۔ یکم ستمبر کو دھوگڑی کے پانچ آدمی جالندھر شہر کے دوآبہ کالج کے قریب ہندو طالب علموں نے شہید کر دیئے۔ اسی روز پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار شوکت حیات خان وغیرہ نے موضع جنڈ وسنگھ والا میں کانفرنس منعقد کی۔ پنڈت نہرو کی امن کی اپیل کے جواب میں ہزارہ سنگھ ذیلدار نے کہا کہ ''ہم تو راولپنڈی اور مغربی پنجاب کا بدلا لے کر چھوڑیں گے تم سے جو بنتا ہے کر لو''۔ چونکہ دھوگڑی کے اردگرد کے تمام دیہات تباہ و برباد ہو چکے تھے اس لئے دھوگڑی میں پناہ گزینوں کی جمعیت بہت بڑھنے لگی۔ انتظام کے لئے ڈوگرا فوج آئی جو مسلمانوں کو تنگ کرتی تھی۔ اس لئے دھوگڑی کے باشندے اور وہاں جمع ہونے والے پناہ گزین وہاں سے اٹھ کر چوہڑ والی کے کیمپ میں چلے گئے جو جالندھر سے ہوشیار پور کو جانے والی سڑک پر جالندھر سے دس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ۱۴ اور ۱۵ ستمبر کی درمیانی شب کو نور پور کیمپ پر زبردست حملہ ہوا۔ اس کیمپ کی حفاظت کے لئے ڈوگرا فوج متعین تھی۔ ساری رات گولیاں چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ صبح کے وقت ایک مرد اور ایک عورت چوہڑ والی کے کیمپ میں پہنچے انہوں نے بتایا کہ نور پور کا کیمپ سکھوں نے ڈوگرا فوج کی مدد سے

تباہ کر دیا ہے۔ ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے شہید ہو چکے ہیں۔

۲۰ ستمبر کو شام چوراسی پر زبردست حملہ ہوا۔ اور پانچ سو مسلمان شہید کر دیئے گئے اس قصبہ پر پہلے بھی تین چار حملے ہو چکے تھے۔ جن کو مسلمانوں نے مقابلہ کر کے مسترد کر دیا تھا۔ یہ حملہ بڑی تیاری سے کیا گیا تھا۔ چوہڑ والی کیمپ میں ہم ۲۴ تاریخ تک رہے۔ بارشوں کے باعث سخت تکلیف کا سامنا ہوا۔ بیماری سے سینکڑوں اموات واقع ہوئیں۔ اس کیمپ میں لوگوں کو کھانے وانے کی تکلیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ کسان لوگ بیل گاڑیوں پر آٹا اور گندم لا دلائے تھے۔ جو لوگ اجاڑ دیئے گئے تھے ان کی مدد کی جاتی تھی۔ ۲۴ ستمبر کو دو لاکھ سے زائد پناہ گزینوں کا قافلہ چوہڑ والی سے چلا۔ یہ قافلہ دیہاتی عوام پر مشتمل تھا جو اپنے ہمراہ بیل گاڑیاں اور چھکڑے ہانک لائے تھے۔ روانگی کے وقت موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ چھکڑے پر چالیس من کا بوجھ دو سو من ہو گیا۔ اور سر پر رکھی بیس سیر کی گٹھڑی دو من کی ہو گئی۔ لوگ سامان پھینک پھینک کر اُفتاں وخیزاں چلتے رہے۔ قافلے کی حفاظت کے لئے ہمارے ساتھ فوجی اسکورٹ کافی تھا۔ لیکن ہمارے اعمال کی شامت کے باعث جو قہر خداوندی بارش کی شکل میں نازل ہوا اس کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔ ۲۷ ستمبر کو دریائے بیاس میں طغیانی آ جانے کے باعث طوفانِ نوح برپا ہو گیا۔ ہمارا قافلہ اس وقت ہمیر امل کے قریب پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ یہ مقام دریائے بیاس سے کوئی ساڑھے سات میل دور جالندھر کی طرف واقع ہے۔ طغیانی کے باعث ہر طرف پانی ہی پانی پھیلنے لگا۔ یہ سیلاب دریا سے دس میل دور تک بیس پچیس فٹ کی بلندی تک چڑھ آیا۔ لوگ پناہ لینے کے لئے چھکڑوں پر چڑھ گئے اور چھکڑے بچوں کی کاغذی ناؤ کی طرح تیرنے لگے۔ بعض لوگ بجلی یا تار برقی کے کھمبوں پر چڑھ گئے۔ عورتیں اپنے بچوں کو دوپٹے کے ساتھ چھاتیوں سے باندھے درختوں پر بیٹھی نظر آنے لگیں۔ ہر منٹ میں دو تین چھکڑے بہہ جاتے تھے اور آدمی غرق آب ہو جاتے تھے۔ جس چھکڑے پر میں سوار تھا وہ بہتا ہوا ایک درخت کے ساتھ اٹک گیا۔ ہم نے وہیں رسّا لے کر اسے درخت کے ساتھ جکڑ دیا۔ ہمیں متواتر ساٹھ گھنٹے تک تین دن اور دو رات وہاں پر کھڑے رہنا پڑا۔

ہر طرف سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے والد، اپنی والدہ اور بیوی بچوں کو دیکھا جو دوسرے چھکڑے پر تھے غرق دریا ہوتے دیکھا۔ بہن پانی میں گرتے وقت مسترحمانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن افسوس کہ میں ان کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ اس سے زیادہ حشر کا سماں اور کیا ہوگا۔ بہت سے خاندان تباہ ہو گئے۔ ہمیں امید تھی کہ کشتیوں سے ہماری مدد کی جائیگی لیکن پاکستان اور ہندوستان کے حکمرانوں میں سے کوئی بھی ہماری مدد کو نہ پہنچا۔ اس طغیانی میں لاتعداد مال مویشی کے علاوہ ۱۲ ہزار انسان لقمۂ اجل ہو گئے۔ میرا سارا خاندان داغ مفارقت دے گیا۔ طغیانی ختم ہونے کے بعد میں تین دن اپنے ماں باپ، بہن، بیوی، اور بچوں کی نعشوں کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن سیلاب انہیں کہیں کا کہیں بہالے گیا تھا۔ مویشی اور انسانوں کے مرنے اور کیچڑ میں سڑنے کی وجہ سے بدبو پھیلی اور ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی روزانہ دو دو تین تین سو آدمی مرنے لگے۔ اس قافلے کا بچا کھچا حصہ پاپیادہ چل کر ۹ اکتوبر کو لاہور پہنچا، خدا غریقان دریا اور کُشتگان وبا کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

خان صاحب دلدار محمد خان ذیلدار چک جھنڈ وخاں ذیل بہرام تحریر فرماتے ہیں:

میری ذیل میں ۱۴ دیہات مسلمانوں کے اور تین دیہات سکھوں کے تھے۔ اس لئے آغاز فساد کے دنوں میں سکھ مسلمانوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ میں نے اپنی ذیل کو فتنہ وفساد سے محفوظ رکھنے کے لئے امن کمیٹیاں بنائیں۔ مسلمانوں کو سکھوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے باز رکھا۔ سکھ آ کر منت سماجت کرتے رہتے اور شکریہ ادا کرتے تھے۔ جب دوسرے قریبی علاقوں میں شورش ترقی کرنے لگی تو میری ذیل میں پولیس کا ایک سب انسپکٹر ایک حوالدار اور چار سپاہی آ گئے جو سب کے سب ہندو اور سکھ تھے۔ پولیس کے یہ آدمی دن کو کھانا میرے ہاں کھاتے تھے اور رات کو سکھوں کے دیہات میں پہرہ دیتے تھے۔ مجھے ان پر بہت بھروسا تھا کہ مصیبت کے وقت میری امداد کریں گے۔ ۲۰ اگست کو پولیس کے ان ملازموں نے سکھوں کے پندرہ سولہ ملحقہ دیہات کے

لوگوں کو جمع کر کے میری ذیل کے ایک گاؤں درانواں کے جاٹ مسلمانوں پر دھاوا بول دیا ابھی وہ نیند سے بیدار بھی نہ ہوئے تھے کہ سکھوں نے آ کر ان کے مکانوں اور بھوسہ کے موسلوں وغیرہ کو آگ لگا دی اور مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ پولیس کے ملازم مسلمانوں پر گولیاں چلا کر حملہ آوروں کی امداد کر رہے تھے۔ ۸۵ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ باقی ماندہ بھاگ کر گنے کے کھیتوں میں چھپ گئے۔ مکان لُوٹ کر جلا دیئے۔ چند بالغ لڑکیاں اٹھا کر لے گئے۔ یہ موضع میرے گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم چھتوں پر چڑھ کر یہ ماجرا دیکھتے رہے۔

اس گاؤں کو تباہ کرنے کے بعد سکھوں کا یہ اجتماع موضع عالمگیر پر ٹوٹ پڑا اس گاؤں میں انہوں نے عورتوں بچوں اور لڑکیوں سے کہا کہ تم سب ایک مکان میں جمع ہو جاؤ تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ جب وہ اکٹھی ہو گئیں تو باہر سے زنجیر لگا دی اور اندر ایک بم پھینک کر ہلاکت مچا دی۔ اس گاؤں سے چند نفوس اتفاقیہ طور پر بچ گئے باقی تمام کے تمام تہ تیغ کر دیئے گئے۔ اسی روز لوہاراں کے ایک سکھ آتما سنگھ نے جو میرا پروردہ تھا اور جسے میں نے اس کی بیوہ ماں کی منت سماجت پر سالہا سال خرچ دے کر پڑھایا تھا پیغام بھیجا کہ آپ بے فکر بیٹھے رہیں۔ آپ کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچایا جائے گا۔ اگلے دن اسی آتما سنگھ نے یہ پیغام بھیجا کہ آپ جس قدر جلد ہو سکے گھر سے بھاگ جائیں ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے۔ میں اسی وقت اپنے اہل وعیال کو لے کر موضع لاہڈرہ میں جا چھپا۔ ۲۱ تاریخ کو صبح نو بجے کے قریب بیس بائیس دیہات کے سکھوں نے مل کر میرے گاؤں پر حملہ کیا۔ چک جھنڈوخاں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کے سوڈیڑھ سو باشندے میرے ساتھ بھاگ کر نکل چکے تھے۔ صرف میرا چھوٹا بھائی اپنے اہل وعیال سمیت اپنے گھر میں جما بیٹھا رہا اور باہر کے دروازے کو مقفل کر کے بالا خانہ پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے چند اور جوان بھی تھے جن کے پاس تین گن بارہ بور کی تھیں۔ حملہ آوروں کی تعداد سات آٹھ ہزار تھی۔ جن کے پاس چالیس رائفلیں تھیں۔ پولیس کی مسلح جمعیت بھی ان کے ساتھ حملہ میں شامل تھی۔ حملہ آوروں نے صبح نو بجے میرے بھائی کے بالا خانہ پر گولیاں برسانی شروع کیں ادھر سے بھی

بندوق کے فائر ہونے لگے۔ ساڑھے چار بجے تک مقابلہ ہوتا رہا۔ میرے بھائی غلام بھیک اور اس کے دو ساتھیوں نے اس روز کوئی ہزار کے قریب کارتوس چلائے اور ۴۷۶ سکھوں کو جہنم واصل کیا۔ سکھوں کی جمعیت یہ حال دیکھ کر پسپا ہو گئی۔ لیکن وہ گنّے کے کھیتوں میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ غلام بھیک نے جب دیکھا کہ مطلع صاف ہے تو وہ اپنے اہل وعیال اور اپنے ساتھیوں کو لے کر گھر سے نکلا ایک شیر خوار بچی اس کی بیوی کی گود میں تھی۔ دو اور لڑکیاں جن کی عمریں ۴ سال و ۶ سال تھیں ان کے ساتھ تھیں۔ ابھی وہ گھر سے چالیس پچاس قدم نکلنے پائے تھے کہ سکھوں نے جو گنّے کے کھیت میں چھپے ہوئے تھے انہیں گھیر لیا۔ غلام بھیک نے بندوق سے تین فائر کئے اور تین سکھ گرا لئے۔ گنگا رام حوالدار پولیس نے جو چھپا بیٹھا تھا غلام بھیک پر گولی چلا دی جو پہلو کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی۔ وہ گرتے ہی فوت ہو گیا۔ چند سکھ جو گھوڑوں پر سوار تھے موقع پر پہنچ گئے جنہوں نے آتے ہی غلام بھیک کی بیوی کا سر تن سے جدا کر دیا اس کی لاش گھسیٹ کر بھوسے کے ایک موسل پر جو جل رہا تھا ڈال دیا۔ دونوں چھوٹی بچیوں کے منہ پر اس قدر طمانچہ مارے کہ ان کے رخسار متورم ہو گئے۔ غلام بھیک کا داماد جو گھر سے نکلا تھا اور کھیت میں چھپا بیٹھا تھا۔ سکھوں کے گاؤں کی طرف چلے جانے کے بعد کھیت سے نکلا اور بچیوں کو لے کر روانہ ہوا گھڑ سوار سکھوں نے دیکھ لیا اور پہنچ کر اسے بھی شہید کر دیا گیا۔ مسلمان جاٹوں کا ایک لڑکا ایک فقیر اور ایک حجام بھی اسی مقام پر شہید ہوئے۔ یہ ساری واردات ہمارے گاؤں کا ایک آدمی جو گنّے کے کھیت میں چھپا بیٹھا تھا دیکھ رہا تھا۔

موضع لاہڈرہ سے نکل کر ہم ننگل ارائیاں میں پہنچے۔ وہاں سے ہم نے اپنے رشتہ داروں کو جو بہرام میں تھے پیغام بھیجا کہ ہمیں آ کر لے جاؤ بہرام والوں کی ایک جمعیت ننگل آئی اور ہمیں ساتھ لے کر بہرام کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں سینی سکھوں نے دونوں طرف سے حملہ کر دیا ہماری جمعیت نے مقابلہ کیا۔ قریب کے ایک گاؤں کے نمبردار چودھری راج مل نے سکھوں کو پیغام بھیجا کہ انہیں گزر جانے دو۔ اس غیبی مدد سے ہم بہرام پہنچے۔ سکھ ہماری تلاش میں تھے اس لئے ہم چھپے بیٹھے رہے دوپہر کے وقت ملٹری کا ایک ٹرک وہاں سے گزرا ان کی منت کی کہ

ہمارے عزیزوں کی لاشیں ہمیں لا دو تا کہ ہم ان کی تکفین و تدفین کر سکیں۔ پہلے ملٹری کے دو سپاہی چھکڑا لے کر جھنڈو چک کی طرف گئے۔ سکھوں نے لاشیں نہ دیں۔ پھر حوالدار نے چار سپاہی بھیجے۔ وہ جا کر لاشیں اٹھوالائے۔ دو قبریں کھدوائی گئیں ایک میں بھائی اس کی بیوی اور اس کے داماد کو دفن کیا دوسری میں حجام اور فقیر کی لاشیں دھری گئیں۔ بہرام کے لوگ اپنے بال بچوں اور عورتوں کو نندا چور کے کیمپ میں بھیج چکے تھے۔ میرے ساتھ پچاس آدمی تھے۔ اور بہرام والے کہہ رہے تھے کہ تمہاری وجہ سے سکھ ہم پر بھی حملہ کر دیں گے۔ ہم سب تین دن سے بھوکے تھے۔ ایک شخص نے ہمیں اپنے مکان میں پناہ دی۔ ہم تین دن وہاں رہے۔ چوتھے دن ایک فوجی لیفٹیننٹ نے ہمیں ٹرک میں بٹھا کر آدم پور کے کیمپ واقعہ چوہڑ والی میں پہنچایا۔ چوہڑ والی کے لوگ بے سروسامان پناہ گزینوں میں فی کس ایک روٹی اور ایک قاش اچار آم کے حساب سے راشن تقسیم کرتے تھے اس لئے گزارا ہوتا رہا۔ چوہڑ والی سے ہم ٹرک میں بیٹھ کر چھاؤنی جالندھر کے کیمپ میں پہنچے۔ وہاں سے ہم نے ایک ٹرک ڈرائیور کو مبلغ دو سو روپیہ دے کر لاہور پہنچنے کا انتظام کیا۔ جس نے ہمیں ماڈل ٹاؤن کے کیمپ میں اتارا۔ ماڈل ٹاؤن میں رات ہمیں کھلے میدان میں بسر کرنی پڑی اور اگلے دن تک کھانا میسر نہ آیا۔ میری ذیل کا ایک فوجی سپاہی اتفاقاً مل گیا جس نے ٹرک لا کر ہمیں بادامی باغ لاہور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس پہنچایا۔ لاہور سے ہم کوئلے کے ایک چھکڑے میں سوار ہو کر لائل پور پہنچے۔ جہاں میرے پانچ مربّعے ہیں۔ (۵۳)

پھلور کی سرگزشت

حکیم محمد شاہ سنیاسی جو ۸۶ سال کے ایک معمر بزرگ ہیں تحریر فرماتے ہیں۔

مارچ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں جب سکھوں کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے ایوان اسمبلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ننگی تلوار کا مظاہرہ کیا اور اس مظاہرہ کے ساتھ ہی سکھوں نے پنجاب بھر میں فتنہ و فساد شروع کر دیا تو جالندھر شہر میں ایک سکھ لیڈر مسمّی لابھ سنگھ وکیل ایک مسلمان لڑکے کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ یہ لابھ سنگھ لساڑا تحصیل پھلور کا باشندہ تھا اس لئے سکھ اس کی ارتھی کو جالندھر سے اٹھالائے اور پھلور کے قریب باؤلی صاحب میں رکھ لی۔ پھلور کے ہندو سیٹھوں اور ساہوکاروں کے مشورے سے سکھوں نے یہ پروگرام بنایا کہ لابھ سنگھ کی ارتھی کا جلوس پھلور میں سے گزارا جائے خوب نعرے لگائے جائیں۔ دو چار مسلمانوں کو قتل کر دیا جائے۔ اور اس طرح پھلور میں فساد کی آگ مشتعل کر دی جائے۔ منڈی کے مسلمان مزدوروں نے کہیں سے یہ بات سن پائی مجھے اور دیگر مسلمانوں کو خبر کر دی۔ مسلم لیگ کے صدر مولوی محمد سعید نے شام کے چار بجے مسلمانوں کو مسجد میں جمع کر کے انہیں اس خطرہ سے جو کل پیش آنے والا تھا آگاہ کیا۔ مسلمان گھروں کو چلے گئے اور رات بھر چارہ کترنے والی مشینوں کے گنڈاسے نکال نکال کر لاٹھیوں میں جڑواتے رہے۔ ہندو اور سکھوں کو جب یہ خبر ملی کہ مسلمان مقابلے کے لئے تیار ہو رہے ہیں تو انہوں نے تھانیدار سے شکایت کی۔ انسپکٹر پولیس نے انہیں سمجھایا کہ فساد کی بنا تو تم رکھ رہے ہو جو لابھ سنگھ کی ارتھی کو اس کے گاؤں کی طرف لے جانے کے بجائے پھلور میں لانا اور پھرانا چاہتے ہو۔ یہ سن کر ہندوؤں اور سکھوں کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ اور پھلور میں کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا۔

ازاں بعد ہندو چھوکروں نے دو ایک مقامات پر آگ لگانے کی ناکام کوششیں کیں۔ مقامی حکام نے امن قائم رکھنے کے لئے سرگرمی دکھائی اور بتیس ہندو اور مسلمان نوجوانوں سے ضمانتیں لے لیں۔ ایک دن ساٹھ ستر ہندو لڑکوں نے شہر کے ہندو وکلا کی فساد انگیز تقریروں سے متاثر ہو کر بازار میں جلوس نکالا وہ نعرے لگا رہے تھے۔

''جو مانگے گا پاکستان، ہم دیں گے اس کو قبرستان''

اس کے جواب میں میں نے اپنی دکان کے تھڑے پر کھڑے ہو کر جواب دیا ''جو نہ دے گا پاکستان وہ جاوے گا شمشان''۔ ہندوؤں کا حلقہ میرے گرد گھیرا ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ فساد برپا کرنا اچھا نہیں۔ اگر پھلور کی فضا مکدر ہو گئی تو اس میں زیادہ نقصان ہندوؤں ہی کا ہو گا۔ اس پر سمجھدار لوگ جلوس سے الگ ہو گئے۔ اور جلوس پھیکا ہو کر منتشر ہو گیا۔

۱۵ اگست کے بعد جب انڈین حکومت کی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق جابجا مسلمانوں پر حملے ہونے لگے تو تحصیل پھلور کے ایسے دیہات میں جہاں سکھوں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادیاں تھیں اور مسلمان تعداد میں کم اور کمزور تھے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ اس ظلم وستم کا تختہ مشق پہلے وہ لوگ بنے جو مکیں تھے۔ یعنی جولاہے، موچی، تیلی، اور مزارعین ان کو لوٹا گیا۔ قتل کیا گیا۔ انکی خوبرو لڑکیاں جبراً چھین لی گئی۔ وہ بھاگم بھاگ دوسرے دیہات میں جہاں ان کے رشتہ دار ہوتے تھے پہنچ جاتے تھے اور ان کا حال دیکھ کر وہاں بھی دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ رات کے وقت قتل کی وارداتیں بکثرت کی جاتی تھیں۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں سے سکھ یا تو خود ہی نکل جاتے تھے یا مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان کر کے وہیں بیٹھے رہتے تھے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے قصبے ابھی تک امن چین سے بیٹھے تھے۔ ۲۸ اگست کو اطلاع ملی کہ لدھیانہ شہر میں مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا ہے شہر بھر میں ہر طرف مسلمانوں کی لاشیں ہی لاشیں پڑی ہیں۔ اس اطلاع نے پھلور میں بھی کافی ہراس پیدا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر ملی کہ مسلم لیگ کے لیڈروں نے جن میں حسین شہید سہروردی کا نام خاص طور پر لیا جاتا تھا اعلان کیا ہے کہ مسلمان گھروں سے نکل کر کیمپوں میں پہنچ جائیں۔ کیونکہ تبادلہ آبادی کی اسکیم منظور ہو چکی ہے۔ یہ خبر سن کر پھلور کے مسلمان بھی گھروں سے نکل کر باہر کیمپ میں جمع ہونے لگے۔ ہمارے لیڈروں کا یہ فیصلہ بے حد افسوسناک تھا اگر وہ اس کے بجائے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو بندوقیں بہم پہنچا دیتے تو مسلمان سکھ جتھوں کا اور انڈین گورنمنٹ کا منہ پھیر دیتے۔

مسلمانوں نے لدھیانہ، تلونڈی رائے، شام چوراسی، رائے پور ارائیاں، تلون، لالو والی اور متعدد دیگر مقامات پر نہتے ہونے کے باوجود سکھ جتھوں کا مقابلہ کیا جن کے ساتھ ملٹری اور پولیس کی امداد بھی ہوتی تھی۔ اور انہیں شکست فاش دی۔ پھلور کے مسلمان لیڈروں کے حکم کے مطابق گھروں سے نکل کر کیمپ میں پہنچ گئے جہاں راہوں، عوڑ، تحصیل پھلور کے دیگر دیہات اور ضلع لدھیانہ کے علاقہ بیٹ کے گوجر بھی جمع ہو رہے تھے اس کیمپ میں پچاس ساٹھ ہزار زن و مرد کا ہجوم ہو گیا۔ بھیڑ، بکری، گائے، بھینس اور گندم زمیندار لوگ اپنے اپنے گھروں سے لے آئے تھے اور بعض دفعہ گوجر لوگ راتوں کو دیہات جا کر لے آتے تھے۔

کیمپ پر ایک آسمانی مصیبت نازل ہوئی برابر تین دن لگاتار مینہ برستا رہا۔ پانچ پانچ فٹ پانی چڑھ آیا بہت سے لوگوں کا سامان تلف ہو گیا۔ غلہ بھیگ گیا۔ ایندھن بہہ گیا کئی کمزور آدمی بچے اور بوڑھے ڈوب مرے۔ یہ کیمپ برابر چار ماہ لگا رہا۔ اس کے بعد یہ قافلہ چلایا گیا۔ راستے میں اس قافلہ پر کسی جگہ حملہ نہیں ہوا البتہ امراض سے بہت سی اموات واقع ہوتی رہیں۔ پھلور سے لاہور تک کے سفر میں ہم نے سڑک کے آس پاس ہزاروں لاشیں پھولی اور سڑی ہوئی دیکھیں۔ دست و پا بریدہ بچوں کی لاشیں بھالوں سے چھیدی ہوئی تھیں۔ عورتوں کے پیٹ چاک کئے ہوئے تھے۔ چار ماہ کیمپ اور سفر کے مصائب جھیلنے کے بعد پھلور کے لوگ پاکستان پہنچے تو یہاں کا باوا آدم ہی نرالہ دیکھا۔ مکان کرائے پر مل رہے ہیں جن کا کوئی اہلکار وسیلہ ہے یا جن کی جیب میں کچھ دام ہیں ان کے لئے آسائش کا سامان موجود ہے لیکن بہت لوگ جن میں عزت دار ملکیتوں والے بھی ہیں اور غریب بھی ہیں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں۔

جناب اسعد گیلانی رقم طراز ہیں:

۱۵ اگست کے بعد پھلور کے چاروں طرف آگ وخون اور آنسوؤں کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ پناہ اور فرار کی سب راہیں مسدود ہو چکی تھیں رات کو پہرہ داروں کی خوف بھری صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ دور کے دیہات سے نقارے بجنے کی آوازیں آتی تھیں۔ جو خطرے کا الارم دے

کر مسلمانوں کو اپنی مدد کے لئے بلاتے تھے۔ دور دیہات میں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بندوقیں چلنے اور بم پھٹنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ دن لاشوں کے ڈھیر، زخمیوں کے انبار اور خوف زدہ پناہ گیروں کے گروہ لاتا ہوا نمودار ہوتا تھا۔ فوجی لاریاں کبھی کبھار چکر لگاتی ہوئی نظر آجاتی تھیں جن کو دیکھ کر سہمے ہوئے دل کسی قدر حوصلہ پکڑتے تھے۔

۱۵ اگست کے بعد ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعرے ''لے لیا پاکستان'' کی آہوں میں تبدیل ہو گئے جلوسوں کی جگہ جنازوں نے لے لی۔ مسلمان نے آنکھ کھولی تو حکومت کا سارا نظام بدل چکا تھا۔ تھانے کے سپاہی سے لے کر ضلع کے حاکم تک تمام وہ لوگ برسر اقتدار نظر آئے جن کی چھاتی پر مونگ دل کر اس نے پاکستان کے نعرے لگائے تھے۔ اس بدلی ہوئی فضا میں اس پر حملے ہونے لگے۔ منظّم گروہ مسلح جتھے، ہتھیاروں سے بھری ہوئی لاریاں رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں اس پر پل پڑے۔ آگ کے شعلے پھلور کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے لگے۔ لدھیانہ ہماری آنکھوں کے سامنے جلا تھا۔ وہاں سے امی بچوں کے ساتھ پھلور آ گئی تھیں۔ جالندھر چھاؤنی کے دو کوہے پر حملے کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں۔ اس لئے بھائی جان وہاں سے چلے آئے تھے۔ جھنگیاں کے لوگ بھاگ کر پھلور میں پناہ لے چکے تھے جن میں مائی جی بھی تھیں۔ بھائی بشیر صاحب کنبہ کے افراد کو مرغی کی سی مستعدی کے ساتھ چھپائے چھپائے پھرتے ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں نقل مکانی جاری تھی۔ ہمیں خیال تھا کہ یہ بدامنی چند روز میں خود بخود دور ہو جائے گی لیکن اس خیال کو تقویت دینے والے آثار کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ مشرقی پنجاب کی مسلم لیگی قیادت روپوش ہو چکی تھی۔ غیر مسلم لیڈر اپنے عوام کے جذبات کو بھڑکا رہے تھے اور فساد آرائی پر ان کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ مسلمان بے سری فوج کی طرح ہراساں تھے۔ انہیں تسلی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ ان کی آنکھوں میں بیچارگی اور لبوں پر ''اب کیا ہوگا'' کا سوال تھا۔

ہم نے یکم ستمبر کو پھلور چھوڑا۔ پاکستان ریڈیو نے اعلان کیا تھا کہ یکم ستمبر سے اسپیشل گاڑیاں اور لاریاں چلانے کے وسیع انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ ہم اس خیال سے کہ جاتے ہی

گاڑی یا لاری مل جائے گی کیمپ میں پہنچے۔ کیمپ محکمہ جنگلات کے ذخیرے کے ساتھ شمالی جانب تھا اس دن تعداد سینکڑوں سے متجاوز نہ تھی۔ بلوچ رجمنٹ کے ۴۵ سپاہی وہاں متعین تھے۔ ان فسادات میں بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے اپنی مستعدی اور فرض شناسی سے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو اپنا گرویدہ احسان بنا لیا۔ پھلور کا کیمپ منظور شدہ کیمپ نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنی راشن کی لاریوں میں پناہ گزینوں کو بٹھا کر جالندھر چھاؤنی کے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔

۲ ستمبر گویا بے سری فوج کی پسپائی کی تاریخ تھی۔ رات کیمپ میں سینکڑوں کی تعداد لے کر نازل ہوئی تھی۔ دن ہزاروں پناہ گزینوں کو ساتھ لئے ہوئے نمودار ہوا۔ پندرہ دن سے ہم ایک ایک گاؤں کو اجڑتے ہوئے لٹتے ہوئے تباہ ہوتے دیکھ رہے اور سن رہے تھے۔ آج جنڈ تباہ ہوا، کل تلونڈی، پرسوں رائے پور لساڑہ، پھر خانپور، پھر مسانی، پھر اوڑ پھر مٹو، میومیانوال پھر ننگل اور نہ معلوم کیا کیا تاراج کیا گیا۔ ۲ ستمبر کو پناہ گزینوں کی آمد جاری رہی۔ ہر طرف سے چھکڑوں کی مویشی کی، انسانوں کی بھیڑیں چلی آ رہی تھیں۔ لوگوں نے کپڑے تان کر جھونپڑیاں بنائیں۔ درختوں کے نیچے ڈیرے ڈالے۔ چھکڑوں کی اوٹ میں پناہ لی، آسمان کی نیلی چھت کے نیچے گھر بنائے۔ لوگ ایندھن اور پانی کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگے۔

سکھ کیمپ کے قریب آتے اور پناہ گیر مسلمانوں کے مویشی ہانک کر لے جاتے تھے۔ لوگ اناج کی تلاش کے لئے باہر جاتے تھے اور سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے۔ مویشی چرانے کے لئے دور نکل جانے والے بھی مارے جاتے تھے۔ بیمار بھی بکثرت مرنے لگے۔ گائیں بھینسیں دس دس بیس بیس روپے میں بک گئیں۔ بکریاں ایک ایک روپے میں فروخت ہوئیں۔ کیمپ کے چاروں طرف غلاظت کے ڈھیر لگتے چلے گئے۔ جانوروں کی اوجھیں سڑنے لگیں مرنے والے مویشی سڑ سڑ کر بدبو پھیلانے لگے۔ اسپیشلیں لدھیانہ کیمپ سے پناہ گزینوں کو بھر کر لاتی تھیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتی تھیں۔ ہم حسرت سے ہاتھ ہلاتے رہ جاتے تھے۔

سات ستمبر کو اس کیمپ میں چودہ لاریاں آئیں اور اگلے دن لدلدا کر چل دیں۔ معلوم ہوا کہ ان لاریوں پر چڑھنے کے لئے فی سواری ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو روپیہ دیا گیا۔ دس ستمبر کو سات لاریاں آئیں۔ ہم نے بادل نخواستہ وہی ترکیب اختیار کی جو اور لوگ کر رہے تھے۔ تیس روپے فی سواری کے حساب سے معاملہ طے ہوا۔ ہم نے اپنے کنبے کو لاریوں میں ٹھونس دیا اور خود چھت پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ لاریاں چلیں پاکستان کی سرزمین میں پہنچنے کا شوق تیز ہوا۔ سات بجے شام امرتسر، بارہ بجے رات کے قریب واہگہ سے ایک میل ادھر ہماری لاری کا انجن کا خراب ہو گیا سات کی سات لاریاں خدا حافظ کہہ کر نکل گئیں۔ ناچار لاری کو دھکیلتے ہوئے رات کے ڈیڑھ بجے پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ موٹر کی لاش سڑک کے ایک کنارے پر پڑی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے سڑک سے ذرا ہٹ کر اطمینان خاطر سے چادریں بچھائیں اور ان پر سو گئے۔ کئی ماہ کے بعد امن اور چین کی یہ پہلی نیند تھی جو پاکستان کی سرزمین پر آئی۔ خوف، بدامنی، اجنبیت، بے کسی اور بے اعتمادی کا جو خول بنا ہوا تھا وہ پھٹ چکا تھا۔ (۵۴)

ہوشیار پور

اونہ ضلع ہوشیار پور کے مہاجر مسٹر سعید الدین تاجر کتب نے اپنی زہرہ گداز داستان یوں بتائی۔

میں کتابوں اور قرآن مجید کی تجارت کرتا تھا۔ اچھی اچھی دینی اور علمی کتب میری دکان میں موجود تھیں۔ فسادات ہشیار پور کے سلسلے میں جب غنڈہ لٹیرے اونہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ تو انہوں نے قتل عام کے ساتھ لوٹ مار بھی مچادی۔ مسلمانوں کو شہید کر کے ان کی دکانوں، مکانوں وغیرہ کو آگ لگادی۔ نقدی، زیورات، کپڑے اور خوردنی اشیاء کو جی کھول کے لوٹا۔ بہت سا مال اسباب نذر آتش کیا۔ جلتی ہوئی دکانوں اور مکانوں میں مرد و زن، بچہ و پیر، جو بھی ہاتھ آیا جھونک دیا۔ سینکڑوں بندگان خدا جل کر خاک ہو گئے۔ بیسیوں معصوم جانیں شعلوں میں تڑپ کر ٹھنڈی ہوئیں۔ اور جن لرزہ آفریں حوادث سے چشم فلک ناشناس تھی۔ خاک کے ان بے گناہ پتلوں کو ان سے آشنا ہونا پڑا۔

میں دکان میں بیٹھا تھا۔ کہ مجھے اپنے مکان کے جلنے کی اطلاع ملی۔ گھر گیا، دیکھا کہ تمام افراد خاندان سپرد آتش ہو چکے ہیں۔ صرف دو سال کا بچہ زندہ ہے وہ بھی ایک گوشے میں گھائل ہو کر پڑا ہے اور زخموں کے بے پناہ درد سے چیخ رہا ہے۔ میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ گوشت کے دونوں نرم و گداز ٹکڑوں یعنی دل و جگر کو طوعاً و کرہاً سنگ و آہن میں منتقل کیا، دل کو تھاما، کلیجے کو پکڑا، آنسوؤں کو پیا، زخم خوردہ معصوم کو کندھے پر رکھا اور دکان کو چل دیا۔ سڑک پر جا رہا تھا لیکن اس طرح جیسے کوئی دیوانہ عقل و ہوش کھو چکا ہو۔ پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ باہر ایک ایک چیز مجھے دھکے دیتی تھی۔ آنکھوں میں وہ اندھیرا تھا۔ جسے لاکھوں سورج اجالے میں تبدیل نہ کر سکیں۔ جی چاہتا تھا دھاڑیں مار کر روؤں۔ سر پر باہیں رکھ کر چلاؤں۔ لیکن خوف تھا کہ دشمن نے ایک قطرہ اشک بھی دیکھ لیا تو جانے آنکھیں نہ پھوڑ دے اور کس عذاب سے مارے۔ ننھے کو اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ دکان کے قریب پہنچا تو کچھ غنڈے دکھائی دیئے میں نے بچے کو چادر میں چھپالیا لیکن خونخوار درندے مجھے اور بچے کو دیکھ چکے تھے۔ وہ میری طرف لپکے اور جھپٹ کر ننھے

کو چھین لیا۔ زخمی معصوم چیخا کانپا ''ابا کول'' کی رٹ لگائی۔ میں نے موذیوں کی بے حد خوشامد کی ان کے پاؤں چھوئے۔ واسطے دلائے، مگر سفاک ذرا نہ پسیجے، اور ان پر اثر ہوا تو یہ کہ ڈنڈے مار کر میرے ہاتھ زخمی کر دیئے۔ پھر غنڈوں نے آپس میں کچھ اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی بچے کو اس زور سے پختہ فرش پر پھینکا کہ وہ بلبلا اٹھا اور آنکھوں کے ڈھیلے اوپر کو گھوم کر کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ایک بے درد آگے بڑھا اس نے چھری کے ساتھ اس کا بازو کاٹ لیا۔ دوسرے لعین نے اس کی ناک فنا کر دی۔ اسی طرح وہ آہستہ آہستہ اس کا ایک عضو کاٹ لیتے اور اس کے کٹنے پر جب وہ چیختا، تڑپتا اور لرزتا تو یہ وحشی کھل کھلا کر ہنستے اور تالیاں بجاتے۔ اس طرح ظالموں کی سختیاں سہہ کر میرے معصوم نے اپنی جان مالک حقیقی کو سپرد کر دی۔

میں اپنے بچے کو یوں جگر پاش طریق سے قتل کرا کے زخمی ہاتھوں کے ساتھ دکان پر آیا۔ میں نے دیکھا کہ دکان کی تمام کتابیں ورق ورق کر کے بازار میں پھینک دی ہیں۔ کلام اللہ کے پھٹے ہوئے اوراق ادھر ادھر پھرتے ہیں۔ میرا دکان پر پہنچنا ہی تھا کہ غنڈوں کی ایک اور ٹولی آئی انہوں نے دکان کو آگ لگا دی۔ ان غنڈوں میں ایک ہندو بھی تھا جس کے ساتھ میرے پرانے دوستانہ تعلقات تھے۔ جب میری اور اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے اشارہ سے اسے سلام کیا۔ اس نے لاٹھی کی ایک ضرب سے سلام کا جواب دیا۔ اور جب میں چوٹ کے درد سے کراہا تو اس ''دوست'' نے خوب قہقہہ لگایا۔ اونہ میں زخمی اور مظلوم مسلمان جو باقی رہ گئے تھے اتنے ہی تھے کہ ان بدقسمتوں کی تعداد آسانی سے انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ غیر مسلم ملٹری نے ان مسلمانوں کو جن میں ایک میں بھی تھا۔ چوپایوں کی طرح ہانکا اور ایک میدان میں لے گئی۔ یہ ہمارا ریلیف کیمپ تھا۔ جہاں نہ پانی تھا نہ سایہ۔ ''میدان'' جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ ہر جگہ کانٹے بکھرے ہوئے تھے۔ آسمان کی نیلی چھت ہمارا اوڑھنا تھا۔ اور فرش زمین بچھونا! ہم ڈیڑھ سو اللہ کے بندے وہاں مواشی کی طرح بیٹھ گئے۔ فاقہ میں چار روز پہلے گزر رہے تھے۔ دو روز یہاں گزر گئے۔ تیسرے روز آدھ پاؤ فی کس کے حساب آٹا ملا۔ لیکن روٹی کیونکر پکے۔ نہ پانی میسر نہ

ایندھن مہیا نہ برتن موجود۔ کوئی اسے پھانکے یا چاٹے، تین دن اور گزرے تو سکھوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیاں آئیں۔ کالی اور بدبودار۔ اگرچہ ہم بھوک کے مارے تھے لیکن یہ روٹیاں دیکھ کر ہمیں قے آتی تھی۔ ہم نے پلید ہاتھوں سے پکی ہوئی روٹیاں کھانے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح دو تین دن اور گزر گئے۔ ہم میں سے بعض کمزور اور ضعیف آدمی فاقہ سے نڈھال ہو گئے۔ اور ان کی جان لبوں پر آ گئی۔ اس پر ملٹری گارڈ کو کچھ توجہ ہوئی۔ اور کھانے پکانے کا مختصر سامان اور کچھ آٹا فراہم کیا گیا۔ بارہ دن اس کیمپ میں گزارنے کے بعد ہمیں حکم ملا کہ ہوشیار پور جانے کے لئے کوچ کرو۔ چنانچہ ہمیں پاپیادہ ہوشیار پور کے لئے ہانک دیا گیا۔ راستے میں دو بار غنڈوں نے حملہ کیا اور ہمارے چند آدمی ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ ''ہوشیار پور کیمپ'' میں پہنچے تو دیکھا کہ صدہا مسلم مظلومین فاقہ اور پیاس اور دیگر اسقام و آلام سے پڑے سسک رہے ہیں۔ ہم بھی ان مصائب میں شامل ہو گئے۔ اس کیمپ میں ہر چوتھے روز فی بالغ آدمی ایک چھٹانک آٹا ملتا تھا دن میں صرف ایک بار پانی پینے کی اجازت دی جاتی تھی۔ چونکہ گرمیاں تھیں اس لئے پیاس زیادہ لگتی تھیں پانی جمع رکھنے کے کیمپ میں کوئی سامان نہ تھا۔ ایک مہینہ ہم نے یہاں گزارا۔ آخر ستمبر کے آخری ہفتے ہمیں پاکستان پہنچانے کے لئے گاڑی میں سوار کیا گیا۔ راستے میں جا بجا قاتلوں نے ٹرین پر حملے کئے۔ رہا سہا اثاثہ لوٹا اور اس طرح یہ اجڑا ہوا قافلہ اکتوبر کے پہلے ہفتے لاہور پہنچا

(مراسلہ: حکیم سید محمود گیلانی)

سید ناظر حسین صاحب رقم طراز ہیں:

گڈھ شنکر میں ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ کو سکھوں اور ہندوؤں کی ایک پارٹی اول فول بکتی ہوئی باہر سے شہر کے اندر داخل ہوئی۔ چند مسلمان نوجوان گزر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان محمد شفیع پر بم پھینکا گیا۔ جس سے وہ بری طرح زخمی ہوا۔ اس کی امداد کے لئے چند نوجوان آگے بڑھے ان پر بھی تلوار کے وار کئے گئے۔ حملہ آور اس قدر شرارت کرنے کے بعد فرار ہو گئے یہ خبر شہر بھر میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ مسلمان غضب آلود جذبات لے کر رائے دولت خان ذیلدار

سب رجسٹرار کی حویلی میں جمع ہونے لگے۔ اور کہنے لگے کہ ہمیں اجازت ہوتو ہم گڈھ شنکر کے ہندوؤں کو اس شرارت کا مزہ چکھادیں۔ رائے دولت خان نے جو ایک نہایت ہی شریف متین اور سنجیدہ شخص تھے مسلمانوں کو سمجھایا کہ چند لونڈوں کی شرارت کی سزا سارے ہندوؤں کو دینا ٹھیک نہیں لیکن مسلمان غصے کے عالم میں تھے۔ وہ حویلی سے نکل کر بازار گئے میں گئے اور ان میں سے بعض نے ہندوؤں کی دکانوں کو آگ لگادی۔ باہر سے آئے ہوئے سکھوں نے جو ہندوؤں کے گھروں میں چھپے ہوئے تھے مسلمانوں کی دکانوں کو نذر آتش کر دیا۔ ۱۴، ۱۵ جولائی کی درمیانی شب کو گڈھ شنکر کے بازار کا بیشتر حصہ جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ علی الصبح محمد شفیع مذکور جو بم سے زخمی ہوا تھا چل بسا۔ صبح کے وقت ملٹری آگئی اس نے آتے ہی لائسنس داروں سے بندوقیں اور پستول لے لئے۔ پھر امن کمیٹی بنانے کے بہانے سے شہر کے چیدہ چیدہ اور سرکردہ مسلمانوں کو تھانے میں بلا کر گرفتار کرلیا۔ اور جیل بھیج دیا۔

راجپوتوں کے معزز افراد کو اس طرح جیل میں ٹھونسنے کے بعد میدان صاف تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گڈھ شنکر کے گردونواح کے دیہات پر حملے ہونے لگے۔ ۱۸ اگست کو شمال مشرق میں گوجروں کی ایک بستی حیات پور پر رات کی تاریکی میں حملہ ہوا۔ گاؤں کے اکثر مرد شہید کر دیئے گئے عورتوں اور بچوں کو بیدردی سے تہ تیغ کیا گیا۔ بہت سے زخمی گڈھ شنکر کے ہسپتال میں لائے گئے۔ ہسپتال کا ہندو کمپاؤنڈر مذاق کرتا تھا۔ کہ گھبراتے کیوں ہو دیکھتے نہیں یہ پاکستان بن رہا ہے۔ حیات پور کے حملہ کے بعد مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر ہراس کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بیس پچیس دیہات کے مسلمان بیرم پور میں جمع ہوگئے۔

۲۰ اگست کو گوجروں کے ایک اور گاؤں موضع جیون پور پر رات کی تاریکی میں حملہ ہوا۔ گوجروں نے زبردست مقابلہ کیا اور سکھوں کے پہلے حملہ کو ناکام بنادیا اس شب سکھوں نے بختاور سنگھ ذیلدار پدرانہ کی سرکردگی میں آتشیں اسلحہ سے مسلح ہوکر دوسرا شدید حملہ کیا۔ اس مقابلے میں ۲۶ مسلمان شہید اور ۳۲ زخمی ہوئے۔ ایک روز قبل جیون پور کا نمبردار بختاور سنگھ کیک گاؤں میں

جا کر سکھ بن گیا تھا۔ وہ حملہ آوروں کے ساتھ تھا اور مکانات کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اس حملہ کے بعد جیون پور کے گردونواح کے دیہات خالی ہونے لگے اور مسلمان گڈھ شنکر میں آ آ کر جمع ہوتے گئے۔ خالی دیہات کو سکھ آگ لگادیتے تھے۔ یہاں اس امر کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بہت سے کمزور طبیعت مسلمان مرتد ہوگئے۔ موضع کتنہ کے بہت سے مسلمان جن میں ''حاجی'' بھی تھے سکھ بن گئے۔

گڈھ شنکر کے جنوب میں مورخہ ۲۴ اگست کو موضع بھنوں پر حملہ ہوا۔ وہاں سے لوگ بھاگ کر چنکوعہ میں جمع ہوگئے ان کے علاوہ بعض دیگر دیہات کے مسلمان بھی وہیں آ گئے۔ مسلمانوں کا یہ اجتماع بہت خوف زدہ تھا۔ تھانیدار نے انہیں اطمینان دلایا کہ تمہیں بحفاظت تمام کٹروعہ کے کیمپ میں پہنچادیا جائے گا جب چنکوعہ کے اجتماع نے سامان اور ہتھیار باندھ کر گاڑیوں پر لاد لئے اور گاؤں سے باہر نکل آئے تو ان پر سکھوں نے خوفناک حملہ کر دیا۔ ہر طرف چٹیل میدان تھا بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ ہزاروں مسلمان اس جگہ شہید کر دیئے گئے۔ سینکڑوں عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ بچے کچھے لوگ بھاگ کر فصلوں میں چھپ گئے اور آخر رات کی تاریکی نے ان پر پردہ ڈالا۔ ازاں بعد پناہ گزینوں کا چوتھا اجتماع سٹروعہ میں ہونے لگا۔ ۳۰ اگست اتوار کو سٹروعہ کے گرد سکھوں کے جتھے جمع ہونے لگے چاروں طرف میلوں تک سکھ ہی سکھ نظر آرہے تھے۔ تین بجے کے قریب سکھوں نے سٹروعہ پر حملہ کر دیا۔ آگے آگے بندوقچی تھے۔ ان کے پیچھے نیزہ برداروں کی قطاریں تھیں۔ جب ایک قطار تھک جاتی تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتی تھی۔ مسلمانوں نے مقابلہ کیا۔ تین گھنٹے تک شدید جنگ ہوتی رہی۔ راجپوت آگے بڑھ بڑھ کر دادشجاعت دے رہے تھے۔ اور اپنے اپنے مورچوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اتنی دیر لڑائی جاری رہنے کے باعث مسلمان بندوقچیوں کے کارتوس ختم ہونے لگے اور اس کے ساتھ ہی حوصلے بھی پست ہونے لگے تھے کہ اللہ کی طرف سے غیبی امداد آ گئی۔ ایک ملٹری مین چودھری فضل محمد حوالدار اپنے بیوی بچوں کو لے جانے کے لئے ایک ٹرک اور ایک جیپ کار لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے

محاصرے اور جنگ کی کیفیت دیکھی تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ حملہ آوروں پر برین گن اور مشین گن سے گولیاں برسانے لگا۔ سینکڑوں سکھ مارے گئے اور باقی بھاگ نکلے۔ چودھری فضل محمد اگلے سٹروعہ کے سارے قافلے کو گڈھ شنکر لے آیا۔ مسلمان پناہ گزینوں کا ایک اجتماع گڈھ شنکر کے جنوب میں موضع نیام میں بھی اکٹھا ہو رہا تھا۔ سٹروعہ کا اجتماع اٹھ جانے کے بعد گڈھ شنکر کے لوگ اس اجتماع کو اپنے ہاں لے آئے اس کے بعد پولیس نے گڈھ شنکر کے باقی ماندہ سرکردہ اشخاص کو بھی گرفتار کرلیا۔ اب تھانہ گڈھ شنکر کے علاقہ میں مسلمانوں کے دو مرکز یعنی گڈھ شنکر اور بیرم پور باقی رہ گئے۔ بیرم پور کے بہادر اور دلیر راجپوت اس بات کا تہیہ کئے بیٹھے تھے کہ ہم سکھوں سے دو دو ہاتھ کئے بغیر اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ اس گاؤں میں مدافعت اور مقابلے کی ہر گونہ تیاریاں بہت اعلیٰ پیمانہ پر کی گئی تھیں۔ لیکن سکھ ان دونوں مرکزوں پر حملہ کرنے سے کتراتے رہے۔ اتنے میں فوج کا کمانڈر مسلمان فوجی افسر لگ جس نے ان دونوں مقاموں کو جنگ و جدال سے بچائے رکھا۔

۶ ستمبر کو بیرم پور کا اجتماع بھی گڈھ شنکر آ گیا۔ اب بارشوں کی مصیبت نے آن گھیرا۔ تمام کیمپ میں پانی ہی پانی ہوگیا جس کے باعث لوگوں کو ناقابل برداشت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ۷ اکتوبر کی شام کو حکم دیا گیا کہ صبح چھ بجے تمام مرد عورتیں اور بچے قافلے کی صورت میں روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ ۸ اکتوبر کو گڈھ شنکر سے قافلہ چلا۔ آہ و بکا اور شور و فریاد کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ گھوڑے داہا راجپوتوں کی بیبیاں جن کی پردہ نشینی ضرب المثل تھی سراسیمگی، پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوگئیں۔ یہ قافلہ نواں شہر کے قریب سے ہو کر شام کے قریب راہوں پہنچا وہاں سے پہلے ہی کافی اجتماع تھا۔ اس لئے وہاں ہیضہ پھیل گیا اور سینکڑوں مسلمان راہی ملک عدم ہوئے۔ ۱۴ اکتوبر کو یہ قافلہ پھلور کی طرف روانہ ہوا اور ساٹرہ میں پڑاؤ کرنے کے بعد ۱۵ اکتوبر کو پھلور پہنچا۔ کیپٹن عبدالغفور باشندہ گڈھ شنکر بیسیوں مرتبہ ٹرکوں کے کانوائے لایا اور عورتوں، بوڑھوں، بچوں کو لاد لاد کر پاکستان لاتا رہا۔ باقیماندہ لوگ آہستہ آہستہ

اسپیشل ٹرینوں یا پیدل قافلے کی شکل میں پاکستان پہنچے۔ دو ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

جناب ضیاءاللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔:

جب ہم اپنے قصبہ میانی افغاناں کو بصد حسرت و یاس چھوڑ کر وہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو ہم نے ریاست کپورتھلہ کی راہ لی۔ ہم روانہ ہوئے تو بارش بھی شروع ہوگئی۔ خواتین جنہوں نے اپنی ساری عمر میں ایک قدم بھی گھر سے باہر نہ رکھا تھا ہر ایک شخص یگانہ و بے یگانہ کے سامنے کھلے منہ چلی جا رہی تھی۔ چونکہ ہمیں سکھ اور ہندو ملٹری کے حملے کا بہت خوف تھا اس لئے قافلے میں عجیب قسم کی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم لوگ بیکووال پہنچے اور کچھ دن وہاں رہ کر وہاں سے بھی چل پڑے۔ اپنے سفر کی کچھ منزل طے کرنے کے بعد جب ہم مہند پور سرکاں میں پہنچے تو سکھ اور ڈوگرا ملٹری نے ہم پر زبردست حملہ کیا۔ قافلے کے بہت سے مرد اور عورتیں شہید کر دیں اور کئی عورتوں کو جو عالم شباب میں تھیں اٹھا کر لے گئے۔ اس طرح گرتے پڑتے ہم نڈالہ کیمپ میں پہنچے جو دریائے بیاس سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کیمپ میں کوئی دو لاکھ آدمیوں کا اجتماع تھا۔ خوراک کے سامان کی بہت قلت تھی۔ اس لئے ہم درختوں کے پتے کھا کھا کر گزارا کرتے تھے۔ ہر روز موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اس لئے سیلاب آ جانے کا خطرہ بھی لگا رہتا تھا۔ ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے کھیسوں کے جو تنبو بنا رکھے تھے۔ ان سے پانی ٹپکتا تھا اور نیچے بھی پانی بہتا تھا۔ اس لئے تنبو میں اکڑے بیٹھے رہتے تھے۔ ہمارے پاؤں متورم ہوگئے اور کھجلی پڑ گئی۔ اگر ہم خوراک کی تلاش میں کیمپ سے باہر نکلتے تھے تو سکھ اور ڈوگرا ملٹری ہمیں گولی کا نشانہ بنا لیتی تھی۔ پانی ہم ان جوہڑوں سے پیتے تھے جو بارش نے جا بجا بنا دیئے تھے۔ کوئی بیس دن وہاں رہے۔ تھوڑی سی مسلمان ملٹری آ گئی لیکن سکھ اور ڈوگرے پھر بھی مظالم سے باز نہ آئے وہ کیمپ سے عورتوں کو اٹھا لے جاتے تھے۔ جب ہم وہاں سے چل کر بیاس کے قریب پہنچے تو ملٹری نے ہمیں وہیں روک دیا۔ رات آئی سوتے میں میرے کانوں میں گڑگڑاہٹ کی سی آواز آنے لگی۔ گھبرا کر اٹھا تو دیکھا کہ پانی کی دیوار کیمپ پر آن پڑی ہے۔ میں نے جلدی سے اپنے

بھائیوں اور بہنوں کو اونچی جگہ پر بٹھایا اور خود ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ طوفان دو دن رہا۔ اس سیلاب میں قافلے کے اکیس ہزار مرد وزن اور بچے نذر آب ہو گئے۔ اگلے روز ہم چل پڑے امرتسر کے قریب سکھ اور ڈوگرا ملٹری نے ہم پر پھر حملہ کیا اور ہمارے بہت سے بھائی شہید کر دیئے۔ دو ماہ بعد ہمارے کیمپ کے دو لاکھ مسلمانوں میں اسے ایک لاکھ پچیس ہزار پاکستان پہنچے۔(۵۵)

کانگڑہ

شیخ عبدالواحد صاحب سیکرٹری مسلم لیگ دھرم سالہ تحریر فرماتے ہیں:

پندرہ اگست سے ہندوستان آزاد ہو گیا اور راشٹریہ سیوک سنگھ نے ضلع کانگڑہ کی دو فیصدی مسلم آبادی کو ملیا میٹ کر دینے کے پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ ہزاروں نہتے مسلمان، مردوں، عورتوں اور معصوم بچوں کو بے دریغ قتل کیا۔ ہزاروں کو زخمی اور سینکڑوں کو زندہ آگ میں جلا دیا۔ ہزار ہا مسلمان جبراً ہندو بنائے گئے۔ متمول لوگ ہندو بن جانے کے بعد بھی قتل کر دیئے گئے۔ سینکڑوں عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ مال مویشی لوٹا گیا۔ مکان جلا دیئے گئے۔ ۲۴ اگست کو مسلمان پولیس سے ہتھیار لے کر انہیں لائن حاضر کر لیا اور کئی سپاہی ہلاک کر دیئے گئے۔ ۲۵ اگست کو دھرمسالہ میں مسلمانوں کو وحشت و بربریت کا تختہ مشق بنایا گیا۔ شیخ علم الدین سپرنٹنڈنٹ پولیس ضلع کانگڑہ کو شارع عام میں قتل کر دیا گیا۔ اور ہر طرف مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے۔ اس روز کوئی ۳۵ مسلمان شہید ہوئے۔ ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ مسلمان محفوظ جگہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ کرفیو لگا۔ رات کو ہماری چھ دکانیں لوٹ کر نذر آتش کر دی گئیں باقی دکانوں کو لوٹ کر ان پر قبضہ جما لیا۔ چیدہ چیدہ مسلمانوں کو گھروں سے نکال نکال کر جیل بھیج دیا گیا۔ مسلمان کرفیو آرڈر کے باعث باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ جو مسلمان باہر نکلتا تھا اسے گولی کا نشانہ بنا لیا جاتا تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ والے آزاد تھے۔ وہ ہر طرف لوٹتے اور مکانوں اور دکانوں کو آگ لگاتے جاتے تھے۔ ڈپو بازار کی بڑی مسجد جلا دی گئی اور اس کی وقف جائداد پر قبضہ جما لیا اسی طرح جامع مسجد اور اس کی ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی وقف جائداد پر قبضہ کر لیا۔ سارے ضلع میں مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ ۲۶ اگست کو ڈپٹی کمشنر کا حکم ملا کہ سب مسلمان ایک گھنٹہ کے اندر اندر دھرمسالہ خالی کر کے امام باڑہ میں جمع ہو جائیں سب لوگ امام باڑہ میں جمع ہونے لگے راستے میں پولیس تلاشی لے رہی تھی اور قیمتی سامان ہتھیا تی جاتی تھی۔ ۲۷ اگست کو پٹھان کوٹ کے کچھ بے ساز وسامان پناہ گزین وہاں لائے گئے۔ ۲۸ اگست کو ہمیں یول کیمپ میں لے جایا گیا۔ جہاں نور پور کی تحصیل کے

سوا باقی ضلع کے مسلمان جمع ہو رہے تھے۔کیمپ میں بہت سے لوگ مجروح نظر آ رہے تھے۔کسی کا ہاتھ کٹ چکا تھا۔کسی کی ٹانگ غائب تھی۔یول کیمپ میں خوراک کا انتظام بہت ناقص اور ردّی تھا پرانی مکئی کا دلیہ تین چھٹانک فی کس روزانہ کے حساب سے ملتا تھا۔آگ جلانے کے لئے گیلے ایندھن سے کام لیا جاتا تھا۔روشنی اور صفائی کا انتظام مطلقاً نہ تھا کئی دفعہ کیمپ پر حملہ کرنے کی سازشیں کی گئیں اور تاریں کاٹی گئیں لیکن مسلمان کپتان کی موجودگی کے باعث حملہ نہ ہو سکا۔گیارہ یا بارہ ستمبر کو پولیس رہا شدہ قیدیوں کی ایک لاری لائی جس میں اکتیس مسلمان تھے ان سب کو لکروٹہ اسٹیشن پر لے جا کر راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہاتھوں قتل کرا دیا صرف تین آدمی بچ کر یول کیمپ پہنچے۔میں اپنے اہل وعیال سمیت ۱۷ ستمبر کو ایک کانوائے میں لاہور پہنچا۔اور یہاں در بدر پھر رہا ہوں۔نہ رہنے کو مکان ملا ہے نہ کاروبار کے لئے دکان ملی ہے۔ہمارے آنے کے بعد یول کیمپ کے جو لوگ ٹرین پر لائے گئے ان پر راستے میں حملہ کیا گیا اور سب سامان چھین لیا گیا۔

چودھری مہتاب الدین سمار بیان کرتے ہیں:

جب ہندو ضلع کانگڑہ میں مسلمانوں کو چن چن کر قتل کرنے لگے تو ہم ساٹھ مسلمان کانگڑہ سے نکل کر پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔ہم کیمپوں کے دردناک کیفیات سن چکے تھے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ بال بچوں سمیت پا پیادہ پاکستان پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ہم مکئی اور باجرے کے کھیتوں اور جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی اوٹ میں چلتے ہوئے آ رہے تھے کہ ایک جگہ سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جتھے نے ہمیں دیکھ لیا۔اور ہمیں گھیر کر برچھیاں، کرپانیں، کلہاڑیاں چلانا شروع کر دیں۔ہمارے بائیس آدمی شہید اور چودہ زخمی ہوئے باقی تتر بتر ہو گئے۔کئی عورتیں گم ہو گئیں۔بچے قتل کر دیئے گئے۔سن رسیدہ مستورات کے دست و پا کاٹ کر انہیں جھاڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ہم بیس آدمی پھر جمع ہوئے اور پاکستان کی طرف چلتے رہے۔پاکستان کی سرحد کے قریب سکھ سپاہیوں نے ہم پر گولیاں چلائیں ہمارے گیارہ آدمی شہید ہو گئے اور ساٹھ کے قافلے سے صرف نو آدمی زندہ وسلامت پاکستان پہنچ سکے۔(مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)(۵۶)

لدھیانہ اور اس کے مضافات کی سرگزشت

لندن کے اخبار ''ڈیلی ایکسپریس'' کو اس کے نامہ نگار نے ۲۷ اگست کو حسب ذیل برقی پیغام بھیجا:

آج نذر آتش ہو کر تباہ و برباد ہونے کے لئے لدھیانہ کی باری آ گئی یہ شہر دہلی سے ایک سو نوے میل جانب شمال واقع ہے اور مسلم اکثریت کا مالک ہے۔آج اس شہر کے ایک لاکھ سکھوں نے سکھ پولیس کی مدد سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس کی توقع کی جا رہی تھی۔سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگی اقدامات کا واحد معرکہ جو یہاں شروع ہوا وہ اپنی تنظیم اور وسعت کے اعتبار سے غالباً ان جملہ اقدامات سے سب سے زیادہ سنگین ہے جو مشرقی پنجاب کے دوسرے شہروں میں اختیار کئے گئے۔میں نے کاروائی شروع ہونے کے کوئی نصف گھنٹہ بعد موٹر کار پر سوار ہو کر شہر کا دورہ کیا۔شہر کا شہر دھڑا دھڑ جل رہا ہے۔چیخ چیخ کر شور وغل مچانے والے سکھوں کا بے پناہ اژدہام من مانی کاروائی کر رہا ہے۔خون آشامی کے اندھے جوش نے اس ہجوم کو پاگل بنا رکھا ہے۔مسلمان اپنے اپنے گھروں میں بند ہیں۔شہر میں ہر طرف خطرے کے نقارے بج رہے ہیں۔کہیں کہیں مسلمان سکھوں پر اینٹیں اور بم پھینک رہے ہیں۔سکھوں کی بھیڑ پولیس کی مدد سے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگا رہی ہے۔اس مقصد کے لئے آتش گیر اشیا مثلاً گھاس پھوس، چیتھڑے اور مٹی کا تیل استعمال کیا جاتا ہے سکھ ٹامی گن سے لے کر نیزوں، بھالوں اور تلواروں تک ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہیں وہ مسلمانوں کو گھروں سے نکال نکال کر قتل کر رہے ہیں بلکہ ان کا شکار کھیل رہے ہیں۔ایک سکھ نے جو میرے قریب سے گزرا مجھے مخاطب ہو کر کہا ''آج ہم مسلمانوں سے وہی کچھ کر رہے ہیں جو چار ماہ سے وہ ہمارے ساتھ کر رہے تھے۔ہم ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے۔''

شیخ نبی بخش صاحب باشندہ محلّہ کریم پورہ لدھیانہ بیان کرتے ہیں:

ویسے تو پندرہ اگست کے بعد ہی لدھیانہ میں مسلمانوں پر اکا دکا حملے شروع ہو گئے تھے لیکن ۲۷ اگست کو منظّم طریق سے مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی مہم شروع کی گئی۔اور لدھیانہ کے

سکھوں اور ہندوؤں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا۔ غیر مسلم افسران میں ہر قسم کے اسلحہ پہلے ہی تقسیم کر چکے تھے۔ ۲۷ اگست کو لدھیانہ پر شہری اور دیہاتی غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کی محلّہ وار فہرست پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔ اس کے مطابق حملہ آوروں، قاتلوں اور آگ لگانے والوں کی ٹولیاں متعین ہو چکی تھیں۔ بڑے وسیع پیمانہ پر کام شروع کیا گیا۔ چند گھنٹوں میں لدھیانہ کے بازار سڑکیں اور گلی کوچے مسلمانوں کی لاشوں سے پٹ گئے۔ ہر طرف سے آگ کے شعلے اٹھ اٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ فضا دھوئیں سے معمور ہو گئی۔ بہت سے مسلمان آگ میں جھونک دیئے گئے۔ جس مکان کو آگ لگتی تھی اگر اس کے مکین باہر نکلتے تھے تو گولیوں سے برچھوں سے یا کرپانوں سے شہید کر دیئے جاتے تھے۔ اگر اندر رہتے تھے تو آگ میں جل کر مر جاتے تھے۔

ایک روز سکھ وحشیوں نے محلّہ کریم پورہ کا محاصرہ کر لیا ہر گلی کوچہ پر خونخوار درندوں کا پہرہ لگ گیا۔ تجویز یہ تھی کہ کریم پورہ کے تمام مسلمانوں کو مکانوں کے ساتھ ہی جلا دیا جائے۔ جب یہ خون آشام درندے میرے مکان میں آئے تو آتے ہی آگ لگانے کی تیاری کرنے لگے ایک بدمعاش نے کچھ اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی چند بدمعاش میری دو نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر چلتے بنے۔ باقیوں نے میرے شیر خوار بچے کو اس کی والدہ کی گود سے جھپٹ کر چھین لیا۔ اور اس کے پیٹ میں چھری گھونپ دی۔ میری بیوی کلہاڑی کے ایک وار سے شہید ہو گئی۔ بوڑھی چچی کا جسم کرپان سے چھید ڈالا۔ ایک بچے اور ایک بچی کو برچھوں سے چھید ڈالا۔ کرپان کا ایک وار مجھے پر بھی ہوا لیکن بدقسمتی سے میں زندہ رہ گیا۔ حملہ آور مجھے ٹانگ سے گھسیٹ کر باہر لے جا رہے تھے کہ ان کے ساتھیوں نے انہیں امداد کے لئے پکارا وہ مجھے چھوڑ کر ان کی طرف چلے گئے۔

(مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی) (۵۷)

قسمت انبالہ کے چند مناظر

سید محمد محسن الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں:

انبالہ چھاؤنی اور اس کے مضافات میں انارکی کی ابتدا یوں ہوئی کہ مؤرخہ ۱۶ اگست کو دو سکھوں نے جو انبالہ چھاؤنی سے تانگے پر سوار ہو کر کلدیب نگر گئے تھے کلدیب نگر کے قریب اپنے ہمراہی دو مسلمان مسافروں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد سکھ تانگہ پر سوار ہو کر اسی مقام کی طرف گئے اور وہاں پہنچ کر تانگے والے کو قتل کر دیا۔ ایک ہندو جو اسی تانگہ پر سوار تھا گھوڑا ہانک کر مسلمان تانگے والے کی لاش چھاؤنی لے آیا۔ مسلمانوں میں ہراس پھیل گیا تانگے والوں نے اگلے دن ہڑتال کر دی۔ اس کے بعد ہر روز قتل کی وارداتیں واقع ہونے لگیں۔ جمعہ ۲۲ اگست کو جامع مسجد میں بم پھینکا گیا جس سے ۶ مسلمان شہید اور آٹھ زخمی ہوئے۔ یہ حالات دیکھ کر میں اپنے بال بچوں کو لے کر ساڈھورہ چلا گیا۔ ازاں بعد سکھ منظّم جتھوں کی صورت میں ریل گاڑیوں پر سفر کرنے اور راستوں میں مسلمانوں کا قتل کرنے لگے۔ انبالہ سے لے کر جگادھری تک کا سفر بے حد پر خطر ہو گیا۔ اس راستے میں کئی مسلمان مارے گئے۔ جب مسلمانوں نے خوف کے مارے سفر بند کر دیا تو مسلمانوں کے دیہات پر یکے بعد دیگرے حملے شروع ہو گئے۔ عید کے دن یعنی ۱۸ اگست کو جگادھری کے ریلوے اسٹیشن عبداللہ پور پر حملہ ہوا اور چار پانچ سو مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد حسن پور تاراج کیا گیا جو مصطفیٰ آباد کے قریب واقع تھا۔ یہاں بھی مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان کے گھر لوٹے گئے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ نوجوان لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ غرض مسلمانوں کے دیہات پر اس قسم کے حملے جاری رہے اور مسلمان تباہ حال ہو کر ادھر ادھر منتشر ہوتے گئے۔

میں ان دنوں ساڈھورہ پہنچ گیا تھا۔ ستمبر کے آغاز میں ساڈھورہ سے ایک میل کے فاصلے پر مسلمانوں کی دو بستیوں اودھم گڈھ اور نواں شہر پر حملے ہوئے۔ اودھم گڈھ کے مسلمانوں نے سکھوں کا پہلا حملہ پسپا کر دیا اور ان کے چھ آدمی مار ڈالے۔ اگلے روز سکھوں نے زیادہ جمعیت کے ساتھ حملہ کیا اور مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ وہاں میرے ماموں بھی تھے جنہوں نے سر پر کلہاڑی

کا زخم کھایا اور گر پڑے۔ ہوش آنے پر وہ پاس کے کھیت میں جا چھپے۔ انہوں نے دیکھا کہ سکھوں نے مسلمانوں کا قتل عام کرنے کے بعد گاؤں کو تسلی سے لوٹا۔ اور پھر نذر آتش کر دیا۔ اس گاؤں سے صرف ایک مسلمان چھپ چھپا کر بھاگنے اور جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ اگلے دن چھوٹا ماروہ اور بڑا ماروہ کے گاؤں تاراج کئے گئے۔ سکھوں کے جتھے اس علاقہ کے مجسٹریٹ چونی لال کوشک اور تھانیدار کیسر سنگھ کے زیر ہدایت کام کر رہے تھے۔ ساڈھورہ کا قصبہ حملے سے محفوظ رہا۔ ۲۱ ستمبر کو مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ مسلمان اگلے دن ساڈھورہ سے نکلنے اور پیدل چلنے کے لئے تیار ہو جائیں انہیں صرف اپنے ساتھ ایک ایک بستر اور ایک ایک ٹرنک لے جانے کی اجازت ہوگی۔ ساڈھورہ کے مسلمانوں نے یہ حکم سن کر اپنا تمام مال لٹا دیا۔ اگلے دن بارشیں ہونے لگیں۔ اس لئے روانگی ملتوی کر دی گئی۔ پھر ۱۳ اکتوبر کو دوسرا اعلان ہوا۔

ساڈھورہ میں پناہ گزینوں کا کیمپ بننے کی داستان یہ ہے کہ جب ضلع انبالہ کی دو تحصیلوں کھرڑ اور روپڑ میں مسلمان بے دردی سے قتل کر دیئے گئے تو بقیۃ السلف میں سے کچھ تو کُرالی کیمپ میں جمع ہو گئے اور کچھ تحصیل نرائن گڈھ میں بھاگ آئے۔ پھر تحصیل نرائن گڈھ میں بھی مسلمانوں کے دیہات پر حملے ہونے لگے وہاں راجپوتوں کے دو گاؤوں کوٹ بلا اور جور یوالہ کے مسلمانوں نے حملہ آوروں کا شدید مقابلہ کیا اور انہیں کافی نقصان پہنچا کر پسپا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ملٹری نے آ کر مسلمانوں پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ بہت سے مسلمان شہید کر دیئے اور کچھ گرفتار کر لئے۔ جب ضلع انبالہ میں اس قسم کے حملوں کے باعث ہر طرف دہشت پھیل گئی تو تحصیلداروں، ذیلداروں اور دوسرے سرکاری کارکنوں سے اعلان کرا دیا گیا کہ مسلمان فلاں تاریخ کو مارچ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس طرح کوٹ بلا اور جھور یوالہ میں کوئی پندرہ بیس ہزار مسلمان جمع ہو گئے اس قافلہ کو پیدل چلا کر ملٹری کی ایک گارڈ نے کالے انب (کالے آم) تک پہنچایا۔ یہ مقام ریاست سرمور ناہن کی ایک چوکی تھا۔ ملٹری گارڈ یہ کہہ کر اس کی ڈیوٹی یہیں تک تھی رخصت ہو گئی۔ اس کی جگہ جاٹ ملٹری کی دوسری گارڈ آ گئی۔ اس گارڈ نے صبح پانچ بجے حکم دیا کہ مسلمان پانی وغیرہ پینا ہو تو پی لیں اور چلنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ چلتے

وقت مسلمانوں سے لاٹھیاں، چھڑیاں اور سونٹیاں تک چھین لی گئیں اور کہا گیا کہ مضبوط اور جوان جوان اشخاص قافلے کے دونوں طرف رہیں۔ پندرہ بیس ہزار مسلمانوں کا یہ قافلہ جس میں نو سو کے قریب بیل گاڑیاں تھیں چھ میل میں پھیلا ہوا تھا۔ جب یہ قافلہ اصغر پور کے قریب دریائے مارکنڈہ کو عبور کر رہا تھا تو اس پر سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جم نے ہلہ بول دیا۔ قافلہ والوں نے حملہ آوروں کو پتھر مار کر بھگا دیا اور انہی کے ہاتھوں سے تلواریں چھین چھین کر انہیں واصل بہ جہنم کیا۔ جاٹ ملٹری حملہ آوروں کا تعاقب کرنے کے بہانے سے کھیتوں میں جا کر چھپ گئی اور پوزیشن لے کر قافلے پر گولیاں برسانے لگی۔ مشین گنوں اور برین گنوں کے منہ کھول دیئے فائرنگ کی آوازیں ساڈھورہ میں سنائی دے رہی تھی۔ صبح سات بجے سے شام تین بجے تک اندھا دھند گولیاں چلتی رہیں۔ اندازہ ہے کہ اس قتل عام میں چار ہزار سے لے کر چھ ہزار تک مسلمان مارے گئے۔ تین سو سے زیادہ عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ پانچ سو کے قریب مسلمان بھاگ کر ساڈھورہ پہنچے جن میں اکثر زخمی تھے۔ قافلے کا پچھلا حصہ واپس لوٹ کر کالا آم چلا گیا۔ ساڈھورہ کے مسلمانوں نے ان تباہ حال بھائیوں کی بہت خدمت کی۔ پانچ چھ ہزار مسلمان کالے آم کو واپس چلے گئے تھے۔ جو ایک ہفتہ وہاں رہے اتنے دن انہیں کھانا تک میسر نہ آ سکا۔ اور لوگ پنواڑ گھاس کھا کھا کر بسر اوقات کرتے رہے۔ ان کو ایک خاص کُنڈ سے پانی پینے کی اجازت تھی اس پانی میں زہر ملا دیا گیا۔ اور لوگ پیچش اور اسہال کے امراض میں مبتلا ہونے لگے۔ ایک ہفتہ بعد ان سب کو ساڈھورہ لایا گیا وہاں ان کے امراض نے ہیضہ کی صورت اختیار کر لی ایک ماہ کے عرصہ میں کوئی دس ہزار مسلمان اس وبا سے لقمۂ اجل ہو گئے۔ ان حالات میں کمزور ایمان کے مسلمان ہندو بن کر اپنی جانیں بچاتے رہے بعض جگہ تو گاؤں کے گاؤں ہندو بنا لئے گئے۔ اور دیگر دیہات کے مسلمان کیمپوں میں جمع ہوتے گئے۔ ساڈھورہ کے کیمپ میں پچاس ہزار سے زیادہ اجتماع ہو گیا۔ ساڈھورہ کیمپ میں راشن کی سخت قلت محسوس ہونے لگی تو میں نے چندہ جمع کر کے ۴۵ روپے کے برقی پیغامات مقامی ڈپٹی کمشنر، مشرقی اور مغربی پنجاب کے وزرا اور حکام حتیٰ کہ قائداعظم تک ارسال کئے۔ پاکستان گورنمنٹ کی طرف سے آٹے کی ایک سو ساٹھ بوریاں آئیں۔ اس کے بعد

پاکستان نے دوسو بوریاں پھر بھیجیں۔ساڈھورہ کیمپ میں جتنا عرصہ گورکھا رجمنٹ حفاظت کے لئے متعین رہی کیمپ میں امن رہا لیکن جب جاٹ رجمنٹ کا پہرہ بدلا تو انہوں نے مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم وستم شروع کر دیئے۔گھروں میں گھس کر عورتوں کو زدوکوب کیا اور ان کی بے حرمتی کی گئی۔ان کا قیمتی سامان لوٹ لیا گیا۔جب کچھ گھوسیوں نے مقابلہ کیا تو جاٹ ملٹری نے فائرنگ کر کے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ساڈھورہ کیمپ سے مسلمان پناہ گزین اسپیشل گاڑیوں میں سوار کر کے پاکستان لائے گئے۔آخری اسپیشل ۲۸ نومبر کو چلی۔اس سے تین دن پہلے جاٹ رجمنٹ کا پہرہ بدلا تھا۔

جناب محمد موسیٰ صاحب رقم طراز ہیں:

جگادھری کا ریلوے اسٹیشن عبداللہ پور میں لائن پر جگادھری سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جہاں کئی قسم کی ملیں اور کارخانے ہیں۔اس شہر کے ہندو کارخانہ داروں نے خفیہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کے منصوبے باندھے اور سکھ حملہ آوروں کو اپنی ملوں میں جمع کر لیا۔مسلمان بے خبر تھے۔۱۸ اگست کو عیدالفطر کے دن دوپہر کے بعد مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے اور عبداللہ پور میں کہرام مچ گیا۔ جہاں کوئی مسلمان نظر آیا قتل کر دیا گیا۔مسلمانوں نے ایک بڑی مسجد ایک لاکھ روپیہ کے صرف سے تیار کرائی تھی۔وہ ابھی زیر تعمیر تھی کہ اسے آگ لگا دی گئی۔چالیس کے قریب مسلمان اس مسجد میں جمع تھے سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔ جگادھری اور عبداللہ پور کے درمیان لائٹ ریلوے چلتی ہے جب اس کی ٹرین عبداللہ پور پہنچی تو اس کے تمام مسلمان مسافر قتل کر دیئے گئے۔ جو ٹرین سہارن پور یا انبالہ چھاؤنی سے آئی تھی اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔رات کے نو بجے تک یہ قتل عام جاری رہا۔۲۵ اگست کو حسن پور پر حملہ ہوا۔۳۱ اگست کو شیخوپورہ کو تاراج کیا گیا۔۵ ستمبر کو ہشیری میں بیکھا رارا جپوت کے مکان کو نذر آتش کر دیا گیا وہ اکیلا تین کپڑوں میں نکل کر گدھولہ گیا لیکن وہاں شہید کر دیا گیا۔جگادھری میں ۶ ستمبر کو ہلڑ مچا۔ اور کوئی پچاسی آدمی شہید کر دیئے گئے۔ اور مسلمان محلّہ مُغل لوہاراں میں جمع ہونے لگے۔ مسلمانوں کے دوسرے محلے لوٹ کر نذر آتش کر دیئے گئے۔محلّہ مغل لوہاراں میں میاں محمد موسیٰ

سابق سب انسپکٹر پولیس نے پناہ گیروں کا اچھا انتظام کیا۔لیکن خوردنوش کی اشیاء کی بڑی تنگی رہی۔ ڈھائی ماہ تک یہ کیمپ لگا رہا۔۲۳ ستمبر کو محلاں دال پر حملہ کیا گیا۔وہاں کے مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور تین دفعہ حملہ آوروں کو بھگا کر گاؤں سے نکالا۔مسلمان صرف چار شہید ہوئے۔حملہ آوروں کے بیس آدمی مارے گئے۔اگلے دن ملٹری نے آ کر مسلمانوں سے نیزے اور گنڈاسے چھین لئے۔ لوگ بددل ہو کر گاؤں سے نکل گئے صرف سو کے قریب مسلمان باقی رہ گئے۔ملٹری نے حملہ آوروں کو بلا کر ان میں سے اکثر کو قتل کرا دیا۔حملہ آور ۲۳ نوجوان عورتیں لے گئے۔مغل لوہاراں کے محلّہ میں مسلمانوں نے تین ہسپتال کھلوائے جہاں زخمی رکھے جاتے تھے۔مسلمان ڈاکٹر اور کمپاؤڈر رضا کارانہ خدمات انجام دیتے رہے۔جگادھری کے محلّہ مغل لوہاراں پر جہاں پناگزیں جمع ہو رہے تھے دو تین دفعہ بم پھینکے گئے۔لوٹ کھسوٹ میں حکام بھی شامل تھے۔اور غالب حصہ لیتے رہے۔بعض دیہات کے مسلمانوں نے ہندو بن کر جانیں بچانے کی کوشش کی لیکن ان میں سے جو متمول تھے قتل کر دیئے گئے اور ان کے گھر لوٹ لئے گئے۔قاہر پور کے مسلمان ہندو بن گئے تھے۔لیکن اس کے قریب گاؤں منڈاولی کے مسلمانوں نے مقابلہ کر کے ہندو اور سکھ حملہ آوروں کو بھگا دیا۔اگلے روز ملٹری نے آ کر منڈاولی کے بیس مسلمان مار دیئے کئی عورتوں نے کنوؤں میں گر کر جانیں دے دیں۔تحصیل جگادھری میں صرف ناصر پور کھارون، مصطفیٰ آباد اور بلاسپور کے قصبے حملے سے محفوظ رہے۔ باقی سب تاراج کر دیئے گئے۔سنا ہے کہ نارائن گڈھ اور روپڑ کی تحصیلوں میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔روپڑ میں تو مسلمانوں کی ایک چوتھائی آبادی بمشکل بچی ہوگی۔ روپڑ کے مسلمان پاکستان کی طرف لے جانے کے بہانے سے ریلوے ٹرین میں بٹھا لئے گئے لیکن سرہند اسٹیشن پر ریاست پٹیالہ کی فوجوں نے سب کو ٹھکانے لگا دیا۔

سید ناصر علی زیدی لکھتے ہیں:

بھریلی سادات تحصیل کھرڑ ضلع انبالہ کے مسلمانوں کو وہاں کا سکھ رئیس اعظم آنریری مجسٹریٹ تسلیاں دیتا رہا کہ تمہاری حفاظت کے لئے ملٹری بلائی گئی ہے۔۱۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ملٹری کا دستہ جو پچپن افراد پر مشتمل تھا ٹرکوں میں سوار ہو کر وہاں پہنچا۔اس ملٹری نے آنریری مجسٹریٹ

کے قلعہ کی جانب سے بھریلی پر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ فائرنگ آٹھ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک جاری رہی۔ اور کوئی ڈھائی ہزار مسلمان دن بھر میں شہید ہو گئے۔ مسلمان مرد عورتیں اور بچے فائرنگ سے ڈر کر عزاخانوں میں جمع ہونے لگے وہاں بھی ان پر گولیاں چلائی گئیں اور سب کو نکال کر اکٹھا کیا۔ ہندو اور سکھ دیہاتی گھروں اور مکانوں کو لوٹنے لگے۔ جب وہ لوٹنے سے فارغ ہو گئے تو شام کے وقت گھروں کو جانے کی اجازت ملی۔ مسلمانوں کے جوان جوان افراد کو قلعہ میں لے گئے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے عزاخانوں میں بیٹھ کر رات بھر بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کرتے رہے اگلے دن صبح کے وقت دیہاتی بلوائیوں نے پھر ہلہ بول دیا۔ اس لئے آٹھ بجے صبح ڈیرہ بسی واقعہ ریاست کلسیہ تک پاپیادہ جانے کا حکم ملا جو بھریلی سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں ملٹری والوں نے عورتوں کو بے نقاب کیا۔ سکھ تین چار لڑکیاں اٹھالے گئے۔ آہستہ چلنے پر برچھے لگائے جاتے تھے۔ اس قافلہ کو ڈیرہ بسی سے دو میل کے فاصلے پر مبارک پور میں اتارا گیا۔ دو تین دن اس گاؤں میں بسر کئے۔ اس کے بعد اس قریہ سے نکال کر باہر ایک کیمپ لگا دیا گیا۔ ہر تیسرے دن ڈھائی چھٹا نک آرد گندم فی کس ملتا تھا۔ رفع حاجت کے لئے صبح ۶ بجے سے ۸ بجے تک اور شام کو چار بجے سے چھ بجے تک کا وقت مقرر تھا۔

اٹھارہ روز کے بعد حکم ملا کہ پیدل قافلے کی شکل میں انبالہ چلو جو وہاں سے اٹھارہ میل دور تھا۔ راستے میں قافلے کے کئی افراد شہید کر دیئے گئے اور چار لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ رات کے ۸ بجے انبالہ شہر کے کیمپ میں پہنچے۔ اس کیمپ میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی اور روزانہ دس بیس موتیں واقع ہونے لگیں۔ آخر جب پاکستان گورنمنٹ نے اسپیشل گاڑیاں چلانے کا بندوبست کیا تو ہم بھی ماہ نومبر میں لاہور آ گئے۔ (۵۸)

کرنال

تھانیسر ضلع کرنال کی ایک مہاجرہ اکرام بیگم صاحبہ بیان کرتی ہیں:

میں تھانیسر سے اپنے منجھلے بھائی کرم احمد کی معیت میں ایک گاؤں لاڈوہ کی طرف روانہ ہوئی وہاں میری خالہ رہتی تھی۔ راستے میں سنا کہ سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے کئی گاؤں جلا دیئے ہیں اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا ہے۔ ہمارے دل میں خوف سا پیدا ہوا لیکن ہم چلتے گئے۔ جب ہم لاڈوہ پہنچے تو دیکھا کہ گاؤں اجڑ چکا ہے۔ گلیوں اور کوچوں میں خون جما ہوا ہے۔ جابجا لاشیں پڑی ہیں۔ کہیں کہیں انسانی جسم کے کٹے ہوئے اعضاء جدا جدا پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ زخمی سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں۔ یہ خونیں منظر دیکھ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ خالہ کے گھر پہنچے تو گھر کو اجڑا ہوا پایا۔ سامان سب لٹ چکا تھا۔ ایک کوٹھڑی میں ہمیں کوئی چیز پڑی نظر آئی۔ ادھر جا کر دیکھا کہ خالہ اور گھر کے سب مرد و زن اسی کوٹھڑی میں جمع کر کے شہید کئے ہوئے پڑے ہیں۔ یہ زہرہ گداز منظر دیکھ کر ہم کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ تھانیسر کو واپس لوٹے راستے میں غنڈوں کے نعرے سنائی دیتے تھے لیکن ہم چھپ چھپا کر تھانیسر پہنچ گئے۔ ابھی ہم گھر جا کر بیٹھے ہی تھے کہ غل مچا ''غنڈے آ گئے۔'' لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگے ہم تھانیسر سے باہر نکلے ہی تھے کہ غنڈوں نے ہم پر حملہ کر دیا میرے دونوں بھائی، ساس، خسر، خاوند، چچا، اور ایک بہن آن کی آن میں شہید ہو گئے میں اپنی دو بچیوں کو لے کر سرکنڈوں میں چھپ گئی اور فصلوں کی اوٹ میں دور نکل گئی۔ تین ماہ پاپیادہ چلنے کے بعد پاکستان پہنچی۔ (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)

کوٹ سیداں تحصیل کرنال (پانی پات) کی ایک سید زادی زاہدہ خاتون بیان کرتی ہے:

ستمبر کے پہلے ہفتے ہمارے گاؤں پر سکھوں اور جاٹوں نے فوج کی مدد سے دھاوا بول دیا۔ ہمارے آدمی اس وقت کاروبار میں لگے ہوئے تھے کہ گولیوں کی تڑاق پڑاق اور غنڈوں کے فلک شگاف نعروں نے ہم پر کپکپی طاری کر دی۔ گھروں میں اس وقت زیادہ تر عورتیں ہی موجود

تھیں۔ وہ ڈر سہم کر مکانوں میں بند ہوگئیں اور اپنے آدمیوں کو کسی طرح غنڈوں کی آمد کی خبر کردی۔ لیکن یہ درندے اتنے میں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ضعیف العمر اور کمزور مستورات کو تو آتے ہی شہید کردیا لیکن جوان ونوعمر لڑکیاں ایک مکان میں اکٹھی کرکے بند کردیں۔ جو بھاگتی ہوئی قابو نہ آئی اس کو سپاہیوں نے گولی کا نشانہ بنایا میں بچ کر قریب کے کھیت میں باجرہ کی آڑ لے کر چھپ گئی۔ اور کانپتی لرزتی یہ خونیں منظر دیکھتی رہی۔ عورتوں کی طرف سے فارغ ہوکر یہ ظالم مردوں کو ڈھونڈنے لگے۔ جو آدمی ملتا اسے وہیں ڈھیر کردیا جاتا۔ فائر اور غل سن کر ہمارے باہر کے آدمی بھی گاؤں میں آئے۔ لیکن آتے ہی ان کی بڑی تعداد ذبح ہوگئی۔ جو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے وہ کرنال کے ''ریلیف کیمپ'' کو روانہ ہوئے۔ میں بھی موقعہ پاکر ان کے ساتھ ہولی۔ تین روز کے بعد ہم گرتے پڑتے اس کیمپ میں پہنچے۔

مہاجرہ نے بتایا۔ ہم نے سن رکھا تا کہ جو لوگ ''کیمپ'' میں پہنچ جاتے ہیں وہ خطرہ سے دور ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس دیکھا۔ کیمپ کے اردگرد دور تک لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ زمین خون شہیدوں سے لالہ زار بنی تھی۔ کتے، چیلیں، گِدھیں اور کوے نعشوں کو نوچنے گھسیٹنے میں مصروف تھے۔ یہ کیمپ دوزخ کا ایک نمونہ تھا۔ ''محافظ دستے'' جو وہاں مقرر تھے۔ مظلوموں کو ذرا ذرا سی بات پر گولی مار دیتے تھے۔ یہ باتیں کوئی خلاف قانون نہیں تھی۔ جس نے پانی مانگا کھانا طلب کیا، یا بول وبراز کے لئے اجازت چاہی اس پر جھٹ فائر کردیا۔ چھ روز تک ہم پر آب ودانہ بند رہا۔ اس کے بعد ایک چھٹانک فی کس کے حساب سے آٹا ملا۔ لیکن نہایت بدبودار۔ جس نے کھایا وہ تڑپا دینے والے درد قولنج میں مبتلا ہوگیا۔ بعض کو اسہال، قے اور پیچش ہوگئی۔ سینکڑوں مرد وزن یہ آٹا کھا کر چل بسے۔ بچے تو اس کی روٹیوں سے بہت جلد ہلاک ہوجاتے تھے۔ آٹے کے بعد پانی کی باری آئی۔ نل پر جانے کی تو کسی کو اجازت نہ تھی۔ البتہ ایک جگہ پانی کی ٹینکی لگادی گئی۔ لیکن جس نے اسے پیاس کی زبان کاٹا ہوگئی۔ حلق سوکھ گیا۔ اور خناق کی طرح گلا گھٹنے لگا۔ اس میں کسی زہر کی آمیزش تھی۔ اور یہ پانی پی

کر بھی کئی نیم جان موت کے آغوش میں چلے گئے۔ خاتون موصوفہ نے بیان کیا۔ کہ ۳۳ روز ہم اس کیمپ میں ظالموں کی سختیاں سہتے رہے۔ آخر ایک روز ہمیں تخلیہ کا حکم ملا۔ حالانکہ کرنال ریلوے اسٹیشن ہمارے کیمپ سے دوفرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ لیکن ہمیں بیسیوں میل پیدل چلا کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر لایا گیا۔ راستے میں غنڈوں نے کئی مرتبہ حملے کئے۔ فوجی گارڈز کے روبرو عورتوں کی بے حرمتی کی۔ قتل عام ہوا۔ مال اسباب لوٹا۔ بچوں کو مارا لیکن ''محافظ سپاہی'' ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ گاڑی میں سوار ہوئے۔ تو غنڈوں نے کئی بار ٹرین پر حملے کئے۔ جب ہماری گاڑی لاہور پہنچی تو اس کے تمام کمرے خون آلود تھے۔ غنڈے جس قدر آدمی گاڑی میں شہید کرتے تھے سپاہی ان کی نعشیں باہر پھینک دیتے تھے۔ (یہ مہاجرہ بھرے گھر کی مالک تھی۔ اس کا کنبہ ۱۱۳ افراد پر مشتمل تھا۔ لیکن اس کا بیان ہے کہ صرف وہی زندہ بچ کر یہاں آئی ہے۔ باقی تمام مرد وزن، طفل وپیر کچھ گاؤں میں کچھ راستے میں شہید ہوگئے۔ اناللہ!) (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)

گورنمنٹ کیٹل فارم حصار میں محمد شرف الدین نام کے ایک صاحب اس کی تجربہ گاہ (Laboratory) میں اچھے عہدے پر ملازم تھے اور حصار ہی کے رہنے والے تھے۔ یہ صاحب آج کل گوجرانوالہ سبزی منڈی میں اپنے ہم زلف کے ہاں مقیم ہیں۔ آپ نے بتایا:

جب حصار کے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جانے لگا۔ تو حیوان خانہ حصار کے انسان نما درندہ صفت افسروں نے مسلم ملازمین سے کہا کہ شہر اور مضافات میں فساد برپا ہے۔ اس لئے تمام مسلمان فارم سے باہر قدم نہ رکھیں۔ اگر وہ سرکاری وارڈ کے اندر رہیں گے تو کوئی ان کا بال بھی بیکا نہ کرسکے گا۔ یہ تمام افسر ہندو اور سکھ تھے۔ صرف تین افسر مسلمان تھے لیکن وہ بے اختیار تھے۔ مسلمان ملازم جو اہل وعیال سمیت کیٹل فارم میں رہتے تھے۔ غیر مسلم افسروں کے جھانسے میں آگئے۔ لیکن اس ''طمانیت بخش اعلان'' کے دوسرے ہی دن یہ افسر صاف آنکھیں بدل گئے اور کہنے لگے کہ ہم بے بس ہیں۔ تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے۔ سنا ہے شہری غنڈے فارم پر حملہ کرنے کو ہیں۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ اور چھپ چھپا کر کسی ریلیف کیمپ میں پہنچ

جاؤ۔ یہ جابرانہ حکم سنتے ہی ہمارے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اور ہم ساٹھ ستر مسلم ملازمین عورتوں اور بچوں کو لے کر چل پڑے۔ ابھی ہم نے فارم کا پھاٹک عبور نہیں کیا تھا کہ ان ہی افسروں نے ہم پر گولی چلادی جس سے کچھ آدمی زخمی ہوئے۔ گولی کی آواز سنتے ہی مسلح غنڈوں کا ایک گروہ، جو کہیں قریب ہی چھپکے بیٹھا تھا ہم پر ٹوٹ پڑا۔ اور آن کی آن میں دو چار کے سوا تمام مسلمان اور ان کے بچے شہید کر دیئے گئے۔ عورتیں اٹھالی گئیں۔ ضعیف و ناتواں عورتوں کو مردوں کے ساتھ ہی ذبح کر دیا گیا۔ ہم صرف پانچ آدمی بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ باجرہ اور جوار کے کھیتوں میں چھپ چھپا کر کئی روز بعد مشرقی پنجاب کی سرحد پار کی۔

مسٹر محمد شرف الدین نے بتایا کہ سکھ درندے معصوم بچوں کو نہایت بے دردی سے ہلاک کرتے تھے۔ چنانچہ بعض بچوں کو گلا گھونٹ کر مارا گیا۔ کئی بچے اس طرح شہید کئے گئے کہ سکھ غنڈے بچے کی ایک ٹانگ پاؤں میں دبا کر دوسری ٹانگ زور سے کھینچتے اور ننھے معصوم کے دو ٹکڑے کر دیتے۔ ہم نے بہت سے بچے اسی طرح شہید ہوتے دیکھے۔ ایک مقام پر سات بچے مرے ہوئے دیکھے تو ہم نے نزدیک جا کر ملاحظہ کیا معلوم ہوا کہ پہلے ان کے نازک جسموں کو کسی اوزار سے جابجا چھیدا گیا ہے اس کے بعد تڑپا تڑپا کر مار ڈالا ہے۔

(مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)(۵۹)

ہانسی ضلع حصار

ہانسی ضلع حصار کے زمیندار مہاجر مسمی اللہ بخش نے بیان کیا:

ایک روز ہم کھیتی باڑی میں لگے ہوئے تھے کہ گاؤں کا چوکیدار ہانپتا کانپتا آیا اور تھرتھراتی زبان سے کہا۔ چوہدی! غضب ہوگیا ملٹری کے پانچ سکھ سپاہی آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمان گاؤں خالی کر دیں ورنہ گولی ماردی جائیگی۔ چوکیدار اتنا کہنے ہی پایا تھا کہ یکے بعد دیگرے آٹھ دس فائر ہوئے۔ گولیوں کی آواز سنتے ہی ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ خوف و ہراس طاری ہوگیا۔ ہم نے چاہا کہ کھیتوں میں چھپ جائیں۔ لیکن دو آدمی نہایت تیزی سے ہماری طرف بھاگے چلے آرہے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہم اور بھی خوفزدہ ہوئے۔ جب وہ ہمارے قریب پہنچے تو آتے ہی کہا۔ چلو بھائی سپاہی تمہیں بلاتے ہیں۔ جب ہم گاؤں میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چوک میں پندرہ بیس لاشیں پڑی ہیں بہت سے معصوم بچے سنگینوں سے ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔ گاؤں کی نوجوان عورتیں نیم برہنگی میں سپاہیوں کے پنجۂ استبداد میں ہیں اور گاؤں کا نمبردار سر بازار پٹ رہا ہے۔ ہم نے یہ دردناک منظر دیکھا تو اپنے گھروں میں گئے ضروری سامان باندھا اور چوک میں لا رکھا۔ سپاہیوں نے گاؤں کے تمام مسلم مرد و زن جو آٹھ سو کے قریب تھے۔ مویشیوں کی طرح ہانک لئے۔ ہم گاؤں سے تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ غنڈوں کے ایک مسلح گروہ نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ نوجوان عورتیں الگ کرلیں۔ اور باقی مردوں عورتوں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ زمیندار مذکور نے بتایا کہ کیمپ تک پہنچتے ہماری تعداد اتنی رہ گئی کہ آسانی سے انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ ہمارے گاؤں کے آٹھ سو افراد میں سے صرف ۴۲ آدمی صحیح سلامت پاکستان پہنچے۔ (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)(۶۰)

گوہانہ ضلع رہتک

گوہانہ ضلع رہتک کے ایک صاحب بابو محمد امین جو رہتک میں ریلوے کلرک تھے۔ ۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو بڑے مصائب و آلام سہنے اور گھر بار تباہ کرانے کے بعد لاہور آئے ہیں۔ اپنی داستان غم یوں بیان کرتے ہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو مجھے گوہانہ سے خط موصول ہوا کہ تمہارا نوجوان بھائی کئی روز سے مفقود الخبر ہے۔ اس کا پتہ لگانے کے لئے فوراً گھر آؤ۔ یہ خط پڑھتے ہی میں نے دو ہفتہ کی چھٹی لی اور گھر پہنچا۔ بھائی کی تلاش میں ادھر اُدھر چکر لگائے آخر ایک کنویں میں اس کی لاش ملی۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے چھوچھک داس گیا ہوا تھا کہ غنڈوں نے اسے قتل کر دیا۔ بھائی کو چھوچھک داس ہی میں دفن کر کے گوہانہ میں واپس آیا تو دو قصبات کنواہ اور مائن ہیل کی نسبت اطلاع ملی کہ وہ بالکل برباد ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا ہے۔ عورتیں اٹھالی گئیں ہیں۔ اور کنواہ کے بعض مسلمان مکانوں ہی میں جلا دیئے ہیں۔ گویا رُہتک میں ہر جگہ فساد شروع ہو گیا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ارادہ کیا کہ رخصت گزار کر تمام کنبہ رُہتک لے جاؤں گا۔ اس لئے کہ وہ ایک بڑا شہر ہے ضلع کے تمام ذمہ دار افسر وہیں ہیں۔ پولیس کا انتظام ہے وہاں خطرہ کم ہوگا لیکن میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔

۱۲ اگست کی صبح کو پولیس کے چار نامسلم سپاہی رہتک سے گوہانہ میں آئے اور کہنے لگے ''لوگو ہمارے علاقہ میں فرقہ ورانہ فساد رونما ہے۔ شرارت پسند آدمی ہر جگہ جھگڑے پیدا کر رہے ہیں۔ ان فتنہ گروں میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی ہیں اور سکھ بھی ہیں۔ ہمیں افسران ضلع نے اس لئے بھیجا ہے کہ سب لوگ اتفاق سے رہو آپس میں کسی قسم کا فساد نہ کرو۔ جو فساد کرے گا گولی سے اڑا دیا جائے گا اور اس کے خاندان پر بھاری جرمانے کئے جائیں گے۔ پولیس کانسٹیبلوں کی یہ ہدایات بظاہر بہت خوبصورت تھیں اور باعث اطمینان تھیں۔ لیکن دوپہر کو میں نے دیکھا کہ ''امن وسلامتی'' کے یہی اجارہ دار سپاہی ایک وسیع احاطہ میں گوہانہ کے نامسلموں کو جمع کئے بیٹھے ہیں۔ اور مسلمانوں کی ہلاکت کے لئے انہیں اشتعال دے رہے ہیں۔ ایک سپاہی ہندوؤں اور سکھوں

سے کہہ رہا ہے ''بھائیو تم کوئی فکر نہ کرو، پولیس ملٹری تمہارے ساتھ ہے اور مُسلوں (مسلمانوں) کو تباہ کرنے کے لئے تمہیں ہر قسم کی مدد دینے کے لئے تیار ہے''۔

یہ الفاظ سن کر مجھے سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ اور سچ پوچھیئے تو خوف سے میری ٹانگیں تھرتھرانے لگ گئیں۔ میں اسی حالت میں گھر گیا۔ بدن پر کپکپی طاری تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کانپتی ہوئی زبان سے کہا اب گوہانہ کے مسلمان کسی صورت نہیں بچ سکتے۔ پھر بیوی اور والدہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ اور کہا جس قدر جلد ممکن ہو ضروری اشیاء باندھ لو۔ میں شام کو سواری کا انتظام کرتا ہوں۔ اور اللہ کا نام لے کر ہم صبح سویرے یہاں سے نکل چلیں۔ والدہ بیوی اور لڑکیاں میری ڈانٹ سن کر ضروری سامان باندھنے میں لگ گئیں۔ میں نے چار تانگوں اور کچھ گھوڑوں کا انتظام کیا۔ تاکہ ہم صبح روانہ ہو جائیں۔ رات کے بارہ بجے تھے کہ گوہانہ کے شمال اور مشرق میں کچھ چیخیں سنائی دیں پھر مغرب سے بھی چلانے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد گلی گوچوں میں آدمی دوڑتے بھاگتے معلوم ہوئے۔ میں نے باہر نکل کر لوگوں سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ گوہانہ اور گردونواح کے سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہے گوہانہ کو تین طرف سے گھیر لیا ہے۔ فلاں فلاں محلے میں بہت سے مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ کئی مکان نذر آتش ہو چکے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ میں اپنی گلی میں مڑا ہی تھا کہ تین گرانڈیل آدمی مجھے مکان میں داخل ہوتے نظر آئے۔ اور میرے پہنچنے سے پیشتر انہوں نے ہمارے چار بچے اور دو لڑکیاں ذبح کر ڈالیں۔ مجھے دیکھ کر ایک غنڈہ میری طرف جھپٹا۔ میں نے لپک کر اس کا نیزہ چھین لیا۔ لیکن دوسرے بدمعاش نے بڑھ کر مجھ پر برچھی سے وار کیا۔ جو میرے بازو کو زخمی کر گیا۔ تیسرے خوں خوار نے میری والدہ اور بیوی کا کام تمام کر دیا۔ چونکہ میں زخم کھا کر گر پڑا تھا اس لئے یہ تینوں بھیڑیئے مجھے چھوڑ کر مکان کے اندر داخل ہو گئے اور مال واسباب لوٹنے لگے۔ گھر کے تمام زن واطفال شہادت پا چکے تھے۔ میں زخم کے درد سے الگ تڑپ رہا تھا۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں رینگتا سرکتا پھر باہر نکلا۔ دیکھا کہ گلیاں لاشوں سے اٹی پڑی ہیں۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اس دلدوز نظارے سے میں پھر بیہوش ہو گیا۔

لیکن ہمارے محلے کے ایک بزرگ نے مجھے گرتا دیکھ کر دوڑ کر میرا بازو تھاما اور کھینچتا گھسیٹتا مجھے مکّی کے کھیت میں لے گیا۔ میرے زخم پر پٹی باندھی۔ منہ پر پانی ڈالا، چہرے پر چھینٹے دیئے اور اس طرح مجھے ہوش میں لا کر کہا: امین میں بھی گھر بار لٹا کر نکلا ہوں۔ اب اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ ہم پاکستان کی طرف منہ کریں۔ اور پیدل چل کر وہاں پہنچ جائیں۔ اگر کسی کیمپ کا رخ کریں گے تو اور بھی مصیبت اٹھائیں گے۔ یہ کہہ کر اس بزرگ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور اس طرح ہم گردش ایام کی سختیاں سہتے ایک ماہ گیارہ روز پا پیادہ چل کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

(مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)

جناب ندیم نظامی صاحب رقم طراز ہیں:

اکبر پور بارو تحصیل سونی پت ضلع رہتک دوسو گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں مغل اور پٹھان آباد تھے۔ ۱۲ ستمبر کو ہندو جاٹوں نے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر اس گاؤں پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے توپوں، رائفلوں اور بندوقوں سے مقابلہ کیا اور جاٹوں کو مار بھگایا۔ سینکڑوں ہندو ہلاک کر دیئے۔ اگلے دن بے شمار ہندو جاٹ اور سکھ فوج اور پولیس کے دستے ساتھ لے کر حملہ آور ہوئے۔ گاؤں والوں نے مقابلہ کیا شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ خان محمد خاں نمبردار ولد کمال خان پٹھان نے عدیم المثال دلیری دکھائی۔ اور سینکڑوں ہندوؤں اور فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس روز بھی جاٹ ناکام ہو کر واپس لوٹے۔ تیسرے دن ایک جم غفیر گاؤں پر حملہ آور ہوا۔ اور مقابلہ ہونے لگا۔ مسلمانوں کے پاس گولہ بارود اور گولیاں ختم ہو گئیں۔ جب کوئی چارۂ کار نہ دکھائی دیا تو عورتیں عصمت بچانے کے لئے کنوؤں میں ڈوب گئیں دو کنوئیں بھر گئے پھر بھی بہت سی عورتیں رہ گئیں جن میں سے جوان جوان عورتوں کو جاٹ پکڑ کر لے گئے۔ باقی بوڑھوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔ گھروں کو آگ لگا دی۔ مسجدوں کو جلا دیا۔ چند آدمیوں کے سوا کوئی مسلمان متنفس زندہ نہ چھوڑا۔ یہ ہے انقلاب زمانہ اور میرا مختصر فسانہ

یہی سر جو بار ہے دوش پر تھا کبھی یہ زانوئے یار پر (۶۱)

ریاست پٹیالہ

ریاست پٹیالہ کے جمعدار میجر عزت دین جو تباہ و برباد ہو کر نومبر کے وسط میں پاکستان آئے ہیں اور اب راجہ بازار راولپنڈی میں اقامت گزین ہیں۔ اپنے دردانگیز حالات یوں بتاتے ہیں۔

میں پٹیالہ فورس میں ۱۹۳۱ء کو بھرتی ہوا۔ دوسری عالمگیر جنگ میں میں اپنی یونٹ کا حوالدار تھا۔ چار سال سمندر پار رہا۔ جمعداری کا عہدہ وہیں ملا۔ پٹیالہ میں واپس آیا تو حکومت برطانیہ کی سفارش پر جمعدار میجر ہو گیا۔ اختتام جنگ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ پٹیالہ کا جابر حکمران اپنی فوج سے مسلمانوں کی نفری کم کرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ معمولی سی باتوں پر مسلم سپاہیوں کو فوجی قسم کی سزا دے کر فارغ کر دیا جاتا۔ اکثر مسلمانوں کو جن کی ملازمت کچھ لمبی ہو گئی تھی۔ قبل از وقت ریٹائر ہونے پر مجبور کیا جاتا اور انہیں پنشن بھی نہ دی جاتی۔ پٹیالہ کے غافل و بے خبر مسلمان ان باتوں کا احساس ضرور رکھتے تھے لیکن انہیں معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔ آخر ۱۹۴۶ء میں راجہ نے خفیہ احکام جاری کئے۔ کہ ہماری فوج سے اسّی فیصد مسلمان فوراً نکال کر ان کی جگہ سکھ بھرتی کئے جائیں۔ اور بیس فیصدی مسلم سپاہی محض دکھاوے کے طور پر رہنے دیئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دسمبر ۴۶ تک پٹیالہ ملٹری میں مسلمانوں کی تعداد اسی کیا نوے فیصدی کم کر دی گئی۔ مسلم افسران فوج کو خاص طور پر نکال دیا گیا۔ اور ان کی جگہ بدمعاش اور غنڈہ سکھوں نے پُر کر لی۔ یہ تھی ریاست کے مسلمانوں کو قتل و غارت کرنے کی بنیاد جس کو اگست ۱۹۴۷ء میں جامۂ عمل پہنایا گیا۔

سچ پوچھیئے تو ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کا کشت و خون اس وقت ہی جاری ہو گیا تھا۔ جب لاہور اور امرتسر کے سکھوں نے مارچ ۱۹۴۷ء میں فساد شروع کیا تھا۔ اسلامیان پٹیالہ کی ہلاکت و تباہی نہ صرف غنڈوں اور بدمعاشوں کے ذریعے ہوئی بلکہ بڑے بڑے افسروں وزیروں اور یوں کہئے کہ خود ظالم راجا کا اس میں بڑا ہاتھ تھا اور انہی کے اشارہ و ایماء پر یہ ستم رانیاں وجود میں لائی جاتی تھیں۔ ان خفیہ ریشہ دوانیوں اور پوشیدہ سازشوں کا بھانڈا ۱۵ اگست کے روزِ بد کو پھوٹا جب

کہ ہنوز دونوں ڈومینیں تقسیم کے جھولے میں لٹک رہی تھیں۔ اس روز پٹیالہ کی جابر حکومت کے حکام نے قتل مسلم کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ ریاست کے بدکرداروں اور سفاکوں کو کھلی چھٹی دیدی گئی۔ ریاست کے فوجی سپاہیوں نے سفید کپڑے پہن لئے۔ غنڈوں میں عظیم المقدار آتشیں اسلحہ اور دوسرے آلات حرب تقسیم کئے۔ افسروں نے پیٹھ ٹھونکی۔ وزیروں نے تھپکی دی۔ کوئی مبالغہ کی بات نہیں، حقیقت ہے کہ خود راجہ نے فتنہ گروں کی ہمت بڑھائی۔ فسادیوں سے مصافحہ کیا۔ لڑاکا سورماؤں کو انعام کے لالچ دیئے، شریروں، لُچوں اور غنڈوں کے لئے خزانہ کے منہ کھول دیئے۔ اور خون مسلم کی وہ ارزانی دیکھنے میں آئی جو تاریخ نے اب تک کسی بازار میں نہ دیکھی ہوگی۔

پانچ سے پندرہ اگست تک کس قدر مسلمان تہ تیغ ہوئے؟ حالات اس کے صحیح اعداد و شمار بتانے سے عاجز ہیں۔ سرسری اندازہ تیس ہزار کا ہے لیکن ہنوز روز اوّل تھا۔ پندرہ اگست کے بعد تو مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ جدھر نگاہ جاتی تھی لاشوں کے ڈھیر، اعضاء کے انبار نظر آتے تھے۔ خون اسلام نے زمین کو رنگین کر دیا۔ شہروں کی نالیاں لہو بہاتی تھیں۔ بدروؤں میں خون ابلتا تھا۔ گڑھے اور کنوئیں نعشوں سے پُر تھے۔ بلا مبالغہ آخر اکتوبر تک ہزاروں مسلمان ہلاک اور تباہ ہوگئے۔ یہ ہے ہنگامۂ پٹیالہ کا سطحی نقشہ!

اب میری کہانی سنئے۔ میں پٹیالہ رجمنٹ میں کوارٹر لے کر اہل وعیال کے ساتھ مقیم تھا۔ بہت سے سپاہی وہاں اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ رہتے تھے۔ ۲۷ اگست کو ہماری یونٹ پریڈ کر کے آئی۔ تو دیکھتے کیا ہیں، پٹیالہ کا سکھ بریگیڈیر غیر مسلم فوجی حکام کے ساتھ کوئی خفیہ گفتگو کر رہا ہے۔ اور خاص ہدایات دے کر اشاروں اشاروں میں کچھ سمجھا رہا ہے۔ افسروں کے بدلے ہوئے تیور، ان کا انداز تکلم اور ان کی غیر معمولی نقل وحرکت دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ آج خیر معلوم نہیں ہوتی۔ چنانچہ اسی شام وہی ہوا جس کا کھٹکا تھا ایک افسر بڑی تیزی سے ہماری یونٹ میں آیا اور مسلم ملازموں کے نوٹ کر کے لے گیا۔ بعد میں معلوم ہوا پٹیالہ کی تمام فوج کے مسلمان ملازمین کی فہرست تیار کی گئی ہے۔ ۲۸ اگست کی صبح کو حکم ملا کہ سب مسلمان فوجی فلاں جگہ اپنے اسلحہ سمیت جمع

ہو جائیں۔ ہم چھاؤنی کے باہر ایک میدان میں اکٹھے ہوگئے۔ وہاں دیکھا کہ بریگیڈیر اپنے غیر مسلم اسٹاف اور دوسرے افسروں کے ساتھ کھڑا ہے۔ دو برین گنیں میدان میں تیار رکھی ہیں۔ اور تین انچ دہانے کی ایک توپ بھی موجود ہے۔ پٹیالہ فوج کے تمام مسلم سپاہی اور افسر قطار میں کھڑے ہوگئے۔ بریگیڈیر اور اس کے ساتھی آگے بڑھے اور کہنے لگے۔ دیکھو جوانو! ریاست میں فرقہ ورانہ فساد شروع ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں فوج بھی اس کا اثر نہ قبول کر لے اس خطرہ کے پیش نظر کمانڈر انچیف نے حکم دیا ہے کہ مسلمانوں سے ''عارضی طور پر'' ہتھیار لے لئے جائیں پس تم اپنی رائفلیں اور گولیاں زمین پر رکھ دو۔ یہ خوفناک حکم سنتے ہی مسلمان سہم گئے۔ منہ پر ہوائیاں چھوٹ گئیں رنگ زرد ہوگئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں رائے لی لیکن ہر چشم زار نے بیکسی و بے بسی کا اظہار کیا۔ سنا نہیں کیا حکم ملا تم کو۔ سکھ میجر کڑک کر بولا۔ اور اس کڑک کے ساتھ ہی ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رائفلیں اور گولیاں ان کے سپرد کر دیں۔ اور نہتے ہو کر بیٹھ گئے۔ سکھ افسروں نے اسلحہ اٹھا کر اپنے سپاہیوں کے حوالے کیا جو میگزین میں جمع کر دیا گیا۔ اس من مانی کاروائی کے بعد ہمیں حکم ملا کہ اپنی بارکوں میں چلے جاؤ۔ جونہی ہم نے منہ موڑ کر مارچ کیا ہم پر برین گنوں سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ اور آن واحد میں نہتے اور بے بس سپاہی سینکڑوں کی تعداد میں ہلاک ہوگئے جو آدمی بچ کر اپنے کوارٹر میں گیا اس کو اہل واطفال کے ساتھ وہیں جنت رسید کر دیا گیا۔ مسلمان افسروں اور سپاہیوں کی بیویاں اور لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ میری بیوی بھی گولی کا شکار ہوئی۔ نوجوان لڑکی کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ تمام بچے کوارٹر ہی میں شہید ہوگئے۔ میں اپنا بال بچہ کٹوا کر مال اسباب لٹا کر بچ گیا۔ زخم ضرور آئے لیکن جھاڑیوں کی پناہ لے کر اپنے اکیس ہمراہیوں کے ساتھ چھپتا چھپاتا پاکستان آ گیا۔ راستے میں ایک ہمراہی نے بتایا کہ ڈیڑھ ہزار مسلمان فوجیوں میں صرف دو تین سو بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)

سید اشرف علی صاحب فاضل جے پوری رقم طراز ہیں:

میں نارنول ریاست پٹیالہ کے حالات لکھتا ہوں۔ ۱۶ ستمبر کو کوئی پچاس ہزار جاٹوں اور رہبروں نے قصبہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ نارنول کے بہادر مسلمانوں نے ۲۴ گھنٹے شدید مقابلہ جاری رکھا حالانکہ حملہ آوروں کی تعداد ان سے تین گنا زیادہ تھی۔ اتنے میں سکھ ملٹری نے ہندوؤں کی خالی دکانوں پر مشین گنیں اور دو انچ دہانے والی توپیں نصب کر لیں۔ مقامی ہندوؤں کو پہلے ہی محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اڑتالیس گھنٹہ کی مسلسل فائرنگ کے بعد سارے شہر میں آگ ہی آگ نظر آنے لگی۔ مسلمانوں کی لاشوں کے پشتے لگ گئے۔ ابھی کچھ مسلمان اپنے پختہ مکانوں میں محفوظ بیٹھے تھے۔ ۱۰ ستمبر کو ہندو اور سکھ ایک گائے لائے اور اس کی دم کو منہ میں لے کر قسمیں کھانے لگے کہ مسلمان ڈریں نہیں بلکہ جے ہند بھارت ماتا کی جے وغیرہ کے نعرے لگاتے ہوئے نکل آئیں اور مندر میں جمع ہو جائیں جہاں انہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ بھوکے پیاسے مسلمان ان کے چکمہ میں آ گئے۔ آٹھ ہزار کے قریب مرد، عورت اور بچے مندر کے قریب پہنچے تو سکھوں، ہیروں اور جاٹوں نے ان پر پھر حملہ کر دیا۔ اور انہیں قتل کرنے لگے۔ کچھ مسلمانوں نے سمٹ کر مقابلہ کیا اور کچھ بھاگ نکلے۔ زخمی عورتوں، بچوں اور مردوں کی ایک خاصی تعداد راتوں رات ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ جہاں مسٹر ویلڈر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مسٹر ای پی سنگھار یلوے لائن کی حفاظت کے لئے پولیس اور فوج کی کچھ جمعیت لے کر آئے ہوئے تھے۔ سکھوں نے اسٹیشن کی حدود میں بھی مسلمانوں پر حملہ کیا، اس پر سنگھا صاحب نے بلوائیوں پر فائر کرائے۔ اس جھڑپ میں ریاست پٹیالہ کا ایک سکھ فوجی افسر مارا گیا۔ شام کو پٹیالہ فوج کے افسر نے مسٹر ویلڈر اور مسٹر سنگھا کو چیلنج دے دیا کہ وہ نارنول کے اسٹیشن سے فوج اور پولیس ہٹا لیں ورنہ ہم حملہ کر دیں گے۔ ایک ہندوستانی افسر نے صلح کرا دی اور اس طرح مسٹر ویلڈر اور ایس پی سنگھا صاحب نارنول کے چار پانچ ہزار مسلمانوں کو جن میں ایک بڑی تعداد زخمیوں کی بھی تھی بچا کر لانے میں کامیاب ہو گئے جن میں ایک بڑی تعداد زخمیوں کی بھی تھی بچا کر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے ایک ہندو

افسر نے بتایا کہ نارنول میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کسی حالت میں بھی پچیس ہزار سے کم نہ تھی۔ حضرت شہید ترکمانؒ کے مزار والے حوض میں ایک ہزار سے زیادہ عورتوں نے ڈوب کر عصمت بچائی۔ مزار کی حفاظت کرنے والے پانچ ہزار مسلمانوں میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ اس تباہی کے بعد سکھوں نے بچی کھچی عورتوں اور لڑکیوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا اور ان سب کو مال غنیمت کے طور پر بانٹ لیا۔

نیمرانہ کے راجپوت ٹھاکر صاحب جو اپنی جیب کار میں جاٹوں کے گاؤں سے گزر رہے تھے ۱۶ مسلمان لڑکیاں جاٹوں سے چھڑا لائے جو انہوں نے جے پور کے مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ نارنول کے قتل عام سے فارغ ہو کر جاٹوں اور سکھوں کا گروہ بھلیرہ جنکشن، اجمیر اور باندی کوٹی کی طرف متوجہ ہوا۔ نیز ریل گاڑیوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ ۲۰ اکتوبر کو اجمیر شریف سے پچیس میل کے فاصلے پر کھروے اسٹیشن کے قریب پاکستان کی طرف جانے والے پناہ گزینوں کی ایک ٹرین پر حملہ ہوا پندرہ سو میں سے ایک ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ اور تین سو سے زائد زخمی ہوئے۔ کھروے کے زخمی مسلمان اپنے تازہ زخم اور خون آلود کپڑے لے کر حیدر آباد سندھ پہنچے تو مہاجرین میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ انہوں نے اپنے مظلوم شہیدوں کا بدلہ لینے کے لئے ایک گاڑی کو روکنا چاہا تو ہمارے پاکستان کی فوج آڑے آ گئی۔ مہاجرین پر فائر کر کے ایک مسلمان کو ہلاک دو کو زخمی کر دیا۔ اور سندھی ہندوؤں کو بچا لیا۔

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسید راست

حافظ محمد اسحاق خاں صاحب لکھتے ہیں:

۲۷ اگست کو اطراف و جوانب میں یہ خبر گشت کرتی ہوئی سنائی دی کہ مہندر گڈھ پر ۳ ستمبر کو حملہ کیا جائے گا۔ بلکہ گردونواح کے دیہات میں دور دور تک اس مضمون کے اشتہار تقسیم کئے گئے کہ جو ہندو بچہ اس حملہ میں شریک نہ ہو وہ گئو کھائے۔ مہندر گڈھ کے مسلمانوں کو یکم ستمبر ہی سے محصور کر لیا گیا۔ جو مسلمان شہر سے باہر نکلتا وہ ختم کر دیا جاتا تھا۔ ریل گاڑی کا سفر بھی محفوظ نہ

تھا کیونکہ راستے میں تمام مسلمان مسافر موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے۔ شہر میں کرفیو لگا کر مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ تاہم مسلمانوں نے محلّہ بیوپاریاں اور محلّہ رائیوراں میں جمع ہو کر دو جگہ اپنی پناہ گاہیں بنالیں۔ اور حفاظتی تدابیر اختیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ۳ ستمبر کو غیر مسلم بلوائیوں کا ایک جم غفیر قصبہ کے اردگرد جمع ہو گیا اور ریاست کی ملٹری نے موٹروں اور جیپ کاروں میں بیٹھ کر قصبہ کے چاروں طرف چکر لگایا۔ اس روز حملے کا شدید خطرہ تھا لیکن حملہ نہ ہوا۔ اس حملہ میں جے پور، بیکانیر، نابھ، الور، جنید، بھرت پور اور ضلع نارنول کے اسی نوے ہزار بلوائی شریک تھے اور ریاست پٹیالہ کی ملٹری بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ ۶ ستمبر کو سنا کے ضلع نارنول کے مسلمانوں پر حملہ شروع ہو گیا ہے۔ شہر نارنول میں تین دن تک مسلمانوں کا قتل عام جاری رہا۔ حملہ آوروں نے مشین گنیں برین گنیں اور توپیں استعمال کیں۔ اور شہر کے چاروں طرف آگ لگا دی۔ شہر نارنول میں پندرہ ہزار مسلمان آباد تھے۔ دس ہزار باہر سے آ کر اس شہر میں جمع ہو گئے تھے کل پچیس ہزار مسلمانوں میں سے صرف تین چار ہزار اپنی جانیں بچا کر بھاگ سکے۔ ہزاروں جوان عورتیں اور لڑکیاں حملہ آوروں کے قبضہ میں چلی گئیں۔ ریاست کی ملٹری نے ان عورتوں کو مادرزاد برہنہ کر کے جلوس نکالا۔ ۹ ستمبر تک شہر نارنول کا قصبہ تمام کر دیا گیا اور ازاں بعد گردونواح کے مسلم دیہات کو جلا دیا گیا۔

۱۱ ستمبر کو تھانیدار مہندر سنگھ نے شہر مہندر گڈھ کی شمالی جائے پناہ یعنی محلّہ بیوپاریاں پر فائرنگ شروع کرا دی۔ اس کے بعد بلوائیوں اور ریاست کی باقاعدہ فوج کے جوانوں نے محلّہ پر یورش کر دی اور مسلمانوں کے بے دریغ قتل کرنے لگے۔ مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بلا امتیاز موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ شام کو فائرنگ بند ہوئی تو محلّہ بیوپاریاں کے بچے کھچے مسلمانوں میں سے چار سو کا ایک قافلہ جمعدار نصیر احمد خاں جاگیردار کے ہمراہ موضع یوانہ کی طرف چل دیا باقیماندہ دو تین سو مسلمان محلّہ راٹھواں میں چلے گئے جہاں پہلے بھی بہت سے مسلمان جمع تھے۔ جو لوگ موضع یوانہ کی طرف گئے تھے انہیں بلوائیوں اور فوجیوں نے راستے میں گھیر لیا اور ان

میں سے دو تین سو آدمی ختم کر دیئے۔ اور موضع مالڑی کو جہاں یہ واردات ہوئی آگ لگا دی۔

۱۲۔۱۳ ستمبر کو ایک جنگی طیارے نے محلّہ راٹھوراں کے پناہ گزینوں پر گولیاں برسائیں۔ لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپے بیٹھے رہے۔ شام کو ملٹری کے دو ٹرک آئے اور محلّہ کے دو سرکردہ بزرگوار اشخاص کو بلا کر کہنے لگے کہ لوگ آرام سے رات گزاریں ملٹری کے دو سو جوان حفاظت کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اس یقین دلانے کے باوجود رات بھر گولیاں چلتی رہیں۔ اگلے دن صبح کو حکام نے دو مسلمان لڑکیوں کو محلّہ راٹھوراں میں بھیجا جو محلّہ بیوپاریاں سے انہوں نے پکڑی تھیں ان لڑکیوں نے کہا کہ ملٹری کے آفیسر مسلمانوں کے لیڈروں کو بلا رہے ہیں۔ لیڈر گئے ان سے کہا گیا کہ مسلمان کسی قسم کا سامان لئے بغیر جس حال میں اسی حال میں ایک گھنٹہ کے اندر اندر شہر خالی کر دیں ہم ان سب کو ریلوے اسٹیشن تک بحفاظت پہنچا کر پاکستان کی طرف بھیج دیں گے۔ غرض مسلمانوں کو نہایت گندے راستے سے اسٹیشن کی طرف چلایا نہیں بلکہ ہانکا گیا۔ اوپر سے بارش ہو رہی تھی۔ راستہ کیچڑ کے مارے دلدل بنا ہوا تھا شام کے پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک سب لوگ اسٹیشن کے باہر بارش میں بھیگتے پڑے رہے۔ گاڑی آئی تو اس میں آدھے آدمی سوار کرائے جا سکے۔ یہ گاڑی جب مہندر گڈھ سے تیسرے اسٹیشن ستنالی کے سگنل پر پہنچی تو یک دم گاڑی رک گئی۔ صدر مسلم لیگ رسالدار محمد حنیف کو آواز دی گئی۔ وہ گاڑی سے اترے تو انہیں گولی مار دی گئی ازاں بعد مسلمانوں پر اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں کیونکہ وہاں ہزاروں بلوائی اور پولیس اور فوج جمع تھی۔ تین گھنٹے تک مسلمانوں کے قتل کا سلسلہ جاری رہا۔ اور بلوائی سامان لوٹتے رہے۔ جب گاڑی لوہارو کے اسٹیشن پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ دو ہزار میں صرف تین سو کے قریب مسلمان بچے ہیں اور ۷۵ زخمی ہیں۔ بہت سی عورتوں کو گاڑی سے اتار لیا گیا تھا۔ ۱۴ ستمبر کو شام کے سات بجے یہ گاڑی جے پور پہنچی۔

مہندر گڈھ کے جو مسلمان پناہ گزین نصف کے قریب باقی رہ گئے تھے ان کو تیسرے دن یعنی ۱۵ ستمبر کو گاڑی پر سوار کرایا گیا۔ اس قافلہ پر بھی حملہ ہوا۔ پہلے لیفٹیننٹ احمد علی خان کو گولی

مار کر شہید کیا گیا اور پھر قتل عام شروع کر دیا گیا۔ اس گاڑی میں سے صرف ایک مرد اور چار عورتیں بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکیں۔ مہندر گڈھ کے اردگرد بہت سے دیہات تباہ کر دیئے گئے۔ اور مسلمان ختم کر دیئے گئے۔ کئی دیہات کے مسلمانوں نے مذہب تبدیل کر کے جان بچائی۔ ہزاروں عورتیں ابھی تک ظالموں کے پنجے میں پھنسی ہوئی ہیں۔

لیفٹیننٹ ولی محمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

موضع کمبالی تھانہ نند پور کلوڑ تحصیل سرہند ریاست پٹیالہ کا ایک گاؤں ہے جس میں نوسو کے قریب مسلمان آباد تھے۔ اس گاؤں میں اردگرد کے دیہات سے بھی مسلمان آ گئے تھے۔ اور کُل تعداد ڈیڑھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یہ سب لوگ ۴ ستمبر کو گاؤں چھوڑ کر کرالی کیمپ میں جانے کے لئے تیار ہو گئے اور قافلہ چل پڑا۔ اتنے میں ریاستی فوج کا ایک دستہ آیا جس نے حکم دیا کہ سب لوگ گاؤں کو واپس چلے جائیں۔ چنانچہ سب واپس چلے گئے۔ تین روز گزرنے پر مؤرخہ ۸ ستمبر کو پانچ ہزار سکھوں کے ایک مسلح جتھے نے کمبال کے قریب باڑی نامی ایک گاؤں پر حملہ کر دیا ایک گھنٹہ تک لڑائی ہوتی رہی اس پر سکھوں نے مسلمانوں سے کہا تم گھروں سے نکل آؤ ہم تمہیں کیمپ میں حفاظت سے پہنچا دیں گے۔ جب سب مسلمان گاؤں سے نکل کر ایک کھلے میدان میں جمع ہوئے تو سکھوں نے جن کے ساتھ ریاست کی فوج اور پولیس بھی تھی انہیں گھیر لیا اور قتل عام شروع کر دیا۔ چودہ سو مسلمان شہید کر دیئے گئے ایک سو جوان عورتوں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے کپڑے اتروا کر انہیں برہنہ کیا گیا۔ ان کے سر کے بال کھول دیئے گئے۔ ایک دن ان کو بالکل برہنہ رکھا گیا اور سکھ وحشیانہ طریق سے ان سب کی عصمت ریزی کرتے رہے۔ تا آں کہ وہ بیہوش ہو گئیں شام کو سکھ انہیں اپنے ساتھ لے گئے بہت سی عورتیں وحشیانہ سلوک کی وجہ سے مر گئیں۔ اس گاؤں کے چھ سات آدمی جو باہر ملازمت پر تھے بچ سکے ہیں یہ دردناک قصہ ایک عورت نے سنایا ہے جو پندرہ دن کے بعد بھاگ کر سرہند شریف کے روضہ پر پہنچ سکی۔

قاضی محمد صدیق قریشی صاحب رقم طراز ہیں:

میں سرہند شریف کے قریب ایک گاؤں باڑہ کا باشندہ ہوں۔ پندرہ اگست کے بعد جب ضلع لدھیانہ کے دیہات میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو ریاست کے حکام ہمیں یقین دلاتے رہے کہ ریاست میں ہر طرح کا امن قائم رکھا جائے گا۔ ۲۴ اگست کو علاقہ کھنہ راہوں ماہوں کے دو ہزار مسلمان پناہ گزینوں کا ایک قافلہ موضع باڑہ میں داخل ہوا۔ یہ قافلہ بڑی تباہ حالت میں تھا۔ اس میں بہت سے لوگ زخمی تھے۔ سب کے سب بے سروسامان تھے۔ تین روز کی مسلسل بارش میں افتان وخیزاں چل کر آئے تھے باڑہ کی مسلم آبادی نے ان کی خبر گیری کی لیکن ناظم صاحب ضلع بسی پٹھاناں سنت پرتاپ سنگھ نے حکم دیا کہ ان پناہ گزینوں کو فوراً ریاست کی حدود سے نکال دو۔ پولیس نے آ کر انہیں باڑہ سے ہانک دیا۔ باڑہ سے دو میل کے فاصلے پر ان پر حملہ کر دیا گیا۔ اور اکثر لوگ شہید کر دیئے گئے کچھ آدمی بھاگ کر روضہ شریف کے کیمپ میں اور کچھ انبالہ کے کیمپ میں پہنچے۔ عورتوں اور بچوں کو سکھ زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ ۴ ستمبر کو ایک ٹرین روپڑ سے لائی گئی۔ جس میں چار ہزار کے قریب مسلمان پناہ گزیں تھے۔ رات کے نو بجے اس ٹرین پر حملہ کر دیا گیا اور تمام مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ عورتوں کو برہنہ کر کے ان کی عصمت ریزی کی گئی۔ حالات یکسر ناقابل بیان ہیں۔ باڑ کے مسلمان کچھ زخمی عورتوں، بچوں اور مردوں کو اٹھا لائے اور ان کی مرہم پٹی کر کے انہیں روضہ شریف کے کیمپ میں پہنچایا۔

اس کے بعد ریلوے اسٹیشن پر ہر روز پندرہ بیس کی تعداد میں مسلمان شہید ہونے لگے۔ اور ریلوے اسٹیشن کا راستہ بند ہو گیا۔ ناظم صاحب ضلع بسّی نے پھر یقین دلایا کہ یہ واقعات ریلوے کی حدود میں ہو رہے ہیں ریاستی علاقہ میں امن بحال رکھا جائے گا۔ ۸ ستمبر کو میرے ایک ہندو دوست نے کہا کہ حالات بہت مخدوش نظر آ رہے ہیں اس لئے تم اپنے بال بچوں کو لے کر روضہ شریف کے کیمپ میں چلے جاؤ۔ راستے پر خطر تھے تاہم میرے ایک جاٹ دوست نے اپنی لاری پر مجھے اور میرے بچوں کو روضہ شریف پہنچا دیا باقی اور میرے والد گھر ہی پر رہے۔

۱۱ستمبر کو صبح آٹھ بجے سنت پرتاپ سنگھ ناظم ضلع بسی پولیس کے چند آدمیوں کے ہمراہ باڑہ پہنچا اور کہ کہ حالات خراب ہورہے ہیں اس لئے باڑہ اور ہمایوں پور کے مسلمان گاؤں خالی کردیں۔اس سب کو بحفاظت سرہند شریف کے کیمپ میں پہنچادیا جائے گا۔چنانچہ پولیس اور فوج نے تمام مسلمانوں کو باہر نکال کر ریلوے روڈ اور گرانڈ ٹرنک روڈ کے درمیان کھڑا کرلیا۔جس کے پاس نیزہ لاٹھی یا تلوار کسی قسم کا ہتھیار تھا سب چھین لیا۔اور چالیس ہزار روپیہ نقد مانگا۔جب روپیہ ہتھیا لیا تو اس نہتے مجمع پر فائر شروع کردیئے۔

میرے والد قاضی مظہر الحسنین قریشی نے یہ حال دیکھ کر مسلمانوں سے کہا کہ تیمّم کرکے سجدے میں پڑ جائیں والد صاحب نے مختصر سی تقریر میں مسلمانوں کو اس بات کی بھی تلقین کی کہ کوئی شخص جان کے خوف سے مذہب تبدیل نہ کرے سب کلمہ حق پر جانیں قربان کردیں چنانچہ اکثر مسلمان تیمّم کرکے سجدہ ریز ہوگئے۔سکھوں نے جن کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی انہیں قتل کردیا۔اور عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔کوئی ڈھائی ہزار مسلمان جو خدا کی بارگاہ میں سربسجود تھے شہید کردیئے گئے۔عورتوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا میں تحریر نہیں کرسکتا۔میرے والد بھی اسی حال میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔دوماہ کے قریب روضہ شریف کے کیمپ میں بسر کرنے کے بعد مورخہ ۷نومبر اسپیشل ٹرین پر سوار ہوکر پاکستان پہنچے راستے میں پندرہ بیس آدمی چھت پر سے گر کر ہلاک ہوئے۔دوآدمی فائروں سے شہید ہوئے۔ہمارے خاندان کی افراد کی کل تعداد دوسواسی کس تھی جن میں دوسوتیس ارکان وہیں شہید ہوگئے باقیماندہ پچاس پاکستان میں کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔(۶۲)

ریاست جیند

قصبہ کلیانہ ریاست جنید سے آنے والے چند مہاجرین نے ایک مشترکہ بیان ارسال کیا۔مہاجرین کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔سربلند خاں نمبر دار،عبدالغفار خاں،ریاض احمد ملک، عبدالرشید بیگ،محمد حنیف بیگ،محمد امین خان،روشن علی،عبدالشکور،فیض محمد،محمد زکریا،قاضی فضل الرحمٰن،رفیق شروانی۔بیان میں لکھا ہے:

کلیانہ ایک پرانا اور تاریخی قصبہ ہے جو ریاست جیند کے ضلع ڈالمیہ دادری کے شمال مغرب میں پانچ میل کے فاصلے پر ایک پہاڑ کی تلہٹی میں واقع ہے۔ضلع دادری ایک سوچوراسی دیہات پر مشتمل ہے جس کی آبادی بیشتر ہندو جاٹوں اور اہیروں کی ہے۔آٹھ دس دیہات ایسے تھے جن میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تھی۔کلیانہ کی چار ہزار آبادی میں سے تین ہزار مسلمان تھے اور دادری شہر میں چھ ہزار مسلمان آباد تھے۔ریاست جیند تین اضلاع پر مشتمل ہے۔۱۔سنگرور کا ضلع جس کے ایک سوساٹھ دیہات میں ۲۵ ہزار مسلمان آباد تھے۔(۲) ضلع جنید جس کے ۹۶ دیہات میں بیس ہزار مسلمان آباد تھے۔(۳) ڈالمیہ دادری جس کے ۱۸۴ دیہات میں ۱۵ ہزار مسلمان آباد تھے۔ریاست میں غالب اکثریت سکھوں کی تھی۔اس ریاست کی حدیں نابھہ اور پٹیالہ کی ریاستوں سے ملتی ہیں۔ریاست جیند میں ۱۵ اگست یعنی ہندوستان کے یوم آزادی ہی سے مسلمان خطرات محسوس کرنے لگے تھے۔۱۸ اگست کو دادری میں عید کی نماز پولیس اور فوج کی حفاظت میں پڑھی گئی۔جس کا انتظام مرزا مشتاق بیگ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کیا تھا۔کلیانہ میں ۱۸ اور ۱۹ اگست کو عید کی دو نمازیں پڑھی گئیں۔مسلمان نماز پڑھنے والوں کی حفاظت کرتے رہے۔اس طرح عید کا دن تو خیریت سے گزر گیا جس کے متعلق سخت خطرہ لاحق ہورہا تھا۔۲۰ اگست کو مسٹر شانتی سروپ ناظم ضلعداری دادری کی موجودی میں دادری سے چھ میل کے فاصلے پر مندولہ گاؤں جاٹوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔۲۸ اگست کو جاٹوں نے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوکر موضع کپوری پر حملہ کرکے مکانوں کو آگ لگادی۔مرزا مشتاق بیگ سپرنٹنڈنٹ پولیس

نے موقع پر جا کر گیارہ جاٹ گرفتار کر لئے لیکن اگلے ہی دن ناظم ضلع نے ان سے تحریری معافی نامہ لے کر انہیں رہا کر دیا۔ دادری اور ضلع دادری کے دیگر قصبات کے مسلمانوں پر ہراس کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ دادری کے لوگ راجکمار کی خدمت میں تین دفعہ حاضر ہوئے راجکمار نے انہیں میٹھے الفاظ میں تسلی دی۔

یکم ستمبر کو دن نکلنے سے قبل ہندو جاٹوں اور سکھوں کے ایک گروہ نے جو کلہاڑیوں، گنڈاسوں اور تلواروں وغیرہ سے مسلح تھا دادری پر حملہ کر دیا۔ یہ حال دیکھ کر مرزا مشتاق بیگ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسلمانوں کو اپنی حفاظت کے لئے مقابلے پر ابھارا۔ تین دن لڑائی ہوتی رہی۔ مرزا صاحب کے پاس گولیاں ختم ہو گئیں۔ اور اپنی کوٹھی سے بھاگ گئے۔ مسلمان چوتھے دن بارہ بجے تک مقابلہ کرتے رہے۔ آخر مورچے ٹوٹ گئے اور حملہ آوروں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ ضلعداری کی چھ ہزار مسلم آبادی ایک گھنٹے میں نیست و نابود کر دی گئی۔ صرف ایک ہزار مسلم آبادی بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو سکی ان پر بھی راستے میں حملے ہوئے وہ قافلہ بہوجھولری واقعہ ریاست دوجانہ تک پہنچتے پہنچتے صرف ۳۵۶ نفوس کا رہ گیا۔ دادری کے حملہ میں راجکمار حملہ آوروں کی کمان کر رہا تھا۔ جو عورتیں زندہ رہیں انہیں سکھ اور جاٹ لے گئے۔

اب کلیانہ کا حال سنئے۔ کلیانہ کو سکھوں اور جاٹوں نے ۲۰ اگست کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور دو روز محاصرہ جاری رکھنے کے بعد بے لڑے واپس چلے گئے۔ ۸ ستمبر کو پھر حملہ کرنیکی نیت سے جمع ہوئے لیکن حملہ کا حوصلہ نہ پڑا۔ ۲۷ ستمبر کو ناظم ضلع قصبہ کلیانہ میں آیا اس نے کہا تم سب کو پاکستان بھیجا جائے گا۔ جو لوگ پاکستان جانا چاہتے ہیں وہ کل صبح تیار ہو جائیں میں کل خود آ کر انہیں لے جاؤں گا جو نہ جائیں گے ان کی حفاظت کی قطعاً کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ ۲۸ ستمبر کو ناظم ضلع ملٹری اسکورٹ لے کر آ گیا۔ اور مسلمانوں کو پا پیادہ چلنے پر مجبور کیا۔ قافلہ بڑھتا دیکھا تو ناظم نے کہا باقی مسلمانوں کا قافلہ چلایا جائے گا۔ یہ قافلہ دادری کے قریب پہنچا تو دو سرکردہ مسلمانوں مرزا اسلم بیگ اور مرزا باسط بیگ کو قافلے سے نکال کر قتل کر دیا۔ دوسرے دن پانچ سو مسلمانوں

کا دوسرا قافلہ کلیانہ سے چلا اور ابھی قصبہ سے نکلا ہی تھا کہ سکھوں اور جاٹوں نے اس پر حملہ کر کے سب کو تہ تیغ کر دیا۔ صرف چند مسلمان جو ناظم ضلع سے اثر و رسوخ رکھتے تھے زندہ سلامت بچ کر کیمپ میں پہنچے یہاں ناظم ضلع نے کلیانہ کے مسلمانوں سے کہا جو نقدی اور زیور تم اپنے گھروں میں دفن کر آئے ہو وہ نکال لاؤ اس کا نصف سرکاری خزانہ میں جمع کر لیا جائے گا نصف تمہیں دے دیا جائے گا۔ بہت سے مسلمان اس دھوکے میں آ گئے اور زیور وغیرہ نکال لائے جو سب کا سب خزانہ سرکار میں ڈال لیا گیا۔ ۲۸ ستمبر سے ۸ نومبر تک قصبہ کلیانہ کے مسلمانوں اور دادری کے ۹۳۹ بچے کھچے مسلمانوں کو کیمپ کے مصائب جھیلنے پڑے۔ ہندو ملٹری بہت سختی کرتی تھی۔ راشن بہت گراں ملتا تھا۔ آٹے میں شیشہ پیس کر کھلایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ لوگ بیمار ہو کر مرنے لگے۔ ۱۱ نومبر کو یہ مہاجرین اسپیشل ٹرین میں سوار ہو کر کراچی پہنچے۔

قصبہ کلیانہ سے تین میل جانب مغرب جھوجھولاں گاؤں واقع ہے جہاں کوئی پندرہ گھر مسلمانوں کے تھے۔ ان مسلمانوں کو جاٹوں نے گھروں سے نکلا کر ایک لائن میں کھڑا کر لیا اور پھر سب کو قتل کر دیا۔ مندولہ کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کر کے مشکیں باندھ دی گئیں پھر سب کو نذر آتش کر دیا گیا۔ چرخی کے تین سو مسلمان ہندو بنا لئے گئے۔ سنگرور کے مسلمان مرزا خورشید بیگ کی مساعی سے بچ نکلے لیکن دو ماہ کیمپ میں پڑے رہے۔ ضلع جیند کے مسلمانوں پر دادری سے بھی زیادہ مظالم اٹھائے گئے۔ صرف چند اشخاص بچ کر نکل سکے باقی سب قتل کر دیئے گئے۔ یا ہندو بنا لئے گئے۔ ضلع جیند میں کوئی کیمپ نہیں بنا تھا۔ (۶۳)

نابھہ، الور اور بھرت پور

ایک صاحب جو اپنا نام لکھنا بھول گئے تحریر فرماتے ہیں:

موضع شیر گڈھ ریاست نابھہ وموضع چھناں ریاست نابھہ اور موضع کنجاری ریاست پٹیالہ کے چار ہزار مسلمانوں کا ایک قافلہ ۴ ستمبر کو چلا۔ یہ مسلمان تمام کے تمام ہتھیار بند تھے۔ راستے میں سکھوں کے جتھے نے اس قافلے پر حملے کئے لیکن سب حملے مسترد کر دیئے گئے۔ یہ قافلہ مالیر کوٹلہ کی طرف جا رہا تھا۔ جس کی حد بیس میل پر واقع تھی۔ یہ قافلہ جب مالیر کوٹلہ کی حد سے دو میل دور نہر سرہند کے پل پر پہنچا تھا وہاں بیس ہزار سکھوں کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ ملٹری کا ایک دستہ بھی ان کی امداد کو آیا ہوا تھا۔ ملٹری نے قافلے کو پل پر سے روکنے کی کوشش کی اور لڑائی شروع ہوگئی۔ مسلمانوں نے ملٹری کے پانچ آدمی گرا کر پل کا راستہ کھولا لیکن سکھوں کے اجتماع نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ مسلمان پلٹے تو ان کا قتل عام شروع کر دیا گیا۔ وہاں پر دو ہزار مسلمان شہید ہو گئے کوئی جوان مرد، یا عورت نہ بچی دو ہزار بوڑھے مرد بوڑھی عورتیں اور بچے مالیر کوٹلہ کی حدود میں داخل ہو سکے۔

موضع آوان ریاست نابھہ کی مظلوم مہاجرہ نذیر فاطمہ نے اپنی ہوئی بیتی یوں سنائی کہ:

اگست کی پندرہ کو جب حکومت تبدیل ہوئی تو اسی روز نابھہ کے سکھوں نے مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اب کوئی مسلمان ہماری ریاست سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ مسلمانوں کو خطرہ تو تھا ہی اور وہ ہر وقت مغموم وفکر مند رہتے تھے۔ چنانچہ ۳ ستمبر کو ہمارے امتحان وآزمائش کا دن آ پہنچا اور اس روز ہم نے جو کچھ دیکھا امید ہے وہ حشر زا منظر چشم فلک نے بھی کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

اس تاریخ کو صبح آٹھ بجے ہی میرا بھائی نذیر احمد بدحواسی کے عالم میں چیختا چلاتا گھر آیا۔ دروازے سے گزرے ہی اس نے ایک چیخ ماری۔ اور یہ کہنا شروع کر دیا ''آ گئے آ گئے'' ہم نے بہتیرا پوچھا کون آ گئے؟ لیکن اس نے کچھ نہ بتایا ہم خوفزدہ بھی تھے اور حیران بھی اس کو دودھ برف اور شربت پلایا۔ تھوڑے عرصہ بعد اسے ہوش آیا تو کہنے لگا ساتھ کے گاؤں میں سکھ

غنڈوں نے قتل شروع کر دیا ہے ایک شخص جو ابھی ابھی بھاگ کر آیا ہے بازار میں کہہ رہا ہے کہ اس گاؤں کے سب مسلمان ذبح ہو چکے ہیں اور غنڈے تمہارے گاؤں میں پہنچنے ہی والے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہم سب کانپنے اور رونے لگ گئے۔ والد اور والدہ ہم کو تسلی بھی دیتے تھے اور روتے بھی جاتے تھے۔ آخر گیارہ بجے کے قریب ایک جگر پاش گونج سنی۔ ''ست سری اکال''، ''واہگورو جی کی فتح''، پھر آواز ''سب مُسلوں (مسلمانوں) کو کرپان بہادر سے مار دو''۔ یہ خوفناک نعرے سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ چہرے زرد ہو گئے۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بھاگنا اور چلنا تو درکنار ہم میں بولنے اور اٹھنے ہی کی سکت نہ رہی۔ والد صاحب نے ذرا دلیری کر کے کہا۔ بشیر (میرے بڑے بھائی کا نام) تم والدہ، لڑکیوں اور بھائی کو لے کر اپنے گنے کے کھیت میں چھپ جاؤ۔ میں حالات دیکھ کر تم سے وہیں ملوں گا۔ بڑے بھائی نے جواب دیا کہ ہم سے یہ کبھی نہ ہو سکے گا کہ آپ کو اکیلے چھوڑ کر ہم روپوش ہو جائیں۔ نہ آپ کو ہماری خبر نہ ہم کو آپ کی خبر۔ بہتر ہے کہ ہمارا مرنا جینا اکٹھا ہو۔ والدہ نے بھی یہ تجویز پسند کی اور والد کو منوایا کہ ہم جہاں ہوں اکٹھے ہی ہوں گے۔ الگ رہنے میں اور بھی خطرہ ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گاؤں سے رونے چلانے اور چیخنے، کراہنے کی آوازیں آنے لگیں، دو تین فائر بھی ہوئے اور کرپانوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ ہم نے سمجھا کہ دشمن سر پر آ گیا۔ دروازوں کی زنجیریں چڑھا دیں گئیں اور ہم گھر کے تمام آدمی سہم کر ایک کوٹھڑی میں بند ہو گئے۔ غنڈے گاؤں والوں کو مارتے دھاڑتے مکانوں کو آگ لگاتے عورتیں اغوا کرتے اور اسباب لوٹتے لحظہ بہ لحظہ ہمارے مکان کے قریب آ رہے تھے۔ اب گولیاں بھی اندھا دھند چل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا غنڈوں کے ساتھ فوجی سپاہی بھی ہیں۔ جب ہمارے ہمسایہ مکان میں آگ لگائی گئی۔ تو ہم کوٹھڑی سے نکل کر صحن میں آ گئے تا کہ اندر ہی اندر جل بھن کر راکھ نہ ہو جائیں۔ والد صاحب نے کانپتے ہوئے کہا۔

دیکھو! جب دشمن ہمارے مکان میں آئیں تو اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو بچانے کی بجائے ہتھیار چھیننے کی کوشش کرنا۔ عورتیں الگ ہو کر بیٹھی رہیں اور ہم میں جو مرد ہیں وہ

ہتھیار چھین لیں۔ والد کا آخری فقرہ ابھی مکمل نہ ہوا تھا کہ ظالموں نے کلہاڑیوں کے ساتھ ہمارا دروازہ توڑ دیا۔ ایک غنڈے نے اندر داخل ہو کر چھوٹتے ہی کہا تمہارے پاس جو نقد روپیہ، زیور، سونا، چاندی اور قیمتی اشیاء، پارچات وغیرہ ہیں وہ سب ہمارے حوالے کر دو۔ والد نے ایک صندوق کی طرف اشارہ کیا وہ غنڈہ تو ان اشیاء کی دیکھ بھال میں لگ گیا اور والد صاحب نے اس کی برچھی پر قبضہ کر کے اسی کے ساتھ اس کو جہنم واصل کیا۔ دو اور غنڈے آئے اور والد نے انہیں بھی ٹھکانے لگا دیا۔ پھر ایک فوجی سپاہی آیا اس نے تین نعشیں دیکھ کر گولی چلائی۔ جس سے بڑا بھائی زخمی ہو کر گرا۔ والد صاحب بندوق چھیننے کے لئے آگے بڑھے لیکن موذی نے گولی مار کر انہیں شہید کر دیا۔ اس کے پاس اسٹین گن تھی۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے کئی فائر کئے میرے سوا گھر کے سب مرد وزن مارے گئے۔ میں بیہوش ہو کر نعشوں کے اوپر گر پڑی۔ وہ مجھے بھی مردہ سمجھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد اور کئی غنڈے ہمارے مکان میں آئے اور چلے گئے۔ مجھے سب نے مردہ تصور کیا۔ دوسرے دن مجھے ہوش آیا۔ تو نعشیں دیکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ پھر ارادہ کیا کہ کنوئیں میں گر کر مرتی ہوں گاؤں سے باہر نکلی۔ ہر طرف نعشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ میں نے ایک کنوئیں کا رخ کیا تو گاؤں کا ایک بوڑھا ملا۔ اور اس نے مجھے اس ارادہ سے روکا۔ اس کی رہنمائی میں جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی پناہ لیتی ڈیڑھ ماہ بعد پاکستان پہنچی۔ (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)

کپتان سید مجتبیٰ حسین بی اے آنرز تحریر فرماتے ہیں:

ریاست بھرت پور میں مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دینے کی سازش نومبر ۱۹۴۶ء سے جڑ پکڑنے لگی تھی۔ جب کہ ریاست کے حکام نے مسلمانوں کا اسلحہ لائسنس دینا بند کر دیا اور ہندوؤں کو شوق دلایا کہ وہ لائسنس لے کر ہتھیار بند ہو جائیں۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں ریاست کی حکومت نے مسلمان افسروں کو غیر اہم جگہوں پر لگانے کی حکمت عملی اختیار کی اور بہت سے اعلیٰ افسروں کو ریٹائر کر دینے کی روش اختیار کر لی۔

فروری ۱۹۴۷ء کے آخیر میں بھرت پور میں کل ہندو جاٹ سبھا کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس

اجلاس کے دوران میں ریاست کے تمام ادارے بند رہے تا کہ جملہ ملازمین اس میں شامل ہو سکیں۔ اس اجلاس میں ہندو اور جاٹ لیڈروں نے مسلمانوں کے خلاف بہت اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ اکثر مقرروں نے کہا ہم مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال کر دم لیں گے۔ اس کے بھرت پور کی جاٹ برادری نے اجلاس میں شامل ہونے والے ہندو لیڈروں کو دعوت دی اور پھر مہاراجہ نے چیدہ چیدہ ہندو لیڈروں کو دعوت دی ان دعوتوں میں نہ معلوم کیا پروگرام بنایا گیا۔ اس دعوت کے اگلے روز فوج کے جاٹ کپتان نے مسلمان کپتان سے کہا کہ اب مسلمانوں کو ریاست سے ختم کر دیا جائے گا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں کنجولی لائنز کی فوجی بارکیں راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضا کاروں کے لئے وقف کر دی گئیں اور فوجی افسر انہیں قواعد پریڈ وغیرہ کی سکھلائی کرانے لگے۔ یہ سکھلائی کئی ماہ تک جاری رہی اور تربیت یافتہ رضا کاروں کو مختلف تحصیلوں میں بھیج دیا گیا۔

۱۸ اپریل سے میوات آبادی کی تحصیلوں میں میو مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے اور بھرت پور سے جاٹ فوج کی دو کمپنیاں ان اقطاع میں بھیج دی گئیں۔ اس فوجی جمعیت کے ہمراہ مہاراجہ کا چھوٹا بھائی سنگھ بھی تھا جو حملوں میں خود شریک ہو کر قاتلوں کے حوصلے بڑھاتا تھا۔ ابتدا میں فوجی چھپ چھپ کر حملہ آوروں کی مدد کرتے تھے لیکن جہاں سخت مقابلہ آن پڑتا تھا وہاں علی الاعلان مسلمانوں پر گولیاں برسانے لگتے تھے۔ اس طرح میو مسلمانوں کے کئی گاؤں اجاڑ دیئے گئے سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کر کے خاک وخون میں لوٹا دیا گیا۔ مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا جاتا۔ خود ہندو سپاہیوں نے بیان کیا کہ مسلمانوں کی مُشکیں باندھ کر انہیں کسی مکان میں ڈال دیا جاتا جاتا تھا اور پھر اس مکان کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ اگر کوئی مسلمان کہیں سے چھپا ہوا ملتا تھا تو فوجی سپاہی اسے پکڑ کر مہاراجہ کے بھائی بچو سنگھ کے پاس لے جاتے تھے۔ بچو سنگھ اسے پستول کی گولی مار کر ہلاک کر دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اس شکار میں جو لطف ہے وہ شیر یا ہرن یا مرغابی کے شکار میں نہیں ملتا۔ میجر حکم سنگھ اس سے بڑھ کر ظالم تھا۔ ایک روز کچھ سپاہی ایک گاؤں کی بربادی کے بعد چار

شیر خوار بچوں کو اٹھالائے انہوں نے کہا کہ انہیں یتیم خانے بھجوادیں لیکن میجر حکم سنگھ نے کہا کہ سانپ کے بچے سانپ ہوتے ہیں ان کو مار دو جب سپاہیوں نے تامل سے کام لیا تو حکم سنگھ نے دو بچوں کو سڑک پر پھینک کر اپنے فوجی بوٹوں سے کچل دیا۔ تیسرے بچے کو ہوا میں اچھالا اور سنگین میں پرو لیا۔ چوتھے کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دیا جہاں چند میو جوان پہلے سے جل رہے تھے۔

ایک طرف دیگ میو کی تحصیل میں یہ تباہی مچ رہی تھی۔ دوسری طرف ۲۱ جون کو ندبئ میں بھی یہ کاروائی شروع کر دی گئی۔ اور ندبئ میں مسلمانوں کے گھروں کو تاراج کر کے آگ لگا دی اور سینکڑوں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ بلوائیوں کے اس ہجوم نے ندبئ کے بعد ویر، بھوسا اور دوسرے دیہات کو تاراج کیا۔ پھر ان کا ایک گروہ تو میوات کی طرف چلا گیا۔ دوسرے گروہ نے پھر سر کے قصبہ پر حملہ کیا پھر سر کے مسلمان ۲۴ و ۲۵ جون کو ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے انہوں نے بلوائیوں کے بہت سے آدمی مار دیئے۔ اس پر بلوائی وہاں سے ہٹ گئے اور جاتے جاتے موضع ہلک کو تباہ کر گئے۔ یہ حال دیکھ کر خاص بھرت پور کے مسلمان شہر سے نکل گئے۔ باجگینہ کے مسلمانوں کو وہاں کے سرکردہ ہندوؤں نے روک لیا تھا اور تسلیاں دیتے رہے تھے لیکن وقت آنے پر سب کے سب مار دیئے گئے اور ان کی عورتیں ہندو بنالی گئیں۔ جولائی کے مہینے میں بھرت پور کے اردگرد کسی قدر امن ہو گیا لیکن میوات میں مسلمانوں کے دیہات تباہ و برباد کرنے کی مہم برابر جاری رہی۔ میو قوم کے جو لوگ پکڑ کر جیل میں ڈال دیئے گئے تھے انہیں پچیس پچیس اور پچاس پچاس کی ٹولیوں میں رہا کر دیا جاتا تھا اور جب وہ باہر نکلتے تھے تو حملہ آور انہیں قتل کر دیتے تھے۔ فضا کو کسی قدر پرسکون پا کر مسلمان بھرت پور میں واپس آنے لگے۔

ماہ ستمبر میں مسلمانوں کو فنا کرنے کی مہم پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اختیار کر لی گئی۔ ۴ ستمبر کو ریاست کی فوج سے ڈیگ میو کا محاصرہ کر لیا۔ مہاراجہ بھی اپنی فوج کے ساتھ تھا۔ ڈیگ میو کے چند سرکردہ مہاراجہ کے پاس گئے اور پناہ مانگی مہاراجہ نے جواب دیا کہ مسلمانوں کا ملک تو عرب ہے تم کو وہاں جانا چاہئے۔ ابھی تو ہم تمہیں ریاست سے نکال رہے ہیں وقت آنے پر

پاکستان سے بھی نکال دیں گے۔ مہاراجہ کے بھائی بچو سنگھ نے ان مسلمانوں کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔ محل سے نکلنے کے بعد بعض مسلمانوں گھاس کے ڈپو میں چھپ کر اپنی جانیں بچائیں ڈیگ کے تمام مسلمان مرد، عورت، بچے اور بوڑھے شہید کر دیئے گئے۔ ۷ ستمبر کو قصبہ کمہیر میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ مہاراجہ بھرت پور اور ماسٹر تارا سنگھ ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے قتل عام کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ۸ ستمبر کو حملہ آوروں کا ہجوم بھرت پور پہنچا اس نے باندی کوٹی سے آنے والی ٹرین پر حملہ کر کے ہندو مسافروں کو اتار لیا اور مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ بھرت پور کے مسلمان جامع مسجد کے کیمپ میں جمع ہونے لگے اور راستے میں اس نے مسلمانوں کے متعدد دیہات تاراج کئے۔ ۹ ستمبر کو تحصیل بیانہ کے مسلمانوں کو ختم کر دیا گیا۔ صرف وہ بچ سکے جو ہندو بن گئے۔ بیانہ کے مسلمانوں نے مقابلے کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اور تین زبردست مورچے قائم کر لئے تھے۔ اس لئے وہاں لڑائی ہونے لگی۔ مہاراجہ بھرت پور نے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اس جنگ کا نظارا دیکھا۔ ۱۰ ستمبر کو مہاراجہ فوج کی کمک لے کر بیانہ پہنچا۔ جس نے حملہ آوروں کی امداد کی مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ بچے کھچے مسلمان قاضی باڑہ کے کیمپ میں جمع ہوئے اور وہاں سے آگرے پہنچا دیئے گئے۔

۱۰ ستمبر کو بھرت پور کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تمہیں بحفاظت تمام آگرے پہنچا دیا جائے گا انہیں رات کے وقت ٹرکوں میں بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ جب یہ قافلہ دارہ کی چوکی پر پہنچا تو اس کی راہ روک لی اور ٹرکوں پر حملہ کر دیا گیا۔ اور بہت سے مسلمان شہید کر دیئے گئے۔

۱۱ ستمبر کو بلوائی روبہاس پر حملہ آور ہوئے وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ڈھائی سو مسلمان لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ ۱۲ ستمبر کو یہ مجمع قصبہ اجین پر حملہ آور ہوا وہاں بھی مسلمانوں کا وہی حشر ہوا جو دیگر مقامات پر ہو چکا تھا۔ مسلمان اب کیمپوں میں جمع ہو چکے تھے۔ بھرت پور کے حکام انہیں آ آ کر ہندو بن جانے کیلئے ورغلاتے تھے۔ گھوسی، تیلی، اور دوسرے بہت سے مسلمان ہندو بننے پر آمادہ ہوتے گئے۔ اور بہت سے ہندو بن گئے۔ وسط ستمبر سے بھرت پور سے مسلمانوں

کے اخراج کی مہم شروع ہوگئی اور قافلے آگرہ اور سندھ کی طرف روانہ ہوتے رہے۔ بہت سے مسلمان جو ہندو بنائے گئے تھے بھاگ کر آگرہ کیمپ میں پہنچتے رہے۔ وسط اکتوبر تک بھرت پور کی ریاست مسلمانوں سے خالی ہوگئی۔

حاجی عنایت اللہ صاحب وآل محمد صاحب لکھتے ہیں:

ریاست ہائے بھرت پور والور میں ریاستی فوج نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور گاؤں کے گاؤں تاراج کر کے رکھ دیئے۔ ہزار ہا لڑکیوں اور عورتوں کا اغوا کیا گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کو جبراً ہندو بنالیا گیا۔ ریاست بھرت پور کے چودہ قصبوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ ریاست الور کے تین بڑے قصبوں مہند پور، منڈاوین، لیل گابانسی میں مسلمانوں کو تہ تیغ کر کے ان کے گھروں کو آگ لگادی گئی۔ میوقوم ہجرت پر مجبور ہوگئی ان میں ستراسی ہزار میواتی دہلی پہنچائے گئے اور بہت سے پاکستان لائے گئے۔ بیس ہزار میو چار ماہ تک ریواڑی کیمپ میں پڑے رہے۔ مسلمانوں کا تمام سامان مال مویشی، غلہ نقد اور زیور چھین لیا گیا وہ صرف تن کے کپڑے لے کر آسکے۔ (۶۴)

ریاست جموں وکشمیر

جناب محمد اسماعیل صاحب نے اپنے ایک دوست کا مکتوب کتاب میں اندراج کے لئے ارسال کیا ہے:

السلام علیکم

خداتعالیٰ کا شکر ہے کہ لاکھ مصیبت اور خطرات کے بعد آج آپ کو لکھنے کا موقع ملا۔ مجھے وہ آپ کے الفاظ بار بار یاد آتے تھے۔ کہ گورنمنٹ مسلمانوں کو بھون کر رکھ دے گی۔ فی الواقع گورنمنٹ نے ایسا ہی کیا۔ ہری سنگھ نلوہ کا زمانہ لوگ بھول گئے۔ پہلے سرکار نے تمام دیہات کو صاف کروایا۔ راشٹریہ سنگ پارٹی فوجیوں کے لباس میں جن کو باقاعدہ وردیاں اور ہتھیار مہیا کئے گئے تھے۔ گاؤں میں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں سرکار کا حکم ہے۔ گاؤں کو خالی کردو۔ چنانچہ سادہ لوح لوگ جب باہر نکلتے تو ان پر بندوقوں اور توپوں سے اس طرح بارش برسائی جاتی کہ قافلہ کا نام تک مٹادیا جاتا اور بعد میں ان کا سامان لوٹا جاتا۔ پل کے پار اسٹیشن کے سامنے جموں میں میراں صاحب، اکھنور چھن روڑیاں اور کھٹوعہ کے پاس مسلمانوں کو ایک جگہ کر کے مسلح فوجوں سے توپیں رکھ کر مروایا گیا۔ باہر جانے کی قانونی اجازت نہ تھی اور جو پاکستان میں جانے کی کوشش کرتا۔ اس کو بھی مروادیا جاتا۔ سانبہ میں ۹۶۵ مسلمان تھے۔ جن میں سے صرف ۶۰ یا ۶۲ کا پتہ چل رہا ہے۔ اور باقیوں کو نالہ میں لٹا کر سب کو تہ تیغ اور نشانہ بندوق بنایا گیا۔ مسلمان جونوجوان لڑکیاں تھیں۔ ان کو اچھوتوں اور بھنگیوں تک میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ مکمل سکیم یہ تھی۔ کہ کسی بھی مسلمان کو زندہ نہ جانے دیا جائے۔ سانبہ میں پیراندتہ نامی ایک شخص کو زندہ پیپل کے درخت کے ساتھ لٹکایا گیا۔ اور نیزوں بلموں اور برچھیوں سے تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ اکھنور میں ایک ہندو تحصیلدار کو جس نے سکیم سے ذرا نااتفاقی کی اور چند مسلمانوں کو زندہ گزرنے کی اجازت دے دی گولی سے مارا گیا۔ تحصیل جمرگڑھ کی ایک معزز عورت کو ننگا کر کے اس کے ساتھ بے حد بے شرمی اور بے حیائی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اور پھر اس کی اندام نہانی پر بندوق رکھ کر مار دیا گیا۔ اسی طرح بڑے

گھرانوں اور خاندانوں کی عورتوں کو اٹال ،ڈوم اور چمارز بردستی لے گئے۔توی کے کنارہ پر دیہاتی اور سادہ مسلمانوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ایک طرف سرکاری ملٹری ہوتی تھی اور دوسری طرف سکھ اور سنگ پارٹی لائنوں کی لائنیں بنا کر تہ تیغ کیا جاتا تھا۔مسلمانوں کے تڑپنے اور چیخ پکار کی آوازیں آتی تھیں۔ایس ایس پی صاحب نے راجہ صحت علی سب انسپکٹر پولیس کو بھیجا کہ جا کر موقع دیکھو اور اصل معاملہ کا پتہ دو۔اس کو سرکاری سپاہیوں نے گولی کا نشانہ بنایا۔ٹھاکر نتھا سنگھ ریٹائرڈ سب انسپکٹر کو جس نے غنڈے آدمیوں کو گرفتار کروانے میں امداد کی قتل کرایا گیا۔ہر فوجی اور پولیس کانسٹیبل بریگیڈیر سے لے کر ادنیٰ ملازم تک غیر مسلح کر کے گرفتار کر لیا گیا۔دیہات کا دورہ اور مسلمانوں کا اخراج کرنے کے بعد جموں شہر کا محاصرہ کیا گیا۔سانبہ سے لے کر اودھم پور تک راجپوتوں،سکھوں،سنگ پارٹیوں،جموں کی ڈوگرہ فوج اور جموں کے ہر نوجوان ہندو کو مدعو کر کے خیموں پر دھاوا بولا گیا۔یہ واقعہ ۱۰ کا تک ۸:۳۰ بجے شام کا ہے۔ایک طرف مندرجہ بالا پارٹیاں اور دوسری طرف نہتے مٹھی بھر مسلمان۔ہر اونچی اونچی بلڈنگ پر مورچے بنائے گئے۔لڑائی لاٹھیوں،پتھروں،اینٹوں،کلہاڑیوں،تیروں،نیزوں،بلموں،ٹکئوؤں،تلواروں،کرپانوں، بندوقوں،سٹین گنوں،برین گنوں،پستولوں،توپوں،اور بموں سے شروع ہوئی۔اتوار کو مسلمانوں کے قدم نرم رہے۔اگلے سوموار کو مسلمان بڑھے ہندوؤں کے مورچوں پر قبضہ کیا۔اور وہاں سے اسلحہ بھی ملا۔جونہی لوگوں پر استعمال کیا گیا۔لیکن ۱۲ کا تک کو مٹھی بھر مسلمانوں کے لئے اس قدر بے پناہ ہجوم کو روکنا محال ہو گیا۔اس لئے ہمارے آدمی ہٹتے گئے۔جو جو مسلمان پیچھے محلوں میں رہ جاتے تھے ان پر ہاتھ صاف کیا جاتا تھا مسلمانوں کو چن چن کر مارا گیا۔باوا جیون شاہ کے مزار کے اندر کئی آدمیوں کو قتل کیا۔وہاں کے جھنڈے کو اتارا گیا۔منارے توڑے گئے۔چھوٹے بچوں کو ان کی ماؤں کی چھاتیوں پر کئی کئی بار کر کے کاٹا گیا عورتوں کے جوڑے ہوئے ہاتھ کاٹے گئے۔ چھاتیوں پر خنجر چلائے گئے۔جس وقت مسلمان ظالم گورنمنٹ کی بے رحمی سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے حکومت کی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہر گھر میں جس میں کہ مسلم لیگ

کا جھنڈا لہرایا جاتا تھا۔ریاست کا پرچم لہرایا۔لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔گولیوں کی بارش متواتر ہو رہی تھی۔ایک مورچہ پرانی منڈی کے قریب شیخ جان محمد کی دکان کے چوبارہ پر تھا۔جس کی گولیاں قصاب بازار کے چوک اور محلّہ دپستیال تک آ رہی تھیں۔ایک مورچہ مت گڑھ میں پنجاب سنگھ کے مکان پر تھا۔جس کی مار بھی ہر چہار طرف آ رہی تھی۔ایک مورچہ جس میں کافی تعداد میں اسلحہ تھا لگی مٹھائی فروش کے مکان پر بازار مکھد اتہ میں تھا۔ایک مورچہ شہر سکھوں کا رزیڈنسی روڈ میں تھا۔جو اردو بازار سے مغرب کی جانب صابون کے کارخانہ کے اوپر تھا۔اور ہزاروں کی تعداد میں ہر طرف مسلمانوں کو ہراساں کیا جارہا تھا۔اس وقت مسلمان صرف دو محلوں میں جمع تھے۔ایک محلّہ دپستیال میں اور دوسرے محلّہ استاد میں۔آخر مسلمانوں کا قافیہ تنگ ہو گیا۔لوگ اپنی بالغ عورتوں کو نئے کپڑا پہنا کر میدان میں لے آئے۔تا کہ وہ بھی گولی سے مر جائیں۔بعض آدمیوں نے بچوں اور عورتوں کو زہر دے دیا۔

ایک شخص مستری عطا محمد نامی نے اپنی تین لڑکیوں کو جو دسویں،نویں اور ساتویں جماعت میں پڑھتی تھیں خود چھری تیز کر کے قتل کیا گویا مسلمانوں پر ایک قیامت کا نظارہ تھا اور نفسی نفسی پڑی تھی۔اسی طرح مسلمانوں کا خاص شہر میں نقصان ہزار اور ڈیڑھ ہزار کے درمیان اندازہ لگایا گیا۔جس وقت دشمن بہت قریب آ پہنچے اس وقت مسٹر نصیر الدین ڈی ایف اوسلار ہہ کا لڑکا سفید جھنڈا نصب کرنے لگا۔اس کو بروقت گولی کا نشانہ بنایا گیا۔اس معرکہ خیز لڑائی میں بے شک ہندو اور فوجی بھی کام آئے جو لڑ رہے تھے۔۶ بجے شام کے قریب حکومت کا حکم آ گیا کہ لڑائی بند کر دو۔سب پارٹیاں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئیں۔اس سے قبل حکومت کو متعدد بار کہا گیا تھا کہ ہماری حفاظت کرو یا ہار جانے دو لیکن حکومت کا جواب ملتا کہ نہ تمہاری حفاظت کی جا سکتی ہے اور نہ ہی تم باہر جا سکتے ہو۔دوسرا گورنمنٹ کا حربہ یہ تھا کہ ہمارا راشن پانی،لکڑی بند کی گئی۔ہندو دکانداروں نے سودا دینا بند کر دیا بھنگیوں نے صفائی کرنی بند کر دی۔جن کو ملتا تھا وہ روکھا سوکھا کھا لیتے تھے اور باقی روزہ رکھ لیتے تھے۔ایک ہفتہ کے بعد کنور دلیپ سنگھ اور وزیر دفاع

سردار بلدیو سنگھ جموں میں آئے اور کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ جموں کو خالی کر دیں۔ کیونکہ حکومت ان کی حفاظت نہیں کر سکتی لیکن یہ سکیم کا دوسرا پہلو تھا کہ اگر سب کے سب مسلمان جموں میں مارے گئے تو اس سے فضا خراب ہو جاوے گی اور دیگر شہری آبادی کو بھی نقصان پہنچنے کا حکم ہوا ہے کہ مسلمان فوراً اپنے اپنے گھروں سے نکل کر پولیس لائنجو گی دروازہ میں چلے جائیں۔ اس افراتفری میں کیا کچھ لیا جا سکتا تھا۔ نکلتے وقت پھر مہاراجہ پٹیالہ کی فوج مورچوں میں داخل ہوگئی اور ایک نہایت مہیب لہجے میں ڈرا رہی تھی۔ ہماری تلاشی ہوئی اور گراؤنڈ میں بٹھایا گیا پھر وہی مظالم دوہرائے گئے راشن پانی بند اور نقل وحرکت بھی بند۔ پہلے ۳۹ لاریاں جن میں کم از کم پچاس آدمی اوپر اور نیچے تھے۔ بھر کر سواریوں کو کہا گیا کہ چلو تمہیں پاکستان میں لے چلیں۔ اور اسی طرح نامعلوم جگہ لے جا کر مختلف گروہوں میں بانٹا گیا۔ اور راستہ میں تلواروں والے سکھوں نے ان کو مختلف جگہوں پر ختم کیا اور نوجوان عورتوں کو اغوا کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے دن پچیس لاریاں پہنچائی گئیں۔ آخر دوسرے دن حکومت کی سکیم کا پتہ چل گیا۔ اور تین آدمی بھی تلواروں سے نکل کر کیمپ میں پہنچ گئے۔ ہمیں ان کی آمد سے پہلے تھوڑا بہت علم ہو گیا تھا۔ چند نیک دل ہندوؤں نے مطلع کر دیا تھا کہ بھوکے پیاسے ٹھہرو اور حالات درست ہو لینے دو۔ پھر ہمیں حالات درست ہونے پر سوچیت گڑھ میں پہنچایا گیا۔ اور ہمارے ساتھ انڈین آرمی کے آدمی لگائے گئے۔ لیکن نصف کے قریب دھوکا دے کر مارے گئے۔

میر پور ریاست جموں کے ایک مظلوم مہاجر الٰہی بخش نے میر پور کے دردناک واقعات بتاتے ہوئے کہا:

ڈوگرہ فوج نے چاندماری کے بہانے بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی اور رائفلوں کا رخ شہر کی طرف کر کے آن کی آن میں کثیر التعداد مسلمان بھون دیئے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ریاست میں ہنوز ''امن وسکون'' تھا اور عام فساد شروع نہ ہوا تھا۔ لیکن فساد کی خبر سنتے ہی ذمہ دار ڈوگرہ افسروں نے ہندوؤں میں اپنے ہاتھ سے آتشیں اسلحہ تقسیم کیا۔ بس پھر کیا تھا؟ نہتے

اور بے گناہ مسلمانوں پر قیامت آ گئی۔ ڈوگروں نے شہر کے چاروں طرف برین گنیں گاڑ دیں تا کہ کوئی مسلمان زندہ بچ کر نہ جائے۔ پھر جموں کی ملٹری نے ڈوگرہ غنڈوں سے مل کر بے پناہ آتشبازی کی اور آنکھ جھپکنے میں سینکڑوں نہیں ہزاروں مسلمان شہید کر دیئے۔ غنڈوں نے مکانوں کی تلاشیاں لے کر مسلمانوں کو چن چن کر مارا۔ عورتوں کو اٹھایا ان کی عصمت برباد کر کے ہلاک کیا۔ دوشیزائیں اغوا کر کے لے گئے۔ اور یہاں تک درندگی وبہیمیت دکھائی کہ نابالغ لڑکیوں کے چلانے اور کراہنے کی حالت میں آبروریزی کی۔ راجہ الٰہی بخش نے بتایا کہ میری دو نوجوان لڑکیاں ڈوگروں نے چھین لیں۔ اور میرے سامنے پانچ بدمعاشوں نے ان کی عزت تباہ کی۔ میرے تین معصوم بچے چھری سے ذبح کئے۔ میری اہلیہ کی آغوش سے شیر خوار بچہ چھین کر اس کا گلا اس قدر گھونٹا کہ ننھا معصوم دس ہی منٹ میں جنت کو سدھار گیا۔ بڈھے باپ کی آنکھوں میں بلّم گھونپ کر اس کا ایک پاؤں کاٹ دیا پھر پیٹ میں برچھیاں ماریں اور اس طرح وہ بزرگ ضعیف تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوا۔ راجہ صاحب نے کہا قصبہ سہانی (ضلع میر پور) میں ڈوگرہ حاکموں کے سفاکانہ حکم سے پردہ نشین حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کیا گیا اور دوشیزاؤں کی کھلے راستوں میں بے حرمتی ہوئی۔ مناور میں چار سو کنواریوں کو اغوا کر کے برہنہ کیا۔ اور ان سے وحشیانہ کاروائی کی گئی۔ کس گمّہ اور پنجیڑی میں ظالموں نے بہت سے ضعیف العمر مرد وزن کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ فوجی افسروں نے قرآن کریم کو پاؤں سے ٹھکرایا۔ ان کے اوراق مقدّسہ پھاڑے اور نذر آتش کئے (نعوذ باللہ) راجوری اور بھمر میں بزرگ مسلمانوں کے گلے میں پھندے ڈال کر درختوں سے لٹکایا اور لوگوں کو دردناک طریق سے مارا۔ دیوار وٹلہ میں ہری سنگھ کے تعلقہ داروں نے اور بھی ستم ڈھایا کہ ضعیف العمر اصحاب کو ایک جھونپڑی میں بند کر کے آگ لگا دی اور جلا کر خاکستر کر دیا۔ نابالغ بچیوں سے شارع عام میں انسانیت سوز ظلم کئے۔ اور نوجوان مستورات کی بحالت برہنگی میدانوں اور مکانوں کی چھتوں پر آبروریزی کی۔ (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی)

چنہنی (ریاست جموں) کے صدیق الحسن قریشی نے جو وہاں کے مڈل اسکول میں

مدرس تھے بتایا:

جموں میں فساد برپا ہونے کی خبر وہاں پہنچ تو چہنی کے فرعون صفت جاگیردار نے فوج، پولیس اور بدمعاشوں کو یہ ظالمانہ حکم دیا کہ مسلمان جہاں ملیں ان کا ایک بچہ زندہ نہ چھوڑا جائے۔ چنانچہ غنڈوں نے ملٹری اور پولیس کی سرکردگی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا۔ بہت سے مسلمان پہاڑیوں میں چھپ گئے۔ جو ہاتھ آئے ان کے گلے پر ظلم کی چھری پھر گئی۔ دو ہی چار روز میں چہنی کا علاقہ مظلوم و بے بس مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے بیان کیا۔ جب ڈوگروں کو معلوم ہوا کہ شہر اور قصبات مسلمانوں سے صاف ہو گئے ہیں تو انہوں نے کونے کھدرے دیکھنا شروع کیے۔ اور تلاش میں جو مسلمان مل جاتا اسے بیدردی سے مار دیا جاتا۔ فوج اور پولیس آگ برساتی اور غنڈے دوسرے ہتھیار کام میں لاتے۔ عورتیں اور جوان لڑکیاں اغوا کر کے افسروں اور جاگیردار کے پاس بھیج دی گئیں جہاں ان کا دامن عصمت داغدار ہوا۔

علاوہ بریں جس جس مقام پر مسلمانوں کو کثیر تعداد میں ہلاک کیا گیا ان مقامات کا خود جاگیردار نے معائنہ کیا۔ جن شہدا کے جسم اطہر تڑپتے نظر آتے۔ وحشی جاگیردار سپاہیوں اور بدمعاشوں کو حکم دیتا کہ انہیں زندہ گاڑ دو۔ ایک جگہ بہت سے نیم جان اور بے جان مسلمان اکھٹے کر کے ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ سفاک جاگیردار نے کئی مسلم نعشوں کے ٹکڑے اپنے ناپاک کُتوں کو کھلائے۔ نعشوں کو ریزہ ریزہ کر کے ان کو پاؤں تلے روندا گیا۔ نابالغ بچیوں سے وحشیانہ کاروائی کی گئی۔ دوشیزاؤں کی عام گزرگاہوں میں عزت بگاڑی گئی۔

منشی صدیق الحسن نے کہا:

میرے بہت سے رشتہ دار اس ہنگامے میں شہید ہوئے۔ باپ، بھائی، بہنیں، بچے، چچا، ماموں، القصہ والدہ کے سوا کنبہ کے سب لوگ شہادت پا گئے۔ اور میں اپنی بوڑھی والدہ کو لے کر بصد مشکل سیالکوٹ میں آیا۔ آتی دفعہ جدھر نگاہ جاتی تھی۔ مسلمانوں کی نعشیں ہی نعشیں نظر آتی تھی۔ انسانی اعضاء جگہ بہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ کتے اور گِدھیں ان کے گوشت سے اپنے شکم پر کر رہے تھے۔ (مرسلہ حکیم سید محمود گیلانی) (۶۵)

دہلی کی سرگزشت

ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام اور اخراج کی مہم ستمبر کے دوسرے ہفتے میں اختیار کی گئی۔ اس شہر میں جس کی خاک کا ذرہ ذرہ مسلمانوں کے شش صد سالہ دورِ حکمرانی کی سطوت و شوکت اور عدل دامن پر شاہد و دال ہے ڈھائی لاکھ مسلمان آباد تھے۔ مشرقی پنجاب کے مسلمان تاراج کئے جا چکے تو دہلی کے مسلمانوں کی باری آ گئی۔

جناب محمد ابراہیم صاحب لکھتے ہیں:

پانچ ستمبر کو جمعہ کی نماز کے وقت ایک سکھ نے گڈ وڈ بہ مارکیٹ کی چھت پر سے ایک عدد بم فتح پوری مسجد کے صحن میں پھینکا جس کے پھٹنے سے دو مسلمان شہید اور چار زخمی ہوئے۔ اس حادثہ کے بعد شہر بھر میں بہتّر گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ تین دن کے بعد کرفیو کھلا تو شہر کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے قتل کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ والوں نے فوجی وردیاں پہن کر رات کے وقت مغلپورہ اور بستی پنجابیاں پر حملہ کیا۔ مسلمان مقابلے پر ڈٹ گئے۔ اس پر حملہ آوروں کی مدد کے لئے ہندوستانی حکومت کی اصلی ملٹری آ گئی جو جاٹ رجمنٹ اور گورکھا رجمنٹ پر مشتمل تھی۔ فوجیوں نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر مسلمانوں کو گولیوں اور سنگینیوں سے ہلاک کیا۔ عورتوں اور بچوں تک میں امتیاز روا نہ رکھا۔ اور ان بستیوں کے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر پرانے قلعے کے کیمپ میں چلے جائیں۔ جہاں دوسرے محلوں کے مسلمان پناہ گزین جمع ہو رہے تھے مسلمان خواتین ننگے سر اور ننگے پاؤں پرانے قلعہ کی طرف چلنے پر مجبور کر دی گئیں۔ فوجی سپاہی گولیاں چلا رہے تھے۔ ہندو اور سکھ غنڈے منظّم طریق سے مسلمانوں کو لوٹ رہے تھے اور خوبرو عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ باڑہ ہندو رائے کی طرف گیا رات وہاں بسر کی۔ اگلے دن صبح کے وقت ملٹری نے اسے پھر تنگ کیا اور پرانے قلعہ کی طرف پا پیادہ جانے کے لئے مجبور کر دیا۔

قرول باغ پر حملہ ہوا وہاں بڑی شدت اور بے دردی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ قرول باغ میں کوئی دو ہزار مسلمان مرد، عورت اور بچے کاٹ دیئے گئے۔ بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے

کر کے عورتوں کی گود میں دے دیئے گئے اور ان سے کہا گیا کہ یہ قربانی کا گوشت کھاؤ۔ عورتوں کے سر کے بال ان کی ٹانگوں سے باندھ کر انہیں چھت کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ اور نیچے آگ جلا دی۔ اس کے بعد پہاڑ گنج پر حملہ ہوا۔ جاٹ رجمنٹ کے سپاہیوں نے گھروں میں گھس کر ہلاکت برسائی اور مکانوں کو آگ لگا دی۔ جو لوگ نکلے ان کی تلاشی لی گئی۔ عورتوں کے زیور اتروا لئے گئے۔ بعض صورتوں میں تو عورتوں اور مردوں کے کپڑے تک اتروا کر انہیں مادرزاد برہنگی کے عالم میں پرانے قلعہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ اس کے بعد ترکمان دروازہ اور بندوق والی گلی پر حملہ ہوا۔ ہندو اور سکھ کوٹھوں پر چڑھ کر مسلمانوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ سڑک پر سکھ اور گورکھے فوجی مسلمانوں کو مار رہے تھے۔

بہادر گڈھ، نزیلہ پنجاب، کھڈرا، فرید آباد شاہدرہ، سبزی منڈی، مہرولی وغیرہ پر شدید حملے ہوئے اور مسلمانوں کو تاراج کر کے انہیں گھروں سے اٹھا دیا۔ ہفتہ ۱۳ ستمبر کو نئی دہلی میں مسلمانوں پر آفت ٹوٹی۔ لودھی روڈ، کناٹ پیلس، مایا روڈ، راجپوت روڈ، بابر روڈ، بیرن روڈ، ترکمان روڈ اور سرکلر روڈ پر مسلمانوں کے کوارٹر، مکان دکانیں اور کوٹھیاں لوٹی گئیں۔ عورتوں کی عصمت ریزی کھلے بندوں کی گئی۔ یہاں بھی سفاکی اور درندگی کے بدترین مظاہرے کئے گئے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے جنینوں کو نیزوں پر لٹکایا اور کہا کہ پاکستان کا جھنڈا بن گیا۔ بچوں کے گوشت کے ٹکڑے ان کی ماؤں کے منہ میں ٹھونسے گئے اگلے دن چاندنی چوک پر حملہ ہوا اور گھنٹہ گھر سے آگے مسلمانوں کی تمام دکانیں لوٹ لی گئیں۔ صرف کوچہ رحمان سے بلّی ماراں تک مسلمانوں کی دکانیں بچی رہیں۔ بلّی ماراں سے آگے اور کھاری باؤلی میں تمام دکانیں لوٹ لی گئیں۔ اللہ دیئے کے کٹڑے میں مسجد ڈھا دی گئی۔ نیل کے کٹڑہ کی دو مسجدیں مندروں میں تبدیل کر لی گئیں۔ پہاڑ گنج کی بڑی مسجد کو دھرم شالا بنایا۔ کوچہ استاد داغ میں جہاں میرا مکان تھا ہندو پولیس نے مسلمانوں کے مکانوں کی تلاشیاں لیں۔ اور بچوں کو دیواروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر ہلاک کیا۔ شہر کے اندر ہندوؤں اور سکھوں کے دو کیمپ تھے۔ وہاں سکھ اور ہندو مسلمانوں کو پکڑ پکڑ لے جاتے تھے اور بکروں کی طرح ذبح کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کو خیمے کی

میخوں سے باندھ کر اپنے بچوں سے کہتے تھے کہ ان پر تلوار چلاؤ ان کو نیزے سے مارو۔

دفیدار بشیر احمد صاحب جو وائسرائے کی باڈی گارڈ میں تھے رقم طراز ہیں:

سات ستمبر کو مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو حکم ملا دہلی میں گڑبڑ شروع ہوگئی اس لئے وہاں جاؤ۔ ہمارے جوانوں کی ایک پارٹی پیدل اور ایک جمعیت آرمرڈ کار پر دہلی پہنچی۔ ہماری ڈیوٹی پہاڑ گنج میں لگی۔ اس وقت پہاڑ گنج کے مسلمان بڑی دردناک مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے۔ ہاؤ ہو کا شور برپا تھا۔ ہندو اور سکھ جتھے مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر رہے تھے مسلمان بدحواس ہو کر بھاگ رہے تھے۔ ان کے پیچھے سکھ ننگی تلواریں لئے انہیں قتل کرتے آ رہے تھے۔ جب بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو علم ہوا کہ لیڈی ہارڈنگ ہسپتال کے قریب مسلمان فوجیوں کی گارڈ لگی ہے تو وہ اس طرف آنے لگے اور آدھا گھنٹہ میں وہاں کوئی پندرہ ہزار پناہ گزین جمع ہوگئے۔ سکھوں نے پیچھے سے ان پر بھی حملہ کر دیا۔ گارڈ نے ان پر گولی چلائی۔ کئی سکھ گرا لئے یہ حال دیکھ کر وہ بھاگ گئے۔ انہوں نے ہندو رجمنٹ کے سکھ کیپٹن کو رپورٹ دی کہ ہسپتال کے قریب مسلمان فوجیوں کی ایک جمعیت ہے جس نے سکھوں کا ستیاناس کر دیا۔ اس کپتان نے ہمارے اوپر ایک ہندو دستہ متعین کر دیا اور ان کو حکم دے دیا کہ اگر یہ مسلمان کسی سکھ یا ہندو کو گولی کا نشانہ بنائیں تو ان پر برین گن سے فائر کر دینا۔ اسی اثناء میں ہمارا انگریز کمان افسر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ہمیں وہاں سے نکالا اور پناہ گزینوں کو پہاڑ گنج سے باہر لے جا کر ایک کیمپ لگا دیا۔ حفاظت کے لئے گارڈ متعین کر دی۔ اس گارڈ کا کمانڈر میں تھا۔ رات بھر ہمارے جوان آرمرڈ کار میں بیٹھ کر کیمپ کے گرد چکر لگاتے رہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پہاڑ گنج کے اندر مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گھس کر انہیں قتل کر رہے تھے۔ کرفیو آرڈر کے باعث مسلمان گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے تھے لیکن ہندو اور سکھ کھلے بندوں اپنا کام کر رہے تھے۔ حملہ کرنے والوں کی تین پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی شہید کرنے والوں کی تھی۔ دوسری لوٹنے والوں کی اور تیسری آگ لگانے والوں کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو ایک مسجد کو آگ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے ان پر فائر کئے وہ بھاگ گئے لیکن ایک

ہندو کیپٹن نے کہا کہ یہ تمہارا علاقہ نہیں اس لئے تم یہاں سے چلے جاؤ مجھے مجبوراً واپس آنا پڑا۔

۸ ستمبر کو مجھے حکم ملا کہ تم اپنے جوانوں کی ایک مسلح کار اور سکھ جوانوں کی ایک مسلح کار لے کر پٹیل کی کوٹھی پر رپورٹ کرو۔ ۹ بجے جا کر رپورٹ کی۔ وہاں سے بلدیو سنگھ اور پٹیل ایک موٹر کار میں بیٹھ کر گشت کے لئے روانہ ہوئے۔ ہماری مسلح کار آگے اور سکھ گارڈ والی پیچھے تھے۔ وہاں سے ہم سیدھے کناٹ پیلس پہنچے۔ وہاں جا بجا لاشیں پڑی تھیں۔ مسلمانوں کے سروں کی ٹوپیاں اور عورتوں کے برقعے خون میں لت پت ہر طرف بکھرے ہوئے تھے مسلمانوں کی دکانیں لوٹی ہوئی تھیں اور ان میں اکثر جلائی جا چکی تھیں۔ بلدیو سنگھ اور پٹیل کار میں بیٹھے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ کناٹ پیلس سے ہم پہاڑ گنج پہنچے وہاں میں نے رات کو جو کیفیات دیکھیں ان سے تین گنا زیادہ دن کو دیکھیں۔ سڑکوں پر لاشیں اس کثرت سے پڑی تھیں کہ گاڑیوں کا گزرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پولیس اور فوج کے سپاہی بھنگیوں سے لاشیں اٹھوا اٹھوا کر انہیں آگ لگوا رہے تھے۔ میں قہقہہ کی زوردار آواز سن کر پیچھے کی طرف دیکھا کہ بلدیو سنگھ نے قہقہہ مار کر پٹیل کی طرف ہاتھ مارا۔ یہ کیفیت دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

وہاں سے ہم قرول باغ اور ملتانی ڈھانڈا کی طرف نکلے وہاں زمین کے اوپر ایک ایک گز کے فاصلے پر لاشیں پڑی تھیں۔ کئی جگہ لاشوں کے ڈھیر لگا کر ان پر کوڑا کرکٹ پھینک رکھا تھا۔ گندے پانی کی نالیوں میں خون جم کر رہ گیا تھا۔ ادھر سے ہم سبزمنڈی کی طرف گئے وہاں پہاڑ گنج سے بھی زیادہ ہولناک نظارے دیکھنے میں آئے۔ وہاں ہم نے گاڑیوں کو روکا کیونکہ لاشوں کی وجہ سے راستہ نہیں تھا۔ ایک سڑک کے داہنے موڑ پر میں نے دیکھا کہ قریباً ایک سو بچوں کی لاشیں یکجا اکٹھی کی ہوئی تھیں۔ ایک سکھ دکاندار قرآن پاک کے اوراق میں سودا ڈال ڈال کر بیچ رہا تھا۔ ایک عورت کی برہنہ لاش اس کی دکان کے سامنے پڑی تھی۔ پٹیل اور بلدیو سنگھ یہاں سے واپس چلے گئے۔ وہاں سے مجھے حکم ملا کہ تم اپنی آرمرڈ کار لے کر ترکمان دروازہ کو جاؤ۔ وہاں گورکھے متعین تھے اور کرفیو لگا ہوا تھا۔ گورکھے شرابیں پی رہے تھے اور گلیوں میں ٹہل رہے تھے۔ انگریز افسر کو میں نے حکم دکھایا کہ اس محلّہ پر میری ڈیوٹی لگی ہے۔ اس پر اس افسر نے گورکھوں کو رخصت

کر دیا۔ محلّہ کے ہندوؤں نے مجھے ڈوگرا خیال کیا اس لئے وہ آ آ کر کہنے لگے کہ ہم تمہیں شراب وغیرہ دیتے ہیں ایک کمرے میں بیٹھ کر دادعیش دو۔ میں نے انہیں جانے کے لئے کہا وہ نہ ٹلے اس پر میں نے ان پر دو فائر کئے۔ وہ سب بھاگ گئے۔ مسلمان چار دن سے گھروں میں بند تھے۔ میں انہیں خوردنوش کی اشیا جمع کرنے کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں نے مسجدوں میں جمع ہو کر نوافل اور اوراد پڑھے۔ شام کو انگریز مجھے ساتھ لے کر حوض قاضی کی طرف گیا وہاں ہندوؤں نے ایک بڑا لنگر جاری کیا ہوا تھا۔ مٹھائی اور پوری تقسیم ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سے کچھ نہ کھایا اور ترکمان گیٹ میں واپس آنے پر مسلمانوں نے مجھے اور میرے ساتھی جوانوں کو کھانا کھلایا۔ رات وہاں امن سے گزری اگلے روز مجھے پہاڑ گنج کے پناہ گزینوں کے کیمپ میں جانے کا حکم ملا۔ اس روز پناہ گزینوں کو لاریوں میں بٹھا بٹھا کر ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک ایک لاری میں تین تین سو مرد عورت اور بچے ٹھونسے جا رہے تھے۔ لاریوں پر سوار کرانے سے پہلے تلاشی لی جاتی تھی۔ لاریاں دو دو گھنٹے دھوپ میں کھڑی رہتی تھیں۔ بچے پانی مانگتے تھے تو انھیں جھڑک دیا جاتا تھا۔ شام کے قریب سو لاریاں چلائی گئیں اور حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے مزار کے سامنے کھڑی کر دیں۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پناہ گزین چیخنے چلانے لگے۔ یہ لاریاں واپس لائی گئیں۔ میں نے اپنی آرمرڈ کار کی سرچ لائٹ کی مدد سے ان سب کو کیمپ کی چار دیواری میں داخل کیا ہم رات کے گیارہ بجے تک یہ کام کرتے رہے۔

اگلے روز ہمیں حکم ملا کہ پرانے قلعہ میں جا کر پناہ گزینوں کے کیمپ کی حفاظت کرو۔ وہاں پہنچ کر میں نے قلعہ کی چار دیواری کے گرد چکر لگایا۔ جنوب کی جانب جنگل میں پناہ گزینوں پر حملہ کرنے کے لئے ہندوؤں اور سکھوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ میں نے اس پر فائر کر کے انہیں وہاں سے منتشر کر دیا۔ اس سے اگلے دن فیض بازار میں میری ڈیوٹی لگی وہاں مسلمانوں کی تلاشیاں ہو رہی تھیں۔ سبزی کاٹنے کی چھریاں، بچوں کے کھیلنے کی ایئر گن یا پانی کے نل کی نالی ملتی تھی تو اسے بھی اسلحہ تصور کیا جاتا تھا۔ اگلے دن اخباروں نے چھاپا کہ فیض بازار کے مسلمانوں کے گھروں سے تلواریں اور رائفلیں برآمد ہوئیں اور ۱۸ انچ دہانہ کی ایک توپ بھی ملی۔ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہاں

سے کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی تھی۔اس کے اگلے دن مجھے شاہدرہ جانے کا حکم دیا گیا۔ وہاں میں نے ایک شہید کی ہوئی مسجد دیکھی جس کا نام ونشاں تک مٹا دیا گیا تھا۔ میں نے شہر کا چکر لگایا۔ وہاں مجھے کوئی مسلمان نظر نہیں آتا تھا۔دکانیں لوٹی ہوئی اور جلائی ہوئی تھیں۔مسلمان کئی مقامات پر چار دیواری کے اندر بند تھے چار دن سے انہیں کھانے پینے کو بھی کچھ نہ ملا تھا میں نے بعض جگہ کے پناہ گزینوں کے لئے راشن حاصل کرنے کا بندوبست کیا۔ پانچ دن کے بعد دہلی میں کچھ امن ہو گیا پھر ہم لوگ شہر نہ جا سکے۔

پیر عرفان احمد قریشی فہمی اپنے بیان میں لکھتے ہیں:

فتح پوری کی مسجد میں پانچ ستمبر کو بم پھینکا گیا اس کے بعد شہر بھر میں اسّی گھنٹہ کا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔اس کرفیو کے دوران میں حکومت نے حملہ آوروں اور ملٹری کی مدد سے مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی بستیاں جو شہر سے دور تھیں خالی کرالیں۔سبزی منڈی قرول باغ، لاری اڈا، اور نبی کریم وغیرہ میں بہت تباہی مچائی۔صبح کے وقت دو گھنٹہ کے لئے کرفیو کھلتا تھا تو ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قافلوں کی صورت میں فراش خانے سے گزرتے تھے۔فراش خانہ، تیاریاں اور بلّی ماراں کے محلے ابھی تک بچے ہوئے تھے لیکن وہاں کے مسلمان بھی سر سے کفن باندھے بیٹھے تھے۔ دس دسمبر تک سبزی منڈی، پہاڑ گنج، نبی کریم، قرول باغ اور نئی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ ان علاقوں میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا۔

میں نے عیدگاہ کے کیمپ کو دیکھا وہاں ایک لاکھ کے قریب مسلمان جمع تھے۔ ہر خاندان اپنے اپنے شہیدوں کا ماتم کر رہا تھا۔ان کے پاس نہ کھانے کو کچھ سامان تھا نہ اوڑھنے کو کپڑا۔ نہ طبی امداد ملتی تھی۔ پانی بھی بہت کم یاب تھا۔عورتوں کے سروں پر برقعے تو کجا دوپٹے تک نہ تھے۔ وہ بیبیاں جن کا آنچل تک کسی نے دیکھا تھا آسمان کی چھت کے نیچے بھوکی پیاسی پڑی تھیں۔

۱۸ ستمبر کو رات کے ۱۲ بجے ہندو ملٹری نے اونچی اونچی عمارتوں پر چڑھ کر مسلمانوں کے گھروں پر گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ یہ حال دیکھ کر میں اپنے کنبے کے افراد کو لے کر پرانا قلعہ کے کیمپ میں چلا گیا۔اتفاق سے اس روز ایک اسپیشل لاہور جا رہی تھی میں نے اس اسپیشل میں اپنے

تمام خاندان کو صرف چند بستر اور چند پہننے کے کپڑے دے کر سوار کرا دیا۔اور میں خود پرانے قلعے میں ٹھہر گیا۔ یہ ٹرین مورخہ ۱۹ ستمبر کو دہلی نظام سے ۱۱ بجے چلی اور چھ روز بعد لاہور اس حالت میں پہنچی کہ ۶/۱ حصہ بھوک پیاس سے مر چکا تھا۔ کچھ مہاجر حملے میں مارے گئے۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ گاڑی کا سکھ ڈرائیور اسے اس قدر آہستہ چلاتا تھا کہ پیدل آدمی بھی اس سے تیز چل سکتا تھا۔ بیاس کے اسٹیشن پر یہ گاڑی چھٹے دن پہنچی ڈوگرا فوج اتر کر نیچے کھڑی ہوگئی۔ رات کے ۹ بجے گاڑی پر مسلح سکھوں نے دونوں طرف سے حملہ کر دیا۔ایک پارٹی دور سے گولیاں چلا رہی تھی دوسری بلّم اور تلوار سے کاٹ رہی تھی۔ تیسری پارٹی لوٹ رہی تھی۔ چھ گھنٹے تک گاڑی پر حملہ ہوتا رہا۔میرے خاندان کے تمام افراد بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔ بچے سِسک رہے تھے۔گاڑی میں ایک گلاس پانی ۳۰۰ روپوں تک فروخت ہوا۔فروخت کرنے والے بھی ہم میں سے ہی تھے۔مگر اللہ تعالیٰ نے ان غداروں کو سزا بھی اس وقت دے دی میرے بہنوئی پیر سید احمد کا بیان ہے کہ ہر اس شخص کے گولی لگی جس نے پانی یا روٹی قیمت لے کر دیا اور وہ تندرست وسلامت گولیوں میں بیٹھے رہے۔ تین ہزار مہاجرین میں صرف تین سو یا اس سے کم زندہ بچے باقی سب کو ظالموں نے شہید کر دیا ان میں سے بھی اکثر زخمی تھے۔ جس ڈبے میں میرے خاندان کے افراد بیٹھے تھے وہ حملے سے اور لوٹ سے بچا رہا۔ کیونکہ اس ڈبے میں تقریباً سب لوگ بیہوش تھے۔جن ڈبوں سے غل مچانے کی آوازیں آتی تھی حملہ آور اسی طرف جاتے تھے۔ چھ گھنٹے بعد حملہ ختم ہوا جب کہ محافظ ملٹری کو یہ خبر ملی کہ پیچھے سے ایک اور ٹرین جس میں ''پاکستانی فوج'' ہے آ رہی ہے۔ کچھ حالات پرانے قلعے کے بھی سن لیجئے۔ میں وہاں پورے ایک ماہ رہا۔حکومت کی طرف سے راشن میں پہلے تو چاول تقسیم کئے جا رہے تھے جو کہ انسانوں کے کھانے کے قابل نہ تھے یا چاول کے ٹوٹے ہوئے ذرّے جن کو کنکی کہتے ہیں۔ خیمے صرف ان لوگوں کو دیئے جاتے جن کا کچھ اثر ہوتا تھا یا جو کارکنوں کے عزیز یا دوست تھے۔غریب اور محتاج لوگ، بارش اور دھوپ میں صرف لکڑی کے تختوں کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ پانی کی اس قدر قلت تھی کہ جو بیان نہیں کی جا سکتی۔ ہر شخص کو پیچش ہوگئی تھی۔ ہیضہ اس قدر زوروں پر تھا کہ

پرانے قلعہ سے باہرایک بہت بڑا قبرستان آباد ہوگیا تھا۔ راشن دوآدمیوں کوایک چاول کا ڈبہ (سگریٹ کا ڈبّہ) دیا جاتا تھا اوروہ بھی صرف ایک وقت شام کو۔ اوروہ بھی بانٹنے والے حضرات کی مہربانی سے خالی ہوتا تھا۔ میرے ماتحت ایک ہزار آدمی تھے جن کو میں راشن تقسیم کرتا تھا۔ سب مفلوک الحال اورزندگی سے بیزار تھے۔ میں نے پرانے قلعے میں بہت سے ایسے خاندانوں کو دیکھا اوراسی حالت میں دیکھا کہ منہ سے بے اختیار ''اللہ الصمد'' نکل جاتا تھا۔ میں نے وہاں سینکڑوں ایسی عورتیں دیکھیں جن کے شوہر شہید ہو چکے تھے۔ اوران کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جن کی دیکھ بھال کرنے والا سوائے خدا کے کوئی نہ تھا۔ یہی حالت ہمایوں کے مقبرہ کے کیمپ میں تھی۔ آخر مورخہ ۱۹ اکتوبر کو میں اسپیشل میں سوار ہوکر ۲۰ اکتوبر کو ۶ بجے شام مغل پورہ اترا۔

جناب نوشے خاں صاحب موٹر ڈرائیور رقم طراز ہیں:

اگست کے مہینے میں اپنی ٹیکسی پر مسافروں کو بٹھا کر دہلی سے باہر لے جایا کرتا تھا۔ راستے میں اکثر دیہات جلے ہوئے اور برباد حالت میں نظر آتے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا تھا کہ یہ مسلمانوں کے گاؤں تھے جنہیں ہندوؤں نے تباہ وبرباد کردیا ہے اور مسلمانوں کو مار دیا ہے۔ ڈوگرا ملٹری مسلمانوں پر گولیاں چلاتی تھی۔ اوران کے گاؤں کو جلادیتی تھی۔ ۵ ستمبر کو دہلی میں مسلمانوں پر حملے شروع ہوئے۔

۱۴ ستمبر کو پی ڈبلیو ڈی کے ملازموں کی ایک اسپیشل ٹرین نظام الدین اسٹیشن سے چلی میں بھی اس میں سوار ہوگیا۔ یہ گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہوئی برنالہ پہنچی جو ریاست پٹیالہ میں واقع ہے۔ یہاں گاڑی تین گھنٹہ کھڑی رہی۔ ڈوگرا گارڈ کے انگریز کمانڈر نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ گاڑی غلط لائن پر آگئی ہے اس لئے واپس جائے گی۔ اندریں اثنا بہت سے ہندو اور سکھ جو بھالوں، نیزوں اور تلواروں سے مسلح تھے وہاں جمع ہونے لگے۔ کمانڈر کے اصرار پر گاڑی آہستہ آہستہ چلی اور سگنل پر جا کر رک گئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے حملہ آوروں کو اس مقام پر جمع ہونے کے لئے کہہ رکھا تھا۔ انہوں نے ٹرین پر حملہ کیا۔ ڈوگرا فوج نے گولی چلانے

سے انکار کردیا۔ انگریز کمانڈر نے فائر کئے اور حملہ آور پیچھے ہٹ گئے۔ گاڑی وہاں سے چلی اسی طرح راستے میں تین چار جگہ حملے کے خطرے پیش آئے اور گاڑی ۴۸ گھنٹے کے بعد قصور پہنچی۔

جناب اشفاق احمد صاحب ٹیلر ماسٹر رقم طراز ہیں:

۵ ستمبر سے ۹ ستمبر تک ہمارے مکان واقعہ بیر روڈ نئی دہلی میں کوئی سات سو مسلمان پناہ گزین جمع ہوگئے۔ کیونکہ پرانی اور نئی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام جاری تھا۔ ہم لوگ چار دن تک بے آب ودانہ اپنے مکان میں بند رہے۔ ہمارے مکان کے دونوں طرف مشین گن لگادی گئی۔ سڑکوں پر سینکڑوں لاشیں پڑی نظر آرہی تھیں۔ چوتھے روز ہم نے مکان کی پچھلی دیوار توڑی اور ادھر سے نکل کر ہم جامع مسجد کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ہم پر شدید حملے کئے گئے۔ سات سو میں سے چار سو مسلمان چاندی والوں کے محلّہ میں محصور ہوگئے۔ ہندو مکانوں کو آگ لگا رہے تھے اس لئے رات کے دوران میں کئی مکان بدلنے پڑے۔ صبح کو وہاں سے چلے اور گلیوں میں سے گزرتے ہوئے کسیر ووالے محلّہ میں پہنچے تو دیکھا کہ بہت سے سکھ ننگی تلواریں لئے قطار باندھے کھڑے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر ہماری جمعیت کے ڈھائی سو مسلمان واپس محلے میں چلے گئے۔ اور باقی آگے نکل کر فراش خانہ میں پہنچ گئے۔ ہمارے ساتھ ایک رائفل والا مسلمان جوان تھا جس نے خاکی وردی پہن رکھی تھی اس لئے ان سکھوں نے ہم سے کوئی تعرض نہ کیا۔

کسیر ووالے محلّہ میں ہندو اور سکھ بڑے منظّم طریق سے کام کررہے تھے۔ ایک ٹولی ہندوؤں کی تھی جنہوں نے اپنے بازوؤں پر سفید پٹی باندھ رکھی تھی۔ یہ ٹولی مسلمانوں کو لوٹ رہی تھی اور مال ہتھیانے کے بعد مسلمانوں سے کہتی تھی کہ اس پتلی گلی کی راہ سے نکل جاؤ۔ پتلی گلی کے باہر سکھوں کا ایک گروہ کھڑا تھا جس نے سرخ پٹی باندھ رکھی تھی یہ گروہ مسلمانوں کو قتل کررہا تھا۔ تیسرا گروہ مسلمانوں کا ہمدرد بن کر انہیں گھروں سے باہر نکال رہا تھا۔ اور سکھوں کے ہاتھ سے قتل کرادیتا تھا۔ جو مسلمان چاندی والوں کے محلّہ میں محصور ہوگئے تھے ان کو نکالنے کے لئے بڑی جدوجہد کی گئی اور ہندو حکام جواب دیتے تھے کہ ہمیں فرصت نہیں مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ میں کیا کرسکتا ہوں۔

تیسرے دن فراش خانہ میں بھی بھگدڑ مچ گئی اور میں اپنے خاندان کے افراد کو لے کر حوض قاضی اور چاؤڑی بازار سے ہوتا ہوا جامع مسجد میں پہنچا۔ راستے مسلمانوں کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ ہندو اپنے کوٹھوں پر سے فائر کر کے مسلمانوں کا شکار کھیل رہے تھے۔ جامع مسجد سے تانگوں پر سوار ہو کر پرانے قلعہ کو جانے کا خیال تھا لیکن تین تانگے والے خون میں لت پت واپس آئے دیکھے تو انہوں نے کہا ہم سواریاں لے کر جا رہے تھے کہ دریا گنج میں حملہ ہوا اور بارہ قصاب جو تانگوں میں بیٹھے قتل کر دیئے گئے۔ لاری کرایہ پر لے کر پرانے قلعے پہنچے۔ ایک ہفتہ بعد مسٹر انور ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر آئے انہوں نے بتایا کہ چاندی والوں کے محلّہ میں ہمارے قافلہ کے جو ڈھائی سو مسلمان محصور ہو گئے تھے وہ سب قتل کر دیئے گئے ان میں سے میں ہی ایک بچ کر آیا ہوں۔ ملٹری کے ایک مسلمان سپاہی نے مجھے اٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا۔ میں لاشوں کے ڈھیر میں پڑا دیکھ رہا تھا کہ جو زخمی مسلمان سسکتا ہوا اور دم توڑتا ہوا نظر آتا تھا اسے بھی لٹھ مارتے اور کہتے تھے کہ یہ سؤر ابھی تک زندہ ہے۔ وہ پٹرول لینے کے لئے گئے تو میں رینگتا ہوا ایک جلے ہوئے مکان میں روپوش ہو گیا۔ جہاں سے ایک فوجی سپاہی نے مجھے ہسپتال پہنچایا۔

سردار قریشی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

۵ ستمبر کی رات کو ایک بجے کے قریب نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کی طرف شور وغل بلند ہوا اور ہمارے محلے میں بھی نعرے لگنے لگے۔ بازار میں لکڑی چلنے کی آواز ایک گھنٹہ تک برابر آتی رہی پھر مکمل سکون ہو گیا اور ہم لوگ گلی اور کٹڑہ میں پہرہ بٹھا کر آرام سے سو گئے۔ اگلے دن شام کے وقت کرفیو کے باوجود صدر اور منڈی کی طرف شعلے بلند ہوتے دکھائی دینے لگے۔ اس سے اگلے دن یعنی ۷ ستمبر کو جب صبح کے وقت دو گھنٹہ کے لئے کرفیو کھلا تو کھٹہ ٹاکیز کی طرف لوٹ مار شروع ہو گئی۔ اور جنرل مارکیٹ میں بے پناہ آگ لگا دی گئی۔ دس بجے سے فائر شروع ہوئے جو دن بھر جاری رہے۔ ایک نوجوان یٰسین نام میری چھت پر بیٹھا حالات کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کے سینے میں گولی لگی وہ تڑپ کے نیچے گرا اور جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ ۸ ستمبر کو صبح پانچ بجے سے گولیاں چلنی شروع ہو گئیں۔ فائرنگ اس زور کی تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ملٹولہ کی جانب سے

ہمارے کٹڑہ پر بم برسائے جا رہے تھے۔ ہندو ملٹری نے بڑی مسجد کے بُرجوں کے پاس کھڑے ہو کر گھروں کے اندر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے شہید ہونے لگے۔ میں نے حکیم جی کے گھر کی دیوار توڑ کر کٹڑے کے اندر جانے کا راستہ بنایا اس راہ سے گلی کی تمام عورتیں اور بچے کٹڑہ میں چلے گئے۔ وہاں سے ایک دیوار توڑ کر سب کو ڈوروالی گلی میں ڈال دیا۔ میں نے قیمتی کپڑوں کی ایک گٹھڑی اور تمام نقدی اپنی بیوی کے سپرد کر دی اور اسے اپنے تمام عزیزوں اور رشتہ دار و کے نام اور پتے لکھ دیئے اور کہہ دیا کہ اگر میں مارا جاؤں یا تم سے الگ ہو جاؤں تو ان میں سے کسی کے پاس چلی جانا۔ اس وقت عجیب منظر تھا۔ مائیں اولاد کا دودھ بخش رہی تھیں۔ بیویاں شوہروں کو مہر معاف کر رہی تھیں۔ شوہر اپنی بیویوں کی غلطیاں بخش رہے تھے۔ سروں پر سے گولیاں سائیں سائیں کرتی گزر رہی تھیں۔ گھروں کے سائبان اور پردے کی چادریں گولیوں سے تاشوں کی طرح بج رہی تھیں۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ جب بلوائی قریب پہنچ گئے تو ایک اور دیوار توڑ کر کوچاندی والوں کی گلی میں ڈال دیا۔ میں نے ایک مکان میں پناہ لی۔ سات بجے فائرنگ بند ہوئی۔ اطلاع ملی کہ محلّہ سنگ تراشاں کے سینکڑوں آدمی کاٹ دیئے گئے ہیں سارے محلے میں سے ایک لڑکا اور ایک آدمی دکاندار بچ کر آ سکے ہیں۔ رات جوں توں کر کے کاٹی۔ ۹ ستمبر کو ہمارے محلّہ کے سب لوگ صلاح ومشورہ کر کے قافلے کی صورت میں نکل کھڑے ہوئے۔ ادھر سے فائر ہونے لگے۔ جب ہم بازار میں پہنچے تو دیکھا کہ سارا بازار لاشوں سے اور قرآن کریم کے ورقوں پٹا پڑا ہے۔ قدم دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ رائے جس کے چھتہ میں ہندو اور سکھ قطار باندھے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر واپس آئے تو جان سے مار دیئے جاؤ گے۔ جب نئی دہلی کے اسٹیشن پر پہنچے تو ایک طرف سے قافلے پر گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف تلواروں سے کاٹا جا رہا تھا۔ لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ وہیں سے نورا کی بیوی اور بھاوج کو اٹھا کر لے گئے۔ میں نے اپنا سامان پھینکا اور عشرت کو گود میں اٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ باقی بیوی بچوں کو وہیں چھوڑ دیا۔ لوگ کثیر تعداد میں مارے جا رہے تھے۔ جب میں پل کے نیچے پہنچا تو ناصرہ کی آواز آئی بابو میاں میرے اچھے بابو میاں مجھ کو اپنے ساتھ لے چلو اس آواز کا سننا تھا کہ

قدم رک گئے مڑ کر دیکھا تو ناصرہ اور اس کی والدہ ننگے پاؤں بھاگی چلی آ رہی تھیں۔ قصہ مختصر ملٹری نے ہم لوگوں کو موتیا کھان کے میدان میں ڈال دیا۔ تین دن وہاں بھوکے پیاسے پڑے رہے۔ پیاس کی شدت سے لوگ مرنے لگے۔ تیسرے روز ایک مسلمان فوجی افسر وہاں آیا۔ میری منت وزاری پر وہ ہمیں پرانے قلعے کو لے جانے پر راضی ہوگیا۔ باقی سب لوگ وہیں پڑے رہے۔ پرانے قلعہ سے جامع مسجد کا راستہ کھلا تھا۔

میرے والدین وہاں ایک رشہ دار کے گھر پہنچ چکے تھے۔ میں بھی بچوں کو لے کر وہیں چلا گیا اور وہاں سے میں نے بستر کپڑے وغیرہ ضروری سامان خرید کیا جو کوڑیوں کے مول بک رہا تھا۔ میرے پہنچنے کے چوتھے دن دریا گنج میں بھی قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ چنانچہ ادھر والے بھی قافلے کی شکل میں پرانے قلعہ کی طرف چل پڑے۔ ایک ہفتہ وہاں رہنے کے بعد میں نے گاڑی میں سوار ہونے کا انتظام کرلیا۔ والدین سے کہا لیکن وہ رضامند نہ ہوئے ناچار دل پر جبر کر کے بیوی بچوں کو لے کر نظام الدین اسٹیشن سے گاڑی پر سوار ہوگیا۔ کھنہ اسٹیشن تک گاڑی خیریت سے آئی۔ وہاں تین گھنٹہ کھڑی رہی۔ وہاں سے چلی تو تین میل کے فاصلے پر جا کر رک گئی۔ اور سکھوں نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ ملٹری کی گارڈ نے اس حملے کو پسپا کیا۔ جب ہم لدھیانہ پہنچے تو وہاں چار سو آدمیوں کی لاشیں پڑی ہوئی دیکھیں۔ معلوم ہوا کہ ہم سے پیشتر جو اسپیشل آئی تھی اسے اس مقام پر ختم کر دیا گیا تھا۔ جہاں ہماری ٹرین پر حملہ ہوا تھا۔ ۲۳ ستمبر کو ہماری گاڑی جالندھر پہنچی وہاں ہم تین دن بھوکے پیاسے پڑے رہے۔ تیسرے روز مسلمان فوجیوں کی ایک اسپیشل آئی چھ سات سو آدمی زبردستی اس میں سوار ہوگئے۔

عجیب منظر تھا ماں کو اپنے بچے کی پرواہ نہ تھی۔ کسی نے بیوی کو چھوڑا کسی نے بیٹے کو اور خود سوار ہوگیا۔ گاڑی وہاں سے چلی ٹرین کے اندر فوجی بیٹھے تھے چھتوں پر پبلک تھی۔ جب گاڑی امرتسر سے گزری تو ٹرین کو اس زور کا جھٹکا لگا کہ کئی آدمی چھتوں پر سے گر کر مر گئے۔ پھر وہاں فائرنگ شروع ہوگئی۔ جو برابر پندرہ گھنٹے تک جاری رہی۔ ملٹری گارڈ نے حملہ آوروں کو گاڑی کے قریب نہ آنے دیا۔ ملٹری والے مسافروں کو گاڑی سے اتار کر امرتسر لے آئے اور ان

سے کہا تمہارے لئے دوسری گاڑی کا انتظام کیا جائے گا۔ لیکن میں بال بچوں سمیت فوجیوں کی اسی اسپیشل میں ۲۶ ستمبر کو لاہور پہنچ گیا۔

جناب امام الدین صاحب رقم طراز ہیں:

ہم سبزی منڈی دہلی کے ساکنین تھے۔ ۸ ستمبر کو ہندو اور سکھ بلوائیوں نے سبزی منڈی پر حملہ کر دیا۔ ہمارے پاس لائسنس کی ایک رائفل تھی اور ایک بندوق تھی، میں رائفل لے کر کوٹھے پر چڑھ گیا۔ آٹھ نو طرف سے ہم پر فائر ہو رہے تھے۔ میں نے فائر کئے اور کچھ بلوائیوں کو مارا اور زخمی کیا میرے بڑے بھائی فرید الدین بھی بندوق سے فائر کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی متعدد بلوائی جہنم رسید کئے۔ اس کے بعد میرے چچا چھت پر آ گئے جنہوں نے مجھ سے رائفل لے کر خود گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ اتنے میں پولیس آ گئی اس نے ہم پر فائر کئے لیکن ہم میں سے کسی کو گزند نہ پہنچا۔ پچیس منٹ بعد ملٹری آ گئی۔ والد صاحب کہنے لگے کہ اب ملٹری امن قائم کر کے بلوائیوں کو گرفتار کرے گی لیکن واقعہ اس کے برعکس پیش آیا ملٹری نے آتے ہی بلوائیوں سے پوچھا کہ مسلمانوں کے مکان کون کون سے ہیں اور برین گنوں اور اسٹین گنوں سے فائر کرنے لگے۔ ایک گھنٹہ کے فائرنگ کے بعد فوجی سپاہی ہمارے گھر کی چھت پر چڑھ آئے۔ کچھ دیہاتی بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہم کمروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں چھت پھاڑنے کی آواز آئی چھت پھاڑ کر پٹرول ڈالا دیا گیا اور آگ لگا دی گئی۔ جب آگ لگی تو ہم سب جن میں محلّہ کے کچھ لوگ بھی تھے باہر نکلے۔ ملٹری نے اوپر سے فائر کئے میری چچی اور میری پھوپھی جو دونوں کی دونوں حاملہ تھیں گولیاں کھا کر شہید ہوگئیں۔ ان کے بعد اور بہت سے مرد عورتیں اور بچے شہید ہوئے۔ باقی بھاگ کر دوسرے مکانوں میں چلے گئے۔ جس مکان میں ہم تھے وہاں پر ملٹری پہنچ گئی۔ ملٹری والوں والوں نے کہا تم سب باہر آ جاؤ ورنہ ہم تم کو مار ڈالیں گے جب دروازہ کھولا تو انہوں نے گولی چلا دی سامنے میرے والد تھے انہیں گولی لگی وہ گر پڑے پھر دوسری گولی ماری وہ شہید ہوگئے۔ ہم نے کواڑ بند کر لئے ملٹری والوں نے کہا کہ دروازہ کھول کر باہر نکل آؤ تو تمہیں گرفتار کر لیں گے۔ ورنہ جان سے مار دیئے جاؤ گے۔ جب ہم باہر نکلے تو انہوں نے پھر ٹامی گن

سے فائر شروع کر دیئے کئی آدمی وہیں ڈھیر ہوگئے جن میں تین میرے قریبی رشتہ دار تھے۔ پھر ملٹری نے کمرے میں داخل ہوکر فائر شروع کر دیئے ۔میری پھوپھی کی لڑکی شہید ہوگئی اور میرے بڑے بھائی زخمی ہوئے۔ہم نے صبح چھ بجے سے کچھ نہ کھایا تھا۔شام کے چھ بج گئے میرے چچا کے دو بچے جو ڈیڑھ سال اور ڈھائی سال کے تھے پیاس کی شدت سے تڑپ رہے تھے۔ان کا حلق تر کرنے کے لئے ان کے والد نے پسینہ پونچھ کر انہیں چسایا پھر ان کے منہ میں تھوکا لیکن اس سے کیا بنتا تھا۔

شام کے چھ بجے میں گھر سے نکلا تو ایک جگہ کوئی پچاس مرد عورتیں اور بچے جمع تھے۔جو کسی مسلمان فوجی نے گھروں سے نکال نکال کر اکٹھے کئے تھے۔ان میں میری والدہ اور میرے بعض دیگر اعزہ بھی تھے۔ہم مکان سے باہر نکلے تو دیہاتی پھر ہم پر ٹوٹ پڑے ہم بھاگ کر اس جمعیت تک پہنچ سکے۔ملٹری نے میرے بڑے بھائی صاحب کو حراست میں لے لیا اور ہم سب کو کہا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ہم نے اصرار کیا ہمیں باڑہ ہندوراؤ کی مسلمان آبادی میں پہنچا دیا جائے۔بڑی مشکل سے ملٹری والے مانے اور ایک چھوٹے سے قافلے کی صورت میں ہمیں باڑہ ہندوراؤ میں لے گئے۔(٦٦)

مہرولی شریف قطب صاحب

حضرت خواجہ شاہ فقیر محمد بشیر صاحب شیخ طریقت خانقاہ چشتیہ قطبیہ تحریر فرماتے ہیں:

مہرولی شریف دہلی سے سولہ میل کے فاصلہ پر مسلمانوں کا ایک قصبہ تھا۔جو کسی زمانے میں قطب مینار کا بہت بڑا شہر رہ چکا تھا۔مسلمانوں نے اپنے ہفت صد سالہ دور حکمرانی میں یکے بعد دیگرے دہلی کے جو سات شہر آباد کئے ان میں پہلا شہر یہی تھا۔یہ شہر اسلامی ہند کی تاریخ میں سیاسی اور روحانی دونوں قسم کی حیثیتوں سے بہت بڑی اہمیت وعظمت کا مایہ دار رہ چکا تھا۔ترک سلاطین کے عہد میں ہندوستان کی اسلامی حکومت کا پایہ تخت یہیں ہوا کرتا تھا اور اس کے علاوہ اس شہر کو ہندوستان میں اسلام کا روحانی اور ثقافتی مرکز ہونے کی اہمیت حاصل تھی۔مہرولی کو عظمت اسلام کی بڑی بڑی یادگاریں رکھنے کا فخر حاصل ہے۔جن میں قطب مینار، مسجد قوۃ الاسلام، سلطان شمس الدین التمش کا مزار، سلطانہ رضیہ کا مزار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ اسلامی تاریخ کے بعض دیگر اعاظم رجال کے مقبرے، شاندار عمارتیں اور فن تعمیر کی نادر روزگار یادگاریں وہاں موجود ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ مہرولی شریف میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کی درگاہ ہے جو سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین سنجری اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے اور بڑے خلیفہ تھے۔درگاہ شریف میں منقش اور رنگین ٹائیلوں کی خوبصورت دیواروں کے آثار جو بارھویں صدی مسیحی میں شاہان اسلام نے ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے نشر وفروغ کی یادگار کے طور پر بنوائی تھیں اب تک باقی ہیں۔مزار شریف اور اس کی منقش دیواریں فن تعمیر کے نوادر میں شمار ہوتے ہیں۔حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کی معیت میں ہندوستان میں تشریف لائے تھے اور دین اسلام کی تبلیغ کے لئے اجمیر شریف کو مرکز بنا کر بیٹھ گئے۔آپ نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو اپنا خلیفہ بنا کر دہلی میں بٹھا دیا تھا۔خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بہت جلد ضیائے اسلام کا مینار بن گئے اور ان کی وفات کے بعد ان کا مزار بھی خواجہ اجمیریؒ کے مزار کی طرح مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں

کے لئے زیارت گاہ بن گیا۔

قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیر بلاشبہ ہندوستان کے پہلے مسلمان سلطان قطب الدین ایبک نے شروع کرائی لیکن مینار کو قطب مینار حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قطب الاقطاب ہونے کے صدقے میں کہا جاتا ہے۔ مہرولی میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار بھی ہے جنہوں نے پہلے پہل ہندوستان میں علم حدیث کو فروغ دیا۔ غرض مہرولی قطب مینار کے اس پرانے عظیم شہر کا قلب ہے جس میں اولیائے کرام، سلاطین عظام شہدائے دین اور علمائے مبین کے مقبرے اور یادگاریں میل ہا میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ موجودہ قصبہ میں آبادی کی غالب اکثریت مسلم تھی۔ اس کے اکثر خاندان چھ یا سات صدیوں سے وہیں چلے آرہے تھے۔ یہ خاندان قطب صاحب کی درگاہ سے تعلق رکھنے والے اولیاء اللہ، علماء خلفاء اور خدّام کی اولاد تھے۔ چونکہ مہرولی شریف کو ہندوستان کے مسلمان عزت وعقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جوق در جوق زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس لئے مہرولی کے مسلمان متمول اور خوشحال بن گئے تھے۔ ان میں سے اکثر بہت اچھا کاروبار کررہے تھے۔ اس قصبہ کے ہندو اور مسلمان کامل اتحاد، یک جہتی اور امن کے ساتھ زندگی بسر کرتے چلے آرہے تھے۔ قصبہ میں مسلم آبادی کی غالب اکثریت تھی اور انہیں ہندوؤں سے کسی قسم کی پرخاش اور شکایت نہ تھی۔

۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو مہرولی کے ایک سرکردہ ہندو مہاجن نے حاجی عبدالغنی متولی مسجد کو شہنشاہ اکبر کے سوتیلے بھائی ادھم خان کے مزار کے دروازے پر مل کر بتایا کہ مہرولی میں فرقہ وارانہ فساد ہوجانے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا مجھے ڈر ہے کہ میں نے جو قرضے لوگوں کو دے رکھے ہیں وہ سب مارے جائیں گے۔ جب اس سے دریافت کیا گیا کہ آپ کس بنا پر فساد کا خطرہ محسوس کررہے ہیں تو اس نے بتایا کہ دہلی کا ڈپٹی کمشنر مسٹر رندھاوا یہاں آیا تھا اور کہہ گیا ہے کہ پانچ ہزار سکھ پناہ گزینوں کو مہرولی میں آباد کرنے کی تجویز منظور ہوچکی ہے۔ مہاجن نے کہا کہ سکھ پناہ گزین جہاں جاتے ہیں فسادات کو اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں۔ اور جہاں فسادات ہوں وہاں میرے کاروبار

کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ حاجی عبدالغنی نے یہ بات مجھے بتائی اس کے ساتھ ہی مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ پنجاب کے سکھ یوسف سرائے میں اور مہرولی کے نزدیک بعض دوسرے مقامات پر جمع ہورہے ہیں۔ چند دن بعد سکھوں کے اس اجتماع کے باعث مہرولی سے دہلی کو جانے کا راستہ پرخطر ہوگیا کیونکہ وہ راستہ چلنے والے اکا دکا مسلمان کو قتل کردیتے تھے۔

۸ ستمبر کو علی الصبح پانچ بجے پچاس ہزار سکھوں، ہندو جاٹوں اور دوسرے ہندوؤں کے ایک جم غفیر نے مہرولی پر آنا فانا دھاوا بول دیا اور مسلمانوں کے محلوں پر ٹوٹ پڑے۔ حملہ آوروں میں سکھ سب سے آگے تھے۔ مسلمانوں نے بھی مقابلہ کیا۔ اور مناسب مورچوں پر جم گئے۔ حملہ آور جدید قسم کے آلات حرب سے مسلح تھے اور ان کے پاس رائفلیں، بندوقیں حتیٰ کہ ٹامی گنیں اور برین گنیں بھی تھیں۔ ان کی تنظیم وتجہیز ظاہر کررہی تھی کہ حملہ پوری تیاری سے منظّم کیا گیا ہے۔ انہوں نے ادھم خان کے مزار کی طرف سے جو اونچی جگہ پر واقع ہے ہمارے گھروں پر نیز خانقاہ پر چڑھائی کی۔ خانقاہ کے صوفیوں، درویشوں اور فقیروں نے جان توڑ مقابلہ کرکے ان کے پے در پے حملے روکے۔ جب وہ خانقاہ میں داخل ہوکر وہاں کے مکینوں کا قتل عام کرنے کے برے ارادے میں کامیاب نہ ہوسکے تو انہوں نے گردونواح کے مکانوں کو آگ لگادی۔ مہرولی کے دوسرے مورچوں پر بھی مسلمانوں نے خوب مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کا منہ موڑ دیا۔ پانچ گھنٹہ تک جنگ جاری رہی۔ تھانہ مہرولی کا سب انسپکٹر پولیس دینا ناتھ خواجہ قطب صاحب کا عقیدت مند تھا اور درگاہ شریف اور اس کے متعلقین کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ اس نے چند مسلمان کانسٹیبلوں کی معیت میں اپنا فرض منصبی بجالانے اور درگاہ شریف کو بچانے کی پوری کوشش کی۔ اس اثنا میں کوئی چھ سات سو مسلمان مرد، عورتیں اور بچے میرے گھر میں نیز خانقاہ میں پناہ لینے کے لئے جمع ہوگئے۔ دس بجے کے قریب حملہ آور شکست کھا کر پسپا ہوگئے۔ گیارہ بجے فوج پہنچ گئی۔ جس نے مہرولی میں مارشل لا لگادیا۔ حملہ آور فوج کے آنے سے پہلے منتشر ہوچکے تھے۔

مہرولی کے مسلمانوں کو فوج نے محصور کرلیا۔ فوجی ہر طرف دہشت پھیلا رہے تھے۔ خانقاہ کے پناہ

گیروں کے پاس پانی جو ذخیرہ تھا وہ جلد ہی ختم ہوگیا اور ہرطرف سے العطش العطش کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ دو مسلمان مشکیں لے کر پانی لانے کے لئے نکلے فوج نے ان دونوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا۔ جب پانی نہ ملنے کے باعث سخت تکلیف کا سامنا ہونے لگا تو میں نے مسٹر دینا ناتھ سب انسپکٹر سے مدد مانگی۔ دینا ناتھ جو درگاہ شریف کا عقیدت مند تھا خانقاہ نشینوں، میرے کنبہ کے لوگوں اور دوسرے پناہ گزینوں کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی درگاہ شریف کی طرف لے گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ہندو بلوائیوں نے دینا ناتھ کی اس انسانیت نوازی کو بہت برا منایا اور اسے دھوکے سے یوسف سرائے کے ہندو گاؤں میں لے جا کر قتل کر دیا۔

نائب تحصیلدار نے فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو جو صورت حال کو سنبھالنے اور امن قائم کرنے کے لئے آئے تھے مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ اور ملٹری نے مہرولی کے مسلمانوں پر ہر نوع کا ظلم و تشدد شروع کر دیا۔ ان کے گھر لوٹے گئے۔ مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ نائب تحصیلدار خود دکانوں کے قفل توڑتا تھا اور لوٹ کے کام میں ہندوؤں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میرا گھر اور خانقاہ بھی لوٹ لئے گئے حالانکہ وہ فوجی چوکی کے عین بالمقابل واقع تھے۔ پولیس فوجی افسر اور سول کے حکام اس لوٹ کھسوٹ کی نگرانی کر رہے تھے اور لوٹ کے مال میں سب سے زیادہ حصہ لیتے تھے۔ ازاں بعد مہرولی کے سات آٹھ ہزار مسلمانوں کو مویشی کی طرح ہانک کر درگاہ شریف میں اکٹھے کر دیا گیا۔ ان میں عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہمارے ساتھ قیدیوں کا سا سلوک کیا جا رہا تھا۔ حشر تمثال کیمپ کی اچھی طرح ناکہ بندی کر لی گئی۔ کسی کو پانی لانے، راشن لانے یا رفع حاجت تک کے لئے باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ جو شخص درگاہ کے احاطہ سے باہر نکلتا تھا اسے گولی کا نشانہ بنا لیا جاتا تھا۔ مہرولی کے ہندو اور حملہ آور سکھ پوری آزادی کے ساتھ پھر رہے تھے۔ اور لوٹ کا مال بیل گاڑیوں اور ٹھیلوں پر لاد کر لے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سرکاری طور پر عائد ہونے والے فرض کی انجام دہی میں مصروف

ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سب کچھ ایک جچی تلی اور سوچی سمجھی تجویز کے مطابق معرض عمل میں لایا جا رہا تھا۔ دہلی کے حکام فیصلہ کر چکے تھے کہ مسلمانوں کو مہرولی سے نکال دیا جائے اور خواجہ قطب کی اسلامی بستی کو ہندوؤں اور سکھوں کی نو آبادی بنا دیا جائے۔ اس لئے تمام ملکی اور فوجی افسر مہرولی کے مسلمانوں پر ہر قسم کا دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑ چھاڑ کر نکل جائیں۔

۱۰ ستمبر کو یعنی دو دن کے بعد ایک فوجی افسر کی معیت میں علاقہ مجسٹریٹ مسٹر گپتا اور انسپکٹر پولیس مسٹر ہیرالال درگاہ شریف کے کیمپ میں آئے اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً وہاں سے نکل جائیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو انہیں ہولناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ ملکی اور فوجی افسران کو کسی قسم کی امداد نہیں دیں گے۔ مہرولی کے مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ تو آٹھ سو سال سے مہرولی میں آباد ہیں۔ اور مہرولی شاہ جہاں کی دلّی سے بہت زیادہ پرانی بستی ہے۔ ہم تو ہندوستان کی حکومت کے وفادار شہری ہیں۔ ہم نے ۱۵ اگست کا یوم آزادی دھوم دھام سے منایا تھا۔ علاوہ بریں مہرولی ہمارا مقدس مقام ہے جہاں خواجہ قطب صاحبؒ کی درگاہ کے علاوہ ہمارے بہت سے اولیائے کرام کے مزار ہیں۔ ہم ان مزاروں کے خادم ہیں۔ لاکھوں مسلمان اطراف و اکناف سے ان مزاروں کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ہم ان زائرین کی خدمت کر کے روزی کماتے ہیں۔ ہم جائیں تو کہاں جائیں ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہمیں اپنے گھروں، اپنی جائیدادوں اور اپنی جنم بھومی سے محروم کر کے بحالت تباہ گداگری پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ درگاہ شریف اور اس تعلق رکھنے والے خدّام کی حفاظت کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ ہماری اس درخواست پر انسپکٹر ہیرالال اور مجسٹریٹ نے بہت درشت کلامی سے کلام کیا۔ ڈرایا دھمکایا اور فی الفور جگہ چھوڑ جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم مہرولی کو فی الفور خالی نہ کرو گے تو تمہارے لئے ہر قسم کے راشن کی راہیں مسدود کر دی جائیں گی۔ (راشن تو پہلے ہی بند تھا) اور تمہیں بھوک پیاس کی کڑیاں جھیل کر مرنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص درگاہ سے باہر نکلے گا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔

اسی روز شام کے وقت درگاہ شریف کے اندر فوجیوں نے کئی مسلمانوں کو گولی مار کر شہید کر دیا متعدد زخمی ہوئے۔ کچھ مسلمان درگاہ شریف کے احاطہ میں ایک کنوئیں سے پانی بھر رہے تھے۔ ملٹری نے ان پر بھی گولی چلا دی۔ ملٹری نے درگاہ شریف میں گھس کر متعدد حملے کئے۔ درگاہ شریف کے احاطہ سے مشرق کی طرف مسلمانوں کے چند جھونپڑے تھے۔ حملہ آوروں نے انہیں آگ لگا دی اور ملٹری نے حملہ آوروں پر گولی چلانے کے بجائے ان مسلمانوں پر فائر کئے جو بھاگ کر درگاہ کی طرف آ رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں نے باؤلی میں پناہ لی۔ کچھ درگاہ کے پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے ملٹری نے ان پر بھی گولیاں چلائیں کئی مسلمان مارے گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ملٹری اب درگاہ شریف میں داخل ہو کر مسلمانوں کا قتل عام کر دے گی۔

تھوڑی دیر بعد حکم ملا کہ مسلمانوں کے دو سردار تھانہ میں پہنچیں کیونکہ وہاں دہلی سے مسٹر مسرا سپیشل مجسٹریٹ آئے ہیں اور مسلمانوں کے سرکردہ اشخاص سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے بات چیت کرنے کے لئے میں تھانہ گیا۔ مسٹر مسرا بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور پوچھنے لگے کہ مسلمانوں کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کی درخواست فقط یہ ہے کہ ان کی جانوں ان کی عزت ان کی ناموس اور درگاہ شریف کی حفاظت کا معقول بندوبست کر دیا جائے۔ اور انہیں بلوائیوں سے بچایا جائے جو درگاہ شریف پر حملے کر رہے ہیں۔ مسٹر مسرا نے وعدہ کیا کہ میں بلوائیوں کو پیچھے ہٹانے کا بندوبست بھی کئے دیتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ مہرولی سے چلے جائیں۔ مجھے یہ بات سن کر بہت مایوسی ہوئی اور میں مسٹر مسرا پر مہرولی شریف کی روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور تاریخی اہمیت و عظمت واضح کرنی چاہی۔ لیکن وہ نہ مانے اور اسی بات پر اصرار کرتے رہے کہ مسلمان وہاں سے چلے جائیں۔ جب ہر طرف سے مایوسی نظر آنے لگی۔ تو ہم نے اپنی عزت اور جان بچانے کے لئے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے مسٹر مسرا سے وعدہ لے لیا کہ مسلمانوں کو وہاں سے حفاظت اور امن کے ساتھ نکالا جائے گا۔ مسٹر مسرا نے وعدہ پورا کیا اور مسلمانوں کو پرانے قلعہ کے کیمپ میں پہنچانے

کے لئے ٹرک بھیج دیئے۔ روانگی سے پہلے تمام مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو دو قطاروں میں کھڑا کر کے سب کی جامہ تلاشی لی گئی۔ تلاشی کے دوران میں عورتوں سے طرح طرح کی بدسلوکیاں کی گئیں۔ مسلمانوں سے نقدی زیورات اور قیمتی اشیاء حتی کہ گھڑیوں اور قلموں تک لے لی گئیں۔ ہیرالال انسپکٹر پولیس دونوں ہاتھوں سے مسلمانوں کو لوٹ رہا تھا۔ جب اسے کہا گیا کہ آپ یہ ظلم کر رہے ہیں اس نے جواب دیا کہ ''یہ ہندوستان کا مال ہے اس لئے اسے پاکستان نہیں لے جا سکتے''۔ اس وقت تک ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمیں پاکستان جانے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ تلاشی کے وقت مہرولی کے ہندو پاس کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے اور مسلمان عورتوں اور مردوں کی تذلیل پر قہقہے لگا رہے تھے۔

انسپکٹر ہیرالال نے بذات خود میری جامہ تلاشی لی۔ میرا گھر اور خانقاہ لوٹے جا چکے تھے۔ میرے پاس دو سوٹ کیس تھے جن میں ایسے زیورات تھے جو لوگوں نے حفاظت کے لئے بطور امانت مجھے دے رکھے تھے۔ انسپکٹر ہیرالال اسے بھی ہتھیا لینا چاہتا تھا لیکن جب میں نے کہا کہ یہ سب اور لوگوں کی امانتیں ہیں تو اس نے مجھے دونوں سوٹ کیس ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ پرانے قلعے میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر مسرا کو ایک ہندو فوجی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے ہم سب کو بحفاظت تمام پرانے قلعے میں پہنچانے کا حکم دیا تھا۔ اس طرح مہرولی کے مسلمان کروڑوں روپے کی جائیدادیں اور مال و منال چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ہم ابھی پرانے قلعے ہی میں تھے کہ ہمیں دلوں کو خون کر دینے والی یہ اطلاعات ملنے لگیں کہ ہندوؤں اور سکھوں نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار اور دیگر اولیاء اللہ کے مقبروں اور مزاروں کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ اور وہاں ایک متنفس بھی مسلمان باقی نہیں رہا جو ان مزاروں پر چراغ تک جلا سکے۔ (۶۷)

ضلع بلند شہر (یوپی)

اردو زبان کے مشہور شاعر جناب ماہر القادری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

دہلی کے خونریز ہنگامہ سے بارہ دن پہلے تک میں وہیں سبزی منڈی کے علاقہ میں اپنے متعلقین کے ساتھ مقیم تھا۔ ۲۶ اگست کو ایک خانگی ضرورت سے مجھے اپنے وطن (کسیر کلاں ضلع بلند شہر) جانا پڑا۔ دہلی میں اس وقت تک کوئی خلفشار نہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر کی طرف سے اعلان کئے جارہے تھے اور پبلک کو اطمینان دلایا جارہا تھا کہ دلّی کو ہر قیمت پر فساد کی زد سے محفوظ رکھا جائے گا ہندوستانی حکومت کا پایہ تخت لاہور اور امرتسر نہیں بن سکتا، مگر دلّی میں مسلمانوں پر جو قیامت نازل ہوئی ہے، اس کے تصور ہی سے دل لہولہو ہوتا ہے میرا بھی سب کچھ لٹ گیا۔ عمر بھر کی کمائی غارت گروں کی نذر ہوگئی۔ دلّی کے خونیں حادثات وہ بدنصیب اور مصیبت زدہ مسلمان لکھیں گے جو اس ہنگامے میں موجود تھے۔ میں ان الم انگیز واقعات کو بھی یہاں دہرانا نہیں چاہتا جو میں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی زبان سے سنے ہیں اس لئے کہ یہ مضمون ''جگ بیتی'' نہیں ''آپ بیتی'' ہے!۔ وہ خوش قسمت اور آرام نصیب حضرات جن کو مصائب وآلام کی ان نازک اور پرہول منزلوں سے گزرنا نہیں پڑا۔ اس آپ بیتی کو پڑھ کر یقیناً متاثر ہوں گے مگر گزرے ہوئے واقعات کے اثرات اور کسی کا دکھ درد سن کر اثر قبول کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
تو اگران نہ نخوردہ گزند را چہ خبر؟

میں جب اپنے گاؤں میں پہنچا ہوں تو مسلمانوں میں خوف وہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے گاؤں سے تیس کوس کے فاصلہ پر خورجہ ریلوے جنکشن کے قریب مسلمان مسافر ایک ٹرین میں قتل کئے جاچکے تھے۔ آس پاس کے دیہات میں ہندوؤں اور سکھوں کے اجتماعات کی اطّلاعیں ملتی رہتی تھیں۔ ہمارے گاؤں (کسیر کلاں) کے ہندو باہر کے ہندوؤں سے ساز باز کررہے تھے اور عام خبر مشہور تھی کہ ۱۴ ستمبر کو بہت بڑی تیاری کے ساتھ کسیر کے مسلمانوں پر حملہ ہوگا۔ اس سے

پہلے بھی دومرتبہ ہندوؤں نے کسیر کو گھیر لیا تھا مگر حملہ کی نوبت نہیں آئی۔ بس محاصرہ ہوکر رہ گیا۔ اب کی بار افواہ گرم تھی کہ فیصلہ کن حملہ ہوگا۔ گاؤں میں عورتوں بچوں اور بڑے بوڑھوں سمیت مسلمانوں کی تمام آبادی بارہ سو کے قریب ہے جس میں ادھیڑ اور جوان مسلمان چار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے بچاؤ کے لئے پہرہ بندی شروع کردی، گاؤں کی گلیوں کے نکڑوں پر راتوں کو پہرے دیئے جانے لگے میں نے اس پہرہ بندی رکھوالی اور شب بیداری میں حصہ لیا، بلکہ یوں کہئے یہ سعادت حاصل کی۔ پولیس اور حکام کو صورت حال کی بروقت اطلاع دیدی گئی تھی، پولیس کا سب انسپکٹر پیتم سنگھ جو پولیس اسٹیشن ڈبائی کا افسر انچارج تھا۔ اس نے کئی دن قبل مسلمان کو خوفزدہ کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ تم پر حملہ ہونے والا ہے اور ہندوؤں اور سکھوں کا جوش انتقام اب کسی کے روکے رک نہیں سکتا، یہ سکھ سب انسپکٹر قاتلانہ حملے کی اسکیم اور سازش میں خود شریک تھا، حملہ آوروں کے سرغنوں اور لیڈروں کی نقل وحرکت کی اطلاعیں اسے ملتی رہتی تھیں اور خفیہ طور پر وہ اس کی کمان کررہا تھا۔

۱۳ ستمبر کو آس پاس کے دیہات سے آنے والوں کی زبانی معلوم ہوا کہ جگہ جگہ مشورے ہورہے ہیں۔ ''کل کسیر کے مسلمانوں پر چڑھائی ہوگی، حملہ کی یہ تاریخ بہت دن پہلے مقرر کی ہوئی ہے اور دور دور سے ہندو اور سکھ آرہے ہیں''۔ اعلان کرنے والے تیز گھوڑوں پر گاؤں گاؤں گھوم رہے تھے۔ ہمارے گاؤں کے ہندوؤں نے ایک دن قبل اپنی عورتوں اور بچوں کو گاؤں سے باہر بھیج دیا تھا، پڑوسی ہندوؤں کے اس طرز عمل نے حملہ کی افواہ کو بہت زیادہ متیقّن بنادیا اور مسلمان محسوس کرنے لگے کہ کوئی عظیم الشان خطرہ ان کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا ہے۔

۱۴ ستمبر (۱۹۴۷ء) کی صبح کو افق پر خطرے کی سرخ دھاریاں سی نظر آرہی تھیں مسلمانوں نے کاروبار چھوڑ دیا تھا، عورتوں اور بچوں کے چہرے اترے اترے سے تھے، حملے کے روکنے کی تدابیر سوچی جارہی تھیں جن گلی کوچوں سے حملہ آوروں کے داخل ہونے کا امکان تھا ان

پر مورچے جمائے جمارہے تھے۔۱۴ستمبر کودن کے بارہ بجے کے قریب سکھ پولیس سب انسپکٹر، تحصیلدار کے ساتھ گاؤں میں آیا، پولیس کی مسلح گارڈ پہلے سے موجود تھی سب انسپکٹر نے گاؤں کے سب سے اونچے مکان پر چڑھ کر دوربین سے چاروں طرف دیکھا اور مکان سے اتر کر بولا۔ ہوشیار رہو، حملہ آوروں کے دل کے دل آرہے ہیں۔شام کے تین بجے گاؤں کے چاروں طرف حملہ آور جمع ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ دور دور تک آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے۔ غارتگروں کا سیلاب امنڈا چلا آرہا تھا۔کھیتوں کے قریب کے مکان جو آبادی کے بالکل کنارے پر واقع تھے مسلمانوں نے خالی کردیئے ،عورتوں اور بچوں کو گاؤں کے درمیان ایک محفوظ مکان میں پہنچادیا گیا، اس مکان کے چاروں طرف پچاس کے قریب مستعد اور جم کرلڑنے والے نوجوان مسلمانوں کو متعین کردیا گیا تھا۔عورتوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ خدانخواستہ حملہ آور ان کے قریب آجائیں تو چھریوں ،کلہاڑیوں اور پتھروں سے مقابلہ کریں۔اور حضرت صفیہ اور حضرت خولہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی معرکہ آرائیوں کی یاد تازہ کردیں، مردوں کو تاکید تھی کہ کسی نازک سے نازک حالت میں بھی عورتوں کے گرد سے نہ ہٹیں،ایک ایک مسلمان کو اسی حلقہ کے آس پاس کٹ کر مرجانا ہے نوجوانوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو جب تک ہمارا دم سلامت ہے ہمارے ناموس کی طرف کوئی آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا۔گاؤں کے مسلمانوں نے پانچ مقامات پر مدافعت کے لئے محاذ قائم کئے تھے میں جس محاذ پر تھا وہ جنوبی مورچہ تھا، ریلوے لائن پر ایک میل تک حملہ آوروں کی فوج مارچ کرتی ہوئی آرہی تھی۔ میں ہاتھ میں لاٹھی لے کر ریل کی پٹڑی کے قریب پہنچا، پولیس سب انسپکٹر جو مسلح گارڈ کو لے کر حملہ آوروں کی سمت جارہا تھا مجھ سے بولا کہ میں حملہ آوروں کو روکتا ہوں آپ اپنے آدمیوں کو ہوشیار کردیجئے۔ پولیس کے اس سکھ تھانیدار نے ہمارے گاؤں کے چند ہندوؤں کو بھی حملہ آوروں سے گفت وشنید کرنے کے لئے بھیجا تھا ،گاؤں سے دوفرلانگ کے فاصلہ پر تھوڑی دیر کے لئے جنوبی سمت کا حملہ آور لشکر رک گیا۔تھانیدار سے حملہ آوروں کے لیڈروں کی نہ جانے کیا بات چیت ہوئی کہ تھانیدار صاحب تو اپنی مسلح جمعیت کو

لے کر خراماں خراماں واپس چلے آئے اور حملہ آوروں نے گاؤں پر ہلّہ بول دیا۔،گاؤں کے چاروں طرف غارتگروں کا سچ مچ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دیتا تھا ان کے پاس بندوقیں، پستول، بم، تلواریں،بلّم ، برچھے، فرشے، ڈھالے اور لاٹھیاں تھیں۔ بندوقچی سب سے آگے تھے ، پھر بلّم والے ان کے پیچھے تیغ بکف سکھ اور برچھی والے ہندوسورما تھے، وہ اپنے ساتھ کوئی آتش گیر مادہ بھی لے کر آئے تھے جس سے مکانوں میں بھک سے آگ لگ جاتی تھی۔

ان حملہ آوروں کے لیڈروں نے دیویوں پر بکرے چڑھا کر ان کے لہو سے ماتھے پر تلک لگا رکھتے تھے، گردنوں میں پھولوں کے ہار پہن رکھے تھے، کوتل گھوڑے ان کے ساتھ تھے۔ اسکیم یہ تھی کہ مسلمان عورتوں کو ان پر بٹھا کر لے جائیں گے۔غارتگروں نے سب سے پہلے گاؤں کے آس پاس مسلمانوں کی بھس کی برجیوں میں آگ لگادی، پھر گھروں کو لوٹنے لگے، جس گھر کو لوٹ لیا اسے آخر میں نذرِ آتش کردیا۔شمال کی طرف کے مسلمانوں کی مستعدی اور جرأت و بیبا کی کی تاب نہ لاکر بہت بڑا مجمع مشرق کی سمت سے کوٹھوں پر چڑھ آیا چند مسلم نوجوانوں نے پتھروں سے ان کو بھگا دیا، سکھ سب انسپکٹر پولیس نے بھاگتے ہوئے ہندوؤں کو للکارا کہ نامردو! تمہیں شرم نہیں آتی، تھوڑے سے مسلمانوں کے لونڈوں سے بھاگتے ہو، غارت گر پھر پلٹے ،سب انسپکٹر نے مدافعت کرنے والے مسلمانوں پر گولی چلادی اور ایک نوجوان عبدالستار تھانیدار کی گولی کھا کر جاں بحق ہوگیا۔مسلمانوں کے مکان دھڑا دھڑ جل رہے تھے، بندوقوں کے فائروں سے فضا گونج رہی تھی ،کوٹھوں کی منڈیروں پر حملہ آور تلواریں چمکا رہے تھے اور نیزے ہلا رہے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے دیوتاؤں کی جے بلند کی اور مسلمانوں نے تکبیر کے شور سے ہیبت انگیز گونج پیدا کردی، ادھر کثرت اور سامانِ حرب پر ناز تھا اور اس طرف مسلمانوں کو اپنے خدا پر بھروسا تھا، ہاتھ پتھر پھینک رہے تھے اور لاٹھیاں چلا رہے تھے اور زبانوں پر خدا کا نام تھا۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

میں جنوب کے مورچہ پر تھا، مسجد کی چھت سے ہم سنگباری کررہے تھے، اور ادھر سے جواب میں

بندوقوں کو اپنی سمت سیدھا دیکھ کر میں نے مسجد کی مینار کی آڑ لے کر اینٹیں پھینکنا شروع کیں، کچھ لوگ جھک کر نیچے ہو گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے کمینہ اور دشمن اسلام حملہ آوروں کی بندوقوں کی گولیوں کو کنکری بنا دیا۔ کسی مبالغہ کے بغیر کہہ رہا ہوں اور یہ جان کر کہہ رہا ہوں کہ خدا کے سامنے مجھے جواب دینا ہے، کافروں کی گولیاں سچ مچ کنکری بن گئیں اور یہ کنکریاں بھی نہایت آہستگی کے ساتھ ہمارے اوپر گر رہی تھیں۔ شور وواویلا اور خون و آتش کے اس عالم میں مسجد کی چھت پر ہم چند مسلمانوں نے عصر کی نماز پڑھی ہم نے زندگی میں ہزاروں سجدے کئے تھے اور بہت سی نمازیں پڑھی تھیں لیکن اس عصر کی نماز کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ سر سے لے کر پیر تک اور دل سے نگاہ تک خشیت الٰہی، خلوص، نیازمندی اور صداقت وعقیدت کی جیتی جاگتی تصویر بنے ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عجیب وغریب استقامت عطا فرمائی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ''طیراً ابابیل'' کی تاریخ پھر سے دہرادی گئی کہاں مٹھی بھر مسلمان اور کہاں وہ مسلح حملہ آوروں کا تیس ہزار کا لشکر! ایک آشوب قیامت، ہنگامہ حشر اور طوفانِ قتل وغارت تھا، ستم گر ہم قلیل التعداد مسلمانوں کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے آئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادوں کو ملیامیٹ کر دیا ان کی تمنائیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ صرف پانچ مسلمان شہید ہوئے۔ ایک دیوانی عورت، ایک بچہ، ایک بوڑھا، ایک ادھیڑ عمر اور ایک نوجوان! کافروں کا جانی نقصان بہت زیادہ ہوا۔ صحیح تعداد کا اندازہ مشکل ہے۔ مگر ہندوؤں کے دیہات سے یہ اطلاعیں آتی رہیں کہ ہمارے اتنے آدمی کام آئے آج فلاں جاٹ چل بسا اور کل اس گھایل ٹھاکر نے دم دے دیا۔ کھیتوں میں جا بجا دور دور تک حملہ آوروں کی لاشیں پائی گئیں۔

یہ حملہ حقیقت میں حق و باطل کی آویزش کا زندہ معجزہ تھا، اللہ تعالیٰ نے غیب سے مسلمانوں کی مدد فرمائی، آسمانی فرشتے ہماری تائید ومعاونت کے لئے بھیج دیئے گئے اور یہ نتیجہ تھا مسلمانوں کی استقامت اور توکل علی اللہ کا! میرا ایمان ہے کہ مسلمان خدا پر بھروسہ کر کے جہاں بھی جم کر لڑیں گے ناکام نہیں ہو سکتے۔ صبر واستقامت اور جرأت وعزیمت سے طوفانوں کے رخ

پھیرے جا سکتے ہیں! اسلام کی تاریخ جرأت وثابت قدمی اور فتح وکامرانی کے ان حوصلہ افزا واقعات سے لبریز ہے۔ رات کے ہوتے ہی حملہ آور واپس چلے گئے۔ وہ رات! اندھیری، بھیانک اور پرہول! برسات کی کالی گھٹاؤں نے اس منظر کو اور زیادہ ڈراؤنا بنا دیا تھا۔ خیال تھا کہ حملہ آور آس پاس کے کھیتوں میں چھپے ہوئے نہ ہوں اور رات کے اندھیرے میں ایکا ایکی تازہ دم ہو کر کہیں ہلّہ نہ بول دیں۔ رات بھر تمام مسلمان جاگتے رہے۔ ہونٹوں پر درود وتسبیح کی موجیں کھیلتی رہیں، رات خدا کی طرف دھیان لگا تھا، نماز تہجد کے سجدوں میں کتنی آنکھوں سے آنسو بہے اور مسجد کا فرش نمناک ہو گیا، مسلمان زبان سے نہیں دردمند دل سے اپنے مالک کی بارگاہ میں استغاثہ کر رہے تھے کہ کون ومکان کے مالک! تو دیکھتا اور جانتا ہے کہ ہم مظلوم ہیں اور ہم پر کافروں نے مسلمان ہونے کے جرم میں چڑھائی کی ہے ہمارا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ ہم تیری نمازیں پڑھتے ہیں اور تیرے نبی اور اپنے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں!

دعا کرتے کرتے آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کٹ گئی سپیدہ سحر نمودار ہوا مگر اداس اور بھیانک صبح! سورج کی کرنیں تک کپکپا رہی تھیں، مسلمانوں کی زبانوں پر شکر خداوندی کے ترانے تھے سب یہی کہہ رہے تھے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا اللہ نے ہمیں بچایا، چھوٹے چھوٹے معصوم اور پھول سے بھولے بھالے بچے اپنی ماؤں، بہنوں اور رشتہ دار عورتوں کی دیکھا دیکھی خدا کا شکر ادا کر رہے تھے۔ دوسرے دن دوپہر کو ضلع کا کلکٹر، پولیس کے افسروں اور کانگریس کے چند لیڈروں کے ساتھ گاؤں میں تحقیقات اور موقعہ کے معائنہ کے لئے آیا۔ مسلمانوں کے جلے ہوئے اور لٹے ہوئے گھر دیکھے، سکھ سب انسپکٹر اپنی جھوٹی کارکردگی بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگا، مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا یہ جھوٹ ہے، بناوٹ ہے واقعات کی تلبیس ہے، اس قاتلانہ حملہ کی بہت کچھ ذمہ داری اسی سب انسپکٹر پر عائد ہوتی ہے۔ اس شخص نے کچھ نہیں کیا، بلکہ حملہ آوروں کی الٹی ہمت افزائی کی اور ہم مسلمانوں پر گولی چلائی، پھر میں نے کلکٹر سے تمام واقعات عینی شاہد کی حیثیت سے بالتفصیل بیان کئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس مجھے بار بار خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

خیال نہیں یقین تھا کہ مجرموں، قاتلوں اور مفسدہ پردازوں کو گرفتار کیا جائے گا۔ امن شکنوں سے باز پرس ہوگی لیکن حکام نے ایک حملہ آور ہندو سے بھی یہ نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں؟ اس ڈھیل چشم پوشی بلکہ ہمت افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے گاؤں اور آس پاس کے ہندو مسلمانوں کی فصلیں کاٹنے لگے، مسلمان نے کسی ہندو سے نرمی کے ساتھ بھی کچھ کہا تو وہی مجرم ہندو اس مظلوم مسلمان کو پکڑ کر پولیس گارڈ کے حوالدار کے پاس لے گیا اور حوالدار نے بھاری رشوت لے کر مسلمان کا پیچھا چھوڑا۔ ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے کے بعد اس نواح کے ایک ایک گاؤں میں جہاں جہاں مسلمان آباد تھے چن چن کر برباد کئے گئے، قتل وغارت گری، عورتوں کی بے عصمتی، اغوا اور جبریہ ارتداد۔ غرض وہ سب کچھ ہوا جو کسی امن پسند، انصاف دوست اور شریف حکومت کے حدود عمل واقتدار میں نہ ہونا چاہئے تھا۔ ہم اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ دلگداز مناظر دیکھتے تھے کہ کھیتوں میں ہندو اور سکھ لٹیرے مسلمانوں کے مکانوں سے مال لوٹ کر لے جارہے ہیں، مسلمانوں کے گھروں سے آگ کے شعلے بلند ہورہے ہیں اور دھواں نکل رہا ہے روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں بستی میں مسلمانوں پر حملہ کردیا اور آج اس آبادی کے مسلمان ہندو ظالموں کی سفاکیوں کا نشانہ بن گئے۔ یہ سب کچھ ایک منظّم اور بہت پہلے سے سوچی ہوئی سازش کے تحت ہورہا تھا، ہمارے گاؤں کسیر سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں پلکھنہ ہے جس میں چھ سو کے قریب مسلمان میواتی اور راجپوت رہتے ہیں، ان لوگوں کے پاس آتشیں اسلحہ بھی تھے اور اس نواح میں ان مسلمانوں کی بہادری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن حملہ سے پہلے ایک راجپوت مسلمان جو بہت خوش حال اور اپنے خاندان کا سردار تھا۔ ہندوؤں سے مل گیا۔ ہندوؤں نے اس کو یہ پٹی پڑھادی تھی اور اس سازش میں ڈبائی کا سکھ سب انسپکٹر بھی شریک تھا کہ ہتھیار ہمارے حوالے کردو، ہم تمہارے خاندان سے کچھ نہ کہیں گے۔ اس غدار اور خودغرض نے حملہ آوروں کو تمام ہتھیار سونپ دیئے اور کانگریس کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔ مگر ہندوؤں نے سب پہلے اسی کے خاندان والوں کا صفایا کیا۔ دوسو کے قریب مرد، عورت اور بچوں کو انتہائی

بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پلکھنہ کے واقعہ نے آس پاس کے مسلمانوں میں بہت زیادہ خوف اور ہراس پیدا کردیا۔ حملہ آوروں کو سب سے زیادہ کامیابی اسی گاؤں میں ہوئی۔ اس علاقہ میں ہمارے گاؤں کے مسلمان اللہ کے فضل سے قدم جمائے ہوئے تھے۔ اس لئے برباد شدہ دیہات کے مسلم پناہ گزینوں نے اسی طرف رخ کیا۔ گاؤں کے مسلمانوں نے ان مہاجرین کے ساتھ انصار جیسا برتاؤ کیا، خود ہمارے چھوٹے سے گھر میں تیس مرد اور عورتیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کی پریشانی اور گھبراہٹ دیکھی نہ جاتی تھی میں اس خیال سے کہ گاؤں والوں کے دل تھوڑے نہ ہوں لوگوں کے مجمع میں منہ پھیر کر رولیتا تھا۔ آنسو بے اختیار پلکوں پر آئے اور میں نے آستین سے بہت صفائی کے ساتھ جلدی سے پونچھ لئے۔

اس واقعہ کے کوئی تین ہفتہ بعد آدھی رات سے ہمارے گاؤں کو ملٹری نے گھیر لیا، صبح ہوئی تو مسلمانوں کے محلوں میں ملٹری اور پولیس ہی پولیس دکھائی دیتی تھی اور ان کے ساتھ آس پاس کے گاؤں کے جرائم پیشہ اہیر اور وہ مفسدہ پرداز اور قاتل ہندو بھی تھے جو ۱۴ ستمبر کے حملہ میں شریک تھے۔ قصبہ ڈبائی کے بہت سے مہاسبھائی کارکن بھی پولیس افسروں کے ہمراہ تھے۔ جرائم پیشہ ہندو سینکڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے گھروں میں گھس پڑے، پردہ نشین خاتونوں کے پردے کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا، تلاشی لینے والے کھیتوں، مکانوں اور بیٹھکوں میں شور کرتے اور دندناتے پھر رہے تھے، جہاں چاہا شور مچاتے ہوئے کہہ دیا کہ ''یہ توپ مل گئی، یہ بندوق ہے'' اس ناجائز اور خلاف قانون تلاشی کے بعد ہندوؤں نے پولیس اور ملٹری کی موجودگی میں مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لیا، ایک مسلمان لوہار کے گھر میں تو پانی پینے کا کٹورا اور کام کرنے کا ایک اوزار تک نہ چھوڑا۔ ۱۴ ستمبر کو ہندو پبلک نے مسلمانوں کو لوٹا اور تین ہفتہ بعد یہ آفیشل لوٹ اور غارت گری عمل میں آئی۔ پولیس افسروں نے متعدد مسلمانوں کو پستول اور رائفل دکھا گلیوں میں بری طرح زدوکوب کیا، ایک عہدے دار جسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بتایا جاتا تھا، مسلمانوں سے کہتا تھا کہ تم نے اپنا پاکستان بانٹ لیا، وہیں جاؤ! پھر گاؤں کے چماروں کی طرف مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا:

''تم ان مسلمانوں کو سلام کرتے ہو، یہ سالے تو خود تم کو سلام کریں گے حکومت تمہاری ہے''۔

گاؤں کے ہندو جس مسلمان کی گرفتاری کے لئے اشارہ کرتے گرفتار کرلیا جاتا، پچاس مسلمان جن میں قریب قریب سب جوان اور تنومند تھے پکڑ لئے گئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے ان میں سے بہت سے اشخاص سے فرداً فرداً رشوت لے کر انہیں چھوڑ دیا اور سولہ مسلمانوں کو گرفتار کر کے لے جایا گیا۔ ان تمام واقعات کی نہایت تفصیل کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو، صوبہ کے وزیر اعظم، گورنر اور دوسرے متعلقہ افسروں کو رجسٹرڈ خطوط کے ذریعہ اطلاع دے دی گئی اور دی جاتی رہی مگر حکومت نے مسلمان مظلوموں اور مصیبت زدوں کی فریاد رسی کے لئے کوئی اطمینان بخش انتظام نہیں کیا۔ اس نواح کے مسلمان آج تک خوف اور خطروں میں گھرے ہوئے ہیں! مسلمانوں کے صبر وضبط، احترام قانون اور امن پسندی کا یہ عالم ہے کہ اتنی کچھ قیامتیں ان پر گزر گئیں مگر ان بیچاروں نے کسی ظالم ہندو کے بدن کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ جذبہ انتقام کا ان خداپرستوں نے گلا گھونٹ دیا۔ امن ووفاداری کا اس سے بڑھ کی ثبوت اور کیا ہوگا۔ ہندوستانی حکومت جو اپنے چند میل کے پایہ تخت کے حدود میں امن قائم نہیں رکھ سکتی اس سے دیہات اور قصبات میں قیام امن کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی غیر جانب دار کمیشن ان حادثات کی تحقیقات کے لئے آئے تو اس پر حقیقت واضح ہوجائے گی کہ انصاف وجمہوریت کی دعوے دار انڈین یونین ایک فرقہ وارانہ حکومت ہے جس کی چشم پوشی اور جانب داری نے اکثریت کو سفاکیوں اور غارت گریوں پر دلیر اور بیباک بنا رکھا ہے اور اس کے حدود عمل اور کارگاہ اقتدار میں کسی مسلمان کا مال عزت اور جان محفوظ نہیں ہے۔ مگر یاد رہے:

جفا مکن کہ مکافات گریہ بلبل
اماں نہ داد کہ گل خندہ را تمام کند (۶۸)

دہرہ دون سے سہارن پور تک

جناب اقبال احمد صدیقی اپنے ایک دوست شفاعت حسین صاحب کی زبانی رقم طراز ہیں:

تاریخ تو ٹھیک یاد نہیں۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں خانہ جنگی اور فرقہ وارانہ فساد کی اس آگ کے شعلے جو مشرقی پنجاب کو جلا کر خاک سیاہ کر چکی تھی۔ انبالہ، سہارنپور سے گزرتے ہوئے دہرہ دون کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔ جب تک غیر مسلم پناہ گزین دہرہ دون میں داخل نہ ہوئے تب تک ہم پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی خبریں محض اخباری حیثیت سے سنتے اور گوارا کرتے رہے۔ لیکن ہمارے شہر کے عام حالات میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ سب ہم دہرہ دودن میں عرصہ سے امن وامان اور اتحاد واتفاق سے رہتے چلے آئے تھے۔ اور اس امن واتحاد پر ہمیں غیر معمولی اعتماد تھا۔ شاید ہی وجہ تھی کہ ہم نے کبھی دہرہ دودن کو فساد کے خوفناک شعلوں میں جل جانے کا تصور بھی نہ کیا۔

لیکن جوں جوں ہندو سکھ پناہ گزینوں کی آمد شہر میں بڑھتی گئی عام حالات میں تغیر ہوتا گیا۔ ہم نے پہلی بار محسوس کیا کہ ہمارے وہ پڑوسی جو ہمارے ساتھ ایک مدت سے رہتے چلے آئے ہیں اب شعلہ فشاں نگاہوں سے گھورنے لگے ہیں۔ پناہ گزینوں کی اشتعال انگیز، بدکلامی اور بے لگامی کے واقعات اکثر بازاروں میں ہماری دکانوں کے سامنے رونما ہونے لگے۔ ہمیں ان کی تباہی اور دکھ درد سے دلی ہمدردی تھی لیکن ہم اپنے اوپر بیجا غصہ کرنے کی وجہ جاننے سے قاصر تھے۔ امن وسلامتی کے شہر دہرہ دون میں شرارت پسند عناصر اور فسادی جراثیم پرورش پاتے رہے۔ ہماری نگاہیں حکومت کے تازہ اقدامات کی منتظر تھیں۔ لیکن پناہ گزینوں کے بڑی تعداد میں داخلہ کے سوا اور کسی مرحلہ کی جانب حکومت نے توجہ نہ دی۔ ایسے حالات کے پیش نظر ہم تینوں بھائی مشرقی پنجاب کی طرح دہرہ دون میں آنے والے خونیں طوفان کے تصور ہی سے کانپ اٹھے۔ لہذا سب ایک جگہ ہوئے اور اپنی آنے والی مشکلات کا حل سوچنے کی کوشش کی۔ ایک طرف خطرات کی سنگین چٹان تھی۔ دوسری طرف خیالات اور احساسات کا موجیں مارتا ہوا سمندر۔ ''یہ

۱۵ ہزار کی دکان، یہ بارہ ہزار کا مکان'' یہ تینوں بھائیوں کی زندگی بھر کا اثاثہ۔ ان سب چیزوں کا کیا ہوگا؟ پھر دہرہ دون کون سے دل سے چھوڑیں گے۔ جہاں ہم نے اور ہمارے بچوں نے بڑے بڑے خوابوں کی دنیا تعمیر کی ہے۔ غرض اسی الجھن میں ہم سب کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ اور پھر ذات باری پر اپنے متزلزل اعتماد کو مستحکم یقین میں بدلتے ہوئے دوبارہ تندہی سے اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے۔ پھر حکومت ہند، اور وزارت یوپی کے بلند بانگ دعوے اور تحفظ وامن کے وعدے بھی ہمارے لئے کچھ کم خوش آئند نہ تھے۔ ہم ان کے جذبہ انسانیت سے سرشار اعلانات پر یقینِ واثق رکھتے تھے۔ لہٰذا دہردون کو نہ چھوڑنے کا ارادہ کرلیا گیا۔ ہلدوانی سے خطوط آئے کہ دہرہ دون میں رہنا مناسب نہیں۔ یہاں چلے آیئے۔ ہم نے انہیں صاف لکھ دیا۔ کہ خدا ہر جگہ موجود ہے نیز ہماری حکومت انسانیت سے اتنی دور نہیں۔ اسی روز شام کو پڑوس کا سیٹھ ہنس کر بولا'' شیخ جی میں نے سنا ہے دکان بیچ رہے ہو؟ بھائی بارہ ہزار میں ہماری اس سے زیادہ میں دوسرے کی؟ میں نے بڑی بے پروائی سے کہا'' سیٹھ جی غلط کہا کسی نے آپ سے۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔ اچھا بھئی تمہاری مرضی۔ سیٹھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور بات آئی گئی ہوگئی۔ آج کا دن حسب معمول ہزاروں افواہوں کے درمیان خیریت سے گزر گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ کچھ آدمیوں کے چھرے گھونپ دیئے گئے۔ تیسرے دن کچھ اور آدمیوں پر اکا دُکّا قاتلانہ حملے ہوئے۔ اور ایک دو مقامات پر آتشزدگی کے واقعات بھی رونما ہوئے۔ ہم تینوں بھائیوں کے گھر ہندوؤں کے محلّہ میں تھے۔ لہٰذا اسی رات کو ہم نے وہ محلّہ چھوڑ دیا۔ اور ایک مسلم محلّہ میں جا کر قیام کیا۔ ابھی ہمارے بازار اور محلّہ میں کوئی واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ اس لئے وہاں تک آمد ورفت کی جرأت ہوگئی۔ میں دبے پاؤں انہی سیٹھ جی کے پاس پہنچا۔ دکان کے بیچنے کی خبر سن کر اکڑ کر بولے۔'' بھئی یوں تو اس وقت تمہاری دکان کے تین سو روپے بھی زیادہ ہیں لیکن تم پڑوسی ہو اس لئے تمہیں تین سو دیدوں گا۔ میرے حواس گم ہوگئے۔ کان آج رات کو اس بازار پر حملہ ہونے کی خبروں سے گونج رہے تھے۔ جلدی سے تین لاکھ سمجھ کر تین سو روپے جیب میں ڈالے۔ اور دکان پر

آخری بار حسرت بھری نگاہیں ڈالتا ہوا لپک کر اپنے گھر کی طرف ہولیا۔

سابقہ گھر میں سامان بند پڑا تھا۔ خیال کیا کہ کم از کم بستر اور دوسری ضروری چیزیں جو لے جاسکوں لیتا چلوں۔ یکا یک ایک مسلمان ہمسایہ بدحواس بھاگتا ہوا میری طرف آیا اس کا گھر لٹ چکا تھا۔ اور میرے گھر کی باری تھی۔ میں اس سے کچھ کہے سنے اور ایک منٹ رکے بغیر اپنے بال بچوں کی طرف بھاگا۔ اور تھوڑی دیر میں گھر جا کر دم لیا۔ وہ لوگ میری وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ واقعات اور حادثات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ہمارے امن واتحاد کو اتنی جلدی پارہ پارہ کردیا کہ ہمیں یقین نہ آتا تھا۔ یہ بدحواسی اور ہراس بڑھتا ہی گیا۔ خدا خدا کر کے سب گھر والوں نے رات گزاری صبح کو دروازے سے منہ نکال کر محلّہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج سب ہی چلنے پھرنے والوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ دوپہر کو ایک اور عزیز کسی طرح جان بچا کر گھر پہنچ گیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ بازاروں میں خوب لوٹ مار ہو رہی ہے۔ اور سڑکوں پر سینکڑوں مسلمانوں کی بے گور وکفن لاشیں پڑی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسی حالت میں اس کے بچ کر آنے پر سب ہی حیران تھے۔ اس دن کے بعد ہم لوگ بھی دیگر محلّہ والوں کی طرح گھر میں محصور ہوگئے۔ اور تین چار روز تک کسی کو دروازے سے باہر جھانکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ شہر میں غل غپاڑہ اور شور وغل رات دن ایک سا ہی رہتا تھا۔ بربریت، اور حیوانیت شباب پر تھی ہر وہ غیر انسانی کام جس کی انسان سے ہرگز امید نہ ہوسکتی تھی دل کھول کر کیا جارہا تھا۔ جو مسلمان غلطی سے فساد کے موقع پر گھر سے باہر تھے ان میں سے شاید ہی کوئی خوش نصیب بچ کر آیا ہو۔ ورنہ خون میں لت پت بے یارومددگار یا تو تڑپ رہے تھے یا جان دے چکے تھے۔ اور ان کی بے گور کفن لاشیں قدموں سے روندی جارہی تھیں۔

دھاوالے سے لے کر کباڑی بازار، مچھلی بازار، حتی کہ پلٹن بازار تک آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور سیاہ دھوئیں کے بھیانک بادل سارے شہر کو ڈھکے لیتے تھے۔ اب کسی مسلمان کا گھر میں بھی محفوظ رہنا ناممکن ہو چکا تھا۔ کام اس تنظیم اور قاعدے کے ساتھ ہو رہا تھا کہ کم سے کم

وقت میں زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو تباہ کیا جا سکے۔ ''بھوک کی شدت'' اور دھوئیں کی حدت سے گھروں میں دم گھٹا جا رہا تھا۔ جب بازاروں کے بعد گھروں کے جلنے کی نوبت آئی تو مسلمان شہر کے ایک معزز مسلمان انعام اللہ کی عظیم الشان بلڈنگ میں پناہ لینے کے لئے بے تحاشہ بھاگے۔ اپنا گھر، اپنا سامان حتی کہ اپنے بچوں اور عورتوں کی بھی خبر لئے بغیر مسلمان انتہائی بدحواسی کے عالم میں گھروں کو چھوڑ کر انعام اللہ بلڈنگ میں پناہ لینے لگے۔ ہم لوگوں نے جب محلّہ والوں کو راتوں رات محلّہ خالی کرتے دیکھا تو اب ہماری بھی ہمت ٹوٹنے لگی۔ اور سوچنے لگے کہ اب سوائے اس کے چارہ نہیں۔ کہ چھوٹے بھائی کے گھر میں کچھ تکلیف ہے۔ بدحواسی کے عالم میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن تھوڑی دیر میں سب حال کھل گیا۔ کہ لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اب یہ ایک مسئلہ خود بخود ہی پیدا ہو گیا کہ زچہ اور بچہ کو اس قیامت کے عالم میں کس طرح اور کہاں لے جایا جائے۔ رات کا کچھ حصہ تو تیمارداری میں گزر چکا تھا۔ بقیہ حصہ اسی غور و فکر اور دماغی الجھن میں گزر گیا۔ لیکن فساد کی بڑھتی ہوئی آگ نے ''ہر قیمت پر جان کی حفاظت'' کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ علی الصبح ایک بھائی جان پر کھیل کر گھر سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں قریب کے ''موٹر لاری اڈے'' سے وہ ایک ٹرک اپنے ہمراہ لئے واپس آیا۔ لاری کے سکھ ڈرائیور کو دیکھ کر حیرت سے منہ کھلا رہ گیا۔ لیکن بھائی نے ٹرک سے اتر کر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا۔ سردار جی ہمیں سہارنپور پہنچا دیں گے کہتے ہیں کہ ساڑھے چار سو روپے لوں گا۔ میں نے بھائی کو اپنے دل میں بے حد احمق خیال کرتے ہوئے کہا ''بھائی روپوں کا سوال ہی نہیں۔ جو یہ مانگ رہے ہیں ہمیں منظور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ بال بیکا نہ ہو۔ سکھ ڈرائیور سیٹ پر سے اتر آیا اور ہنس کر بولا بھائی صاحب آپ بلاوجہ فکر کرتے ہیں۔ دنیا میں شریف آدمی بھی ہوتے ہیں؟ لیکن اس کے بیان پر کسی طرح یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ میرا ضمیر بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سمجھی سمجھائی اور سیدھی سادی بات ہے کہ اگر سردار جی ہمیں یہاں سے لے گئے تو زندگی کی کسی طرح خیر نہیں۔ میں نے اپنی مزید تسلی کے لئے کہا۔ ''سردار جی گرونانک کی قسم

کھاؤ کہ کوئی دھوکہ نہ ہوگا''۔ اس پر سکھ ڈرائیور کسی قدر برہم ہو کر بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگ مجھے بھی ایک کمینہ سکھ سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا سردار جی یہ بات نہیں۔ سب باتیں وقت نے سکھائی ہیں۔ اس کے بعد اس نے گرونانک کی قسم کھائی۔ اور کہا کہ تم لوگ ٹرک میں جلد سوار ہو جاؤ۔ چونکہ اڈے پر سوائے اس کے دوسرا ٹرک موجود ہی نہ تھا۔ اس لئے بادل نخواستہ اپنی زندگی کو ایک بار پھر سپرد خدا کرتے ہوئے سوار ہونے کی ٹھان لی۔ ٹھیلہ کی چھت غائب تھی۔ فرش کے تختے جا بجا ٹوٹے ہوئے تھے۔ انہیں تختوں پر ایک چارپائی بچھا کر ایک رات کی زچہ و بچہ کو لٹا دیا۔ جو سامان پچھلے گھروں سے لا سکے تھے وہ گاڑی میں رکھا۔ بچوں اور عورتوں کو سوار کیا۔ اس کے بعد میں بھی ایک بار اور سکھ ڈرائیور کو راستہ میں گاڑی نہ روکنے کی تنبیہ کرتا ہوا ٹرک میں سوار ہو گیا۔ سامنے حد نگاہ تک پھر آگ کے خوفناک شعلے منہ پھاڑ رہے تھے اور خون آشام چنگاریاں شہر کے اوپر منڈلا رہی تھیں۔ سکھ ڈرائیور نے گاڑی ایک دم پوری رفتار سے چھوڑ دی۔ راستے میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو، سکھ ہجوم کی شکل میں جمع تھے۔ ہجوم کا ایک حصہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے جے کارے لگا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایک مسلمان کو پکڑے بے دردی سے ذبح کر رہے تھے۔ سڑک کے درمیان اور کنارے کی نالیوں میں مردوں، بچوں اور عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ہم سب یہ منظر دیکھ کر کانپ اٹھے۔ اور خوف سے اپنے منہ چھپا لئے۔ تھوڑی دیر میں ''ٹھیلہ روکنے کی آوازیں آنے لگی۔ میں نے گھبرا کر آگے کو دیکھا۔ ہندو سکھوں کا ایک مشتعل ہجوم تیزی سے ہمارے ٹرک کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ڈرائیور نے ہجوم کی دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور گاڑی بیچ سڑک میں پوری رفتار سے چھوڑ دی۔ ہجوم گاڑی کے سامنے آ گیا سکھ ڈرائیور نے ''ہارن کی گونج میں ٹرک کی رفتار بدستور رکھی، تلواروں برچھیوں، بھالوں، کرپانوں، اور لاٹھیوں سے مسلح ہجوم نے ناکام ہو کر ٹرک پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ ہم سب لوگ ایک دوسرے کے پاس پناہ لینے کے لئے گرنے لگے۔ لیکن ٹرک پر چھت نہ ہونے کے باعث ہمارے جسم لہو لہان ہو گئے۔ ایک

بڑا سا پتھر درمیان میں لیٹی ہوئی زچہ کے سینے پر آ کر لگا۔ بچہ اور بچہ کی ماں بلبلا کر رہ گئے۔ شریف سکھ ڈرائیور نے ہزاروں گالیوں، طعنوں اور اپنے مذہبی نعروں سے متاثر ہوئے بغیر گاڑی کہیں نہ روکی۔ حتی کہ آبادی کا علاقہ ختم ہوا۔ اور خدا خدا کر کے ہم لوگ غیر آباد سڑک پر آ گئے۔ وہاں سے اینٹوں اور پتھروں کی بارش بند ہوئی۔ ہم میں سے ہر انسان سکھ ڈرائیور کی اس جرأت پر آفریں کہہ رہا تھا۔ کبھی کبھی آنکھیں دھوکہ کھا جاتی تھیں۔ اور بار بار دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ یہ ڈرائیور اسی ظالم سکھ قوم کا ایک فرد ہے جس نے مشرقی پنجاب کے ہیبت ناک جہنم میں نہایت بے دردی اور شقی القلبی کے ساتھ ہزاروں نہیں لاکھوں بے گناہ انسانوں کو بھون دیا۔ گو تاریخ انسانیت میں یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن کم از کم اس حیوانیت کے دور میں یہ ایک بے حد انوکھا اور ممتاز واقعہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں موجودہ خانہ جنگی کے انسانی دور میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہی ہوئے ہوں گے۔

سکھ ڈرائیور کی غیر محدود شرافت اور جذبہ انسانیت کی بدولت ہم لوگ خیریت سے سہارنپور پہنچ گئے۔ سہارنپور میں ہم سب بھائیوں نے طے شدہ رقم ادا کی۔ اور اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ ٹرک سے اتر کر سہارنپور کے متعلق اڑی ہوئی افواہوں کی تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ خوب فساد ہو چکا اور آج چند گھنٹوں کے لئے اس وقت کرفیو کھلا ہے۔ یہ بات سن کر گویا دل پر دوبارہ بجلی گری۔ اب سہارنپور کے ایک ایک ذرہ سے خوف اور دہشت ٹپکنے لگی۔ معاً دل میں خیال آیا کہ ایک دوزخ کے منہ سے نکلے تھے لیکن دوسرے کے دہانے پر آ گئے۔ سب متوحش نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ سڑکوں پر دور دور تک انسانوں کا پتہ نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک طرف سے ایک سفید پوش معزز آدمی آتا ہوا معلوم ہوا۔ کچھ جان میں جان آئی۔ لپک کر اس کی طرف ہو لئے۔ بیچارہ وہ بھی کوئی انسان نہیں تھا بلکہ فرشتہ تھا۔ ہماری دردمندانہ التجا اور روح فرسا داستان سن کر ان کا دل بھر آیا۔ اور بڑی خندہ پیشانی سے فرمانے لگے میں مسلمان وکیل ہوں۔ تمہیں اب زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سامنے میرے مکان دوسرا حصہ خالی

ہے جب تک شہر کی حالت درست ہو اس میں قیام کیجئے۔ حکم کی دیر تھی فوراً ہی یہ لٹا ہوا قافلہ ان کے مکان میں جا گزیں ہوا۔ بھوک کی شدت سے بچے، بڑے سب ہی نڈھال تھے فوراً ہی کچھ انتظام کیا۔ اور اب لوگ کھانا کھانے بیٹھے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ کرفیو دوبارہ نافذ ہونے کی خبر ملی۔ اس کے بعد پھر، ہم لوگ دہرہ دون کی طرح گھر میں قید ہو گئے۔ جب تک کھانا پاس تھا کھاتے رہے۔ اس کے ختم ہونے پر فاقہ کشی کی نوبت آئی۔ تیسرے چوتھے روز کرفیو کھلتا تھا لیکن اس میں بھی مسلمان کا گھر سے باہر نکلنا گولی کھانے کے مترادف تھا۔ اکثر مسلمان کرفیو کی عدم موجودگی میں خرید و فروخت کرتے ہوئے دشن کی تلوار یا برچھی کا شکار ہو جاتے تھے۔ کئی روز متواتر بے آب و دانہ گھر میں بند پڑے رہے۔ خدا خدا کر کے یہ مصیبت کا دور پورے چودہ روز کے بعد ختم ہوا۔ مسلمان گھروں کے باہر چلنے پھرنے لگے۔ بازاروں میں بھی معمولی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ہم لوگوں کے پاس زندگی کی جو کچھ متاع بچی تھی اسے فروخت کر کے ایک دن خدا کا نام لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور خیریت سے یہاں مع اہل و عیال پہنچ گئے۔ راستہ میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ البتہ ہمارے آنے کے بعد سہارنپور اور دہرہ دون کی حالت پہلے سے زیادہ ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اس سے آگے! کوئی بتلاؤ ہمیں بتلائیں کیا! (۶۹)

بمبئی

شیخ عنایت اللہ منیجر تاج کمپنی لمیٹڈ کے برادر اصغر شیخ نذیر احمد مرحوم نے جو کئی سالوں سے بمبئی میں بڑے وسیع پیمانے پر کتابوں کی طباعت واشاعت کا کام کر رہے تھے اور مورخہ ۲۷ دسمبر کو کراچی سے بمبئی جانے والے ہوئی جہاز پر حادثہ کا شکار ہو کر شہید ہو گئے تھے اپنی وفات سے قبل ایک بیان کتاب میں اندراج کے لئے ارسال فرمایا تھا۔

اس بیان میں انہوں نے لکھا:

بمبئی میں ستمبر ۱۹۴۶ء ہی سے فرقہ وار فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو کبھی چند دن کے لئے بہت شدت اختیار کر جاتا تھا اور کبھی قتل کی اکّا دکّا وارداتوں تک موقوف رہتا تھا۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا لیکن شہر کی رونق اور کاروبار کی گہما گہمی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جن دنوں قتل کی وارداتیں کثرت سے ہونے لگتیں تھیں یا فسادات بعض بازاروں میں شدت اختیار کر لیتے تھے۔ ان دنوں شہر والوں پر خوف و ہراس کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ جب امن کی صورت پیدا ہو جاتی تھی تو لوگ مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ جب قائداعظم نے ملیبار ہل کی کوٹھی بیچنی چاہی تو ان کی دیکھا دیکھی بمبئی کے بعض بڑے بڑے تاجروں نے بھی بمبئی سے کراچی کی طرف منتقل ہونے کی کوششیں شروع کر دیں اور اپنے کاروبار کو ادھر لے جانے لگے۔ تاہم تجارتی کاروبار کو بمبئی سے کراچی کی طرف منتقل کرنے کی تحریک کسی قسم کے خوف و ہراس پر مبنی نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہندوستان میں آزادی مل جانے کے بعد مسلمانوں پر زندہ رہنا دشوار بلکہ محال بنا دیا جائے گا۔ اگست کے آغاز میں بمبئی کے فسادات مدّھم پڑتے پڑتے ختم ہو گئے تھے۔ مسلمان عام طور پر سمجھنے لگے تھے کہ اب انہیں ہندوؤں سے دب کر رہنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں۔ محمد علی روڈ پر سے فسادات کے دنوں میں کسی ہندو کا گزرنا غیر ممکن تھا لیکن فسادات ختم ہونے پر ہندو اس سڑک پر دندناتے پھرتے تھے۔ مسلمان بھی جان لپیٹ کر ہندوؤں کے علاقوں میں سے گزر سکتے تھے۔ ۱۵ اگست کو آزادی کی صبح نمودار ہوئی اور اس کے چند دن بعد خبریں پہنچنے لگیں کہ مشرقی پنجاب میں بہت خون خرابہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ مشرقی پنجاب کے واقعات کی خبریں بمبئی اور ہندوستان کے اخباروں میں نہیں چھپتی تھیں اس لئے بمبئی کے لوگوں کو اس خوفناک حقیقت حال

کی مطلقاً خبر نہ تھی۔ جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر گزر رہی تھی۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں دہلی میں فسادات شروع ہو گئے۔ اور بمبئی اور دہلی کے درمیان ہوائی جہازوں اور ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہو گئی۔ مجھے لاہور پہنچنا تھا اس لئے میں ہوائی جہاز پر سوار ہو کر بمبئی سے کراچی گیا اور وہاں سے ٹرین پر سوار ہو کر لاہور پہنچا۔ میں نے اس سفر کے دوران میں روہڑی سے لے کر لاہور تک مسلمان پناہ گزینوں کے بڑے بڑے قافلے دیکھے۔ جو اسپیشلوں پر لاد کر مختلف جگہوں کی طرف منتقل کئے جا رہے تھے۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اور پناہ گزین بیچارے ٹرینوں کے اوپر مال کی بوریوں کی طرح لدے ہوئے جا رہے تھے۔ وسط ستمبر میں میں کراچی کی طرف لوٹ گیا۔ برادر معظم شیخ عنایت اللہ بھی میرے ساتھ تھے۔ میں نے قیام لاہور کے دوران میں سکھوں اور ہندوؤں کے بے پناہ مظالم کے دردانگیز واقعات سنے جو وہ مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں پر ڈھا رہے تھے۔ یہ حالات سن کر اور پناہ گزینوں کی بربادی اور تباہ حالی کو دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ اب ہندوستان میں کسی جگہ بھی مسلمان کی جان اور آبرو محفوظ نہیں۔ چنانچہ بھائی صاحب کے ساتھ صلاح و مشورہ کرنے کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ میں بھی اپنا کاروبار کراچی میں منتقل کر لوں۔ اس سے قبل بعض ہندو سیٹھ میری دکان کی جگہ حاصل کرنے کے لئے مبلغ اسی ہزار روپیہ محض پگڑی کا پیش کر رہے تھے یعنی اسی ہزار یونہی دے کر میری دکان معقول کرائے پر لینا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے ان کی پیشکش قبول نہ کی تھی۔ کیونکہ میرا ارادہ مستقل طور پر بمبئی میں رہنے اور وہیں کاروبار کرنے کا تھا۔ لیکن مشرقی پنجاب اور دہلی کے حالات جاننے کے بعد میں نے دکان یونہی چھوڑ دی اور اپنی دکان کا سامان قرآن مجید اور کتابیں وغیرہ لاد کر لانے کے لئے دو آبی جہازوں کا بندوبست کیا۔ اور کراچی میں دکان لے کر وہاں کاروبار شروع کر دیا۔ اس کے بعد بمبئی سے مسلمانوں کی عام ہجرت شروع ہو گئی۔ لوگ کراچی کے ہندوؤں کے ساتھ اپنی جائیدادوں کا تبادلہ کر کے جانے لگے۔ کراچی پہنچ کر میں نے سکونت کے لئے بنگلہ کرائے پر لیا۔ پریس خریدا اور وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ بمبئی سے مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان بھر سے مہاجرین بمبئی کی راہ سے پاکستان کی طرف جا رہے ہیں۔ بمبئی میں مسلم لیگ کے کارکنوں نے مہاجرین کی امداد اور سہولت کے لئے کیمپ قائم کر رکھا ہے۔ (۷۰)

جب امرتسر جل رہا تھا

خواجہ افتخار

آغا علی مرحوم کے بیان کے مطابق وہ شریف پورہ کیمپ میں پناہ حاصل کرنے کے لئے روانہ ہونے لگے تو ان کی ضعیف والدہ کہنے لگیں۔ جب تک میرا بیٹا سودا سلف لے کر نہیں آئے گا میں یہاں سے کسی صورت نہیں جاؤں گی۔ آغا صاحب نے اپنی والدہ صاحبہ کو بہتر سمجھایا کہ وہ شریف پورہ کیمپ میں چلا گیا ہوگا، ہم لوگ وہاں جا کر اس کو ڈھونڈھنے کی کوشش کریں گے، زندہ ہوگا تو مل جائے گا۔ لیکن ان کی والدہ اپنے جگر گوشے کے انتظار کی ضد پر اڑی رہیں چنانچہ ہندوؤں سکھوں کے متعدد جتھے بھیانک نعرے لگاتے ان کے محلے سے گزرے۔ آغا صاحب اپنے مکان کی منڈیر کے جھروکے سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے کہ انہیں برابر والے مکان سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اس مکان کی طرف جھانک کر دیکھا تو وہ عورت رو رو کر کہہ رہی تھی کہ میرا خاوند اپنی بیوہ بہن اور اس کے بچوں کو شریف پورہ کیمپ تک چھوڑنے گیا تھا ،واپس نہیں آیا، آپ مجھے بھی اپنے ساتھ شریف پورہ لے چلیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب فسادیوں کی ٹولیاں نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو آغا صاحب اپنی والدہ اور ہمسایہ عورت کو اس کے بچوں سمیت شریف پورہ چھوڑنے نکل پڑے۔ وہ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سامنے سے ہندو سکھ فسادیوں کا ایک گروہ آ گیا۔ انہوں نے آغا صاحب جیسے گرانڈیل مسلمان کو دیکھا تو کھٹ سے گولی چلا دی۔ آغا صاحب اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ اٹھے۔ ان کی والدہ کے ساتھ جو ہمسایہ عورت تھی اس کو فسادیوں نے اس کے معصوم بچوں سمیت وہیں ڈھیر کر دیا۔ آغا صاحب کی والدہ کو اپنے بیٹے کی شہادت نے پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ یہ دلخراش منظر دیکھ کر بے ہوش ہوگئیں۔ ممکن تھا کہ فسادی انہیں بھی شہید کر دیتے کہ اس اثناء میں اتفاق سے ایک فوجی جیپ جائے واردات کے قریب سے گزری جس کو آتے دیکھ کر فسادی بھاگ گئے اور جیپ میں سوار انگریز افسر نے آغا صاحب کی والدہ کو جیپ میں ڈال کر شریف پورہ ریلیف کیمپ پہنچا دیا۔ آغا

صاحب مشتعل ہجوم کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنی گلی کے موڑ پر پہنچے تو ان کی گلی سے ایک سکھ فوجی بندوق اٹھائے نمودار ہوا۔ اس آغا صاحب کی طرف رائفل کا دہانہ موڑ کر انہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہا تو آغا صاحب نے اپنے ہوش وحواس قائم رکھتے ہوئے اس سکھ فوجی کی طرف اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اٹیچی کیس بڑھاتے ہوئے کہا کہ سردار جی۔ اس میں ڈھیر سارے زیورات اور نقدی موجود ہے، آپ مجھ کو مارنے کے بجائے یہ اٹیچی لے لیں اور مجھے جان سے نہ ماریں۔ آغا صاحب کا تیر نشانے پر بیٹھا اور سکھ فوجی نے اس سودے کو منظور کرتے ہوئے تنی ہوئی رائفل کا دہانہ سرنگوں کر کے آغا صاحب کی تمام عمر کی کمائی سے بھرا ہوا اٹیچی دبوچ لیا۔ آغا صاحب اپنی جان بچانے کے خیال سے دوڑ کر اپنے محلے کے ایک پرانے مکان میں چھپ گئے جو سردار شنکر سنگھ کا تھا اور عرصہ دراز سے ویران ہونے کے سبب جا بجا مکڑیوں نے جالے بُن رکھے تھے۔ اس مکان میں دن کے وقت بھی رات جیسا اندھیرا ہوتا تھا اور زمانہ امن میں بھی لوگ اس مکان کے قریب سے گزرتے وقت خوف کھایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس مکان میں بھوتوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

آغا صاحب اس تاریک اور بوسیدہ مکان میں چھپے ہوئے تھے کہ فسادیوں کی ایک ٹولی اس محلے کے مسلمانوں کے مکانوں کو نذرِ آتش کرنے آ گئی۔ انہوں نے گلی میں داخل ہوتے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کی تو اس محلے کے ایک متعصب ہندو نے حملہ آوروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائیو۔۔۔ بلاوجہ اپنی گولیاں ضائع نہ کرو کیونکہ اس محلے کے تمام "سؤر" بھاگ گئے ہیں۔ ابھی فسادیوں کی چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ رام باغ تھانے کے ایک غیر مسلم پولیس افسر نے فسادیوں سے کہا جلدی سے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگاؤ اور بھاگ جاؤ کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں باؤنڈری فورس کے افسر ہمارے تھانے کا معائنہ کرنے آ رہے ہیں۔ فسادیوں میں سے ایک فسادی نے اس پولیس افسر سے کہا کہ مہاراج۔ ہم اوپر والوں کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے مکانات کو نشان لگا چکے ہیں اور ان مکانوں کا قیمتی سامان لوٹنے کے بعد آگ لگائیں گے۔

آغا صاحب سردار شنکر سنگھ کے بوسیدہ مکان کی تاریک سیڑھیوں میں بیٹھے فسادیوں کی

سرگوشیاں سُن رہے تھے کہ اس اثناء میں حملہ آوروں کی ایک ٹولی مسلمانوں کے گھروں سے سامان نکال کر گلی میں پھینکنے لگی اور دوسری ٹولی مسلمانون کے لُٹے ہوئے مکانوں پر پیڑول چھڑک کر آگ لگانے میں مصروف ہوگئی۔

انسانی لاشیں اور کتے

آغا صاحب تین روز تک بھوکے پیاسے اس تاریک اور ویران مکان میں چھپے رہے۔ بالآخر ایک روز علی الصبح انہوں نے اپنے تمام کپڑے اتار کر بدن پر راکھ ملی۔ گلی میں پڑے ہوئے بھنگیوں کا ٹوکرا سر پر رکھا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر بھنگیوں کی طرح سڑکوں کی صفائی کرتے ہوئے شریف پورہ پہنچ گئے۔ راستے میں انہوں نے جابجا مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بکھری پائیں جن کو آوارہ کتے اور گِدھ نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ آغا صاحب نے شریف پورہ پہنچتے ہی اپنی والدہ کی تلاش شروع کردی۔ ان کی والدہ شریف پورہ کے ریلیف کیمپ میں نیم مردہ پڑی تھیں۔ اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کو زندہ سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آگئی اور قدرت نے بچھڑے ہوئے ماں بیٹے کو ملا دیا۔

مسلمان دوشیزہ کی دردبھری سرگزشت

کمپنی باغ کے قریب مال روڈ واقع گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کے مسلمان ہیڈ کلرک افتخار حسین کاظمی کے والد، بڑے بھائی یاور حسین کاظمی آف انبالہ اور ان کی اکلوتی جوان سالہ ہمشیرہ جوہر کو شہید کرنے کے لئے فسادی جب اسکول کے احاطہ کی طرف اشتعال انگیز نعرے لگاتے بڑھے تو انھوں نے سب سے پہلے افتخار حسین کاظمی مرحوم اور ان کے بوڑھے والد کو شہید کیا۔ افتخار حسین کاظمی زخمی حالت میں بھاگے تو اسکول کے اردگرد لگی ہوئی خاردار تاروں میں الجھ گئے۔ فسادیوں نے خاردار تاروں میں اُلجھے ہوئے اس مظلوم مسلمان پر اس بیدردی سے برچھے مارے کہ ان کا جسم زخموں سے چھلنی ہوگیا۔ اس کے بعد حملہ آور ان کے بڑے بھائی یاور حسین کاظمی پر ٹوٹ پڑے جس کے نتیجے میں وہ بھی شہید ہوگئے۔ فسادیوں نے ان تینوں مسلمانوں کی لاشوں کو

یکجا کر کے ان پر پٹرول چھڑک دیا۔ فسادی ابھی ان مظلوموں کی لاشوں کو لگائی جانے والی آگ کے شعلوں کے اردگرد کھڑے ہوکر "جو بولے سونہال۔ ست سری اکال، جے ہند اور جو مانگے گا پاکستان۔ اس کو دیں گے قبرستان کے بھیانک نعرے لگا رہے تھے کہ اس اثناء میں کاظمی صاحب کی جواں سال ہمشیرہ کو (جو اسکول کی ملحقہ کوٹھی کے ایک کمرے میں چھپی ہوئی تھی اور جس کے ہندو مالک اور گھر کی عورتوں نے خطرے کی صورت میں پناہ دینے کا وعدہ کر رکھا تھا) مصیبت کی اس کٹھن گھڑی میں یہ کہہ کر اپنی کوٹھی سے نکل جانے کا حکم دے دیا کہ ہم تمہاری وجہ سے اپنی جائداد اور اولاد کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے، اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔

مائی کوشلیا اور استانی سکھونت کور

بیچاری جوہر نے جب دیرینہ ہمسایوں کی طوطا چشمی دیکھی تو وہ اپنے قول سے پھر جانے والے بزدلوں کی کوٹھی کی عقبی کھڑکی سے کود کر چھپتی چھپاتی اس اسکول کے بچوں کے پاس سودا بیچنے والی مائی کوشلیا کے کوارٹر کی طرف بھاگ گئی۔ کوشلیا نے کمال جرأت سے جوہر کو اپنے کوارٹر میں چھپا لیا۔ فسادیوں کو جب کسی شرپسند نے بتایا کہ شہید ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ ان کی جوان ہمشیرہ بھی رہا کرتی تھی تو شراب کے نشے میں دُھت حملہ آوروں نے جوہر کی تلاش شروع کردی فسادی جوہر کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب کوشلیا کوارٹر میں پہنچے تو جوہر سجدے میں پڑی کربلا کے شہیدوں کے صدقے میں باری تعالیٰ سے اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ فسادیوں نے کوشلیا سے جب جوہر کی بابت پوچھا کہ اسکول کے کوارٹروں میں رہنے والے مسلمانوں کی جوان بیٹی کو تم نے ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے تو ہمیں جلدی بتاؤ کہ وہ کس طرف گئی ہے؟ کوشلیا نے فسادیوں کے تیور دیکھ کر، مسلمانوں کو غلیظ گالیاں دینی شروع کردیں اور حملہ آوروں کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ اس لڑکی کو تو اس کے والدین نے کافی عرصہ قبل یہاں سے دوسری جگہ منتقل کردیا تھا۔ فسادیوں نے کوشلیا کی زبان سے جب یہ بات سُنی تو مایوس ہوکر چلے گئے۔ اگلے روز کوشلیا نے جوہر کو سکھ عورت کا لباس (ساڑھی اور لوہے کا کڑا) پہنایا

اور گورنمنٹ گرلز ہوئی اسکول کی فرشتہ سیرت سکھ استانی سکھونت کور کے ہاں پہنچا دیا۔ سکھونت کور نے چند روز جوہر کو اپنی حقیقی بیٹیوں کی طرح بحفاظت اپنے پاس رکھا اور اس کے بعد جالندھر کی طرف سے آنے والے بلوچ رجمنٹ کے ایک فوجی ٹرک میں سوار کر کے پاکستان بھجوا دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے فرض شناس فوجیوں نے لاہور پہنچ کر جوہر کو میو ہسپتال میں پاکستان کے نیک دل اور نامور سرجن ڈاکٹر امیر الدین کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر امیر الدین نے کئی روز تک جوہر کے لواحقین کی تلاش جاری رکھی۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کی ایک ہمسایہ خاتون مِس وحید شاہ (جو چوبُر جی کوارٹر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں معلّمہ تھیں) نے اس لڑکی سے اس درد بھری کہانی سنی تو راقم الحروف کی والدہ (جو امرتسر گورنمنٹ گرلز اسکول میں پڑھایا کرتی تھیں اور تقسیم کے فوراً بعد چوبر جی کوارٹر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں معلّمہ تھیں) کو اسکول آ کر جوہر کی لرزہ خیز سرگزشت سنائی۔ راقم کی والدہ اسی وقت مِس وحید شاہ کے ہمراہ ڈاکٹر امیر الدین کی کوٹھی پر پہنچیں۔ وہاں جوہر سے آمنا سامنا ہوا تو وہ چیخیں مارتی ہوئی میری والدہ سے لپٹ گئی اور جوہر اسی روز نسبت روڈ پر ہمارے ہاں آ گئی۔ وہ کافی دنوں تک ہمارے گھر میں مقیم رہی۔ بعد ازاں جب اس کے قریبی عزیزوں سے رابطہ قائم ہوا تو وہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں منتقل ہو گئی۔

صبحِ آزادی

مسجد رنگریزاں شہر کی اہم ترین دینی درس گاہ تھی اور اس میں نہایت پُر آشوب ایّام اور سخت نامساعد حالات میں بھی پانچ وقت اذان کی ایمان افروز صدا بلند ہوتی تھی۔ ہر صبح قرآن پاک کا درس ہوتا تھا۔ طالب علم دینی تعلیم میں دن رات مشغول رہتے تھے اور شب و روز وعظ و کلام، درس و تدریس اور رُشد و ہدایت کے چشمے بہتے تھے۔ لیکن پاکستان کی صبح آزادی اس محلے کے ساکنوں کے لئے شبِ قیامت ثابت ہوئی عید سے تین دن پہلے رمضان المبارک کی ۲۷ ویں روز ریاستی اور گورکھا فوج نے مقامی ہندو سکھ بھیڑیوں کی نشاندہی پر اس مسجد ہر ہلّہ بول دیا۔ مخدوش حالات کی وجہ سے محلّے کی تمام مستورات نے جن سنگھی غنڈوں اور اکالی درندوں کے متوقع حملے

کے پیشِ نظر اس مسجد میں پناہ لے رکھی تھی اور ان کے تمام رشتہ دار مرد قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے کہ ان لعینوں نے نہ صرف تمام مسلمانوں کو بیدردی سے تہِ تیغ کر دیا بلکہ قرآن پاک کے مقدس نسخوں کی بے حُرمتی بھی کی مسجد میں موجود مستورات نے جن میں نوجوان لڑکیوں کی کثرت تھی مسجد کے ملحقہ کنوئیں میں چھلانگیں لگا کر اپنی آبرو بچائی، مگر اس اچانک حملے کی وجہ سے جو لڑکیاں کنوئیں تک نہ پہنچ سکیں۔ ان بیچاریوں کے ساتھ مسجد کے اندر انتہائی بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ فسادی ان کی عزّتیں لوٹنے کے بعد لاشوں کو برہنہ حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

اس دردناک سانحہ کا ذکر امرتسر کے مشہور بزرگ صحافی فرخ امرتسری مرحوم نے اپنی تصنیف "خون کی ہولی" کے صفحہ ۴۸ پر اس طرح کیا ہے:

"۱۴ اگست ۴۷ کو میجر پورن سنگھ مجسٹریٹ دفعہ ۳۰۔ انچارج علاقہ شریف پورہ کے کیمپ میں آئے اور صوفی غلام محمد ترک نے جن سکھ وحشیوں کے انسانیت سوز مظالم کا ذکر کیا تو وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جائے واردات تک چلنے کو آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ صوفی غلام محمد ترک، میجر پورن سنگھ، دو فوجی سپاہیوں اور میجر صاحب کے عملے پر مشتمل ایک پارٹی شہر میں گئی۔ جا بجا لاشیں پڑی پائیں۔ راستہ خون سے رنگین دیکھا۔ مکانات کھنڈر بنے ہوئے بھیانک تباہی کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ یہ دردناک منظر کچھ کم نہ تھا کہ وہ مسجد رنگریزاں میں پہنچے جہاں گیارہ نوجوان لڑکیوں کی دردانگیز لاشیں اپنی مظلومیت کا صورت حال سے اظہار کر رہی تھیں۔ وہ سب بے جان تھیں۔ ان کے زخموں سے خون جاری تھا۔ پیٹ چاک تھے" امرتسر کے معروف مزدور لیڈر صوفی محمد ترک (جو سوشلسٹ ذہن رکھتے اور تقسیم کے بعد نسبت روڈ پر ترک ہوٹل کے مالک تھے) نے اپنی سرگذشت "داستانِ ترک" میں اسلامیانِ امرتسر پر ہندوؤں سکھوں کے مظالم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "جب ہم کوچہ رنگیریزاں کی مسجد سے باہر نکلے تو ایک مکان کے پرنالے سے خون بہہ رہا تھا۔ مکان کی چھت پر چڑھ کر دیکھا تو ایک عورت کے شیر خوار بچے کے جو تقریباً ڈیڑھ مہینہ کا ہو گا ٹکڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ (صفحہ ۹۲ داستانِ ترک)

دو آنکھیں دو خنجر

مسجد کوچہ رنگریزاں کے برابر والے مکان کے حکیم جان محمد مرحوم، مسعود بٹ (جو آج کل ملتان ہوتے ہیں) خواجہ حامد حسن خیال کے والد خواجہ غلام حسن ایڈوکیٹ مرحوم (جو تقسیم کے بعد ملتان میونسپل کمیٹی کے قانونی مشیر تھے) ممتاز مسلم لیگی کارکن خواجہ غلام نبی لیڈر اور صوفی غلام محمد ترک (مرحومین) نے بھی اس لرزہ خیز سانحہ کے بعد مسجد رنگریزاں پر گزرنے والی قیامت کے دردناک مناظر دیکھے۔ خواجہ غلام حسن ایڈوکیٹ، خواجہ غلام نبی لیڈر اور صوفی محمد ترک (جو سوفی نصیر آف او کے ریڈیو ہال روڈ لاہور والے تھے) کے بیان کے مطابق جب وہ جائے واردات پر گئے تو ان کی نظریں ایک مکان کے پرنالے پر پڑیں جس سے انسانی خون بہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اس مکان پر چڑھے تو وہاں ایک مسلمان عورت برہنہ حالت میں مری پڑی تھی اور اس کے قریب ہی اس کا نومولود بچہ خاک وخون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے معصوم جسم پر گولیوں اور برچھیوں کے اَن گنت نشانات ہندو سکھ وحشیوں کی درندگی اور بربّریت کا منہ چڑا رہے تھے کوچہ رنگریزاں کی مسجد کے کنوئیں میں جن غیرت مند دوشیزاؤں نے چھلانگیں لگا کر اپنی آبرو بچائی تھی ان کی نعشیں کنوئیں میں تیر رہی تھیں۔ اس محلّے کے ایک جلے ہوئے مکان کی بالائی چھت کے درمیان نصب شدہ آہنی سلاخوں کے چھجّے میں ایک مسلمان عورت کی جلی ہوئی ٹانگیں لٹک رہی تھیں اور گوشت کی چربی پگھل پگھل کر قطروں کی صورت میں نیچے صحن میں ٹپک رہی تھی۔ ایک نوعمر بچے کی آنکھوں میں دو خنجر گڑے ہوئے تھے تاکہ اس معصوم کی آنکھیں صبحِ آزادی کے سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکیں۔ اسلامیانِ امرتسر نے وزیرِ اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان مرحوم کو اس دردناک سانحہ سے مطلع کر دیا تھا چنانچہ خواجہ غلام نبی لیڈر، خواجہ غلام حسن ایڈوکیٹ اور صوفی محمد ترک مسجد کے اندر اور بازار میں پڑی ہوئی برہنہ مستورات اور شہیدوں کے جسموں کے ٹکڑے یکجا کر کے ان پر سفید چادریں ڈال دیں اور اپنی پلکوں پر جھلملاتے ہوئے خون کو آنسو لئے لیاقت مرحوم کی متوقع آمد کا انتظار کرنے لگے۔ لیاقت علی خاں مجوزہ پروگرام کے مطابق اسی روز امرتسر چھاؤنی اترے اور

چھاؤنی کے ریلیف کیمپ میں موجود مسلمان پناہ گزینوں کی زبانی انہوں نے جب اس دردناک سانحہ کی تفصیل سنی تو بے اختیار رو دیئے اور مسجد رنگریزاں کا دلخراش منظر دیکھنے کی تاب نہ رکھتے ہوئے وہیں سے لوٹ گئے۔ انہوں نے وہاں سے واپس جا کر بلوچ رجمنٹ کی زیرِ نگرانی امرتسر کے مسلمانوں کو پاکستان پہنچانے کے لئے فوجی ٹرک اور اسپیشل ٹرینیں چلانے کا انتظام کر دیا جس کے باعث اسلامیانِ امرتسر کو بحفاظت پاکستان منتقل ہونے میں کافی سہولت مل گئی۔ الغرض وہ صبح آزادی طلوع ہو چکی تھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے برصغیر کے مسلمان قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ اس اثناء میں ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کے روز ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہو گیا جس سے اسلامیانِ امرتسر کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

مسلمان عورتیں یا تاش کے پتّے

خونِ مسلم کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ بھارت سے پاکستان آنے والا کوئی پیدل قافلہ یا اسپیشل ٹرین صحیح سلامت لاہور نہیں پہنچی تھی۔ علاوہ ازیں لاکھوں مسلمانوں کو شہید کیا جا رہا تھا اور مسلم دوشیزاؤں کے ننگے جلوس نکال کر انہیں کلمہ گوئی اور پاکستان کا مطالبہ کرنے کے "جرم" کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ہزاروں مسلمان دوشیزائیں ہندو سکھ غنڈوں نے مالِ غنیمت سمجھ کر تاش کے پتوں کی طرح آپس میں بانٹ لیں اور ایک ایک مغویہ کے ساتھ شراب کے نشے میں دُھت ہو کر ان درندوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لاہور کے روزنامہ آفاق نے ۲/ ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں "لاہور سے لاہور تک" کے عنوان کے تحت ننکانہ صاحب کے مقام بابا گورونانک کے استھان پر ہندوستان سے آنے والے ایک سکھ یاتری کا انٹرویو بالاقساط شائع کیا ہے جس میں وہ زود پشیمان سکھ اپنے گھناؤنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ "میں بابا گورونانک کے استھان پر پاکستان آیا ہوا ہوں اور ابھی پاکستان میں مقیم ہوں۔ میں بھی تقسیم کے وقت کا ایک کردار ہوں۔ میں ضلع امرتسر کے ایک گاؤں سٹھالہ کا رہنے والا ہوں۔ جن دنوں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ میں جوان

تھا۔ابھی نئی نئی مسیں بھیگی تھیں۔ جوانی کا جوش تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ان دنوں ایک نعرہ دیا تھا۔ رنگے اور مودے کے مظالم کا بدلہ لے لو۔ہمیں بتایا گیا تھا کہ اورنگ زیب نے سکھوں پر اور محمود غزنوی نے ہندوؤں پر بہت ظلم کئے ہیں۔ان کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے اور پھر کیا تھا ہم وحشی بن گئے۔انسانیت کو پاؤں تلے روند ڈالا۔حیوانیت اور بہیمت ہمارے دماغوں پر مسلط ہوگئی درندگی کے عالم میں قتل وغارت، ماردھاڑ، بے کسوں کی چیخیں، مظلوموں کی آہیں اور بچوں کی فریادیں کوئی چیز ہمیں پگھلا نہ سکی۔ہم نے مسلمانوں کو خوب لُوٹا۔ان کے نہتے قافلوں پر حملے کر کے جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کو قتل کر کے ہم ان کی نوجوان بیٹیاں اٹھا لیتے اور دادِ عیش دیتے۔

گر و معاف کرے ہم اس وقت وحشی بن گئے تھے۔ہم دس دس سکھوں نے بیک وقت ایک ایک مظلوم لڑکی کو بے آبرو کیا۔ہمیں اس وقت تخریب اور درندگی کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ہم نے معصوم اور مظلوم بچوں کو کرپانوں کی نوک پر اٹھا اٹھا کر مارا۔عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر کہتے۔ یہ تمہارا پاکستان ہے۔نوجوان عورتوں کو چھانٹ کر الگ کر لیتے اور باقی بچوں بوڑھوں اور بوڑھی عورتوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے۔ جب انسانی جسم جلتے تو ہمیں کئی بوتلوں کا نشہ ہوتا۔ہم قہقہے لگاتے اور اتنا بھنگڑا ڈالتے کہ ہمارے کیس (یعنی بال) کھل کر رہ جاتے اور پھر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلتے۔بکروں کا جھٹکا کرتے۔شراب پیتے اور پھر ان کھلی سرمستیوں کی کہانی کا باب کھل جاتا۔میں کیا بتاؤں میاں جی،،،،،ہم بالکل اندھے ہوگئے تھے اور انسانیت کا آخری احساس بھی مِٹ چکا تھا۔"

سکھ درندے اور پاگل دوشیزہ

یہ تھا لاہور کے روزنامہ آفاق کے ۲/ ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اعترافِ جرم کا پہلا حصہ،،،،،اب اسی اخبار ۵/۹/۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع شدہ دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیں جس میں سکھ بھیڑیوں نے ایک ایسی مسلمان لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔

" آگ اور خون کی ہولیوں کے دور میں نہ جانے ہم بھگوان اور گرو کو کیوں بھول گئے تھے۔میاں جی۔اس پاگل لڑکی کو "دنیا داری" سے کسی قسم کی آگاہی ہی نہ تھی مگر ہم وحشی تھے۔ درندے تھے اور درندوں کا کام ہوتا ہے چیڑ پھاڑ کرنا۔سو ہم نے باری باری اس معصوم کو لُوٹا۔ایک مسلمان کی بیٹی سمجھ کر،،،،،وہ مظلوم بے ہوش ہوگئی اور ہم تینوں کرتار سنگھ کیکر سنگھ اور میں اُسے جھنجھوڑتے اور نوچتے رہے۔حتیٰ کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں مرگئی۔میاں جی۔ہم اندھے تھے، درندے تھے۔ہم انسان نہیں حیوان بن چکے تھے۔شراب کے نشے نے ہمیں ذلیل ترین حیوان بنا دیا تھا۔ہم نے مردے کی ارتھی کی بے حرمتی کی اور پھر بھگوان نے ہمیں کسی قابل نہ رکھا۔ہم انسان تھے۔ مرد تھے۔مگر میں اور میرے ساتھی نہ مرد رہے اور نہ انسان۔بھگوان نے ہمیں زندگیوں میں ہی ہماری حرام کاریوں کی سزا دی اور پھر وہ ہوا جس کے ہم سزاوار تھے۔ہم تینوں کی داستان علیحدہ علیحدہ ضرور ہے۔مگر ایک بات سب میں مشترک ہے کہ ہماری وہ سردارانیاں جنہیں ہم باجوں گاجوں سے بیاہ کر لائے تھے۔ یکے بعد دیگر ہم سے علیحدہ ہوگئیں۔کیکر سنگھ کی بیوی ایک اچھوت کے ساتھ نکل گئی (یعنی بھاگ گئی) کرتار سنگھ کی بیوی اس کے نوکر کے ساتھ فرار ہوگئی اور میری پتنی میرے ہی گاؤں کے ایک موچی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی اور میں نے اس واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر سادھو سنتوں جیسے طور طریقے اپنا لیے اور اپنا گاؤں چھوڑ کر در در کی خاک چھاننا میرا مقدر بن گیا۔" ننکانہ صاحب میں آئے ہوئے اس سکھ یاتری کے اقرارِ جرم سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان خونخوار بھڑیوں نے اگر پاگل اور مردہ لڑکیوں کی عصمتیں لوٹنے سے گریز نہیں کیا تھا تو ان ہزاروں مسلمان دوشیزاؤں کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہوگا جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے بچھڑنے کے بعد خونی درندوں کی تحویل میں آئی ہوں گی۔

ایک سو برہنہ عورتیں

بریگیڈیئر برسٹو مسلمان مہاجروں کی اسپیشل ٹرینوں پر ہندوؤں سکھوں کے منظّم حملوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " گیارہ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جنک سنگھ اور اس کے ڈوگرہ گروپ کو ایک

عجیب واقعہ پیش آیا سہ پہر کے وقت مسلم پناہ گزینوں سے بھری ہوئی ٹرین روانہ ہوئی۔ اس ٹرین کے ہمراہ اسٹیٹ فورس اسکارٹ تھا۔ ٹینک بھی ساتھ ساتھ حرکت میں آ گئے جب یہ ٹرین ریاست کپورتھلہ کی سرحد کے قریب پہنچی تو جنک سنگھ نے دیکھا کہ ٹرین کا اگلا ڈبہ پٹڑی سے اتر گیا ہے۔ وہ پیچھے مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو ہزار کے قریب سکھوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا ہے۔ جنک سنگھ نے حملہ آوروں پر فوراً یورش کی اور مار بھگایا لیکن اس دوران سکھ بے شمار مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے۔ لاتعداد زخمی ہوئے اور حملہ آور دو سو کے قریب عورتوں اور لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ اس واقعہ کے فوراً بعد جنک سنگھ کی جگہ لیفٹیننٹ وجاہت حسین نے لے لی اور ان کے ہمراہ سی ،آئی، ایچ کے جو کچھ جوان موجود تھے اس بدقسمت ٹرین کے مسافروں کی حفاظت اپنے تیس کے لگ بھگ ساتھیوں سمیت کر رہے تھے کہ اندھیرا بڑھنے لگا۔ چاروں طرف سے زخمیوں کی کراہیں اور چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے عزیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ تمام رات سخت بے چینی رہی اور خوف و ہراس چھایا رہا۔ سکھ جا چکے تھے۔ جب صبح ہوئی تو ایک عورت کی جوتی کچھ فاصلہ پر ملی۔ اس سے آگے ایک میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں تقریباً ایک سو برہنہ عورتیں ملیں ان میں سے ابھی کچھ زندگی تھیں اور بیشتر عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ بچے قتل کر دیئے گئے تھے۔ بیس کے قریب بچے رینگ رہے تھے اور اپنی ماؤں کو تلاش کر رہے تھے۔ عورتوں کی برہنہ لاشیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رات میں ان عورتوں کی بار بار عصمت دری کی گئی تھی اور اس کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی ہزار اکالی گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ حملہ کیا چنانچہ ان بچے کچھے پناہ گزینوں کی زندگیاں سخت خطرے میں تھیں۔ لیفٹیننٹ وجاہت حسین اور سی، آئی، ایچ کی مختصر پارٹی نے ٹینکوں کی مدد سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور پناہ گزینوں کو قتلِ عام سے بچا لیا۔

بریگیڈیئر برسٹو ٹرینوں پر ہندوؤں سکھوں کے حملے کی روداد کے بعد پاکستان کا رُخ کرنے والے مفلوک الحال مسلمانوں کے پیدل قافلوں اور کیمپوں کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۴۷ء کے آخر میں منتقلی کا کام زیادہ تیز رفتاری سے جاری تھا۔ ہزاروں افراد ٹرینوں اور لاریوں میں سوار اور بے شمار پیدل قافلوں کی شکل میں دریائے بیاس کے پل پر رواں دواں تھے اور دوسرے کیمپوں میں پناہ گزین بھاری تعداد میں جمع ہو رہے تھے کہ اواخر ستمبر ۱۹۴۷ء میں ایک بہت بڑی تباہی نے ہمیں پریشان کر دیا۔ یہ تباہی قدرتی تھی۔ ان دنوں میں عام طور پر برسات کا زور تھم جاتا تھا لیکن ایسی قیامت خیز بارشیں ہوئیں کہ دریائے بیاس میں سیلاب آ گیا۔ بیاس نصف میل کی چوڑائی سے دس میل چوڑا ہو گیا۔ بیسن ایک چھوٹا سا نالا تھا، دریا بن گیا اور ریلوے کا پُل ٹوٹ گیا جب میں بیسن پر پہنچا تو جہاں کیمپ تھا وہ مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا۔ درخت جڑ سے اکھڑ گئے تھے۔ لوگ مدد کے لئے چیخ رہے تھے۔ اندازاً دو ہزار افراد اپنی بَیل گاڑیوں وغیرہ سمیت اچانک پہاڑی نالے کے تیز پانی میں بہہ گئے۔ جب سیلاب کا پانی اتر گیا تو کیمپ کی تباہی کا صحیح نقشہ سامنے تھا۔ پانچ سو افراد کے مردہ جسم اور تین سو گائے بھینسیں اس کیمپ میں مردہ حالت میں ملیں۔ مسلمانوں نے اپنے مردوں کو دفن کر دیا۔ یہ بڑا رقت آمیز منظر تھا ہم نے بچے کھچے مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لئے ہیلی کوپٹر میں بیٹھ کر محفوظ جگہ کے انتخاب کی کوشش کی۔ تمام ہموار میدان چاروں طرف پانی میں گھرے ہوئے تھے۔ بے شمار مکانات پانی میں ڈوب چکے تھے۔ بعض اونچے مکانوں کی چھتوں پر لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔

یہ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ جو لوگ قتلِ عام سے بچ چکے تھے ان میں سے اکثر سیلاب کی نذر ہو گئے تھے۔ اب یہ امید کی جا رہی تھی کہ سکھ اس صورتِ حال میں حملہ نہیں کریں گے لیکن افسوس کہ سکھ اپنی بربریت سے باز نہیں آئے اور ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب پناہ گزین منتشر تھے، سیلاب کی تباہ کاریوں نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ۲۷/ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو سکھوں نے بیاس کے ریلوے پل کے قریب حملہ کر کے تیس پناہ گزینوں کو قتل کر دیا اور دس لڑکیوں کو اغوا کر لیا۔ یہ اس وقت ہوا جب یہ لوگ کیچڑ اور پانی میں ڈوبی ہوئی گاڑیاں اور خورد و نوش کا سامان تلاش کر رہے تھے۔ کوئی اس بزدلی اور غیر انسانی فعل کا تصور نہیں کر سکتا جو سکھ کر رہے تھے۔

جب سیلاب کا پانی اتر گیا اور دریائے بیاس آمدورفت کے قابل ہوا تو پتہ چلا کہ پانچ ہزار جانیں اور سینکڑوں بیل گاڑیاں ضائع ہو چکی تھیں۔ بچے کچھے معدودے چند لوگ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھے اور موت سے پنجہ لڑا رہے تھے۔ ان سب کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اپنی مملکت (پاکستان) پہنچ جائیں۔

بریگیڈیئر برسٹو کے مندرجہ بالا دردناک مشاہدات کے مطالعے کے بعد غیر ملکی مصنف لاری کوئز اور ڈینک لائبریری کی کتاب "فریڈم ایٹ مِڈ نائٹ" کے ترجمے اور تلخیص کی جھلک ملاحظہ فرمائیں جسے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے اگست ۱۹۷۹ء کے آزادی نمبر میں مسٹر ذوالفقار کاظم نے سپردِ قلم کیا ہے۔ فاضل مترجم مذکورہ بالا کتاب کا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ہندوستان کا یومِ آزادی پنجاب کے لئے تباہی کا دن تھا۔ اس روز طلوع ہونے والا آزادی کا سورج بنفشی اور سنہری نہیں بلکہ تشدد کے اَن گنت واقعات اور خونریزی کی بناء پر قرمزی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ امرتسر میں نئے حکام آزادی کے بعد اپنے اختیارات سنبھال چکے تھے۔ مگر شہر میں امن و امان کی صورتِ حال بدستور مخدوش تھی۔ شہر کے اندر سکھ اپنے مسلمان ہمسایوں کا بے دریغ خون بہا رہے تھے۔ مردوں کو بے رحمی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ عورتوں کو اغواء کیا جاتا۔ ان کی آبرو ریزی ہوتی۔ خوف و تشدد سے کانپتی ان برہنہ بے بس عورتوں کو شہر بھر میں پھرا کر گولڈن ٹمپل (دربار صاحب) تک لایا جاتا اور پھر بہت سی عورتوں کی گردنیں اڑا دی جاتیں۔

مغویہ خواتین کا بھیانک مستقبل

تحصیل ترنتارن کے گاؤں بھوجیاں اور آس پاس کے دیہات میں بسنے والے مسلمان تقسیم برصغیر تک ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن جب ہندوؤں سکھوں کو ریاستی غنڈوں اور فوجی درندوں کی اعانت حاصل ہوگئی تو وہاں کے مسلمان بے بس ہوگئے۔ یہ گاؤں امرتسر سے دس میل کے فاصلے پر واقع تھا اور اس میں چار ہزار کے قریب مسلمان رہتے تھے۔ البتہ اردگرد کے دیہات میں ہندوؤں سکھوں کی غالب اکثریت آباد تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کے

ابتدائی ایّام میں اس گاؤں کے مسلمانوں کو تہِ تیغ کرنے کی غیر مسلموں نے کئی مرتبہ کوششیں کیں۔ لیکن اس آبادی کے بہادر مسلمان ان کے ہر حملے کا دندان شکن جواب دیتے رہے بعد ازاں جب ۱۵/اگست ۴۷ء کا دن قریب آیا تو آس پاس کی مخلوط آبادیوں کے مسلمان اپنی جانیں بچانے کے خیال سے بھوجیاں میں اکھٹے ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب بھوجیاں ہندوستان کی جغرافیائی حدود کا حصہ بن چکا تھا۔ چنانچہ بھارتی فوج کی سرپرستی میں گردوپیش کے دیہاتی غنڈوں نے حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وطنِ عزیز کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت علامہ عزیز انصاری آف گوجرانوالا کے والدِ گرامی حاجی امان اللہ، معروف عالم دین مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ، مولانا عبدالرحیم خان اور دیگر ہزاروں مسلمان شہید کر دیئے تھے۔ ایک ہزار کے قریب مسلمان لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ مؤخرالذکر تینوں شہداء ممتاز روحانی شخصیت مولانا فیض محمد کی آنکھوں کے نور تھے۔ اس خاندان کے شاگرد آج بھی درجنوں کی تعداد میں اہلِ حدیث کے مدارس میں طلبا کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ہفت روزہ الاعتصام کے مالک و مدیر مولانا عطاء اللہ بھوجیانی اسی گاؤں میں رہا کرتے تھے اور انہیں بھی مولانا فیض محمد کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

علامہ عزیز انصاری کے والد کی شہادت کا زخم ابھی تازہ تھا کہ علامہ صاحب کے بہنوئی مولانا محمد صاحب (سکنہ موضوع چوہلہ تحصیل ترنتارن) حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے والدِ گرامی سمیت شہید ہوگئے۔ ان کے تین کمسن بچے ادریس، نذیر اور بشیر معجزاتی طور پر بچ گئے۔ ان کی والدہ آمنہ بی بی نے انہیں فسادیوں کے حملہ کے پیشِ نظر مرغیوں کے ڈربے میں چھپا دیا تھا اور خود لحافوں والے ٹرنک میں چھپ گئی تھیں۔ بھوجیاں سے ایک ہزار کے قریب اغواء ہونے والی مسلمان دوشیزاؤں کے ساتھ فسادیوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تصوّر کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علامہ عزیز انصاری ۳۳ برس کے بعد آج سے دو سال قبل جب اپنے آبائی بھوجیاں گئے تو بھوجیاں میں تقسیم سے قبل کریانہ کی دکان کرنے والے چھیانتی سروپ نامی ہندو

سے ان کی ملاقات ہوگئی ۔ علامہ صاحب کے بیان کے مطابق چھیانتی سروپ نے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے علامہ صاحب کو بتایا کہ بھوجیاں پر حملے کے بعد ایک ہزار کے لگ بھگ اغوا شدہ عورتوں کو حملہ آور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گئے تھے۔ چھیانتی سروپ نے بھوجیاں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک مسلمان لڑکی کے اغواء کی روداد بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بھوجیاں کی مسجد (جسے فسادیوں نے شہید کر دیا تھا) اب ایک حویلی کے روپ میں موجود ہے اور اس میں ایک سکھ خاندان رہائش پذیر ہے۔ آپ اس مسجد کو دیکھنے کے بہانے چلے جائیں آپ کو اس حویلی کے صحن میں ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی دکھائی دے گی ۔ آپ اس عورت کو جب غور سے دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہ عورت بھوجیاں کے کون سے معزز گھرانے کی آبرو تھی۔

علامہ صاحب جب چھیانتی سروپ کے انکشاف کی روشنی میں اس مسجد کے ملبے اور حویلی کے پاس پہنچے تو عورت اپنی حویلی کے صحن میں چارپائی پر بیٹھی سردیوں کی دھوپ تاپ رہی تھی ۔ اس عورت نے جب علامہ صاحب کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو اس نے انہیں ایک ہی نظر میں پہچان لیا اور وہ اپنے گاؤں کے اس دیرینہ مسلمان ہمسائے کا سامنا کرنے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے برسنے والے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی بجلی کی سی تیزی سے ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ علامہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس عورت کے اوجھل ہوتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور تقسیم کے موقع پر اغواء ہونے والی ایک مسلمان دوشیزہ کی داستان نے پاکستان کے نام پر قربان ہونے والی ہزاروں مسلمان دوشیزاؤں کے اغواء کی داستانوں کی دردبھری یاد تازہ کر دی اور وہ اس سوچ میں ڈوب گئے کہ ان کے گاؤں کی اس مسلمان مغویہ کی طرح نہ جانے کتنی مسلمان عورتیں کسی محمد بن قاسم کے گھوڑوں کی ٹاپ سننے کی آس میں اپنی کوکھ سے غیر مسلم بچوں کو جنم دیتے دیتے بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔

ایک رضا کار لڑکی کا دل ہلا دینے والا بیان

اب لاہور کی ایسی لڑکی کا بیان قارئینِ کرام کی نذر کیا جاتا ہے جو قیام پاکستان کے موقعہ پر زندہ دلانِ لاہور کے دوش بدوش واہگہ سرحد عبور کرنے والے پریشان حال مہاجرین کی رضا کارانہ طور پر خدمت انجام دے رہی تھی۔ ماہنامہ حکایت کے سالنامہ (اپریل ۱۹۸۰ء) کے شمارے میں شائع ہونے والی اس لڑکی (زری) کے بیان کے مطابق پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تھا۔ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ان کی پناہ پاکستان تھی۔ پناہ گزینوں کے قافلے سیلاب کی طرح چلے آ رہے تھے۔ مسلم لیگ ہائی کمان سے حکم جاری ہوا کہ کالجوں کے طلباء تعلیم ترک کر کے واہگہ اور گنڈا سنگھ والا چلے جائیں اور مہاجرین کو سنبھال لیں یہ ایک نئی ڈیوٹی تھی۔ میں اسے معمولی سا کام سمجھ کر ایک روز لڑکیوں کے ساتھ واہگہ چلی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پچھتانے لگی کہ میں یہاں کیوں آ گئی تھی ۔ قیامت اس سے زیادہ ہولناک اور ہیبت ناک کیا ہوگی۔ انسانوں کا ایک ریلا تھا جو ہندوستان سے چلا آ رہا تھا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کے کپڑے خون سے لال تھے۔ جو زخمی نہیں تھے ان کے ذہن اور دل اتنے زخمی تھے کہ ان کے چہرے لاشوں کی مانند تھے۔ وسیع کھیتوں میں ایک ہجوم بکھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پانی سے نکالی اور ریت پر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے۔ ان میں مرد بھی تھے۔ جوان اور بوڑھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں ۔ جوان کم اور بوڑھی زیادہ اور ان میں بچے بھی تھے۔ بچے ماؤں اور باپوں کو پکارتے، روتے اور بلبلاتے آ رہے تھے۔ شاید چند ایک بچوں کو ماں باپ مل گئے ہیں۔ لیکن مہاجرین کہتے تھے کہ جن بچوں کو ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے مہاجرین ساتھ لائے ہیں۔ ان کے ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ مارے گئے ہیں۔

تین زندہ مائیں، تین مردہ بچے

پاکستان کے نام پر یتیم اور بے گھر ہو جانے والے ان بچوں کی چیخ و پکار کے ساتھ

عورتوں کے بین اور بعض کی سینہ کوبی آسمان کو بھی رلاتی تھی۔ میں نے تین مائیں دیکھیں جنہوں نے دودھ پینے کی عمر کے مردہ بچے سینوں سے لگائے رکھے تھے۔ تینوں کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں بتاتے تھے کہ یہ بچہ مر گیا ہے لاؤ اسے دفن کر دیں تو وہ بچوں کو اور زیادہ اپنے ساتھ چپکا لیتیں اور ان پر دوپٹے ڈال دیتی تھیں۔ بولتی کچھ بھی نہیں تھیں۔ آنکھیں اور منہ کھولے ہوئے سب کو دیکھتی تھیں۔ ان کے خاوند مارے گئے تھے اور خاندان کے باقی مردوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہندوستان سے آنے والے قافلوں میں بیل گاڑیاں بھی تھیں۔ ان پر عورتیں، بچے اور بوڑھے سوار تھے۔ بیشتر بیل گاڑیوں میں لاشیں تھیں۔ اس کے علاوہ کئی مہاجرین کندھوں اور چارپائیوں پر بھی لاشیں اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ میں نے لوگوں کو قبریں کھودتے ہوئے دیکھا۔ لاشیں دفن بھی کی جا رہی تھیں۔ اتنے ہجوم میں جنازہ پڑھنے والے دس بارہ سے زیادہ آدمی نہیں ہوتے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان لوگوں کے لئے موت اور تجہیز و تکفین کوئی اہمیت اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بچوں کو چیخ و پکار اور عورتوں کے بین مِل کر ایسی آواز بن گئے تھے جسے موت کی آواز کہا جا سکتا تھا۔ بعض منزل پر آ کر گرتے اور اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے گھر، جائیدادیں اور اپنے عزیزوں کی لاشیں سرحد پار چھوڑ کر آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم اپنی قربانیوں کو بھول گئے۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گی کہ مہاجرین کس حال میں آئے تھے اور ان کے خون کے رشتوں کا کس طرح قتلِ عام ہوا تھا اور ان کی جوان اور کمسن بیٹیوں کو کس طرح بے آبرو اور اغوا کیا گیا تھا۔ میں پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ قوم نے پاکستان کے لئے کتنا زیادہ خون، کتنے ہزار بچے اور کتنے جوان مرد اور عورتیں قربان کی تھیں۔ مہاجرین کو طلباء سنبھالتے تھے۔ انہیں کھلاتے پلاتے، زخمیوں کو ہسپتال اور دوسروں کو ریفیو جی کیمپ تک لے جاتے تھے۔ ہم لڑکیاں عورتوں کو سنبھالتی تھیں۔ ان دنوں ریفیو جی کیمپ تو ایک ہی تھا جسے والٹن کیمپ کہتے تھے لیکن سارا لاہور ریفیو جی کیمپ بن گیا تھا۔ سڑکوں کے کنارے مہاجرین نے ڈیرے ڈال دیئے تھے اور لاہور کے مقامی لوگ انہیں کھانا اور کپڑے دیتے تھے۔

میری یہ حالت تھی کہ میں بھول گئی تھی کہ میں جوان لڑکی ہوں۔ میرے اندر انقلاب آ گیا تھا قوم سے کفار نے پاکستان کی جو قیمت وصول کی تھی اس نے مجھے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں مہاجرین کے خون میں ڈوبی جا رہی تھی۔ ان کی مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کی فریادوں کے طوفان میں تنکے طرح اڑی جا رہی تھی۔ انہی دنوں اس ہجوم میں میں نے اپنی عمر کی ایک خوبصورت لڑکی دیکھی۔ وہ اپنے بال نوچتی، اپنے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتے اور روتی تھی۔ اس کے گالوں پر خراشیں تھیں۔ وہ روتے روتے ایک دم چپ ہو جاتی سہمے ہوئے انداز سے اِدھر ادھر دیکھتی اور دوڑ کر ایک جوان آدمی کے قدموں میں جا بیٹھتی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ وہ آدمی اسے اٹھا کر اور بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیتا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور تسلیاں دیتا تھا مگر وہ خود بھی ہچکیاں لینے لگتا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر دھاڑیں مارنے لگتا۔ اُس وقت یہ لڑکی اور ایک بوڑھی عورت اسے بہلانے بیٹھ جاتیں۔

وہاں تو اس سے زیادہ دردناک منظر دیکھنے میں آتے تھے۔ پتھر بھی پگھل رہے تھے لیکن اس لڑکی سے میری توجہ ہٹ نہ سکی۔ میرے ساتھ دو اور رضا کار لڑکیاں تھیں۔ ہم نے اس لڑکی کو دلاسہ دیا جس کا کچھ بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں ہم ایک طرف لے گئے۔ معلوم ہوا کہ جو جوان آدمی اس لڑکی کو اپنے ساتھ بار بار لگاتا ہے وہ اس کا بھائی ہے اور بوڑھی عورت ان دونوں کی ماں ہے۔ وہ امرتسر کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اس گاؤں میں آدھے گھر مسلمانوں کے تھے۔ سکھوں نے ایک روز اُن پر حملہ کیا۔ گھر میں یہ بہن بھائی تھے۔ ایک ان سے بڑا بھائی تھا اور ایک بھائی چودہ پندرہ سال کی عمر کا تھا۔ ان کا باپ بھی تھا اور یہ بوڑھی ماں بھی۔ حملے کے وقت سب گھر میں موجود تھے۔ ان کے گھر میں داخل ہونے والے حملہ آوروں کے پاس برچھیاں اور کرپانیں تھیں۔ گھر والوں نے لڑکی کو ایک چارپائی کے نیچے چھپا دیا۔ اسی چارپائی کے نیچے دو ٹرنک پڑے تھے۔ سکھوں نے لٹ مار کے لئے ٹرنک باہر گھسیٹے تو انہوں نے لڑکی کو دیکھ لیا۔ گھر کے تمام افراد اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے۔ انہیں لڑکی کی چیخیں سنائی دیں جو فوراً ہی خاموش ہو

گئیں۔ مرد حیران ہوئے کہ خاموشی کیوں ہوگئی ہے۔ گاؤں میں قیامت بپا تھی۔ باپ باہر آیا۔ اسے دیکھ کر تینوں بیٹے بھی سامنے آ گئے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں ایک کے پاس لمبی چھری اور ایک کے پاس چارہ کاٹنے والا ٹوکی تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کو سکھوں نے اندر فرش پر گرایا ہوا تھا اور لڑکی کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ لڑکی کا باپ اور بھائی سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس لڑائی میں لڑکی کا باپ، چھوٹا بھائی اور سب سے بڑے بھائی مارے گئے۔ لیکن لڑکی کی آبرو لٹ چکی تھی۔ میں نے اس کے گالوں پر خراش نما زخم دیکھے تھے۔ وہ سکھوں کے ناخنوں اور دانتوں کے نشان تھے۔ لڑکی نیم بے ہوشی میں تھی۔ یہ تینوں جس طرح اُس گاؤں سے نکال کر پاکستان آئے وہ ایک معجزہ اور سنسنی خیز کارنامہ تھا۔ آپ تصور میں لا سکتے ہیں کہ اس ماں، اُس بیٹی اور بیٹے کی جذباتی حالت کیا ہوگی جو اپنے خون کے رشتے کی لاشیں، اپنا گھر اور بیٹی کی آبرو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ذرا تصور میں لائیں کہ اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو ہماری ذہنی کیفیت کیا ہوتی؟

لاہور سے ہندو سکھ ہندوستان چلے گئے تھے اور ان کے محلے خالی ہو گئے تھے ہمت اور حوصلے والے مہاجرین ان کے مکانوں میں آباد ہو رہے تھے۔ میں نے اس لڑکی، اس کے بھائی نذیر اور ان کی ماں کو ریفیوجی کیمپ لے جانا مناسب نہ سمجھا جی میں آتا تھا کہ کم از کم اس لڑکی کو اپنے گھر ضرور لے جاؤں۔ میں بھی اس جیسی لڑکی تھی اور اس کے جذبات کو میں ہی سمجھ سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھ والی لڑکیوں سے بات کی۔ انہوں نے اپنی جان پہچان کے تین چار طلباء سے بات کی۔ شام تک ان نوجوانوں نے ایسا انتظام کر دیا کہ نذیر اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ایک ہندو کے خالی مکان میں پہنچ گیا۔ میں ان کے ساتھ تھی۔ چار کمروں کا بڑا اچھا مکان تھا۔ لیکن وہاں کوئی سامان نہ تھا۔ ہم نے کئی ایک گھروں سے برتن، کپڑے اور بستر جمع کر کے نذیر کا گھر آباد کر دیا۔ لوگوں نے انہیں کچھ پیسے بھی دیئے۔ ہمارا گھر ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ان کے ہاں تقریباً روزانہ جاتی تھی۔ نذیر اور اس کی ماں کا سوائے رونے کے کوئی کام نہ تھا۔ نذیر کی بہن چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔ کبھی چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوتی اور دوڑ پڑتی لیکن صحن میں جا کر اِدھر

اُدھر دیکھتی اور سر جُھکا کر اندر آ کر چارپائی پر لیٹ جاتی۔ نذیر نے مجھے بتایا کہ یہ رات کو بھی ایک دو مرتبہ ایسے ہی کرتی ہے۔ ایک روز اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ " کنواری "ہو؟ میں نے کہا" ہاں "تو اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ کنواری نہیں تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد نذیر گھبراہٹ کی حالت میں ہمارے گھر آیا۔ اس کی بہن لاپتہ ہوگئی تھی۔ وہ رات کو سوگئی تھی۔ معلوم نہیں کس وقت نکل گئی۔ اس نے نذیر کو بتایا کہ تھانے سے پولیس کا سپاہی آیا ہے۔ اسے تھانے بلایا گیا تھا۔ نذیر تھانے گیا تو وہاں اس کی بہن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ چہرہ اور سینہ ٹھیک تھا۔ نیچے کا دھڑ کئی ٹکڑوں میں کٹ گیا تھا۔ اس نے ریل گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لی تھی۔ تھانیدار نے نذیر کو ایک رقعہ دکھایا۔ یہ مرنے والی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ بعد میں مَیں نے بھی وہ رقعہ دیکھا تھا۔ وہ چھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ میں اپنے پیٹ میں کسی کافر کا بچہ نہیں پال سکتی۔ میں اپنی جان خود لے رہی ہوں۔ اس رقعے پر اس نے اپنے بھائی کا نام اور محلّہ لکھا ہوا تھا۔ نذیر نے تھانیدار کو بتایا کہ امرتسر کے ایک گاؤں کے ہندو سکھوں نے اس کی بہن کی عزت لوٹ لی تھی۔ چنانچہ تھانیدار نے نذیر کا بیان لینے کے بعد لاش واپس کر دی۔ (۱۷)

مسلمانوں کا اہل ہند کے ساتھ رویہ

اورنگزیب عالمگیر اور ایک ہندو برہمن دوشیزہ

پنڈت لالہ رام کاسی کے پنڈتوں کا ایک نہایت مشہور گھرانہ تھا۔ اطراف ہند کے سینکڑوں یاتری ہر وقت اس کے مہمان خانے میں بھرے رہتے تھے۔ جائیداد بھی اچھی خاصی تھی۔ برادری کے لوگ بھی اعتماد کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کم وبیش سارے بنارس کے لوگ پنڈت جی کو جانتے تھے۔ شہرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہزار تمناؤں کے بعد اُدھیڑ عمر میں ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ بچی کیا تھی جمال وزیبائی کی مورت تھی۔ ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کہاں نہیں ہوتی لیکن اس گھر کا قصہ بڑا عجیب وغریب ہوگیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب تک ماں باپ اپنی بچی کا منہ نہیں دیکھ لیتے تھے کسی چیز کو دیکھنا حرام سمجھتے تھے۔ بچی نے جیسے ہی شعور کی منزل میں قدم رکھا۔ اسکی تعلیم وتربیت کے لئے کئی کئی اتالیق مقرر کر دیئے گئے۔ قامت ورُخ کی دل کشی کے ساتھ ساتھ عقل وذہانت بھی اسے غضب کی ملی تھی۔ چودہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ علم وہنر میں یکتائے روزگار ہوگئی۔

حسن کی شہرت کے ساتھ ساتھ اب اس کے علم وکمال کی چاندنی دور دور تک پھیل گئی تھی۔ صبح کے تڑکے جب وہ گنگا اشنان کرنے کے لئے نکلتی تھی تو راہگذر میں سینکڑوں پروانے اپنی آنکھیں بچائے کھڑے رہتے تھے۔ حیا اور پارسائی کی وہ ایک مجسمہ تھی۔ گھر سے نکلتے وقت پلکوں کی جو چلمن گرتی تھی تو وہ گھر ہی واپس آکر اوپر اٹھتی تھی۔ گھاٹ یا راستے پر کبھی نظر اٹھا کر اس نے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ سال میں ایک بار وہ ہنومان مندر میں پوجا کے لئے جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پوجا کے موقعہ پر وہاں تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی۔ دور دور سے بادیدہ عشاق اس کے خرام ناز کا محشر دیکھنے کے لئے مندر کے آس پاس پجاری کے بھیس میں وہاں جمع ہو جاتے تھے۔ متھرا، جودھیا اور ہندو دھرم کے تمام بڑے بڑے شہروں سے پیغام نکاح کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن ماں نہیں چاہتی تھی۔ کہ اس کی لاڈلی بیٹی ایک لمحے کے لئے بھی اس کی پلکوں کی چھاؤں سے اوجھل ہو۔ وہ کوئی ایسا بر تلاش کرتی تھی جو ساری خوبیوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ گھر داماد بننے

کے لئے بھی تیار ہو۔ اس لئے جتنے بھی رشتے آتے۔ انہیں مسترد کر دیا جاتا تھا۔ ماں باپ پیار سے اپنی بیٹی کو شکنتلا کہتے تھے بڑے ہونے پر یہی نام سب کی زبان پر جاری ہوگیا۔ اب شکنتلا کا نام گھر ہی کے لوگوں کی زبان پر نہیں تھا دور دور تک شکنتلا کے نام کی شہرت پہنچ گئی تھی۔ ٹھیک انہی دنوں میں حضرت اورنگ زیب کی حکومت کی طرف سے ابراہیم خاں نامی ایک شخص بنارس کا کوتوال مقرر ہوکر آیا تھا۔ ابھی اسے آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ سارے بنارس میں اس کے خلاف دہشت پھیل گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک نہایت ظالم اور عیاش شخص تھا۔ اتنے دبدبے سے رہتا تھا کہ کوئی اس کے خلاف پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس کی ہولناک نگاہوں کی زد سے کسی نوشگفتہ کلی کا بچ نکلنا بہت مشکل تھا۔ اس کے جاسوس گلی گلی چلمنوں کے پیچھے مہکتی ہوئی زلفوں کا سراغ لگاتے پھرتے۔ ایک دن جاسوسوں نے فاتحانہ انداز میں کوتوال کو یہ اطلاع بہم پہنچائی۔ حضور ناحق پریشان ہیں اپنے وقت کا سب سے چمکتا ہوا ہیرا تو اسی بنارس میں موجود ہے لوگ کہتے ہیں کہ پنڈت لالہ رام کی بیٹی شکنتلا، اس کنول کا پھول ہے۔ جو سارے جھیل میں ایک ہی کھلتا ہے۔ شہر کا بہت بڑا حصہ اس کے کاکل ورخ کا اسیر ہو چکا ہے۔ صبح سے شام تک نہ جانے کتنے گھائل اس کی گلی کا چکر کاٹتے ہیں اور اس دیوار سے اپنی آنکھیں سینک کر چلے آتے ہیں۔ وہ چلتی ہے تو قدموں کی آہٹ سے قیامت جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی خمار آلود آنکھوں میں جیسے مے خانہ تیرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ اپنی زلفیں بکھیر دیتی ہے۔ تو ہر طرف کالی گھٹاؤں کا موسم امنڈنے لگتا ہے۔ اس کا ایک تبسم نہ جانے کتنے ناسوروں کا علاج ہے۔ اس کے روپہلے بدن کی رنگت اتنی نکھری ہوئی ہے، جیسے کسی نے چاندنی کا غازہ مل دیا ہو۔ یہ سن کر کوتوال کے منہ میں پانی آگیا۔ حرص وہوس کا شیطان اس کی آنکھوں میں ناچنے لگا۔ اس کی فطرت کی درندگی اب برہنہ ہوتی جارہی تھی۔ ایک بدمست شرابی کی طرح بہکتے ہوئے انداز میں کہا۔ تم اس کے گھر کا صحیح صحیح پتہ معلوم کر کے آؤ اور یہ خبر بھی لے آؤ کہ وہ اپنے گھر سے باہر کب نکلتی ہے۔

دوسرے دن جاسوسوں نے ساری تفصیلات معلوم کر کے کوتوال کو یہ اطلاع دی۔ "کاشی کے فلاں

محلے میں بالکل لب دریا اس کا گھر ہے۔ بالکل صبح سویرے وہ گنگا اشنان کرنے کے لئے اپنے گھر سے باہر نکلتی ہے۔ رات اور دن میں اس کے گھر سے نکلنے کا بس یہی وقت ہے"۔ آج کئی دن سے پنڈت لالہ رام کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھوں کی نیند بھی اڑ گئی تھی۔ کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا۔ بیوی الگ پریشان تھی۔ شکنتلا الگ متفکر تھی۔ صحیح وجہ کسی کو نہ بتاتے تھے۔ بہت پوچھنے پر بس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے کہ طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بیماری کی علامت بھی کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ یہ بہانہ چھپ سکے۔ بالآخر ایک دن ماں بیٹی دونوں بضد ہو گئیں۔ کہ آپ اپنی پریشانیوں کی صحیح صحیح وجہ بتائیے۔ کس نے آپ کو کیا کہا ہے؟ کس کی فکر میں آپ شب و روز غلطاں رہتے ہیں۔

بہت دیر تک تو پنڈت نے ضبط کرنے کی کوشش کی۔ جب غم کا دباؤ قابو سے باہر ہو گیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں بیٹی بھی اپنے تئیں ضبط نہ کر سکیں بے اختیار ان کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ بڑی مشکل سے پنڈت نے اپنے دل پر قابو حاصل کیا اور طبیعت تھم جانے کے بعد اصل واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ "یہاں کے کوتوال کے متعلق ہوس پرستی اور عیاش مزاجی کی جو داستانیں شہر میں مشہور ہیں وہ تم بھی جانتی ہو۔ اب بہو بیٹی کی آبرو اس کے حرص و آز کی درندگی سے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ جب تک کہ وہ عفت و عصمت کا کوئی تازہ خون نہیں کر لیتا۔ اس کی رات چین سے نہیں کٹتی۔ آج تک ہمارے بنارس میں کوئی ایسا بدطینت، شقی القلب اور بد مست فرمانروا نہیں آیا تھا۔ آہ! کتنی مظلوم روحیں آج اس کے زخموں کی ٹیس سے بے چین ہیں۔ کسی کو کیا معلوم؟" ابھی یہیں تک بات پہنچی تھی کہ وہ پھر پھوٹ پڑا اور روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ماں بیٹی پر ایک سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ وہ سخت حیران تھیں کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کسی صدمے نے اس طرح گھائل کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کچھ سکون ہوا تو پھر اس نے سلسلہء بیان کا آغاز کیا۔ آج چھٹا دن ہے کہ اس کے دو سپاہی بنگلے پر آئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کے کوتوال صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ خبر پا کر میرا کلیجہ سوکھ گیا۔ اس لئے کہ اس سنگدل کی سرشت سے واقف ہوں بہر حال اس کی حکومت ہے۔ چار و ناچار مجھے جانا پڑا۔ لرزتے

کانپتے جب میں اس کے سامنے پہنچا تو اس نے اپنی کھڑی کھڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے ایک تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اس کے سپاہی جھٹ پٹ گئے تو اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ مجھے خبر ہے کہ شکنتلا نام کی تمہاری بیٹی ہے۔ وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو گئی ہے۔ جب کہ کسی کے گھر کی زینت بنے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس کی ڈولی سجا کر میرے دروازے پر پہنچا دو۔ پنڈت نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کی یہ بات سن کر میں بے اختیار رونے لگا۔ بار بار مجھے اپنے خاندان کا ناموس یاد آ رہا تھا۔ بار بار میں سوچتا تھا کہ آبرو سب سے زیادہ قیمتی چیز ہوتی ہے۔ اس کے لٹ جانے کے بعد اب میرے پاس وہ کیا جائے گا؟ روتے روتے میرا برا حال ہو گیا مگر اس ظالم کو ذرا ترس نہ آیا۔ مجھے اسی حالت اضطراب میں وہ چھوڑ کر اٹھا اور کہتا ہوا چلا گیا۔ ایک ہفتے کی مہلت تمہیں دیتا ہوں۔ اگر اس مدت میں شکنتلا کی ڈولی میرے دروازے پر نہیں لگی تو یاد رکھنا میں اپنے سپاہی بھیج کر اسے اپنے یہاں اٹھوا منگواؤں گا۔ کان کھول کر سن لو کہ بنارس کے سب سے بڑے حکمران کی زبان کے الفاظ ہیں۔ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس لوٹ سکتا ہے۔ مگر میری زبان کے الفاظ واپس نہیں لوٹ سکتے"۔ کہانی کے آخری حصے میں پہنچتے پہنچتے پنڈت کا حال قابو سے باہر ہو گیا، اب اس گریہ و ماتم میں ماں بیٹی بھی پوری طرح شریک ہو گئیں۔ عورت کا دل یونہی نازک ہوتا ہے اور وہ بھی ماں کی ممتا! گنگا کی لہروں کی طرح طوفان کا ایک تلاطم برپا ہو گیا۔

ماں کا دل اس وحشت ناک صدمے کی تاب نہ لا سکا۔ وہ فرط غم سے بیہوش ہو گئی۔ شکنتلا اپنی ماں کی یہ حالت دیکھ کر پاگل ہو گئی۔ جلدی سے اٹھ کر منہ پر پانی کا چھینٹا دینا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد ماں کو ہوش آ گیا۔ پنڈت کی آنکھوں کا آنسو ابھی جذب نہیں ہوا تھا کہ اس نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ایک دن کی مہلت باقی رہ گئی ہے۔ جتنا رونا ہے رو لو۔ کل اس کے سپاہی آ کر ہماری بیٹی شکنتلا کو ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین کر لے جائیں گے۔ آہ! کل ہمارے گھر شکنتلا کی ارتھی اُٹھے گی۔ ہماری آرزوؤں کا چمن تاراج ہو جائے گا۔ کیوں نہ ہم کل سورج طلوع

ہونے سے پہلے گنگا کی لہروں میں ڈوب جائیں۔ یہ کہتے ہوئے عالم وحشت میں اٹھ کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ شکنتلا اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "باپو جی! آشانہ توڑو۔ وقت سے پہلے ہمیں یتیم نہ بناؤ۔ بھگوان کی کرپا ہوگئی تو یہ گرہ کٹ جائے گی۔ اور مان لو اگر وہی وقت آ گیا تو ہم سب کے سب ایک ساتھ ہی گنگا جی کے چرنوں میں اپنا شرن بنائیں گے"۔ بیٹی نے اصرار کر کے اپنے باپ کو خودکشی سے روک دیا۔ اس کے بعد بٹھا کر سمجھانے لگی۔ باپو جی! آپ اتنا نراش نہ ہوں۔ تدبیر کے ہتھیار سے تلوار کی دھار بھی بے بیکار ہو جاتی ہے۔ آپ کل صبح کوکوتوال کے پاس جائیے اور اس سے کہئے کہ شکنتلا کی ڈولی سجانے کے لئے ہمیں ایک مہینے کی مہلت دے۔ آخر بیٹی کو تن کے کپڑے پر ہم کیسے رخصت کر دیں۔ باپ ہونے کے رشتے سے آخر ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں۔ زیادہ نہ سہی تو کچھ نہ کچھ تو انتظام کرنا ہی ہوگا"۔ باپ نے پوچھا۔ مان لو! اس نے مہلت دے دی تو پھر ایک مہینے کے بعد کیا ہوگا جو کام اس وقت ہمیں کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کر ڈالیں"۔ بیٹی نے آنکھیں نیچی کئے ہوئے جواب دیا۔ ایک مہینے میں حالات بدل جائیں گے۔ باپو جی! وہ شاخ ہی نہ رہے گی جس پر آشیانہ باندھنے کی نوبت آئے۔ بہتر ہے آپ ہم سے اس کی تفصیل نہ پوچھئے۔

دوسرے دن کوتوالی میں سپاہیوں کا دستہ ہی کھڑا تھا کہ ہانپتے کانپتے پنڈت جی پہنچ گئے۔ کوتوال نے دیکھتے ہی دریافت کیا۔ شکنتلا کی ڈولی کہاں ہے۔ پنڈت نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔ حضور! وہ تو آپ کے چرنوں میں آنے کے لئے بالکل تیار ہے۔ مگر ماں باپ اس کو تن کے کپڑوں پر کیسے رخصت کر دیں۔ کچھ تو اس کی ڈولی سجانے کے لئے ہمیں کرنا ہی چاہیے۔ اس لئے سرکار ایک مہینے کی مہلت ہمیں پروان کریں تا کہ ہمیں بھی اپنے دل کے ارمان نکالنے کا کچھ موقع مل سکے۔ یہ غیر متوقع جواب سن کر بڈھے کوتوال کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے خوشی کے ترنگ میں جواب دیا۔ ضرور تمہیں ایک مہینے کی مہلت ملے گی۔ لیکن اس کے بعد اب مدت میں کوئی توسیع نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے جو تیاری کرنی ہے۔ اس مدت میں کر لو اور دیکھو! اس سلسلے میں میری

مدد کی بھی کوئی ضرورت ہو تو میں ہر طرح تیار ہوں"۔

پنڈت یہ جواب لے کر خوشی خوشی گھر لوٹا اور اپنی بیٹی کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ مہلت کی خبر سن کر شکنتلا کے دل میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے۔ اسے اپنے تئیں اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کافی موقعہ مل گیا تھا۔ ویسے باپ کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا تھا کہ وقتی طور پر بلا ٹل گئی۔ دوسرے دن شکنتلا نے اپنے باپ سے کہا۔: پتا جی! مغل شہزادے جس طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ بالکل ہو بہو اسی طرح میرے لئے بھی دو جوڑے تیار کرا دیجئے۔ چوڑی دار پائجامہ، انگرکھا نما قبا۔ کمر میں زریں پٹکا اور کمخواب کا سفید عمامہ۔ باپ نے ایک دو روز میں شکنتلا کی یہ فرمائش پوری کر دی۔ لیکن باپ حیران تھا کہ آخر مردوں کا پیراہن لیکر وہ کیا کرے گی۔ بیٹی نے تفصیل پوچھنے سے چونکہ منع کیا تھا۔ اس لئے اس کی زبان کچھ دریافت کرنے کے لئے کھل نہیں رہی تھی۔

سارا سامان مکمل ہو چکنے کے بعد اس نے تیسرے دن رات کے وقت اپنے ماں باپ کو فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اب میں آج رات کے کسی حصے میں اپنی مہم پر روانہ ہو رہی ہوں۔ ٹھیک ایک مہینے سے دو دن پہلے واپس آ جاؤں گی۔ اس درمیان میں آپ لوگ کسی قسم کی چنتا نہ کریں گے۔ میں جہاں بھی رہوں گی محفوظ رہوں گی۔ میری گمشدگی کا یہ راز بھی کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔ مجھے پورا وشواس ہے کہ میرا سفر ضائع نہیں ہوگا"۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنے ماں باپ کے پاؤں چھوئے اور اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ رات کے پچھلے پہر اس نے چوپال سے اپنا سدھایا ہوا تیز رفتار گھوڑا کھولا۔ سفر کے لوازمات سے اسے آراستہ کیا اور اس پر بیٹھ کر ایک طرف روانہ ہوگئی۔

آج جمعہ کا دن تھا بھارت کی راجدھانی، دھلی میں عید کی طرح سے چہل پہل مچی ہوئی تھی۔ گلی گلی سے علماء و مشائخ کی پالکیوں کے جلوس جامع مسجد کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ علم و تقدس اور طہارت و عرفان کے نورانی چہرے ستاروں کی طرح جامع مسجد کے فرش پر بکھر گئے تھے۔ لال قلعہ کے کنگورے سے پہلی توپ سر ہوتے ہی زریں پوشاک میں نقیبوں کے دستے باہر نکل آئے اور شاہی گیٹ سے جامع مسجد کے زینے تک دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ شاہانہ

کروفر کے ساتھ صاحبقراں شہنشاہ ہندوستان سلطان اورنگ زیب کی سواری محل سرائے خاص سے نکل چکی تھی۔ آگے آگے کلغیاں لگائے، ننگی تلواریں لئے ہوئے مصاحبین کا دستہ چل رہا تھا۔ شاہی سواری جدھر سے گزری مبارک، سلامت کی دعاؤں سے فضا گونج اٹھی۔ جامع مسجد کے پہلے زینے پر قدم رکھتے ہی سلطان اورنگ زیب کی پیشانی خم ہوگئی۔ یہ بندگی کا پہلا خراج تھا جو دربار خداوندی میں پیش کیا گیا۔ اب خطبے کی اذان ہوئی اور خطیب نے ممبر پر کھڑے ہوکر خطبہ شروع کیا۔ عرفاء وعشاق کے ہجوم میں جمعہ کی نمازِ دوگانہ ختم ہوئی۔ سنتیں ادا کرنے کے بعد لوگ مسجد سے باہر نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد شور بلند ہوا کہ سلطان اورنگ زیب سنتوں سے فارغ ہوکر باہر تشریف لا رہے ہیں۔ جامع مسجد کے زینوں پر ملک کے طول وعرض سے آئے ہوئے فریادی اپنی عرضیاں لئے کھڑے تھے۔ سلطان جونہی دروازے سے باہر نکلے مملکت کے عرائض نویس قلم دان لئے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔

ایک فریادی نے آگے بڑھ کر سلطان کی خدمت میں اپنی عرضی پیش کی۔ اس پر حکم صادر ہوا۔ عرضی نویس نے قلم بند کرلیا پھر آگے بڑھے پھر عرضی پیش ہوئی، حکم صادر ہوا اور قلم بند کر لیا گیا۔ یہ سلسلہ مسجد کے آخری زینے تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سب سے آخر میں ایک نہایت خوبصورت شہزادہ سر پہ کمخواب کی دستار لپیٹے ہوئے کھڑا تھا۔ جیسے ہی سلطان اس کے قریب سے پہنچے۔ وہ اپنی عرضی لئے آگے بڑھا۔ سلطان نے جونہی اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ بارِ حیا سے اس کی پلکیں جھک گئیں۔ ایک روشن ضمیر بادشاہ کو حقیقت تک پہنچنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں ہوئی۔ نقیب کو حکم دیا۔ "اس نوجوان کو دیوان خاص میں میرے سامنے پیش کیا جائے"۔ شہنشاہ کی سواری آگے بڑھی اور نقیبوں کے ہمراہ وہ نوجوان قلعہ معلیٰ کی طرف چل پڑا غازی محی الدین اورنگ زیب عالم گیر جیسے ہی اپنے دیوانِ خاص میں تخت شاہی پر فروکش ہوئے نقیب نے اس نوجوان کو فوراً پیش کیا۔ سلطان نے اپنی نظر نیچی کرتے ہوئے حکم صادر فرمایا دربار فوراً خالی کردیا جائے۔ جب سارا دربار خالی ہوگیا تو سلطان نے اپنا شاہی دوشالہ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "بیٹی! لو

دستار اتار کر یہ چادر اوڑھ لو۔ ایک عورت کو اجنبی مردوں کے سامنے بے نقاب نہیں رہنا چاہیے۔ یہ الفاظ سن کر نوجوان پر سکتے کی حالت طاری ہوگئی۔ پھر سلطان نے کہا "اپنی نسوانیت کا راز مت چھپاؤ۔ میں تمہاری فریاد ہی سننے کے لئے یہاں بیٹھا ہوں"۔ بات اب ضبط سے باہر ہوگئی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سر اور چہرے کو چادر سے چھپاتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اس کے منہ سے نکل سکے۔ "دیالو مہاراج؟ میں اس وقت خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہوں کہ اس وقت جہاں پناہ نے مجھے "بیٹی" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں ایک برہمن ذات کی لڑکی ہوں۔ سلطان نے جواب دیا۔ جب تو اور بھی تمہاری دلجوئی میرے لئے ضروری ہوگی تاکہ یہ بھید تم پر کھل جائے کہ اسلام اپنے فرمانرواؤں کو کتنا فراخ دل بنا دیتا ہے اور جن قوموں کا وہ ذمہ لے لیتے ہیں ان کے ساتھ ان کا سلوک کتنا حیرت انگیز اور روح پرور ہوتا ہے۔ اس لئے یہ جاننے کے بعد بھی تم ایک برہمن زادی ہو۔ میرا جذبہ ءِ شفقت پھر تمہیں "بیٹی" کے ساتھ مخاطب کرتا ہے۔ شکنتلا یہ جواب سن کر حیرت ومسرت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔ سلطان کا اشارہ پا کر اب اس نے اپنی دردناک سرگزشت کو سنانا شروع کیا۔ سماعت کے دوران سلطان کا حال قابل دید تھا۔ ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ کبھی پلکیں بھیگ جاتیں۔ کبھی فرطِ غم سے چہرہ سرخ ہو جاتا اسی عالم اضطراب میں کہانی تمام ہوئی۔ جب وہ اپنا بیان ختم کر چکی تو سلطان نے اپنا حکم سنایا۔ ایک مہینے کی مہلت میں چند ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ تم فوراً اپنے مستقر پر واپس لوٹ جاؤ اور اپنے والدین سے کہہ دو کہ وہ فوراً تمہارے ڈولے کا انتظام کریں۔

یہ حکم سن کر شکنتلا کے سارے ارمانوں کا خون ہوگیا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ چادر کے ایک کونے میں اپنی آنکھوں کا آنسو جذب کرتے ہوئے اُلٹے پاؤں واپس ہوگئی۔ نقیبوں کا ہجوم دیوان خاص کے باہر کھڑا تھا۔ ہاتھوں ہاتھ اسے قلعہ معلیٰ تک پہنچا دیا۔ سیدھے وہ سرائے پہنچی اپنا گھوڑا لیا اور بنارس کی طرف روانہ ہوگئی۔ راستے بھر نا کامی کی چوٹ اسے ستاتی رہی۔ بار بار وہ یہی سوچتی کہ بادشاہ نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا پھر کبھی خیال آتا کہ بادشاہ کے منہ

سے بیٹی کا خطاب معمولی چیز نہیں ہے وہ ضرور اس کا حق ادا کرے گا۔

ماں باپ نہایت بے تابی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی اس کے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کانوں میں آئی۔ ماں خوشی سے چیخ اٹھی۔ شکنتلا آ گئی"۔ بیٹی کو بخیر و عافیت دیکھ کر ماں باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ انہیں یقین تھا کہ شکنتلا کا یہ گمنام سفر کچھ نہ کچھ ضرور رنگ لائے گا۔ رات کے وقت ماں نے شکنتلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔ "بیٹی تو اتنے دن تک کہاں تھی؟ اب تو بتا دے کہ مہم سرانجام دے کر لوٹی ہے مدت مقررہ میں اب دو ہی دن روز کا وقفہ رہ گیا ہے۔ معلوم نہیں ہم لوگوں کا کیا انجام ہوگا۔ ماں کی آواز میں اتنی دردناک مایوسی تھی کہ شکنتلا کا دل بھر آیا۔ ناکامی کی چوٹ ابھر آئی۔ بے اختیار رونے لگی۔ ماں نے فرطِ محبت میں بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر بعد شکنتلا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا: میں دہلی گئی تھی۔ شہنشاہ کے حضور میں اپنی فریاد پیش کی لیکن افسوس کہ وہاں بھی میری فریاد رائیگاں گئی۔ انہوں نے حکم دیا کہ ڈولا سجا کر کوتوال کے دروازے تک پہنچا دیا جائے۔ میں اس حکم کی تعمیل ضرور کروں گی چاہے میری جان چلی جائے۔ کیونکہ شہنشاہ نے مجھے "بیٹی" کہا ہے۔ ایک برہمن زادی اپنے باپو کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ شکنتلا کی یہ بات ابھی ختم بھی نہیں ہو پائی تھی۔ کہ پھر گھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں باپ نے لاکھ سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ تیسرے دن سپاہیوں کی حفاظت میں شکنتلا کا ڈولا تیار کیا گیا۔ دن دھاڑے غشی پر غشی آنے لگی۔ سارے محلّہ پر کوتوال کے مظالم کی ایک بھیانک دہشت طاری ہوگئی۔

بوڑھا کوتوال آج خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ ایک ملکہ حسن آج اس کے گھر دلہن بن کر آ رہی تھی۔ بالوں میں خضاب آنکھوں میں سرمہ لگائے سر سے پا تک چھبیلا بنا ہوا تھا۔ جیسے بڑھاپے میں عہد شباب پلٹ کر آ گیا ہو۔ شکنتلا کے ڈولے کے اردگرد شہر کے بھکاریوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا اور انہیں پیسے لٹائے جا رہے تھے۔ ساری راہ گزر پر تماشائیوں کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے لیکن کوتوال کے قہر کے آگے کوئی چوں نہیں کر سکتا تھا۔ اب شکنتلا کا ڈولا کوتوالی کے قریب پہنچ رہا

تھا۔ ایک سپاہی نے دوڑ کر کوتوال کو اطلاع دی۔ "سرکار" ڈولا اب بہت قریب آ گیا ہے۔ بس چند قدم کے فاصلے پر ہے"۔ کوتوال نے اپنی کھڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ڈولا اس وقت دروازے پر نہ لگایا جائے جب تک کہ میں اپنے ہاتھوں سے خیرات نہ تقسیم کر لوں"۔ اب ڈولا دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کوتوال شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ باہر نکلا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے بے دریغ پیسے لٹانے لگا۔ بنارس کے بھکاریوں میں ایک لوٹ مچ گئی۔ مبارک سلامت کے شور میں کوتوال کا حاکمانہ غرور انگڑائی لے کر جاگ اٹھا۔ جیسے ہی وہ پیسے لٹا کر ڈولے کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک بڈھے فقیر نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "سرکار" کا اقبال سلامت مجھے بھی کچھ بخشش ملے"۔ کوتوال نے تیور بدل کر جواب دیا۔ زمین پر یہ گرے ہوئے پیسے تجھے نظر نہیں آتے۔ اٹھا لے انہیں تیرا دامن بھر جائے گا۔ بوڑھے نے پھر خوشامد کرتے ہوئے اصرار کیا۔ نہیں سرکار! زمین کے گرے ہوئے پیسے میں نہیں لوں گا۔ میں تو یہ ارمان لے کر آیا ہوں کہ سرکار ہی کے مبارک ہاتھوں سے کچھ خیرات لوں گا"۔ بوڑھے کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر کوتوال نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ اچھا بے! نہیں مانتا ہے تو لے" یہ کہتے ہوئے جوں ہی اس نے پیسے دینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ بڈھے فقیر نے اپنا میلا کچیلا لباس اتار کر پھینک دیا۔ اب جو نظر اٹھی تو سامنے شہنشاہ اورنگ زیب کھڑے تھے۔ کوتوال خوف سے کانپنے لگا۔ دہشت کے مارے سارے جسم کا خون سوکھ گیا۔ چہرے پر سیاہی چھا گئی۔ بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا کہ غصے سے کانپتے ہوئے شہنشاہ نے کہا۔ کیوں بے ننگ اسلام؟ اسی کرتوت کے لئے تجھے بنارس بھیجا گیا تھا۔ دن دیہاڑے میری رعایا کا خون کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ ایک ہولناک قہر و ظلم کا یہ تماشا رچاتے ہوئے تجھے اس کا خیال نہیں آیا کہ حق کے مقابلے میں اورنگ زیب کی تلوار اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی۔ کیا تجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ سارا ہندوستان اسلام کی پناہ میں ہے۔ یہاں کے اقوام کی عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ ایک مسلمان کا سب سے مقدس فریضہ ہے۔

فرطِ غضب سے شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے چنگاری پھوٹ رہی تھی اور کوتوال کا خون سوکھتا جا رہا تھا۔ اسی درمیان میں دہلی سے چلا ہوا فوجی دستہ بھی آ موجود ہوا۔ کوتوال کی طرف اشارہ کر کے شہنشاہ نے سپہ سالار کو حکم دیا۔ اس سیہ کار کو فوراً کیفر کردار تک پہنچاؤ تا کہ دوسروں کے لئے اس کا انجام تماشائے عبرت ہو اس کے دونوں پاؤں الگ الگ دو خونخوار ہاتھیوں کی ٹانگوں سے باندھ دیے جائیں اور پوری قوت کے ساتھ ہاتھیوں کو مختلف سمت دوڑایا جائے۔ یہاں تک کہ زمین پر اس بد بخت کے ریزے ریزے بکھر جائیں۔ شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کے لئے فوجی دستہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ سارا بنارس شہنشاہ اورنگ زیب کے آوازۂ رحم وانصاف سے گونج رہا تھا۔ شہنشاہ کی دانشواری رعایا نوازی اور بے لاگ قوت فیصلہ پر ہر شخص مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔

شکنتلا کا ڈولا فتح کی مسرتوں میں ڈولتا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ بجلی کی طرح شہنشاہ اورنگ زیب کے فیصلے کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ واقعہ کی اطلاع پاتے ہی شکنتلا کے ماں باپ خوشی سے پاگل ہو گئے۔ شکنتلا اپنے گھر جیسے ہی پہنچی۔ شہنشاہ اپنی "بیٹی" کے گھر تشریف لائے اور فرمایا۔ پیاس کی شدت سے بے تاب ہوں سب سے پہلے مجھے پانی پلایا جائے۔ میں اس دن سے پیاسا ہوں۔ جس دن شکنتلا نے میرے حضور میں اپنی فریاد پیش کی اسی دن میں نے اپنے خدا سے عہد کر لیا تھا کہ جب تک میں ایک مظلوم برہمن کو اس کا انصاف نہیں دے لوں گا۔ اپنے حلق کے نیچے پانی کا ایک قطرہ نہیں اتاروں گا"۔ شکنتلا نے دوشالے سے اپنا منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ بھارت کے سوامی! مجھے پورا وشواس تھا کہ جسے آپ نے اپنی بیٹی کہا ہے اس کی لجا بچانے ضرور آؤ گے اپنی محبوب رعایا کے ساتھ یہ انیائے تم سے ہرگز دیکھا نہ جائے گا۔ اسی لئے میں نے اپنی زمین میں ایک چبوترا پہلے ہی بنا دیا تھا تا کہ ہمارے شہنشاہ کو نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ تلاش نہ کرنی پڑے اسی چبوترے پر پانی اور بھوجن کا بھی انتظام ہے"۔ حضرت اورنگ زیب نے پہلے وضو کر کے شکرانے کی دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد کچھ تناول فرمایا اور پانی کے چند گھونٹ

پی کر جونہی واپس ہونا چاہتے تھے کہ پنڈت لالہ رام ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ جہاں پناہ! جس بھومی کو آپ نے اپنے سجدوں سے پوتر بنا دیا ہے۔ اب ہم اسے کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم اپنے دل کی اتھاہ گہرائی سے اس زمین کو مسجد کے لئے وقف کرتے ہیں"۔ شہنشاہ نے اس کے اس اعلان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک تانبے کے پتر پر یہ تحریر لکھ کر دے دی کہ اس مسجد کے متولی ہمیشہ اسی خاندان کے لوگ رہیں گے"۔ چنانچہ وہ مسجد آج بھی گنگا کے کنارے کھڑی ہے اور اس کا نام دھریرا کی مسجد ہے۔

سید العلماء حضرت مولانا سید شاہ آل مصطفیٰ صاحب قادری دامت برکاتہم نے تانبے کے پتر پر حضرت اورنگ زیب کا وہ تاریخی دستاویز بچشم خود ملاحظہ فرمایا ہے آج بھی اسی خاندان کا شخص اس مسجد کا متولی ہے۔ (۷۲)

حواشی

(۱)تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار،شمیم جالندھری،ادارہ مصنفات،۸۔اے ہیرن روڈ اسلام پورہ،لاہور،ص:۸۷تا۹۱

(۲)تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار،شمیم جالندھری،ادارہ مصنفات،۸۔اے ہیرن روڈ اسلام پورہ،لاہور،ص:۳۲۱تا۳۲۹

(۳)اردوڈائجسٹ،اگست۱۹۸۳ء،جلد:۲۳-شمارہ۸،ص:۲۲-۱۲۸

(۴)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۷ء،جلد:۳۷-شمارہ:۸،ص:۱۲۴-۱۲۸

(۵)آزادی کے مجاہد،جنگ پبلشرز پریس۔۱۳،سرآغاخان روڈلاہور،اشاعت اول۱۹۸۹ء،ص:۹تا۱۶

(۶)اردوڈائجسٹ۱۹۸۶ء،جلد:۲۶،شمارہ:۸،ص:۲۰۵تا۲۱۶

(۷)اردوڈائجسٹ اگست۲۰۰۳ء،جلد۴۳،شمارہ۸،ص:۱۲۴تا۱۲۷

(۸)اردوڈائجسٹ اگست۲۰۰۳ء،جلد۴۳،شمارہ۸،ص:۱۵۸تا۱۶۷

(۹)اردوڈائجسٹ اگست1981،جلدنمبر۲۱---شمارہ۸:ص۶۰-۶۴

(۱۰)سیارہ ڈائجسٹ،اگست۱۹۷۷ء،ج:۲۸ ش:۲،ص:۱۵تا۲۰

(۱۱)اردوڈائجسٹ،اگست۱۹۸۳ء،جلد:۲۳-شمارہ۸،ص:۶۷-۷۲

(۱۲)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۶ء،جلدنمبر:۳۶-شمارہ:۸،ص:۹۳-۹۷

(۱۳)اردوڈائجسٹ،اگست۱۹۹۶ء،جلد۳۶،شمارہ۸،ص۲۶۵تا۲۶۹

(۱۴)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۶ء،جلد:۳۶-شمارہ:۸،ص:۲۰۵-۲۱۲

(۱۵)آزادی کے مجاہد،جنگ پبلشرز پریس۔۱۳،سرآغاخان روڈلاہور،اشاعت اول۱۹۸۹ء،ص:۱۷تا۲۴

(۱۶)آزادی کے مجاہد،جنگ پبلشرز پریس۔۱۳،سرآغاخان روڈلاہور،اشاعت اول۱۹۸۹ء،ص:۴۹تا۵۷

(۱۷)آزادی کے مجاہد،جنگ پبلشرز پریس۔۱۳،سرآغاخان روڈلاہور،اشاعت اول۱۹۸۹ء،ص:۱۰۵تا۱۱۰

(۱۸)آزادی کے مجاہد،جنگ پبلشرز پریس۔۱۳،سرآغاخان روڈلاہور،اشاعت اول۱۹۸۹ء،ص:۱۱۱تا۱۱۴

(۱۹)آزادی کے مجاہد،جنگ پبلشرز پریس۔۱۳،سرآغاخان روڈلاہور،اشاعت اول۱۹۸۹ء،ص:۱۱۵تا۱۲۰

(۲۰)اردوڈائجسٹ اگست۲۰۰۳ء،جلد:۴۳-شمارہ:۸،ص:۱۷۲-۱۷۶

(۲۱)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۷ء،جلد:۳۷-شمارہ:۸،ص:۷۵-۷۸

(۲۲)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۷ء،جلد:۳۷-شمارہ:۸،ص:۱۶۲-۱۶۶

(۲۳)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۷ء،جلد:۳۷-شمارہ:۸،ص:۱۶۷-۱۷۵

(۲۴)اردوڈائجسٹ،اگست،۱۹۷۷ء،ج۱۷،شمارہ۸،ص:۵۷تا۶۰

(۲۵)تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار،شمیم جالندھری،ادارہ مصنفات،۸۔اے ہیرن روڈ اسلام پورہ،لاہور،ص:۳۲۰تا۳۳۹

(۲۶)تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار،شمیم جالندھری،ادارہ مصنفات،۸۔اے ہیرن روڈ اسلام پورہ،لاہور،ص:۳۴۰تا۳۴۴

(۲۷)تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار،شمیم جالندھری،ادارہ مصنفات،۸۔اے ہیرن روڈ اسلام پورہ،لاہور،ص:۳۴۵تا۳۵۲

(۲۸)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۷ء،جلد:۳۷-شمارہ۸۰،ص:۱۷۶-۱۹۲

(۲۹)اردوڈائجسٹ اگست۱۹۹۷ء،جلد:۳۷،شمارہ:۸،ص:۲۰۲تا۲۱۱

(۳۰)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی(علیگ)،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری اشاعت۱۹۹۸ء،صفحہ نمبر۳۵۲سے۳۵۳

(۳۱)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری اشاعت۱۹۹۸ء،صفحہ نمبر۷۹ سے ۸۰

(۳۲)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری اشاعت۱۹۹۸ء،صفحہ نمبر۸۱سے۸۹

(۳۳)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری اشاعت۱۹۹۸ء،صفحہ نمبر ۹۸ سے ۱۱۱

(۳۴)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری اشاعت۱۹۹۸ء،صفحہ نمبر۱۱۴سے۱۱۵

(۳۵)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری اشاعت۱۹۹۸ء،صفحہ نمبر ۱۱۸

(۳۶)آزادی کے آنسو،سید مصطفیٰ علی بریلوی،مطبوعہ:غزالی برادرس۔B-43،کمرشل ایریا۔ناظم آباد،دوسری

اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر ۱۴۷ سے ۱۵۲

(۳۷) آزادی کے آنسو، سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ: غزالی برادرس۔B-43، کمرشل ایریا۔ناظم آباد، دوسری اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر ۱۵۵ سے ۱۶۰

(۳۸) آزادی کے آنسو، سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ: غزالی برادرس۔B-43، کمرشل ایریا۔ناظم آباد، دوسری اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر ۱۶۱ سے ۱۶۷

(۳۹) آزادی کے آنسو، سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ: غزالی برادرس۔B-43، کمرشل ایریا۔ناظم آباد، دوسری اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر ۱۸۰ سے ۱۸۴

(۴۰) آزادی کے آنسو، سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ: غزالی برادرس۔B-43، کمرشل ایریا۔ناظم آباد، دوسری اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر ۱۹۳ سے ۱۹۷

(۴۱) آزادی کے آنسو، سید مصطفیٰ علی بریلوی، مطبوعہ: غزالی برادرس۔B-43، کمرشل ایریا۔ناظم آباد، دوسری اشاعت ۱۹۹۸ء، صفحہ نمبر ۵۸ سے ۶۴

(۴۲) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۴۹ تا ۲۵۶

(۴۳) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۵۸ تا ۲۶۲

(۴۴) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۷۵ تا ۲۸۰

(۴۵) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۸۰ تا ۲۸۳

(۴۶) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۸۳ تا ۲۸۶

(۴۷) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۸۶ تا ۲۹۶

(۴۸) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۲۹۷ تا ۳۰۱

(۴۹) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۳۰۲ تا ۳۰۸

(۵۰) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۳۰۸ تا ۳۱۷

(۵۱) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۳۱۹ تا ۳۲۷

(۵۲) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۳۲۸ تا ۳۴۴

(۵۳) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۳۴۵ تا ۳۷۹

(۵۴) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۳۷۹ تا ۳۹۰

(۵۵) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۲۵ تا ۴۳۸

(۵۶) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۳۹ تا ۴۴۲

(۵۷) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۴۳ تا ۴۴۶

(۵۸) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۴۹ تا ۴۶۰

(۵۹) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۶۱ تا ۴۶۷

(۶۰) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۶۸ تا ۴۶۹

(۶۱) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۶۹ تا ۴۷۶

(۶۲) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۴۸۸ تا ۵۰۶

(۶۳) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۵۰۶ تا ۵۱۱

(۶۴) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ نمبر ۵۱۲ تا ۵۲۴

(۶۵) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ: ۵۲۴ تا ۵۴۰

(۶۶) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ ۵۴۱ تا ۵۶۷

(۶۷) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ ۵۶۹ تا ۵۸۲

(۶۸) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ ۵۸۳ تا ۶۰۰

(۶۹) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ ۶۰۲ تا ۶۱۵

(۷۰) اخراج اسلام از ہند، مرتضیٰ احمد خان، تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۴۸ء، صفحہ ۶۱۵ تا ۶۲۰

(۷۱) جب امرتسر جل رہا تھا، خواجہ افتخار: الحمد پبلیکیشنز، لاہور، اشاعت ۲۰۱۰ء

صفحہ نمبر ۱۷۴ تا ۱۷۷، صفحہ نمبر ۱۷۸ تا ۱۸۲، صفحہ نمبر ۱۸۹ تا ۱۸۶، صفحہ نمبر ۲۰۰ تا ۲۰۲، صفحہ نمبر ۲۱۴ تا ۲۱۱، صفحہ نمبر ۲۱۸ تا ۲۲۰، صفحہ نمبر ۲۳۳ تا ۲۴۳

(۷۲) زلف وزنجیر، علامہ ارشد القادری، قادری رضوی کتب خانہ، لاہور، دوسری اشاعت ۲۰۱۰ء، صفحہ نمبر ۱۲۷ سے ۱۴۲